
ماہنامہ
کرن
جنوری 2018
سالِ نو مبارک
کرن کا دسترخوان
A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

حمد	اختر حسین شیخ	11
نعت	احسان حسن ساحر	11

بیادِ ابنِ انشاء

ابنِ انشا ایک عہد	قرۃ العین خرم ہاشمی	12

انٹرویو

نیا سال نئی امیدیں	شاہین رشید	16
منال خان سے ملاقات	شاہین رشید	22
میری بھی سنیے	گوہر رشید	26
مقابل ہے آئینہ	یاسمین اقبال	31

ناول

ہوائیں رخ بدل گئیں	نگہت عبداللہ	32
من مورکھ	آسیہ مرزا	194

مکمل ناول

مہجورِ نشیمن	مصباح علی سید	70
سیم زدہ	سحر ساجد	132

ناولٹ

مہرباں ہوا	عنیزہ ولی	240
عشق ہے ام الکتاب	نگہت سیما	49
فراق	صدف آصف	103
کلثوم زمانی بیگم	نفیسہ سعید	172
پیامِ صبحِ نو	جہانہ آفتاب	211

افسانے

تیر نشانہ	سیما بنت عاصم	124
نیلم	ماریہ یاسر	66
لو ہم نے ہار مانی	نزہت جبین ضیاء	226
امیدِ سحر	ماہ وش طالب	269

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے



مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو	شعاع عمیر	274
یادوں کے دریچے سے	بشریٰ محمود	277
مجھے یہ شعر پسند ہے	شگفتہ سلیمان	279
موتی چنے ہیں	ادارہ	281
مسکراتی کرنیں	روبینہ شریف	283
نامے میرے نام	مدیرہ کرن	285

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

جنوری 2018

جلد 40 شمارہ 10

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

اداریہ

ایک اور سال گزر گیا۔ جاتے سال کی اُداس ساعتوں میں آنے والے سال کی روشن امیدیں بھی مسکرا رہی ہیں۔

ابھی سن 2017ء کا آغاز ہوا تھا کہ اختتام بھی آ پہنچا۔ پتا نہیں وقت کی رفتار بڑھ گئی ہے یا زندگی کی تیز رفتاری نے ہمارے محسوسات کو بدل دیا ہے۔ ہمیں گزرتے ہوئے وقت کی ہر بات ابھی کی بات لگتی ہے۔

وقت انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ جو لمحہ بیت گیا وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ انسان اپنی پوری طاقت، جستجو اور خواہش کے باوجود وقت کا ایک لمحہ بھی لوٹانے پر قادر نہیں ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ہم اتنے قیمتی وقت کو بے معنی باتوں میں گنوا دیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی رنجشیں، لڑائیاں، جھگڑے، جلن، حسد میں ہم اپنی زندگی کی قیمتی متاع کو ضائع کر دیتے ہیں۔ زندگی ہمیں جو دیتی ہے، ہم اس کی قدر ہی نہیں کر پاتے۔ اس اٹل حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ یہ جہاں اور یہاں کی ہر چیز فانی ہے، جو آج ہے، وہ کل نہ ہوگا۔ ہم وقت کی قدر نہیں کرتے۔

سال کے آخری لمحوں میں اپنا احتساب ضرور کریں۔ ہم کیا کر سکتے تھے جو ہم نے نہیں کیا۔ یا کر نہیں پائے۔ بہت کچھ ایسا ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم کر سکتے ہیں۔ بس تھوڑا سا سوچ کا رُخ بدلنے کی ضرورت ہے۔ اپنی سوچ کو مثبت بنالیں، زندگی آسان بھی ہوگی، خوب صورت بھی۔ یہی گزرتے وقت کا پیغام ہے۔

انشاجی،

ایک انداز جوگیوں جیسا
ہم نے دیکھا ہے ابن انشاجی

نگر نگر گھومتے، شاعری کرتے، کالم لکھتے انشاجی کا دُنیا میں تمام بھی جوگی کا پھیرا ہی تھا۔ آئے اور چلے گئے مگر مختصر سی زندگی میں بہت کچھ دے گئے، خوشیاں، مسکراہٹیں، قہقہے۔ اور دل گداز شاعری۔

انشاجی کا کالم پڑھیں۔ پڑھتے ہوئے مسکراہٹ لبوں سے جدا نہیں ہوتی سبے ساختگی، روانی اور زندگی کا فطری بہاؤ۔ شاعری دیکھیں تو الگ ہی دُنیا نظر آتی ہے۔ جوگ بجوگ کی باتیں، درد و سوز اور حکایتِ دل۔ انشاجی کی شاعری میں تشنگی بھی ہے اور غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا قصہ بھی۔

انہوں نے زیادہ عمر نہیں پائی لیکن ان کے کالم، ان کی شاعری کی عمر بہت طویل ہے۔

11 جنوری 1978ء کو وہ دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی برسی کے موقع پر دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- ابنِ انشا ایک عہد" قرۃ العین خرم ہاشمی،
- نیا سال، نئی امیدیں" شاہین رشید کا مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے سروے،
- فنکارہ منال خان سے شاہین رشید کی ملاقات، ، اداکار گوہر رشید کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
- اس ماہ یاسمین اقبال کے "مقابل ہے آئینہ"، ، نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول "ہوائیں رُخ بدل گئیں"،
- آسیہ مرزا کا ناول "من مورکھ کی بات نہ مانو" اپنے اختتام کی طرف، ، سحر ساجد کا مکمل ناول "سیم زدہ"
- "مجبور نگینہ" مصباح علی سید کا ناول اپنے اختتام کی طرف، ، نگہت سیما کا ناولٹ "عشق ہے اُم الکتاب"
- صدف آصف، کلثوم زمانی بیگم اور جہانہ آفتاب کے ناولٹ،
- سیما بنت عاصم، نزہت جبیں ضیاء، ماریہ یاسر اور ماہ رخ طالب کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

"کرن کا دسترخوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔

حمد باری تعالیٰ

حرارت نبضِ ہستی کی، فقط تیری رضا دیکھے
تماشا ہر قدم، بے تاب چشم آشنا دیکھے

حسِ جاں ڈوبنے کو ہو، اگر بے درد موجوں میں
تیرا ہی آسرا پائے، تجھے مشکل کشا دیکھے

حقیقت رنگ و بو کی پوچھ، چشمِ عشق پیشہ سے
جہاں کے ذرّے ذرّے، اسے جلوہ نما دیکھے

مقام بندگی یہ ہے، مٹا کر ماسوا یکسر
نظر احساس کی، اللہ کو حاجت روا دیکھے

جبین شوق میں اخترؔ، سجا اس ذات کا سجدہ
خدا کو دیکھتا ہو تو، ترا جھکنا خدا دیکھے

اختر حسین شیخ

نعت رسول مقبولؐ

اُترا تھا جو حرا میں مقدس رسول پر
وہ چلتا پھرتا بولتا قرآن آپؐ ہیں

جس چہرۂ حسیں میں نہاں عکسِ ذات ہو
اس ربِ کائنات کی پہچان آپؐ ہیں

خلق و عطا و عجز کے گل ہائے مختلف
جس میں سجے ہوئے ہیں وہ گلدان آپؐ ہیں

عرشِ معلیٰ پر جنہیں جانے کا شرف ہے
دونوں جہاں میں اولیں انسان آپؐ ہیں

ان دو حقیقتوں سے تو زندہ ہے یہ نظام
یہ کائنات جسم ہے اور جان آپؐ ہیں

احسان حسن ساحر

ابن انشاء ایک عہد

قرۃ العین خرم ہاشمی



یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں
یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاجی کا نام نہ لو کیا انشاجی سودائی ہیں؟
ہیں لاکھوں روگ زمانے میں
کیوں عشق ہے رسوا بے چارا
ہیں اور بھی وجہیں وحشت کی
انسان کو رکھتیں دکھیارا
ہاں بے کل بے کل رہتا ہے
ہو پیت میں جس نے جی ہارا
پر شام سے لے کر صبح تلک
یوں کون پھرے گا آوارہ؟
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں
یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاجی کا نام نہ لو کیا انشاجی سودائی ہیں؟

کیا انشاء جی سودائی ہیں؟ ابن انشاء ایک عہد، ایک صدی کا نام ہے۔۔! وہ عہد، جو آج بھی اپنے لفظوں میں زندہ ہے۔ سانس لے رہا ہے ابن انشاء کے لفظوں میں، وہ منتر، وہ جادو ہے، جو آنے والے وقت کو اپنی گرفت میں رکھنے کا ہنر جانتا ہے۔ ان کے لفظوں کی روانی اور بہاؤ، پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ بہا کر کہیں دور، کسی جوگی کی بستی میں، کسی بنجارے کے راستوں میں، کسی عشق کی دھول میں لے جاتا ہے۔ ان کا نثری انداز برجستہ اور خوب صورت جملوں سے مزین ہے۔ وہ شگفتہ انداز میں معاشرے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں اور ان کی شاعری کے اتار چڑھاؤ میں، من کے بھید کھلتے ہیں!

معلوم ہمیں سب قیس میاں کا قصہ بھی
سب ایک سے ہیں، یہ رانجھا بھی، یہ انشا بھی!!

اپنے دور میں سب بڑے اور نامور ناموں کے درمیان ابن انشاء اپنی ایک الگ اور مضبوط پہچان رکھتے ہیں۔ ابن انشاء جن کی تحاریر ایک نظر سے گزرتی رہی ہیں! جنہیں ہم میں سے بہت سے لوگ قریب سے تو نہیں جانتے ہیں مگر ان کے لفظوں کی وجہ سے ہم احساس اور انس کی ایک ڈور سے بندھے ہوئے ضرور ہیں۔ آج مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں ان کے بارے میں کچھ لکھ سکوں تو۔۔۔! یہاں آ کر میرے سب لفظ گونگے ہو گئے ہیں۔ سورج کو سر اٹھا کر دیکھنا آسان نہیں ہوتا! کہاں ایک گمنام سا ذرہ، سورج کی مدح سرائی کرے! ہاں مگر میں یہاں کچھ مضامین کی مدد سے ان کی زندگی کا احاطہ ضرور کرنا چاہوں گی کیونکہ ہم میں سے بہت سے لوگ ان کے

بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں۔

"انشاجی جسے پکارتے ہو۔۔
اس شخص کا نام شیر خاں ہے!!"

شاعر، مزاح نگار ابن انشاء کا اصلی نام شیر محمد خاں تھا۔ جالندھر کے ایک نواحی گاؤں، پھلا پور میں 15 جون 1927ء کو پیدا ہوئے۔ 1946ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور 1953ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا 1962 میں نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ٹوکیو بک ڈیویلپمنٹ پروگرام کے وائس چیئرمین اور ایشین کو پبلی کیشن پروگرام ٹوکیو کی مرکزی مجلس ادارت کے رکن تھے۔ دو شعری مجموعے "چاند نگر" اور "اس بستی کے کوچے میں" شائع ہو چکے ہیں چینی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ (چینی نظمیں) شائع ہوا۔

یونیسکو کے مشیر کی حیثیت سے متعدد یورپی و ایشیائی ممالک کا دورہ کیا تھا۔ جن کا احوال اپنے سفر ناموں

"چلتے ہو تو چین چلیے"
"آوارہ گرد کی ڈائری"
"دنیا گول ہے"
اور
"ابن بطوطہ کے تعاقب میں"

اپنے مخصوص طنزیہ و فکاہیہ انداز میں تحریر کیا۔ اس کے علاوہ "اردو کی آخری کتاب" اور "خمار گندم" ان کے فکاہیہ کالموں کے مجموعے ہیں۔

ابن انشاء ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے۔ ان کے اندر کا بے چین فرد، جو جوگی بن کے نگر نگر گھومنا چاہتا تھا۔ انھیں اقوام متحدہ کے آفس کی ملازمت کے سلسلے میں دنیا بھر کے ممالک کا دورے کرنے کا موقع ملا اور ان دوروں کے سفر نامے بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیے۔

انشاء جی نے جہاں اردو نظم وغزل، کہانیاں، ناول، افسانے، سفرنامے، کالم نگاری، تراجم، بچوں



کے عالمی ادب، مکتوبات اور دیگر ادبی اصناف پر کام کیا۔ تحریر انداز بیاں اور جدا رنگ سخن کی وجہ سے میر، کبیر اور نظیر اکبر آبادی کے ہم قلم شاعر تھے۔ ان کے کلام کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی کہ ان کے اشعار گیت و غزل انسانی جذبات کے قریب تر ہو کر دل کے تار کو چھو لیتے تھے۔ کیوں کہ شاعری کا تعلق دل کی واردات سے ہوتا ہے۔ ان کی جس غزل نے شہرت و مقبولیت کے جھنڈے گاڑے اس کی چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

انشاء جی اٹھو، اب کوچ کرو اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

انشاء جی کی شاعری میں حسن و جاذبیت کی وجہ یہ ہے کہ وہ زبان میں اپنے جذبات اور احساسات کو بھرپور انداز میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اپنے دلکش اسلوب اور طرز خاص سے اردو غزل کو مقبول بناتے ہوئے انتہائی سادگی سے دلنشین انداز میں پیش کیا۔ ابن انشاء نے اردو ادب میں جدت اور شگفتہ نگاری پر توجہ دی اور ایک ایسے انداز کی داغ بیل ڈالی جو ادبی دنیا میں ایک منفرد خصوصیت رکھتی ہے اور اسی خوبی کی وجہ سے انھیں بیسویں صدی کی ادبی دنیا میں ممتاز مقام ملا۔ انھیں ان کی ادبی خدمات، شاعری، سفرناموں، خطوط، فکاہیہ کالموں، تراجم، افسانوں، ناول نگاری اور دیگر اصناف ادبی و علمی کاوشوں کی بدولت ادبیات اردو میں ایک معتبر نام کا رتبہ کا اعزاز حاصل ہوا۔ LetterofMan

چاند نگر کے انشاء کی شاعری میں دیوانگی، حسن

اور عشق کے کئی کہے، ان کہے قصے جا بجا ملتے ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بنجارہ، اپنی دھن میں اونچے نیچے راستوں پر چلتا، دل کے ساز پر محبت اور احساس کے نغمے گنگناتا ہے۔دل سے نکلے ہیں لفظ، اس لیے پڑھنے والوں کے دلوں کو گھیر لیتے ہیں! ایک نغمہ، ایک ردھم، ان کی شاعری میں موجود ہے۔جہاں اپنی بستی کا قصہ بھی ہے اور دنیا کی بے ثباتی کا یقین بھی۔۔۔! اس لیے تو وہ ہر قدم پر کہتے نظر آتے ہیں کہ

"جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہرجائی ہے
اس شہر سے دور۔۔۔ اک کٹیا ہم نے بنائی ہے
اور کٹیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے......سب مایا ہے!

کہتے ہیں کہ ابن انشاء کو اپنی والدہ محترمہ سے بہت محبت تھی۔ جس کا اندازہ سردار محمود کے دیے ہوئے اس انٹرویو سے ہوتا ہے۔

سردار محمود بیان کرتے ہیں کہ

"ہماری اماں پہلے تو گھر کے دروازے سے بھائی جان کو چوم چمچا کر اور پیار دے کر خدا حافظ کہہ دیتیں اور وہ ایک آدھ بار پیچھے دیکھ کر اپنے راستے پر قدم آگے بڑھانے لگتے۔اماں کا یہ حال کہ جب تک بیٹا لمبی گلی میں جاتا نظر آتا رہتا ادھر دیکھتی رہتیں اور خدا معلوم اپنے رب سے کیا کیا دعائیں مانگتی رہتیں۔ جونہی وہ گلی کا موڑ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے وہ خاموشی سے گھر کی چھت پر آجاتیں اور کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں سے انھیں جاتا ہوا دیکھتی رہتیں۔ تاحد نظر، پھر جب وہ اور ان کے تین چار ساتھی طالب علم درختوں کی اوٹ میں غائب ہو جاتے تو کچھ دعائیں پڑھتی نیچے اتر آتیں۔

اس زمانے میں گھڑیاں عام نہیں تھیں۔ کم از کم ہمارے گھر میں نہیں تھی لیکن ہماری والدہ کو معلوم ہو جاتا تھا کہ بیٹے کی اسکول سے آمد کا وقت قریب ہے۔ چنانچہ وہ کافی دیر پہلے ہی پھر چھت پر پہنچ جاتیں۔

وہ ہر بات میں اپنے بیٹے کا دفاع کرتیں اور تعلیمی معاملات میں ان کا دل بڑھاتیں اور ایک چھوٹی گاؤں میں گزار کر جب وہ لدھیانہ کے لیے روانہ ہوتے تو کس طرح وہ ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ خوردنی اشیاء کی پوٹلیاں بناتیں اور بار بار انھیں ہدایت کرتیں کہ ہوسٹل پہنچ کر وہ انھیں ضرور اپنے استعمال میں لائیں اور ساری دوستوں میں تقسیم نہ کر دیں۔" اپنے طور پر یہ والہانہ مادرانہ شفقت کتنی دلآویز ہے۔

زندگی کے آخری حصے میں وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے، بہ حیثیت وزیر وہ مہنگے سے مہنگے علاج کرانے کا حق رکھتے تھے لیکن حب الوطنی کا انداز تو دیکھیے کہ انھوں نے وطن عزیز پر علاج کے اخراجات کا بوجھ ڈالنا گوارا نہیں کیا بلکہ نیشنل ہیلتھ اسکیم کے تحت اپنا علاج کراتے رہے وہ بیماری کی حالت میں بھی اپنا لکھنے کا کام جاری رکھتے رہے۔یہ ابن انشاء ہی کا کمال اور ذوق تھا کہ انھوں نے انتہائی مصروف زندگی میں بھی اردو ادب کی احسن انداز میں آبیاری کی۔اردو ادب کے عظیم و انقلابی شاعر شگفتہ مزاج ادیب، کالم نگار، سیاح افسانہ و ناول نگار اور کتنوں سے محبت کرتے یہ عہد آفرین شخصیت اپنے ہزاروں چاہنے والے دوست اور مداحوں کو غمگین کر گیارہ جنوری 1978 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اب انشاء جی کو بلانا کیا اب پیار کے دیپ جلانا کیا
جب دھوپ اور چھایا ایک سے ہوں
جب دن اور رات برابر ہو
وہ راتیں چاند کے ساتھ گئیں
وہ باتیں چاند کے ساتھ گئیں
اب سکھ کے سپنے کیا دیکھیں
جب دکھ کا سورج سر پر ہو

☆☆

پھر نیا سال، نئی صبح، نئی امیدیں
اے خدا خیر کی خبروں کے ساتھ اجالے رکھنا

نیا سال ماضی کی تلخیاں بھلا کر خوش گوار توقعات کے ساتھ ایک بار پھر نئی امیدیں لے کر آپ کے سامنے ہیں۔ دعا ہے کہ نیا سال نہ صرف ہمارے، ہمارے ملک کے لیے مبارک ہو بلکہ تمام عالم کے لیے مبارک ثابت ہو۔ ہر سال نئے سال کی ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے، دیکھتے ہیں مختلف شعبہ جات کے لوگ نیا سال کس طرح سیلیبریٹ کرتے ہیں۔
اس دفعہ ہمارا سوال ہے کہ
آپ نئے سال کو کس طرح مناتے ہیں؟ گھر میں رہ کر یا فیملی کے ساتھ گھر سے باہر جا کر۔

نیا سال نئی امیدیں

شاہین رشید



قیصرہ حیات

(ڈرامہ رائٹر + ناول و افسانہ نگار)

میں نیو ایئر پہ کبھی باہر نہیں گئی، ایک تو سردی بہت ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ کہ ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے، ہم سب یعنی گھر کے افراد نئے سال کی سیلیبریشن ٹی وی پہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔۔۔ دعا ہو رہی ہو تو دعا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کیک کھانے کو دل چاہ رہا ہو تو والد صاحب سے منگوا کے سیلیبریٹ کرتے ہیں اور گھر والوں کے ساتھ خوشی میں شریک ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عمر فاروق

ENT اور Cochlear implanT اسپیشلسٹ

نیو ایئر کو ہم خاص طور پر سیلیبریٹ نہیں کرتے۔۔۔ کیونکہ ہم مسلمانوں کا نیو ایئر ذرا مختلف ہوتا ہے۔ اور بات اسلامی بھی نہیں ہے مگر جب فائرنگ ہوتی ہے پٹاخے پھاڑے جاتے ہیں تو اچھا نہیں لگتا۔ جن کا یہ تہوار ہے وہ بھی اس طرح سے نیو ایئر نہیں مناتے جس طرح سے ہم مناتے ہیں وہ صرف نیو ایئر ہی نہیں مناتے ان کے یہاں دوسری باتیں بھی بہت اچھی ہیں، ان کے یہاں نیو ایئر پر جو سیل لگتی ہے وہ واقعی سیل ہوتی ہے۔۔۔ وہاں کم حیثیت والے نیو ایئر اور کرسمس کی سیل میں اپنے لیے سال بھر کی خریداری کر لیتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں تہواروں کے موقعوں پہ ہر چیز مہنگی ہو جاتی ہے اور سیل میں بھی ریجیکٹڈ مال بھیجا جاتا ہے۔



عمرانہ مقصود: (رائٹر)

میری زندگی میں کوئی ایسا نیو ایئر نہیں ہے کہ جس کو میں نیو ایئر کہوں بس ایک سال ختم ہوا اور دوسرا سال شروع ہو گیا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ سب بچے ہمارے گھر جمع ہو جاتے ہیں کھانا کھاتے ہیں۔ گانے گاتے ہیں اور ہلا گلہ کرتے ہیں چونکہ سب کو میوزک سے لگاؤ ہے تو کوئی گا رہا ہوتا ہے تو کوئی انسٹرومنٹ بجا رہا ہوتا ہے، میری بیٹی بھی آ جاتی ہے باتیں ہنسی مذاق۔ بس اس سے آگے کچھ نہیں ہوتا اسے ہی ہم نیو ایئر ——— کہتے ہیں۔ زیادہ تر ہم بڑے بھی اور بچے بھی گھر میں ہی رہتے ہیں۔۔۔ اس دن گھر سے نکلنا بھی مشکل ہوتا ہے پھر ہمارا ماحول بھی ایسا نہیں ہے۔۔۔ ایسے موقع پر مجھے اپنی ایک دوست یاد آتی ہے۔ ایک دفعہ میں ملک سے باہر گئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ اس بار نیو ایئر کیسے منایا تو اس نے کہا کہ بہت اچھی طرح کہ گارڈز کی ایک گاڑی پیچھے کی طرف اور ایک آگے کی طرف لگا دی تھی اور نیو ایئر با حفاظت منایا۔۔۔ تو لعنت ہے ایسی تفریح پر۔۔۔



پروفیسر شاداب احمد صدیقی (حیدرآباد)

میں انگریزی کے نئے سال کو نہیں مانتا، کیونکہ اس کا ہمارے مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر ویسے بھی اس دن انتہا سے زیادہ فائرنگ کی وجہ سے انسانی جانوں کا بہت نقصان ہوتا ہے۔۔۔ طوفان بدتمیزی عروج پہ ہوتی ہے اور پیسے کا ضیاع ہوتا ہے، عریانی اور فحاشی کا اہتمام کیا جاتا ہے اور رقص و سرور کی محافل منعقد کی جاتی ہیں۔۔۔ ان تمام باتوں کی اجازت ہمارا مذہب ہرگز نہیں دیتا، یہ صرف یہود و نصاریٰ کی تقلید ہے جو بھی تہوار ہمارے مذہب کے خلاف ہے ہمیں اس کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ میرا نیو ایئر منانے والوں سے یہ سوال ہے کہ اس کو منانے کے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔۔۔ اس رات کتنے ہی گھر کے چراغ فائرنگ کی وجہ سے گل ہو جاتے ہیں، اور جس سال کا آغاز ہی قتل و غارت گری سے ہو تو پھر انجام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

جمیل احمد

آر جے + وائس اوور آرٹسٹ + اداکار

بہ حیثیت مسلمان ہم تو اس نیو ایئر پر اتنا فوکس نہیں کرتے۔ بس ٹھیک ہے نیا سال شروع ہو رہا ہے خوشی کی بات ہے اور نئے سال کے لیے کوئی خاص تیاری نہیں ہوتی۔۔۔ ہاں اتنا ضرور کرتے ہیں کہ جب معلوم ہوتا ہے کہ فلاں جگہ پہ آتش بازی کا



منظر ہو گا تو وہاں چلے جاتے ہیں، جیسے گزشتہ سال ہم "پورٹ گرینڈ" گئے تھے اپنی فیملی کو لے کر اور ہم سب نے انجوائے کیا تھا۔ اور وہاں بھی بچوں کی خاطر ہی گئے تھے۔

ناجیہ اشعر (نیوز اینکر)



نیو ایئر کی کوئی بہت خاص سیلیبریشن تو نہیں ہوتی بس ایک ایکسائٹمنٹ سی ہوتی ہے کہ نیا سال آرہا ہے بچے زیادہ خوش نظر آرہے ہوتے ہیں۔۔۔ میری تیاری اس حد تک ہوتی ہے کہ سال کے آخر تک ہمیں بہت سارا میٹریل تیار کرنا ہوتا ہے پروگرام کے لحاظ سے کہ سال بھر کیا ہوتا رہا، اور پھر نئے سال سے جو توقعات ہوتی ہیں اس کے بارے میں بھی لوگوں سے بات ہوتی ہے پروگرامنگ کے حوالے سے بڑی تیاری ہوتی ہے۔۔ اور پھر اپنی زندگی پر بھی نظر ڈالتے ہیں کہ سال بھر کیا کیا کیا ہے اور نئے سال میں کیا کرنا ہے۔۔ بندے نے پلاننگ تو بہت کی ہوتی ہے تو یہ بھی دیکھتے ہیں کہ گزشتہ سال جو پلاننگ کی تھی اس میں کیا کیا پورا ہوا، کیا حاصل کیا اور پھر نئے سال کے لیے سوچتے ہو کہ کون سے پرانے کام مکمل کرنے ہیں اور کون سے نئے کام شروع کرنے ہیں۔۔ بڑی سنجیدگی کے ساتھ مستقبل کی پلاننگ ہوتی ہے۔ گھر سے باہر جا کر کوئی سیلیبریشن نہیں کرتے کہ سڑکوں پر رش بہت ہوتا ہے تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اس دن بچوں کو لے کر گھر سے باہر نہ نکلیں۔

احمد میر

(اداکار۔۔۔یقین کا سفر کے ڈاکٹر اسفندیار)



میں نیو ایئر گھر پر رہ کر اپنی فیملی کے ساتھ ہی مناتا ہوں اور فیملی کے ساتھ خوشیاں سیلیبریٹ کر کے ایک بہت اچھا احساس ہوتا ہے تو فیملی کے ساتھ ہی اس دن کو انجوائے کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد جنید (ڈینٹل سرجن)

نیو ایئر حقیقت میں اسکول کی سردیوں کی



چھٹیوں سے ایسوسی ایٹڈ ہوتی ہے تو ہم لوگ تو پوری فیملی کے ساتھ شہر سے باہر کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے گئے ہوتے ہیں اور زیادہ تر ہم شدید سردی والے ایریاز جیسے نادرن ایریاز میں جا کر مناتے ہیں، اور بچوں کے ساتھ اور فیملی کے ساتھ بہت انجوائے کرتے ہیں اور اپنے شہر سے باہر ہی نیو ایئر کو بھی ویلکم کرتے ہیں۔

انور مقصود: (رائٹر)



نئے سال کے موقع پر میں گھر سے نہیں نکلتا، کیونکہ اگر آنے والا سال اچھا ہو۔۔ تو خوشی میں نکلنا چاہیے پاکستان میں ہر آنے والا سال جانے والے سال سے برا ہوتا ہے اس لیے میں گھر سے نکلتا ہی نہیں اور نہ ہی ٹی وی کے کسی شو میں جاتا ہوں۔

عائشہ جہاں زیب: (اینکر)



نیو ایئر اپنی فیملی کے ساتھ سیلیبریٹ کرتی ہوں، عام طور پر تو گھر پر ہی سیلیبریٹ کرتے ہیں مگر کوشش کرتے ہیں کہ کھانا گھر سے باہر کھایا جائے پوری فیملی کے ساتھ اور اگر گھر پر اہتمام ہو تو پھر کچھ سنگرز کو بھی بلا لیتے ہیں، اور سب کے فرمائشی گانے سن رہے ہوتے ہیں۔۔ اور اس طرح سال کا آخری دن گزر جاتا ہے

الطاف حسین (ڈی ایس پی)



بہ حیثیت ایک پولیس افسر کے ہماری تو نیو ایئر

پہ ڈیوٹیاں ہی لگی ہوئی ہوتی ہیں ۔۔۔ لیکن پھر بھی جیسے ہی موقع ملتا ہے اور نیا سال شروع ہوتا ہے تو میں دو رکعت نفل شکرانے کے ادا کرتا ہوں اور نئے سال کے لیے دعا مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے کہ یہ سال ہمارے لیے بابرکت اور مبارک ثابت ہو، اور یہ سال صحت اور خوشحالی لے کر آئے ۔۔ ہمارے لیے، ہمارے ملک کے لیے، ہمارے ہم وطنوں کے لیے یہ سال مبارک ثابت ہو۔ خوشیوں کا سال ہو۔

شازیہ انور

(جوائنٹ ایڈیٹر ہم ٹی وی نیٹ ورک)



اس بحث سے قطع نظر کہ نیا سال کب منانا چاہیے مجھے لگتا ہے کہ اپنوں کے ساتھ خوشیاں منانے کے ہر موقع کا فائدہ اٹھانا چاہیے ۔ کیونکہ فی زمانہ بڑھتی ہوئی مصروفیات نے ہمیں اپنوں سے بہت دور کر دیا ہے ۔۔ تو چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ضرور منائیں گذشتہ کئی سالوں سے 31 دسمبر کی رات جوشیلوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا مشکل امر لگتا ہے، فائرنگ، فائر ورک سمیت دیگر ہنگامہ خیزیاں ہماری راہوں کی رکاوٹ ہوتی ہیں ۔ اس لیے تمام دوستوں اور رشتے داروں کو تہنیتی پیغامات بھیجتی ہوں، ، اور جن سے ممکن ہو بات بھی کر لیتی ہوں، شام گھر آتے وقت چھوٹا سا ۔۔ کیک لانا ضروری ہے

کیونکہ میرے بیٹے کے نزدیک کوئی بھی خوشی کیک اور سرپرائز گفٹ کے بغیر نامکمل ہے، ہم ڈائننگ ٹیبل پہ کیک سجا کر رات 12 بجے کا انتظار کرتے ہیں، نئے سال کا آغاز ہوتے ہی کیک کاٹتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ نیا سال ہمارے ہمارے بہی خواہوں، پورے ملک، قوم اور دنیا میں جہاں جہاں مسلمان ہیں سب کے لیے خیر و عافیت، کامیابیوں اور ترقیوں کا سال ثابت ہو۔

بنیش راجہ (ڈرامہ آرٹسٹ)



نیو ایئر پر کچھ اسپیشل پلان نہیں کرتے، بس گھر میں ہی رہتی ہوں۔

شہناز نقوی ۔ (رائٹر + صحافی)

میں نیو ایئر بہت ساری دعاؤں، بہت ساری نئی امیدوں اور اس کے ساتھ ایک روشن اور پر امن دنیا کی خواہش کے ساتھ گھر سے باہر کہیں کھلی فضا میں فیملی ڈنر یا پھر کسی ادبی، ثقافتی پروگرام میں شرکت کر کے مناتی ہوں کہ ہم سب نے ماضی سے کچھ سیکھا ہوگا۔ اور اپنی ذات کے حوالے سے میں اپنی ذات کا محاسبہ ضرور کرتی ہوں۔



منال خان سے ملاقات

شاہین رشید

یہ حقیقت ہے کہ جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس طرح ایک ہی ماں باپ کے سارے بچوں کے نصیب بھی ایک جیسے نہیں ہوتے، حتیٰ کہ جڑواں بچے بھی اپنا اپنا نصیب لے کر آتے ہیں۔۔شوبز کی دنیا میں دو جڑواں بہنیں ناظرین میں اور شوبز کی دنیا میں کافی پاپولر ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس فیلڈ میں جتنا کام ''ایمن خان'' کر رہی ہے ''منال خان'' نہیں۔۔۔ایمن اگر سال میں چار سیریلیز کرتی ہے تو منال شاید ایک یا دو۔۔۔ایمن کے انٹرویوز بھی آپ نے بہت پڑھے ہوں گے مگر منال کے زیادہ نہیں خیر آج ہم آپ کی ملاقات ''ایمن خان'' کی بہن منال خان سے کروائیں گے۔

☆''کیا حال ہیں منال؟''

×''جی اللہ کا شکر ہے۔''

☆''دو بہنیں۔ایک سی شکلیں۔سب ہی سوال کرتے ہوں گے مگر میں ذرا مختلف باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔۔ایمن بہت کام کرتی ہیں۔۔آپ بہت کم۔۔وجہ؟''

×''نہیں ایسا نہیں ہے۔کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس کا کام لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں میرا نہیں۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی اس کا کام جلدی آن ایئر ہو جاتا ہے کبھی میرا۔۔۔ورنہ کام تو ہم دونوں ہی کر رہی ہیں۔۔۔''

☆''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ایمن خان کا نام لوگوں کی زبان پر زیادہ چڑھا ہوا ہے اور۔۔۔''

×''جی۔۔۔یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے، اور پھر لوگوں کو کام سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے۔اب آرٹسٹوں کے ناموں پہ لوگ ذرا کم ہی توجہ دیتے کسی کا کام بہت زیادہ پسند آجائے تو نام پوچھ لیتے ہیں کہ اس لڑکی کا نام کیا ہے۔''



☆''اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ لوگ کہتے ہوں گے کہ یہ ایمن ہے یا منال ہے۔۔''

× ہنستے ہوئے۔۔''جی۔۔۔جی ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔ویسے اب لوگ کافی حد تک ہمیں ہمارے ناموں سے پہچاننے لگے ہیں۔۔۔جب ہم اس فیلڈ میں آئے تھے۔تب لوگوں کو کافی مشکلات ہوتی تھیں۔۔''

☆''اب پہچانے جانے کی کیا وجہ ہے؟۔۔کوئی چینج آیا آپ میں؟''

×''نہیں چینج تو نہیں آیا۔لیکن لوگوں کو تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا ہے۔اگر شکلوں سے نہیں تو بات چیت سے تو ہو ہی جاتا ہے۔تھوڑا بہت فرق تو اللہ میاں نے رکھا ہی ہوتا ہے۔آخر ہماری پیدائش میں بھی تو تھوڑا فرق ہے ہی۔''

''اچھا!۔۔۔کتنا فرق ہے!''

''ہنستے ہوئے۔۔۔ایمن مجھ سے آدھا گھنٹہ بڑی ہے کہنے کو وہ آدھا گھنٹہ بڑی ہے مگر کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ مجھ سے دو تین سال بڑی ہے۔۔''

☆''اچھا کیوں ایسا لگتا ہے؟''

×''بس کئی باتوں میں اس کا رعب ہے بلکہ تھا۔۔اب ایسا نہیں ہے مگر کچھ بھی ہو۔۔ہے تو مجھ سے بڑی۔۔''

☆''رعب کس چیز کا؟''

×''یہی کہ یہ چیز میری ہے۔تیار ہونا ہے تو مجھے پہلے ہونا ہے، کپڑے لینے ہیں تو اس سے اچھے والے لینے ہیں۔۔بس انہی باتوں کا رعب تھا بھی۔۔اور اب بھی ہے مگر کم ہے۔''

☆''کام کے معاملے میں؟۔۔کہ یہ سیریل میں کروں گی تم نہیں؟۔۔''

×''نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔۔بلکہ اس معاملے میں ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت کوآپریٹو ہیں۔۔اور پھر پروڈیوسر اور ڈائریکٹرز ہی ہمیں پک کرتے ہیں اس لیے اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔''



☆''ویسے جڑواں، پھر ایک جیسی شکلیں، پھر ایک جیسا کام، نقصان ہے یا فائدہ؟''

×''نہیں۔۔۔اگر بہت زیادہ فائدہ نہیں ہے تو بہت زیادہ نقصان بھی نہیں ہے۔۔بس ٹھیک ہے سب کچھ۔۔ہاں فیلڈ تھوڑی مختلف ہونی چاہیے تھی۔۔خیر۔۔۔ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی اس فیلڈ کے کسی اور شعبے میں چلے جائیں۔۔۔مگر ابھی بہت ٹائم ہے اس بارے میں کچھ سوچنے کا۔''

☆''گو کہ آپ جڑواں ہیں۔۔اور ماں باپ کو اپنی ساری اولاد سے پیار ہوتا ہے۔۔پھر بھی لگتا ہے کہ پیارا الگ ہے ماں باپ کا؟''

×''جی۔۔۔جی۔۔۔بالکل۔۔۔ایمن کو بابا بہت چاہتے ہیں بہت پیار کرتے ہیں جبکہ ماما مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔اور مشترکہ بات یہ ہے کہ بابا اور ماما ہم دونوں کی کسی بھی خواہش کو رد نہیں کرتے۔اور ہماری ہر جائز خواہش کو مانتے ہیں۔''

☆''اور آپ دونوں میں کس کو کس سے زیادہ محبت ہے؟''

×''ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت محبت ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھوری ہیں۔''

☆''آپ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ آتی جاتی

ہیں، سوائے شوٹس کے، بھی ایک ساتھ کسی سیریل میں کام کرنے کا اتفاق ہوا؟"

x"جی۔۔۔ جیو کا ایک سیریل تھا "من کے موتی" اس میں ہم نے ایک ساتھ کام کیا تھا۔ لیکن چند اقساط تک کیونکہ کردار ایسے نہیں تھے کہ دیر تک یا آخر تک چلتے۔"

☆"آج کل ڈرامہ سیریل "لوٹ کر چلے آنا" میں آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

x"بہت اچھا۔۔۔ لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔ اور سیریل بھی بہت اچھا ہے اور حقیقت کے قریب ہے۔"

☆"نعمان اعجاز اور سویرا ندیم جیسے منجھے ہوئے اور سینئر فنکاروں کے ساتھ کام کر کے کیسا لگا۔۔ کوئی ڈر کوئی خوف تھا کیا؟"

x"ارے نہیں۔۔۔ بلکہ میری تو شدت سے خواہش تھی کہ میں ان دونوں کے ساتھ کام کروں۔۔ خاص طور پر نعمان اعجاز صاحب کے ساتھ اور میں بہت خوش ہوں ان کے ساتھ کام کر کے کیونکہ جب مجھے بتایا گیا کہ نعمان اعجاز بھی اس سیریل میں اہم رول کر رہے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی کہ میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔"

☆"پھر کیسا لگا ان کے ساتھ کام کر کے؟"

x"مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔۔۔ اور ہم سینئرز سے ہی کچھ سیکھ سکتے ہیں کیونکہ انہیں کام کا بہت تجربہ ہوتا ہے۔"

☆"نعمان اعجاز اور سویرا ندیم کے ساتھ کام کرنے کی خواہش تو پوری ہو گئی۔۔۔ اب اور کوئی بھی ہے جس کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہیں؟"

x"جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ مجھے ماریہ واسطی بے حد پسند ہیں، اب ان کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں۔۔"

☆"اس فیلڈ میں کہاں تک جانا ہے؟"

x"بہت آگے تک۔۔۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ میں ایسا کوئی کردار کرنا چاہتی ہوں کہ جو میرے نام سے زندہ رہے اور اسے کبھی کوئی بھول نہ پائے۔"

☆"اب تک کتنے سیریلیز وغیرہ کر چکی ہیں؟"

x"کام تو میں کافی کر چکی ہوں۔ فہرست لمبی ہے لیکن چند نام میں آپ کو بتا سکتی ہوں۔ ان میں ایک تو جو آج کل چل رہا ہے۔ "لوٹ کر چلے آنا" میرا پہلا ڈرامہ "محبت جائے بھاڑ میں" تھا جس میں میں نے ایک اسکول طالبہ کا کردار کیا تھا۔ پھر "قدوسی صاحب کی بیوہ" میں اور ایک سیریل تھا "ادھوری عورت" اس میں بھی اہم رول تھا۔۔۔ اور میں نے اب تک جتنے بھی سیریلیز کیے ہیں وہ سب ہی بہت مقبول ہوئے۔"

☆"فلم کی طرف کوئی رجحان ہے یا صرف ڈرامے ہی کرنے ہیں؟"

x"ویسے تو میں ماشاء اللہ ڈراموں میں بہت زیادہ مصروف ہوں لیکن بڑی اسکرین پہ کام کرنے کی بھی بہت خواہش ہے۔۔۔ اور جہاں کہیں اچھی آفر ملی خواہ اپنے ملک میں یا پڑوسی ملک میں کام ضرور کروں گی۔"

☆"کیا ڈیمانڈ ہو گی آپ کی؟"

x"کچھ نہیں۔۔۔ بس اچھا اسکرپٹ ہو۔۔۔ ڈائریکٹر بہت اچھا ہو، میرا رول بہت اچھا ہو۔۔۔ بس یہی کچھ ہوتا ہے ایک فلم کے لیے۔"

☆"ماڈلنگ کا تجربہ کیسا رہا۔۔۔ اچھا لگا۔۔۔ پیسہ بھی زیادہ ملتا ہے اور ٹائم بھی کم لگتا ہے۔۔۔ ایسا ہی ہے نا؟"

x"بات تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر ہر وقت پیسے کے بارے میں بھی نہیں سوچا جا سکتا، کام کے معیار کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ ویسے میں سب کے لیے ماڈلنگ نہیں کرتی، مشہور برانڈز کے لیے، مشہور بوتیک کے لیے اور مجھے مزا آتا ہے اس طرح کی ماڈلنگ میں۔ کمرشل ماڈلنگ کم کی ہے میں نے۔ کیونکہ ٹائم نہیں ملتا۔"

☆"آپ کو پتا ہے کہ ہمارے ڈرامے ملک سے باہر بھی بہت پسند کیے جاتے ہیں؟"

x"جی۔۔۔ جی۔۔۔ بالکل معلوم ہے۔۔۔ ہمارے جو لوگ رشتے دار ملک سے باہر ہیں وہ ہمیں بتاتے رہتے ہیں کہ ہمارے ڈرامے بہت زیادہ پسند

کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ پڑوسی ملک میں بھی۔۔۔"

☆"منال آپ نے ایک دو ڈراموں میں کامیڈی رول بھی کیے ہیں۔ خود آپ کی کیا خواہش ہوتی ہے کہ کیسے رول ہوں؟"

x"جو ڈائریکٹرز مجھے بک کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ چونکہ میری شکل میں بہت معصومیت ہے اس لیے مجھے معصومانہ کردار ہی کرنے چاہئیں۔ اس لیے مجھے ایسے ہی کردار ملتے ہیں۔۔۔ ایسا ہی کچھ ایمن کے ساتھ بھی ہے۔"

☆"مقابلے کی فضا سگے بہن بھائیوں میں بھی ہوتی ہے۔۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ زیادہ اچھی پرفارمر ہیں۔ یا ایمن اور لوگ کیا کہتے ہیں؟"

x"لوگ تو ہم دونوں کی ہی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایمن مجھ سے زیادہ اچھی پرفارمر ہے۔"

☆"اور یہی خیال ایمن کا ہوگا۔۔۔ خیر یہ بتاؤ کہ ہر وقت ایک جیسے کام سے بور نہیں ہو جاتیں؟"

x"ایک جیسے کیوں؟ بہت ورائٹی ہے ہمارے کام میں نیا سیریل، نیا رول۔ مجھے تو بہت مزا آتا ہے۔ میں تو اس فیلڈ میں بہت انجوائے کر رہی ہوں۔"

"گڈ۔۔ شکلیں ایک جیسی ہونے کا کبھی کوئی فائدہ اٹھایا۔ یعنی ایمن کی جگہ تم اور تمہاری جگہ ایمن؟"

x"نہیں کبھی بھی نہیں۔۔۔ نہ ہمارے مزاج ایسے ہیں نہ ہم میں لالچ ہے۔۔ جو کام میرا ہے وہ میرا ہی ہے اور جو ایمن کا ہے وہ اس کا ہے۔"

☆"گھر والے خوش ہیں آپ دونوں کے کام سے کوئی خدشات تو انہیں پریشان نہیں کرتے؟"

x"بہت خوش ہیں۔۔۔ شروع شروع میں یقیناً خدشات ہوں گے کہ پتا نہیں فیلڈ کیسی ہو۔۔۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ انہیں یقین ہو گیا کہ فیلڈ میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے، اگر انسان خود اچھا ہو۔۔۔ شروع میں بابا اور ماما دونوں ہمارے ساتھ جاتے تھے، پھر کبھی بابا اور کبھی ماما جاتی تھیں۔۔ مگر اب ہم خود ہی چلی جاتی ہیں۔۔۔"

"باقی جو بھائی (جڑواں) و ... ن ہے۔۔ انہیں شوق نہیں اس فیلڈ میں آنے کا؟"

x"جی فی الحال تو نہیں ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ فیوچر میں شوق ہو جائے۔۔۔"

☆"آپ دونوں نے اپنے فیوچر کے بارے میں کیا سوچا تھا؟"

x"کچھ بھی نہیں۔۔۔ ہمارے والدین نے یہ بات ذہن میں بٹھا دی تھی کہ بس اپنے اوپر اعتماد رکھنا اور دلجمعی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا تمہارے فیوچر کے راستے اللہ تعالیٰ خود ہموار کرتا چلا جائے گا۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ والدین کی حوصلہ افزائی نے ہی ہمیں کامیابیاں عطا کی ہیں۔"

☆"ایمن کی تو منگنی ہو گئی۔۔ آپ کے کیا ارادے ہیں؟"

x"دیکھیں۔۔۔ جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔۔ انسان کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے اپنی تعلیم بھی مکمل کرنی ہے اور اس فیلڈ میں بھی بہت آگے تک جانا ہے۔"

☆"امور خانہ داری سے دلچسپی ہے؟"

x"کوئی خاص نہیں۔۔۔ لیکن امی سے سیکھ رہی ہوں کہ لڑکیوں کو سب کچھ آنا چاہیے۔ پھر امی کے ساتھ ہاتھ بھی بٹاتی ہوں۔"

☆"فرصت کے اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

x"سچ پوچھیں تو فرصت کے اوقات بہت کم ملتے ہیں۔۔۔ اور جب مل جائے قسمت سے تو پھر میں مووی دیکھتی ہوں۔۔۔ یا پھر شاپنگ کے لیے نکل جاتی ہوں۔"

☆"شاپنگ کا شوق ہے یا ونڈو شاپنگ کرتی ہیں؟"

x"دونوں طرح کی شاپنگ کا شوق ہے۔۔۔ شاپنگ کی نیت سے جاتی ہوں تو پھر کچھ نہ کچھ ضرور خریدتی ہوں۔"

"اس کے ساتھ ہی ہم نے منال خان سے اجازت چاہی۔"

☆☆

میری بھی سنیے

گوہر رشید

شاہین رشید



☆ "میرا نام"
× "گوہر رشید"
☆ "پکارا جاتا ہوں؟"
× "صرف گوہر کے نام سے، شکر ہے کہ نام بگڑا نہیں میرا۔"
☆ "دنیا میں آمد؟"
× "2 مئی۔"
☆ "بہن بھائیوں میں میرا نمبر؟"
× "آخری ہے جی۔۔۔ سب کا پیار میرے حصے میں آیا ہے۔"
☆ "تعلیم؟"
× "گریجویٹ ہوں اور میرے مضامین میں ٹی وی اور فلم بھی شامل تھا۔ اور جرنلزم بھی۔"

☆ "انسان نصیب کا کھاتا ہے یا محنت کا؟"
× "کھاتا نصیب کا ہے مگر نصیب کو ڈھونڈنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔۔۔ اور میں نے بھی محنت کی، اللہ نے صلہ دیا۔"
☆ "میری سفارش کس نے کی؟"
× "اللہ تعالیٰ نے۔۔۔ الحمدللہ میری پہلی جاب ہم نیٹ ورک پہ بھی اور میرٹ کی بنیاد پر تھی۔۔۔ جو کام کیا میرٹ پہ ہی کیا۔"
☆ "آج کل میری مصروفیات؟"
× "مصروفیات تو بہت ہیں، ڈراموں میں بھی اور فلم کے حوالے سے میں آپ کو الگ بتاتا ہوں۔"
☆ "فلم؟"
× "جی میری فلم ریلیز ہوگی 21 دسمبر کو آپ کے میگزین کے آنے سے پہلے اور بہت سے لوگ ان شاء اللہ اسے دیکھ بھی چکے ہوں گے۔ فلم کا نام "رنگریزہ" ہے اور آج کل اس کی پروموشن میں کافی مصروف ہیں۔"
☆ "کہاں کہاں پروموشن کرتی ہے؟"
× "پہلے لاہور، پھر اسلام آباد، اس کے بعد دبئی، دبئی سے یوکے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔"
☆ "فلم میں میرا کردار؟"
× "فلم میں میرے کردار کا نام "وسیم والے" ہے یہ ایک ڈھولک پلیئر ہے ایک قوال بینڈ کا۔"
☆ "مشکل کردار ہے یا آسان مزے کا؟"
× "اس کے لیے میں نے بہت محنت کی، میں نے اپنا پورا گیٹ اپ تبدیل کیا، مونچھیں رکھیں بال بڑے کیے اور اپنا وزن بڑھایا۔۔۔ تو بہت اچھا کردار ہے ان شاء اللہ سب کو پسند آئے گا اور سب اس فلم کو

ضرور دیکھیں اور ہمیں فیڈ بیک دیں۔"
☆ "میرے آن ایئر ڈرامے؟"
× "مجھے جینے دو اور دو ون چینل سے آن ایئر ہے یہ ہر پیر کی شب آٹھ بجے آن ایئر ہوتا ہے اور اس کا موضوع یعنی بنیادی کہانی "چائلڈ میرج" ہے۔"
☆ "آنے والے ڈرامے؟"
× "ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا، کیونکہ ابھی یہ سیٹ پہ ہیں کب مکمل ہوں کب آن ایئر ہوں پتا نہیں۔"
☆ "شہرت ملی؟"
× "ڈائجسٹ رائٹر نے مجھے بہت شہرت دی۔"
☆ "کون سا دن اچھا لگتا ہے؟"
× "جب اپنی فیملی کے ساتھ ہوتا ہوں، تب ہر دن ہر تہوار اچھا لگتا ہے۔ اپنی ہر خوشی پریشانی انہی کے ساتھ شیئر کرتا ہوں۔"
☆ "چڑچڑا ہو جاتا ہوں؟"
× "جب بھوک لگ رہی ہو اور کچھ کھانے کو نہ ہو۔"
☆ "خوشی کا دن؟"
× "چھٹی کا دن۔ خوشی ہوتی ہے کہ آج کام پر نہیں جانا اور میں دیر تک نیند کے مزے لوں گا۔"
☆ "جب بور ہوتا ہوں تو؟"
× "موویز دیکھتا ہوں، یا مطالعہ کرتا ہوں۔ مجھے مطالعہ کرنا اچھا لگتا ہے۔"
☆ "پیسا کس کے لیے کماتا ہوں؟"
× "اپنی عزت کے لیے کیونکہ اس دنیا میں اگر ہے عزت تو پیسے والے کی۔"
☆ "پیسا کمانا مشکل ہے؟"
× "پیسا کمانا مشکل نہیں ہے۔ جتنی محنت کریں گے اتنا پھل ملے گا۔ بشرطیکہ آپ کی قسمت بھی اچھی ہو۔"
☆ "کب جھوٹ کا سہارا لیتا ہوں؟"
× "کسی کو دکھ اور پریشانی سے بچانے کے لیے اکثر میں جھوٹ کا سہارا لے لیتا ہوں۔"
☆ "کب پھنس جاتا ہوں؟"
× قہقہہ۔۔۔" جہاں سچ نہیں بولنا ہوتا وہاں



بھی سچ بول دیتا ہوں۔ آپ اسے میری بری عادت بھی کہہ سکتی ہیں۔"
☆ "کھانا بیڈ پہ کھاتا ہوں یا ڈائننگ ٹیبل پہ؟"
× "مجھے زمین پہ بیٹھ کر یعنی چٹائی بچھا کر کھانا کھانے میں مزا آتا ہے۔"
☆ "گھر کا کھانا اچھا لگتا ہے یا باہر کا؟"
× "نہ جی۔۔۔ گھر کے کھانے سے اچھا کوئی کھانا ہو ہی نہیں سکتا۔ باہر بہت کم کھانا کھانے جاتا ہوں۔"
☆ "سینما میں پہلی فلم جو دیکھی؟"
× "جیوا"
☆ "فقیر کو کم سے کم کتنے دیتا ہوں؟"
× "100۔۔۔ اب تو اس کی بھی ویلیو کم ہوگئی ہے۔"
☆ "اکثر سوچتا ہوں کہ؟"
× "کاش بنگلہ دیش ہمارا ہوتا۔ مشرقی پاکستان کے نام سے۔"
☆ "شکر ادا کرتا ہوں؟"
× "آئینہ دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مکمل انسان بنایا ہے مجھے۔"
☆ "زندگی میں کامیابی کے لیے؟"

×''محنت اور سخت محنت، ایمانداری اور دوسروں کے تجربات سے سیکھنا۔''

☆''کھانے کے دوران کس چیز کا استعمال زیادہ کرتا ہوں؟''

×''پانی ۔۔پانی کے بغیر کھانا کھانا مشکل ہو جاتا ہے ویسے بھی میں پانی زیادہ پیتا ہوں۔''

☆''غصے میں میرا ردعمل؟''

×''میں زیادہ تر خاموش رہتا ہوں اور گھر سے باہر نکل جاتا ہوں تاکہ بدتمیزی نہ ہو جائے۔''

☆''یادگار ڈرامے؟''

×''ڈائجسٹ رائٹر کے بعد ''من مائل'' یہ بہت زیادہ پسند کیا گیا۔۔بے حد۔۔پھر ''کھلونا'' بھی اچھا تھا اور اعتراض بھی۔''

☆''فریش ہو جاتا ہوں؟''

×''جب فجر کی نماز پڑھتا ہوں۔ویسے بھی مجھے اپنے مذہب سے بہت لگاؤ ہے۔۔اللہ مجھے ایک اچھا مسلمان بننے کی مزید توفیق دے۔''

☆''کن باتوں سے ڈرتا ہوں؟''

×''غریب اور لاچار، اور معذور لوگوں کا دل دکھانے سے ڈرتا ہوں اور اللہ سے ہر وقت دعا کرتا ہوں کہ جانے انجانے میں بھی کوئی ایسا وقت نہ آئے کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف اور دکھ پہنچے۔''

☆''2018ء الیکشن کا سال ہے میں اگر پاور میں آیا تو؟''

×''تو اس ملک میں جتنے بھی بے ایمان، چھوٹے، کرپٹ لوگ ہیں انہیں ملک بدر کر دوں گا۔ مگر میں پاور میں کیسے آسکتا ہوں (قہقہہ) لیکن اپنے وطن کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

☆''میری زندگی کا بہترین دور؟''

×''جب میں اپنے فیوچر کے لیے جدوجہد کر رہا تھا، کیونکہ مجھے اپنی محنت کا رزلٹ بھی مل رہا تھا۔۔ حالانکہ جب میں پریکٹیکل لائف میں آیا تو میں نے کافی لطف ٹائم گزارو مگر اس کا تو پھل کھانے کا مزا آتا ہے۔''

☆''لڑکیوں سے آنکھیں ملا کر بات کرتے ہیں؟''

×''زیادہ تر نظریں نیچی ہی ہوتی ہے۔اور کوئی لڑکی بہت زیادہ نظریں ملا کر بات کرے تب نظریں نیچی ہی کر لیتا ہوں۔''

☆''گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟''

×''امی کا۔ان کے غصے سے ڈرتا ہوں۔''

☆''صبح اٹھ کر دل چاہتا ہے؟''

×''دوبارہ سو جاؤں اور کام پر نہ جانا پڑے۔ بستر چھوڑنا اکثر مشکل ہو جاتا ہے۔''

☆''اپنے کون ہوتے ہیں؟''

×''اس کے لیے اپنوں کو آزمانا بہت ضروری ہے۔کیونکہ آزمائش میں ہی لوگ کھل کر سامنے آتے ہیں۔''

☆''میں کیا ہوں؟''

×''ایک سچا اور کھرا انسان۔''

☆''لڑکیوں میں خوب صورتی پسند ہے یا خوب سیرتی؟''

×''جو چیز ساری زندگی کام آنی ہے وہ سیرت اور ذہانت، اس لیے یہ پسند ہے خوب صورتی ایکسٹرا کوالٹی ہے۔''

☆''سکون کے لیے ضروری ہے؟''

×''امی کی گود۔ماں کے پاس ہی سکون ملتا ہے۔''

☆''میرے پاس ذخیرہ ہے؟''

×''جی ذخیرہ ہے بہت ساری تصاویر کا جو مختلف اوقات میں اپنی فیملی کے ساتھ بنواتا ہوں یا ان کی بناتا ہوں۔ کیونکہ یہ میری یادیں ہیں جنہیں جمع کرنا میرا مشغلہ ہے۔یادوں کا ذخیرہ دل و دماغ میں ہے اور تصاویر کا ذخیرہ البم کی صورت میں ہے۔''

☆''دیس دیس کے کھانے پسند ہیں یا اپنے دیس کے؟''

×''صرف اور صرف اپنے دیس کے اپنے کھانوں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔''

☆''فیس بک، انٹرنیٹ کو کتنا وقت دیتا ہوں؟''



x ''پہلے بہت دیتا تھا۔ مگر اب نہیں کیونکہ اب مصروفیات بہت زیادہ ہوگئی ہیں تو ٹائم کم دیتا ہوں۔''

☆ ''مجھے ہر وقت دھڑکا رہتا ہے؟''

x ''کہ کہیں میں اپنے قریبی لوگوں کو کھو نہ دوں۔ مجھے سب سے بہت پیار ہے۔ میں کسی کو کھونا نہیں چاہتا ۔۔۔ اللہ میرے اپنوں کو سلامت رکھے (آمین)''

☆ ''گھر سے نکلتے وقت کیا چیزیں لازمی لے کر نکلتا ہوں؟''

x ''گاڑی کی چابی، والٹ اور سیل فون۔ یہ چیزیں نہ لوں تو ادھورا ادھورا سا محسوس ہوتا ہے۔''

☆ ''غلطی کا اعتراف جلدی یا دیر سے کرتا ہوں؟''

x ''فوراً کرلیتا ہوں۔۔۔ سوری کرلیتا ہوں۔''

☆ ''کسی سے دوستی ہو جائے تو؟''

x ''تو پھر کوشش کرتا ہوں کہ اس کے اچھے اور برے دنوں کا ساتھی بن جاؤں۔ پکی دوستی ہو جائے تو توڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

☆ ''اچھے مشورے کون دیتا ہے دل یا دماغ؟''

x ''دل اور میں سنتا بھی دل کی ہوں اور مانتا بھی دل کی ہوں۔''

☆ ''دعا کرتا ہوں کہ''

x ''کہ مجھے کبھی غرور میں مبتلا نہ کرنا۔ اپنا عاجز بندہ بنا کر رکھنا۔''

☆ ''ہاتھ میں کس کے ذائقہ ہوتا ہے؟''

x ''میرے خیال میں عورت کے ہاتھ میں ذائقہ ہوتا ہے۔''

☆ ''ناشتا اور کھانا گھر میں کون اچھا بناتا ہے؟''

x ''صرف اور صرف میری ماں۔''

☆ ''ملنا چاہتا ہوں؟''

x ''قائداعظم سے اور بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے ملک کا کیا حال ہوگیا ہے۔''

☆ ''خواتین کی ایک بری عادت؟''

x ''بات کا بتنگڑ بہت بناتی ہیں ایک ذرا سی بات کو بہت ہوا دیتی ہیں۔''

☆ ''اچھی عادت؟''

x ''مخلص ہوتی ہیں، پرخلوص ہوتی ہیں۔''

☆ ''کیا کھویا کیا پایا اس فیلڈ میں؟''

x ''الحمدللہ کچھ نہیں کھویا۔ بلکہ بہت کچھ پایا ہے۔ عزت دولت شہرت سب کچھ۔''

☆ ''کفایت شعار ہوں؟''

x ''نہیں۔۔۔ مگر فضول خرچ بھی نہیں ہوں۔ ضرورت کی چیزیں لیتا ہوں۔۔۔ اور جہاں خرچ کرنا ضروری ہو، کر بھی دیتا ہوں۔''

☆ ''پاکستان کے لیے کیا سوچتا ہوں؟''

x ''یہ پوچھیں کہ کیا نہیں سوچتا۔ خدا ہمارے ملک کو سلامت تا قیامت رکھے۔'' (آمین)

☆☆

کچن اور آپ

اس ماہ عندلیب زہرا کو ''کچن اور آپ'' میں انعام کا حق دار قرار دیا ہے۔ ادارے کی طرف سے عندلیب زہرا کو تین ماہ کے لیے ''ماہنامہ کرن'' مفت دیا جارہا ہے۔

یاسمین اقبال

ادارہ

☆ ''آپ کا پورا اور اصلی نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے تھے؟''

x ''یاسمین اقبال ہی پورا اور اصلی نام ہے۔ گھر والے گوگی، گوگی دی بچی کرلنگ والے بالوں کی وجہ سے گوگی جوگی اور سارے والی خالہ گوگی مرن جوگی کہتی تھیں۔ جیسے ہی شادی ہوئی اباّ نے سب کو وارننگ دے دی کڑی دا ویاہ ہوگیا ہے اس نوں عزت نال تے اصلی نام نال بلایا کرو لوجی بیاہ نا ہوا وزیراعظم کی کرسی مل گئی بس پھر تو اتنی عزت ملی کہ گوگی تو کہیں دفن ہوگئی یہ نام تو اب بھولی بسری یاد بن کر رہ گیا ہے۔''

☆ ''کبھی آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟''

x ''چار دن کا بیشتر حصہ آئینے کو یقین دلانے میں گزر جاتا ہے کہ بھائی کبھی ہم بھی خوب صورت تھے۔ آئینہ بھی اکثر کہتا ہے کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت حسین تھی۔'' (ہاہاہا)

☆ ''حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟''

x ''صدقے جاؤں بنانے والے کے بے ساختہ منہ سے سبحان اللہ نکلتا ہے۔''

☆ ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو''؟

x ''کھنگھ (کھانسی) والا سیرپ، شوگر بلڈ پریشر کی گولیاں (گوڈوں گٹوں) کے مساج کے لیے کوئی آئل یا بام وغیرہ۔۔۔ ہاہاہا''

''چاکلیٹ رنگ برنگی ٹافیاں، ٹشو، سونف، غبارے۔ بچے بہت پیارے لگتے ہیں ان کی خوب صورت مسکراہٹ دیکھنے کے لیے ان کو ان چیزوں کا لالچ دیتی ہوں۔ بڑی لالچی ہوں میں۔''

☆ ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

x ''بھوتوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی البتہ اک بھوتنی سے ڈر لگتا ہے جو اکثر آئینے میں آکر ڈراتی ہے۔'' (ہاہاہا)

☆ ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

x ''مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ بہت اچھے لگتے ہیں ان مہمانوں کا تو منہ چومنے کو دل کرتا ہے جو اپنا رزق ساتھ لے کر آتے ہیں جن کے دونوں ہاتھوں میں فروٹ اور مٹھائی کے شاپر ہوتے ہیں۔''

☆ ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

x ''اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ہر چیز۔ کھانے میں کوئی نخرہ نہیں۔''

☆ ''پسندیدہ شاعر؟''

x ''(اپنے علاوہ) امجد اسلام امجد اور ہر وہ شعر جو بقول فوزیہ ثمر بٹ کے جو دل کی چولیں ہلا دے۔''

☆ ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو؟''

x ''اسلامی شریعت نافذ کروں گی۔''

☆ ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

x ''بچپن میں لڑاکا تھی۔ اب بالکل بھی نہیں۔''

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیے نکال
مدت سے آرزو تھی سیدھا کرے کوئی

☆ ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

x ''اپنے جیسے معصوم سیدھے سادے محبت کرنے والے۔''

☆ ''اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی؟''

x ''پھر ہم اللہ کے شکر گزار بندے کیسے بنتے اسی کی بدولت تو دن میں کئی بار اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔''

☆ ''اللہ پاک کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

x ''وہی وقت بہترین ہے جس میں اللہ کو یاد کیا جائے۔''

بقیہ صفحہ نمبر 273



نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے‘ چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی‘ مدد کرتے ہیں۔
حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں‘ وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اس قدر تیز طرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں
حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ‘ خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔
سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ‘ حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

تیسری قسط



حمزہ تین دن بعد آفس آیا تھا تو آگے اس کی ٹیبل پر کافی کام جمع ہو گیا تھا۔ لیکن حیدر علی کی اچانک وفات نے اسے ایسا دھچکا لگایا تھا کہ وہ سنبھل نہیں پا رہا تھا۔ ابا کے بعد وہی تو تھے جنہوں نے ہر قدم اس کی ڈھارس بندھائی تھی کہ آج وہ اپنے گھر کو سہارا دینے کے قابل ہو گیا تھا۔ اور یہیں تک تو بس نہیں تھا اسے آگے بھی ان کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ حقیقتاً وہ اب خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ رات فاخرہ کی گود میں سر رکھ کر وہ باقاعدہ رو پڑا تھا۔

''تایا جان کو ابھی نہیں جانا چاہیے تھا امی۔''

''بیٹا اللہ کی مرضی۔'' فاخرہ کے اپنے آنسو چھلک گئے کیونکہ انہیں یہی لگ رہا تھا جیسے ان کے بچے دوسری بار یتیم ہو گئے ہوں۔

''تائی جان کیسے...... کیا...... کریں گی۔ بیٹیوں کا ساتھ ہے۔'' اسے ادھر کی بھی فکر تھی اور فاخرہ کے پاس وہی جواب تھا۔

''اللہ مالک ہے۔''

''اللہ تو مالک ہے ہی۔'' اس وقت فائل پر نظریں جمائے اس کا ذہن اسی سوچ میں الجھ رہا تھا کہ ربیکا کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا وہ اس کے سامنے چیئر کھینچ کر بیٹھ گئی تب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''آپ تین دن سے کہاں غائب تھے؟'' ربیکا نے پوچھا تو وہ بمشکل خود کو بولنے پر آمادہ کر پایا۔

''میں نے باس کو فون کر دیا تھا۔''

''یقیناً کیا ہوگا۔ مجھے بتانے میں کیا حرج ہے۔''

''کوئی حرج نہیں۔ میرے تایا جان کی اچانک ڈیتھ ہو گئی میں اس لیے نہیں آ رہا تھا۔''

''اوہ ویری سیڈ آئی ایم سوری۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور افسوس کا اظہار کر کے کہنے لگی۔ ''مجھے ڈیڈی نے نہیں بتایا ورنہ میں اسی روز تعزیت کے لیے آتی۔''

''نیور مائنڈ۔'' وہ یہی کہہ سکا۔

''آپ مجھے ابھی بھی ٹھیک نہیں لگ رہے۔ ایک دو دن اور آرام کر لیتے۔'' وہ اب اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے بولی تھی۔

''نہیں بس۔ یہاں تین دن میں اتنا کام جمع ہو گیا ہے۔'' اس نے فائلوں کی طرف اشارا کیا تو وہ فوراً کہنے لگی۔

''کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ اپنا خیال کریں۔''

''میں ٹھیک ہوں اور اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں یہ فائل دیکھ لوں۔'' اس نے بہت طریقے سے اسے وہاں سے اٹھا دیا تھا۔ پھر یہ تو نہیں ہو سکا کہ وہ ہر سوچ جھٹک کر کام میں مصروف ہوتا۔ منتشر ذہن کے ساتھ جتنا ہو سکا کام کیا۔ باقی اگلے دن پر چھوڑ کر وہ آف ٹائم سے پہلے ہی آفس سے نکل آیا کیونکہ اسے حیدر علی کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینا تھا۔ اس کے بعد ہی ان کے ڈیوز اور پینشن کی کارروائی عمل میں آ سکتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جائیں تاکہ تائی جان کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ اس لیے وہ سرٹیفکیٹ لے کر سیدھا ان ہی کے پاس آیا تھا۔ اب پتا نہیں اس اچانک سانحے نے واقعی حمیدہ بیگم کو توڑ کر رکھ دیا تھا یا وہ اپنی غرض سے مجبور تھیں کہ اس سے بہت شفقت سے پیش آئیں۔

''تمہاری بڑی مہربانی حمزہ کہ تم نے اس کام کے لیے وقت نکالا۔'' حمیدہ بیگم ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا سن کر بولیں۔

''مہربانی کیسی تائی جان یہ میرا فرض ہے۔ میں کل یہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ تایا جان کے آفس جمع کرا دوں گا پھر ان شاءاللہ جلدی پنشن جاری ہو جائے گی۔ ابھی آپ یہ رکھ لیں۔'' اس نے جیب سے لفافہ نکال کر حمیدہ بیگم کی طرف بڑھایا تو خزینہ ایک دم بول پڑی۔

''نہیں حمزہ! اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ لیں تائی جان۔'' اس نے ان سنی کر کے لفافہ حمیدہ بیگم کی گود میں رکھ دیا پھر خزینہ کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''تم کتنے دن کی چھٹی پر ہو؟''

''کل سے جاؤں گی۔'' خزینہ کے جواب پر وہ خاموش ہو گیا۔

''میں تو شہرینہ سے بھی کہہ رہی ہوں کل سے کالج جائے۔'' حمیدہ بیگم نے کہا تو خزینہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''نہیں امی ابھی شہرینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ اس کے ساتھ زبردستی نہ کریں۔''

''کیا ہوا ہے شہرینہ کو۔'' وہ بہت سنبھل کر بولا تھا۔ ''ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہے تو چلو لے چلتے ہیں۔''

''نہیں۔ اصل میں چھوٹی بھی تو ہے ناں۔ اس صدمے سے سنبھل نہیں پا رہی صبر آتے آتے ہی آئے گا۔''

''ہوں......'' وہ اسے دیکھنے کی خواہش دبا گیا۔

''میں چائے لاتی ہوں۔'' خزینہ اٹھی تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

''نہیں بس میں چلوں گا۔ ٹھیک ہے تائی جان آفیشل کاموں کے علاوہ بھی آپ کو کسی کام کے لیے میری ضرورت ہو تو مجھے بلا لیجیے گا۔''

''ہاں بیٹا اب تم ہی ہو۔'' حمیدہ بیگم نے کہا تو اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر گویا اپنے تعاون کا یقین دلایا پھر جلد آنے کا کہہ کر باہر نکلا تھا۔

☆☆☆

تیمور غزنی اب سارہ کو سمجھا نہیں سکتا تھا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ کیونکہ ڈاکٹر نے اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا اور یہ بھی کہ اس کی کسی بات کی نفی نہ کی جائے ورنہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے گی۔ اس لیے اب وہ سارہ کو تسلی دیتا تھا کہ وہ جلد اس کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لیے وہ پہلے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا تھا اور یہ بات اس نے سارہ سے کہہ دی تھی۔ جب ہی اب وہ ضد نہیں کرتی تھی۔ لیکن باتوں کے دوران بچے کا ذکر ضرور لے آتی۔ گویا یاد دہانی کرائی تھی۔ ایسے میں صبر اور جبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس وقت وہ ایسے مرحلے سے گزر کر آفس آیا تھا اور اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس کی نظر گلاس ونڈو سے ادھر خزینہ پر پڑی جس کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر جمی تھیں لیکن صاف لگ رہا تھا کہ اس کا ذہن کام نہیں کر رہا۔ تیمور غزنی کی پیشانی پر پہلے سلوٹیں پڑیں پھر اچانک خیال آیا تھا کہ وہ لڑکی کس سانحہ سے گزر کر آئی ہے۔ تب اس نے پیون کو بلا کر خزینہ کو اندر بھیجنے کا کہا اور ذہن میں اس سے تعزیت کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دینے لگا۔

''پلیز......'' خزینہ کے آنے پر اس نے فوراً اسے بیٹھنے کا اشارا کر دیا۔ پھر قدرے رک کر گویا ہوا۔

''مجھے آپ کے فادر کا بہت افسوس ہوا۔'' اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ خزینہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جنہیں وہ روک نہیں سکتی تھی جب ہی سر جھکا لیا۔

''آپ......'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ ادھر ادھر دیکھا پھر ٹشو پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پلیز آپ روئیں نہیں۔ میں نے سنا ہے اس سے مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔'' خزینہ نے ٹشو پیپر لیتے ہوئے بلا ارادہ نظریں اٹھائی تھیں اور وہ نظریں چرا گیا۔ چھلکتے پیالوں نے شاید کہیں نقب لگائی تھی۔ اس نے اٹھ کر فریج میں سے ایپل جوس کا پیکٹ نکالا اور گلاس میں ڈال کر گلاس خزینہ کے سامنے رکھ دیا۔

خزینہ کچھ پریشان ہوکر اسے دیکھنے لگی۔

''پلیز۔'' وہ اسے پینے کا اشارا کرکے بیٹھا تو پوچھنے لگا۔ ''آپ کے گھر میں کون کون ہے؟''

''میری امدار اور چھوٹی بہن۔'' خزینہ کے سیدھے سادے جواب پر بھی وہ الجھ گیا۔

''اور بھائی؟'' خزینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کن الفاظ میں حوصلہ دے۔ خود کو مشکل میں محسوس کرتے ہوئے وہ اسے جوس پینے کا کہہ کر روم سے نکل گیا۔ خزینہ اب خود کو سرزنش کرنے لگی۔ اپنے آنسوؤں پر غصہ آ گیا جو اس کے سامنے چھلک گئے تھے۔ مزید ٹشو پیپر نکال کر اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں پھر جوس کا گلاس اٹھالیا اور گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے خود سے بولی تھی۔

''مجھے واقعی اس کی ضرورت تھی۔'' پھر ادھر اس نے گلاس خالی کرکے ٹیبل پر رکھا ادھر وہ کمرے میں داخل ہوا اور ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا تھا۔

''چلیں مس خزینہ میں آپ کو ڈراپ کردوں گا۔''

''جی......'' وہ نا سمجھی میں اسے دیکھنے لگی کیونکہ ابھی تو صرف بارہ بجے تھے۔

''میں ویٹ کر رہا ہوں۔'' وہ کہہ کر کمرے پھر آفس سے نکل آیا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر سگریٹ سلگالی۔ کچھ دیر بعد خزینہ آئی تو اس نے سگریٹ پھینک کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا۔

''آپ کو کچھ دن آرام کرنا چاہیے۔'' گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ''مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آئی مین میں سمجھ سکتا ہوں کہ جس سانحہ سے آپ گزری ہیں اس کے بعد سنبھلنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی تو پھر وہ بھی خاموش ہوگیا اور اس کے اشاروں پر گاڑی موڑتے ہوئے جب اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تب اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

''ہم اللہ کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتے۔ آپ کو ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہے۔ سمجھ رہی ہیں ناں۔'' خزینہ نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ وہ سراسیمہ سی ایک لفظ شکریہ تک نہیں کہہ سکی اور فوراً اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

تیمور غزنی نے ایک نظر اس کے گھر پر ڈالی پھر بلا ارادہ اسپیڈ سے گاڑی بھگا دی۔ یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ پیچھے رہ جانے والی کیا سوچے گی کہ اس نے بادل ناخواستہ اخلاقی فرض نبھایا ہے۔ اور جب احساس ہوا وہ کافی دور نکل آیا تھا۔ لیکن اب فوری تلافی ممکن نہیں تھی اس لیے اس نے سر جھٹک دیا اور اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کردی۔ لیکن کچھ تھا جو وہ بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ کوئی خیال کوئی سوچ جیسے زبردستی اس پر مسلط ہونا چاہ رہی تھی۔ جس سے بھاگ کر وہ سارہ کی محبت میں پناہ ڈھونڈنے لگا تھا۔

ساری دوپہر پھر شام سے رات ہوگئی۔ وہ سارہ کو پاس بٹھائے جانے کب کب کے اور کہاں کہاں کے قصے چھیڑے بیٹھا تھا۔ آخر تھک کر سارہ نے اس کے کندھے پر سر رکھا تو پل میں غافل بھی ہوگئی۔ اس کے بعد کتنی دیر تک وہ اپنے آپ بولتا رہا جب سارہ کا سر اس کے کندھے سے لڑھکا تب وہ چونک کر ایک دم خاموش ہوگیا پھر احتیاط سے سارہ کو تکیے پر لٹا کر لائٹ آف کردی۔ گھنٹوں مسلسل بولتے رہنے کے باعث اس کا اپنا سر چکرا رہا تھا۔ دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ کر خود کو ریلیکس کرنے کی سعی میں وہ پھر اسی مقام پر جا کھڑا ہوا تھا جس سے بچنا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

صبح اس نے اٹھنے میں جلدی نہیں کی کیونکہ آفس تو جانا نہیں تھا اس لیے دن چڑھے تک سوتی رہی۔ پتا نہیں کسی نے اٹھایا نہیں تھا یا وہ اٹھانے سے بھی نہیں اٹھی تھی۔ دس بج رہے تھے جب کچھ ملی جلی آوازوں سے اس کی آنکھ کھلی تو منہ پر سے لحاف ہٹا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر آوازوں کی سمت کان لگا دیے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا تب اٹھتے ہوئے شہرینہ کو پکار لیا۔

''اٹھ گئیں۔'' شہرینہ نے اندر آتے ہوئے کہا تو وہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''کوئی آیا ہے کیا؟''

''ہاں عالیہ خالہ آئی ہیں۔''

''اکیلی......؟''

''نہیں شرجیل بھائی کے ساتھ' چلو اب تم منہ ہاتھ دھو لو میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔ تم ناشتا کرو گی؟'' شہرینہ نے جاتے جاتے پوچھا تھا۔

''نہیں بس چائے۔'' وہ کہہ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اوپر اوپر سے بالوں میں برش پھیرا پھر دوپٹا اوڑھتے ہوئے جمیلہ بیگم کے کمرے میں آ گئی۔ سردی کے باعث عالیہ خالہ بھی جمیلہ بیگم کے ساتھ کمبل میں گھسی بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر کمبل سے نکلنے لگیں لیکن اس نے فوراً روک دیا۔

''بیٹھی رہیں خالہ۔ کیسی ہیں آپ۔'' وہ بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی پھر شرجیل کو دیکھ کر سلام کیا تو وہ جواب کے ساتھ پوچھنے لگا۔

''تم کیسی ہو، آج آفس نہیں گئیں؟''

''نہیں ابھی چھٹی پر ہوں اور تم؟'' وہ جواب کے ساتھ سوالیہ نشان بنی تو شرجیل ذرا سے کندھے اچکا کر بولا تھا۔

''میں بھی چھٹی پر ہوں۔''

''خیریت......؟'' اس نے سیدھے سادے انداز میں ٹوکا تھا لیکن جانے کیوں شرجیل اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا جیسے جواب وہ دیں گی۔ تب ہی شہرینہ چائے لے کر آ گئی تو اس کا دھیان ہٹ گیا۔

''بیٹا کچھ کھا بھی لو۔ خالی چائے مت پیو۔'' حمیدہ بیگم نے اسے چائے کا کپ اٹھاتے دیکھ کر کہا تو وہ ان سنی کرکے چائے پینے لگی۔ لیکن اس نے دیکھ لیا کہ عالیہ خالہ اور شرجیل آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو کچھ اشارہ کر رہے تھے۔ وہ یہ بھی سمجھی شاید اس کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتے جب ہی اٹھنے لگی تھی کہ عالیہ خالہ کہنے لگیں۔

''جمیلہ! مناسب تو نہیں لگتا کہ میں اس وقت یہ بات کروں کیونکہ ابھی تو حیدر بھائی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔'' وہ اٹھنے کا ارادہ ترک کرکے پوچھنے لگی۔

''کیا بات ہے خالہ؟'' عالیہ خالہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر جمیلہ بیگم کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

''سعدیہ کے سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔ وہ بھی جلدی۔ میں نے انہیں بتایا بھی کہ ابھی میری بہن عدت میں ہے لیکن۔'' عالیہ خالہ خاموش ہوگئیں تو وہ جمیلہ بیگم کو دیکھنے لگی کہ وہ کچھ کہیں گی۔ لیکن پھر ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر وہ بول پڑی۔

''خالہ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی ابو کا کفن میلا نہیں ہوا ہوگا لیکن یہ بھی تو ایک ذمہ داری ہے۔ فرض ہے۔ اچھا ہے ادا ہو جائے۔ آپ امی کی عدت کی وجہ سے التوا میں نہ ڈالیں۔ کردیں سعدیہ آپا کی شادی۔''

''بیٹا میرا اپنا دل نہیں مانتا۔ میری بہن پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے اور میں......'' عالیہ خالہ کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بھی گرنے لگے تھے۔

''خالہ...... خالہ!'' وہ اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہنے لگی۔ کسی کے جانے سے دنیا کا کام رک نہیں جاتے جب باقی سارے کام ہو رہے ہیں تو یہ کیوں نہیں۔ کیوں امی؟''

’’ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔‘‘ جمیلہ بیگم نے بادل ناخواستہ اس کی تائید کی پھر رندھی آواز میں کہنے لگیں۔ ’’کتنا ارمان تھا مجھے سعدیہ کی شادی کا اب میں ہی شریک نہیں ہوں گی۔‘‘

’’اوہو امی! اب آپ ایسی باتیں تو نہ کریں۔‘‘ اس نے فوراً ٹوک دیا۔

’’ایک صرف سعدیہ آپا تو نہیں ہیں اور بھی ہیں آپ ان پر اپنے ارمان پورے کر لیجیے گا۔‘‘

’’جی خالہ میں بھی تو ہوں اور میری شادی تو آپ ہی کروائیں گی۔‘‘ شرجیل نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تو پھر ان دونوں نے ماحول کو قدرے خوش گوار بنا دیا تھا۔ جس سے عالیہ خالہ تو مطمئن ہوئیں' جمیلہ بیگم کو بھی لگا جیسے یہ ہی بہتر ہے۔

پھر دونوں بہنیں شادی کے معاملات اور لین دین پر باتیں کرنے لگیں تو وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ جہاں شہرینہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

’’کیا بنا رہی ہو......؟‘‘

’’چکن کا سالن بناؤں گی دونوں ٹائم ہو جاتا ہے۔‘‘ شہرینہ نے لہسن چھیلتے ہوئے بتایا۔

’’وہ تو ہو جاتا ہے لیکن ابھی خالہ اور شرجیل بھی تو ہیں۔ ان کے سامنے کیا صرف سالن روٹی ہی رکھی جائے گی۔‘‘ وہ کہہ کر خود ہی نفی میں سر ہلانے لگی تو شہرینہ بے قراری سے بولی۔

’’خزی مجھ میں ہمت نہیں ہے زیادہ دیر چولہے کے پاس کھڑے رہنے کی۔‘‘

’’تو میں تم سے کب کہہ رہی ہوں تم جاؤ آرام کرو میں کر لوں گی سب۔‘‘ وہ زبردستی شہرینہ کو اندر بھیج کر خود مصروف ہو گئی۔ پہلے پلاؤ کے لیے جھٹ پٹ یخنی چڑھا دی پھر قورمے کا مسالا تیار کر رہی تھی کہ شرجیل کچن کے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

’’تم کیا کر رہی ہو......؟‘‘

’’دیکھ نہیں رہے کھانا بنا رہی ہوں۔‘‘ اس نے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی۔

’’ہمارے لیے تکلف مت کرنا۔‘‘ وہ ان سنی کر گئی تو شرجیل اسٹول کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموشی سے اس کی مصروفیت دیکھتا رہا پھر اسے متوجہ کر کے پوچھنے لگا۔

’’سنو تم تو شادی میں آؤ گی ناں؟‘‘

’’ہاں میں کیوں نہیں آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔‘‘ اس نے قصداً ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا پھر خود ہی کہنے لگی۔ ’’دکھ سکھ زندگی کے ساتھ چلتے ہیں شرجیل پھر یہ بھی طے ہے کہ اللہ نے جس کام کا جو وقت مقرر کیا ہے وہ اسی مقررہ وقت پر ہونا ہے تو ہمیں اسی کے مطابق چلنا چاہیے ہے ناں۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

’’چائے پیو گے؟‘‘ شرجیل نے چونک کر دیکھا تو مسکرا کر بولی تھی۔

’’میں بھی پیوں گی۔‘‘

پھر اگلے دو تین دن اس کے بہت مصروف گزرے۔ گھر کا راشن پانی، ہفتے بھر کے لیے سبزی گوشت، بل وغیرہ بھی جمع کرا دیے۔ اس کے بعد آفس جانے کا سوچنے لگی تھی۔

☆☆☆

ربیکا کو حمزہ اپنے بارے میں سب بتا چکا تھا۔ اپنی منگنی اور یہ کہ وہ شہرینہ سے کتنی محبت کرتا ہے اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سب جاننے کے بعد بھی ربیکا اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ اس وقت جب حمزہ اس کے سامنے شہرینہ کی محبت میں ڈوب کر بول رہا تھا تب اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ اس کے بعد کئی دن وہ ایک انجانی آگ میں سلگتی رہی تھی پھر دھیرے دھیرے نارمل تو ہو گئی۔ یہ اس کی ازلی خودسری تھی۔

اب تک کی زندگی میں اس نے جو چاہا تھا پایا تھا پھر وہ اس سے کیسے دست بردار ہو سکتی تھی جو اس کے دل کی اولین تمنا تھا۔ آفس میں وقفے وقفے سے وہ کسی کام کے بہانے حمزہ کے روم میں جاتی مقصد محض اسے اپنی طرف متوجہ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ اس کے دل تک رسائی چاہتی تھی۔ کیونکہ خود سے آگاہ تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ اپنے دل پر لگا نو ویکنسی کا بورڈ خود ہی اتار پھینکے گا۔

اسی وقت وہ اسے ہی سوچ رہی تھی کہ اس کی ممی ثمرہ اس کے پاس آ بیٹھیں اور بغیر کسی تمہید کے پوچھنے لگیں۔

’’پھر تم نے کیا سوچا رالی؟‘‘ اور وہ جو حمزہ کو سوچ رہی تھی بے ساختہ بولی تھی۔

’’میں اس سے ہٹ کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔‘‘

’’کیا مطلب؟ ثمرہ سمجھیں نہیں۔‘‘

’’آپ کیا کہہ رہی ہیں۔‘‘ وہ اب چونک کر ثمرہ کو دیکھنے لگی۔

’’میں تمہارے لیے آئے پرپوزلز کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ تمہارے ڈیڈی بھی کہہ رہے ہیں کہ اب تم جلدی فیصلہ کرو۔‘‘ ثمرہ نے قدرے زچ ہو کر کہا۔

’’تو آپ ڈیڈی سے کہہ دیں کہ مجھے حمزہ پسند ہے۔‘‘ وہ بہت آرام سے بولی تھی۔

’’حمزہ یہ کون ہے؟‘‘ ثمرہ نے ایک پل میں کتنوں کو سوچ ڈالا تھا۔

’’ڈیڈی جانتے ہیں اسے۔‘‘ وہ ہنوز اطمینان سے تھی۔

’’اور میں ...... میرا خیال ہے میں تمہارے ڈیڈی کے سب دوستوں سے واقف ہوں اور شاید ان کی اولادوں سے بھی۔ ان میں حمزہ......‘‘ ثمرہ سوچنے میں لگ گئیں۔

’’آپ خواہ مخواہ اپنے ذہن پر زور نہ دیں مما کیونکہ آپ نے اسے نہیں دیکھا۔‘‘ اس کے ٹوکنے پر ثمرہ سر جھٹک کر اسے دیکھنے لگیں تو وہ مزید گویا ہوئی۔

’’میرا خیال ہے آپ کو اور ڈیڈی کو بھی میری پسند پر اعتراض نہیں ہوگا۔ باقی آپ کو جو معلوم کرنا ہے ڈیڈی سے کریں اور انہیں یہ بھی بتا دیں کہ میری شادی ہوگی تو حمزہ سے ورنہ۔‘‘ ثمرہ اچانک متجسس ہو گئی تھیں جب ہی مزید اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے یونہی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فوراً اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئیں جہاں حسان صاحب بیڈ پر نیم دراز نیوز دیکھ اور سن رہے تھے۔

’’حسان......!‘‘ ثمرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں پکارا تھا۔ وہ بنا حرکت کیے بس نظروں کا زاویہ بدل کر انہیں دیکھنے لگے۔

’’حسان! یہ حمزہ کون ہے؟‘‘ ثمرہ نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

’’حمزہ؟‘‘ حسان کے سوالیہ انداز پر وہ جلدی سے کہنے لگیں۔

’’ہاں ربیکا کہہ رہی ہے آپ اسے جانتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ابھی میں ربیکا سے شادی کے متعلق بات کر رہی تھی تو اس نے حمزہ کا نام لے دیا۔ وہی میں پوچھ رہی ہوں کون ہے حمزہ؟‘‘ حسان صاحب ساری بات سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ غالباً ان کا ذہن اپنے دوست احباب کو سوچنے لگا تھا۔ پھر ثمرہ کو دیکھ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

’’آئی ڈونٹ نو۔‘‘

’’یو ڈونٹ نو!‘‘ ثمرہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ’’پھر ربیکا اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہے کہ آپ اسے جانتے

ہیں۔“

”ایک منٹ۔“ حسان صاحب ایک دم سیدھے ہو بیٹھے۔”کہیں وہ حمزہ احمد علی کی بات تو نہیں کر رہی۔ وہ میرے آفس میں کام کرتا ہے۔“

”آپ کے آفس میں۔“ ثمرہ کا سارا اشتیاق جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”ہاں لیکن ربیکا ایسا کیسے سوچ سکتی ہے۔“ حسان صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔”کنفرم کرو۔“

”فرض کریں اگر وہی ہوا تو......“ ثمرہ خود خائف ہوگئی تھیں۔

”تو، نیور......“ حسان صاحب نے سختی سے کہہ کر ٹی وی کی آواز تیز کردی گویا اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتے اور ثمرہ بھی چاہتی تو یہی تھیں لیکن اپنی بیٹی کی ضد سوچتے ہوئے پریشان بھی ہوگئی تھیں۔ اس لیے انہوں نے فوری ربیکا سے اس سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔

☆☆☆

جنوری کے ساتھ ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا اور اسے ہمیشہ سے سرد موسم پسند تھا۔ کچھ بھی ہو جائے وہ یہ موسم انجوائے کرتا تھا۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے وہ ایسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ موسم کی جولانیاں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام ہورہی تھیں۔ اس وقت وہ خاصا بے زار سا سونیا کے سامنے بیٹھا تھا۔ کافی کا مگ جو دس منٹ پہلے سونیا نے لاکر رکھا تھا جوں کا توں پڑا تھا۔ جس سے سونیا کو کوفت ہورہی تھی۔

”تیمی کافی تو پی لو......“ آخر وہ جھنجلائی تھی۔

”آں......“ اس نے نگ اٹھا کر سونیا کو دیکھا تو وہ پوچھنے لگی۔

”کیا سارہ پھر پریشان کررہی ہے؟“

”نہیں اسے تو میں نے آسرا دے دیا ہے۔“ اس نے کہا تو سونیا اس کے چہرے پر کچھ کھوجتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”صرف بہلانے کی خاطر یا......؟“

”سارہ کو اب بہلایا نہیں جاسکتا آپی یہ آپ بھی جانتی ہیں۔“ وہ فوراً بولا تھا۔ سونیا قصداً خاموش رہی تو وہ جیسے ہار گیا۔

”مجھے آپ کی بات ٹھیک لگ رہی ہے لیکن......“

”لیکن ویکن چھوڑو تیمی۔“ سونیا خاصے جوش میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی اور اس کا بازو تھام کر کہنے لگی۔”ہمارے خاندان کی نسل تم سے چلنی ہے۔ بابا ابھی بھتیجی کی محبت میں تمہیں سمجھ رہے۔ تم تو سمجھو دوسری شادی گناہ نہیں ہے۔ پھر تم آرام سے افورڈ کرسکتے ہو اور سب سے بڑی بات تمہارا اپنا بچہ ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ میں بچہ سارا کی گود میں کیسے ڈالوں گا میرا مطلب ہے بچے کی ماں۔“ وہ اسی بات میں الجھ رہا تھا۔

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں تیمی۔ اس کے لیے میں کچھ سوچوں گی۔ ابھی تم پہلا مرحلہ تو طے کرو یعنی شادی۔“ سونیا نے کہا وہ اب اطمینان سے ہوگئی تھی۔

”شادی کے لیے ایک لڑکی چاہیے۔ ہے آپ کی نظر میں۔“ اس کی بات پر سونیا اچھل پڑی۔

”پاگل ہوگئے ہو۔ جاننے والوں میں شادی کا سوچنا بھی مت۔ پہلے خبر ماما پاپا تک پہنچے گی۔“ اس نے سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا پھر پرسوچ انداز میں بولا تھا۔

”اس کا مطلب ہے آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کریں گی۔“ سونیا نے جواب نہیں دیا اور اس نے

شکوہ بھی نہیں کیا۔ سگریٹ جو ابھی سلگائی تھی ایش ٹرے میں مسل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلتا ہوں۔“

”پھر تم کیا کروگے؟“ سونیا اب خائف تھی۔

”دیکھیں۔“ وہ اسی قدر کہہ کر باہر نکل آیا۔

بادل گھر گھر کر آرہے تھے یوں جیسے برس کر ہی دم لیں گے۔ سردی ایسے ہی عروج پر تھی مزید بارش کا سوچ کر وہ سیدھا گھر چلا آیا۔ سارہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اس نے خود کو صوفے پر گراتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں پکارا تو اس کی آواز ٹیرس سے آئی تھی۔

”یہاں آجاؤ تیمی۔“

”نہیں تم اندر آؤ۔“ وہ کہہ کر جوتے موزے اتارنے لگا۔

”اتنا اچھا موسم ہورہا ہے۔“ سارہ نے اندر آتے ہوئے کہا۔ وہ ان سنی کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے سردی لگ رہی ہے۔ تم چائے لے کر آؤ۔ میں جب تک چینج کرلوں۔“ وہ کہہ کر ڈریسنگ روم میں بند ہوگیا۔ پھر چینج کرکے نکلا تو کمبل میں بیٹھ گیا۔ اسے واقعی سردی لگ رہی تھی شاید اس کے احساسات برف ہو رہے تھے۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے تیمی۔“ سارہ چائے کے ساتھ بوائل انڈے بھی لے آئی۔

”ہوں اور تم نے کوئی گرم کپڑا کیوں نہیں پہنا چلو ادھر کمبل میں آکر بیٹھو۔“ اس نے قدرے سختی سے کہا تو سارہ ٹرے اس کے گھٹنوں پر رکھ کر اس کے ساتھ کمبل میں آن بیٹھی۔

”احتیاط کرنی چاہیے۔ یہ اچھا موسم خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے انڈے کا پیس اٹھا کر سارہ کے منہ میں ڈال دیا۔

”میں تمہارے لیے لائی ہوں۔ سارہ نے دوسرا پیس اٹھا کر اس کے منہ میں ڈالا پھر کہنے لگی۔”میں تو سوچ رہی تھی کہ تم آؤ گے تو ہم کہیں باہر چلیں گے۔

”ضرور چلیے لیکن ابھی مجھے لگ رہا ہے بارش ہوگی اور خوب جم کر ہوگی۔ ایسے میں کہیں جانا ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہوں......“ سارہ نے چائے کا سپ لیا پھر ایک دم یاد آنے پر بتانے لگی۔”ہاں تیمی وہ زوبی کا فون آیا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں اس کے ہاں تیسرا بے بی آنے والا ہے۔“

”آگیا؟“ اس کی زبان سے بلا ارادہ پھسلا تھا۔

”نہیں ابھی تو شاید فور منتھ ہیں بے بی آنے میں...... میں تو تمہیں یہ بتارہی تھی کہ زوبی امریکا جارہی ہے۔ کہہ رہی تھی ڈیلیوری وہیں ہوگی۔“ سارہ کی بات سن کر اسے اطمینان ہوا تھا۔

”اچھا اب تم اس سے بے بی لینے کی بات مت کرنا۔“

”کیوں؟“ سارہ نے ایک دم اسے دیکھا تھا۔

”کیوں کہ میں کہیں اور بات کرچکا ہوں۔“ اسے فوری یہی جواب سوجھا اور سارہ اس پر خوش ہوگئی۔

”سچ تیمی۔ پھر کب ملے گا بے بی؟“

”جلدی تو نہیں کہہ سکتا۔ تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ بس یوں سمجھو اس سال کے اینڈ تک بے بی تمہاری گود میں ہوگا۔“ وہ اب سنبھل کر بولتے ہوئے سارہ کو دیکھنے لگا جس کی آنکھیں اس تصور سے ہی چمکنے لگی تھیں اور بلاشبہ وہ اس کی اب تک کی زندگی میں آنے والی پہلی رات تھی جو وہ نیند کو پکارتے پکارتے تھک گیا تھا۔

☆☆☆

''وہ فجر کے بعد سویا تھا جب ہی جلدی اٹھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ سارہ وقفے وقفے سے اسے پکار رہی تھی۔ وہ ذرا سی آنکھیں کھولتا پھر سو جاتا۔ بارہ بج رہے تھے جب سارہ باقاعدہ اسے جھنجوڑنے لگی اور اسے متوحش دیکھ کر وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ رتجگے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''بہت پریشان کرنے لگی ہو۔'' اس کی آواز میں ابھی بھی نیند کا خمار تھا۔ سارہ نے اس کی پیشانی تک آیا بالوں کا گچھا اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔

''پریشان تم کر رہے ہو بھی۔ کب سے اٹھا رہی ہوں تمہیں کہیں نیند کی گولی کھا کر تو نہیں سوئے تھے؟''

''ابھی اس کی نوبت نہیں آئی۔'' اس نے سارہ کا ناک پکڑ کر ہلایا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''کوئی مطلب نہیں۔'' وہ بازوؤں کو ایکسرسائز کے انداز میں جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور باقاعدہ ایکسرسائز کرنے لگا۔

''اب آپ کے لیے کیا لایا جائے ایپل جوس یا چائے۔'' سارہ کا یہ انداز ناراضی کا اظہار تھا۔ اور وہ جھک کر پیروں کے انگوٹھے چھو رہا تھا ایک دم سیدھا ہو گیا۔

''چائے میم۔'' مسکینی سے بولا سارہ جھٹکے سے مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

''الٰہی خیر......!'' وہ بھاگ کر واش روم میں بند ہو گیا۔ سارہ روزمرہ کی روٹین میں کوئی کمی بیشی برداشت نہیں کرتی تھی چھٹی کے دن بھی نہیں اور وہ اس کا بے دام غلام تو نہیں تھا' البتہ اس کی محبت میں سر تسلیم خم کرتا تھا۔ ابھی دس منٹ میں شاور لے کر تیار بھی ہو گیا۔ پھر چائے کے دوران سارہ کو منا بھی لیا اور شام میں اس کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام رکھ کر آفس آ گیا۔

رات ہر پہلو کو مدنظر رکھ کر اس نے جو سوچا تھا تو اب دل کو اس پر آمادہ کرتے ہوئے اس نے انٹرکام پر خزینہ کو اپنے روم میں آنے کا کہا اور جیسے ہی وہ دروازے سے داخل ہوئی اس کا ذہن پھر بھٹک گیا تھا۔

''جی سر......!'' خزینہ کو ہمیشہ کی طرح اسے متوجہ کرنا پڑا تھا۔

''پلیز......!'' وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔ ''آپ ٹھیک ہیں۔''

''جی......!'' خزینہ کا جی اثبات سے زیادہ سوالیہ تھا۔ جب ہی اسے وضاحت کرنی پڑی۔

''آئی مین کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔''

''نو سر۔''

''ہم......'' اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور کیا بات کرے تو ذرا سی گردن موڑ کر گلاس ونڈو سے باہر دیکھنے لگا۔ کل جو بادل برسنے کو بے تاب تھے انہیں شاید اب اشارہ ملا تھا کہ اچانک رم جھم کی برسات ہو گئی اور وہ جانے کس سوچ میں تھا اس کی آنکھوں کے سامنے باہر کا منظر دھندلا رہا تھا اور اسے خبر نہیں تھی جبکہ خزینہ پریشان ہو گئی۔

''سر بارش۔''

''ہوں......'' وہ اب چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ''کچھ کہا آپ نے۔''

''وہ بارش'' خزینہ نے گلاس ونڈو کی طرف اشارہ کیا تو وہ ایک نظر ادھر ڈال کر پھر اسے دیکھنے لگا۔ جس سے وہ کنفیوز ہو گئی۔

''سر آپ نے مجھے کسی کام سے بلایا تھا......؟''

''ہاں لیکن اب تو خاصی دیر ہو گئی۔ کل پر رکھیں۔'' اسے کوئی کام نہیں تھا یونہی بات بنا گیا۔

''او کے سر میں جاؤں۔'' خزینہ نے اپنی سیٹ پر جانے کی بات کی تھی اور وہ گھر جانے کا سمجھا جب ہی فوراً پوچھا۔

''کیسے جائیں گی؟''

''جی......!'' وہ حیران ہوئی۔

''آئی مین بارش...... ذرا تھم جائے پھر میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔ ابھی آپ اپنی سیٹ پر جائیں۔'' وہ خزینہ کو بھیج کر خود پر جھنجلانے لگا کہ وہ ایک لڑکی کے سامنے کتنا پزل ہو رہا ہے۔ اس میں اس کا قصور نہیں تھا کیونکہ اس نے کبھی فلرٹ نہیں کیا تھا۔ ابھی بھی فلرٹ نہیں کر رہا تھا بس اپنی غرض سے مجبور تھا۔ جب ہی کشمکش کا شکار تھا کہ پتا نہیں وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط۔ بہرحال صحیح اور غلط کے درمیان خود کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے آخر اس نے سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

بارش تھم گئی تھی لیکن وقفے وقفے سے بادلوں کی زوردار گرج کے ساتھ بجلی بھی چمک رہی تھی۔ ابھی شام کے صرف سات بجے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے نصف رات بیت گئی ہو۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں تو گھر کے اندر بھی سناٹوں کا راج تھا۔ حمیدہ بیگم سرشام ہی لحاف میں دبک گئی تھیں۔ شہرینہ بھی لحاف میں گھسی موبائل پر حمزہ سے چیٹنگ کر رہی تھی اور ایک وہ تھی جسے منہ سر لپیٹنے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ لائٹ تو ہمیشہ کی طرح بارش کی پہلی بوند گرتے ہی داغ مفارقت دے گئی تھی اور اب موم بتی بھی آخری دموں پر تھی۔ جس کا لرزتا سایہ بھی اس کی محویت توڑنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ سماعتیں الگ بادلوں کی گھن گرج سننے سے قاصر تھیں کیونکہ وہاں کوئی مسلسل دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

''وہ مجھے پسند ہے۔ بلکہ نہیں پسند سے زیادہ میں اسے اپنانا چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں لیکن میرے پیرنٹس نہیں مانتے اور شاید وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ کیونکہ وہ میری شادی فیملی میں کرنا چاہتے ہیں۔ میں کیا کروں میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سوچتا ہوں ساری صورت حال اسے بتا کر پرپوز کروں۔ شاید وہ مجھ پر بھروسا کرے۔ میں اسے سب کچھ دوں گا سب کچھ۔''

یہ آج شام کی بات تھی جب تیمور غزنی اسے گھر چھوڑنے آ رہا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی وہ خاصا ڈسٹرب لگ رہا تھا جیسا اس نے آفس میں اسے دیکھا تھا جب ہی ہمت کر کے اس کی پریشانی کا سبب پوچھ بیٹھی تھی اور تیمور غزنی نے سبب بتا کر پھر اس سے پوچھا تھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ مجھے ایکسیپٹ (قبول) کرے گی آئی مین میری فیملی کے بغیر۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں سر۔'' اس نے پہلے دامن بچانے کی کوشش کی تھی لیکن پھر کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

''میرا خیال ہے سر اگر وہ آپ سے محبت کرتی ہے تو انکار نہیں کرے گی۔'' اس کی بات سن کر تیمور غزنی خاموش ہو گیا تھا۔ پھر اس نے بھی کوئی بات نہیں لیکن اس وقت سے مسلسل وہ اسے ہی سوچ رہی تھی اور جہاں اسے اس ان دیکھی لڑکی پر رشک آ رہا تھا وہاں دل سے ہوک بھی اٹھتی تھی۔ کتنے یقین سے اس نے شہرینہ سے کہا تھا کہ۔

''اس کا ہائیوڈ یٹا یہ ہے کہ اگر میری قسمت میں شادی لکھی ہے تو اس سے ہو گی ورنہ نہیں۔''

اس کا مطلب ہے میری قسمت میں شادی لکھی ہی نہیں گئی۔ اس نے سوچا پھر اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے کے لیے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں کے سامنے کرتے ہی چونک گئی۔ کمرہ مکمل تاریکی میں ڈوبا تھا۔ شمع نے کب آخری سانسیں لیں اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ کتنی دیر پلکیں جھپک جھپک کر وہ اپنے ہاتھ دیکھنے کی سعی کرتی رہی پھر

اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ دل کی بستی بسنے سے پہلے ہی اجڑ گئی تھی۔ وہ روتی نہ تو کیا کرتی۔

سردیوں کی طویل رات اس کے خاموش آنسوؤں کی گواہ تھی۔ اور صبح پھر جل تھل کا سماں تھا۔ وہ آفس جانے سے رہ گئی اور یہ بھی اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ تیمور غزنی کا سامنا کرنے سے خائف تھی۔ کہیں وصل سے پہلے ہجر کی داستاں اس پر آشکار نہ ہو جائے۔

"چائے بن گئی خزی۔" شہرینہ نے کچن میں آتے ہوئے پوچھا تو وہ جو کھولتے پانی سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے کھڑی تھی چونک گئی۔

"ہاں بس تم یہ ٹرے امی کے کمرے میں لے جاؤ۔" اس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا کر شہرینہ کو تھمائی پھر جلدی سے چائے دم کی اور تھرماس میں ڈال کر اندر لے آئی۔

"پہلے سردی کیا کم تھی جو یہ بارش۔" حمیدہ بیگم کو لحاف میں بھی سردی لگ رہی تھی۔

"آپ یہ بوائل انڈا لیں امی اور گرم گرم چائے پئیں۔" اس نے انڈے کی پلیٹ حمیدہ بیگم کے سامنے رکھی پھر مگ میں چائے انڈیلنے لگی۔

"ابھی تمہاری خالہ کا فون آیا تھا۔ وہ بھی پریشان ہو رہی تھیں۔" حمیدہ بیگم اپنی توجہ کھانے پر رکھ کر بول رہی تھیں۔ "شادی سر پر ہے سو چکر بازار کے لگنے ہوتے ہیں۔ اب بارش میں کہاں نکل سکتی ہیں۔"

"ہوں۔" شہرینہ سلائس کا ٹکڑا توڑتے ہوئے زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی جبکہ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یوں بھی اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

"خزی تم سعدیہ آپا کی شادی میں کیا پہنو گی۔" شہرینہ نے اسے مخاطب کر کے پوچھا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

"دیکھو......"

"کیا دیکھو میں نے تو کل ساری الماری دیکھ ڈالی مجھے کوئی ایسا سوٹ نہیں ملا جو شادی میں پہنا جا سکے۔" شہرینہ نے برا سا منہ بنا کر بتایا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"اچھا میں دیکھوں گی۔" پھر جاتے جاتے رکی تھی۔ "امی آپ کو کوئی کام تو نہیں ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔"

"کیوں رات میں نہیں سوئی تھیں۔" شہرینہ کے ٹوکنے کا اس نے نوٹس نہیں لیا اور حمیدہ بیگم کا جواب سن کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

"بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا اب ہلکی پھلکی کن من ہو رہی تھی۔ اس نے لحاف میں بیٹھ کر اپنا موبائل اٹھایا تھا کہ شہرینہ آ گئی۔

"خزی کیوں بور کر رہی ہو۔ میں رات سے دیکھ رہی ہوں تم چپ چپ ہو۔ میری کسی بات کا ٹھیک سے جواب ہی نہیں دے رہی ہو۔"

"ایک منٹ میں ذرا نمرہ سے پوچھ لوں کہ وہ آفس گئی ہے یا نہیں۔" وہ کہہ کر نمرہ کو میسج ٹائپ کرنے لگی پھر اس کا جواب آنے پر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ "ہاں اب بولو کیا بات ہے؟"

"تم بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے۔ اداس اداس لگ رہی ہو۔" شہرینہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تو جواب سے بچنے کی خاطر وہ ایک طرف کھسکتے ہوئے بولی۔

"سردی ہے لحاف میں آ جاؤ۔"

"نہیں پھر لحاف سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"تو تمہیں اب کیا کرنا ہے دوپہر کا کھانے بنانے کی ضرورت نہیں ہے فریج میں کچھ نہ کچھ رکھا ہوگا۔ بھوک لگے گی تو وہ ہی کھا لیں گے۔" وہ قصداً بات کو طول دے رہی تھی تاکہ شہرینہ کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ جائے۔

"اچھا تم سونا مت۔ میں بور ہوتی ہوں۔" شہرینہ نے پھر اسے ٹوکا۔

"اچھا بابا نہیں سوتی تم اٹھو یہاں سے۔" وہ خواہ مخواہ الجھنے لگی تھی۔ شہرینہ منہ پھلا کر کمرے سے نکل گئی تو اس نے فوراً لیٹ کر لحاف سر تک کھینچ لیا تھا۔

☆☆☆

اس نے ڈور بیل کا بٹن پش کرنے کے بجائے گیٹ بجا ڈالا کیونکہ بارش کی وجہ سے اکثر ان بٹنوں میں کرنٹ آ جاتا ہے۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کون کی آواز نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"حمزہ......" اس نے بتایا تو فوراً ہی گیٹ کھل گیا۔

"میں یہ ہرگز نہیں کہوں گی کہ ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔" اسے دیکھتے ہی شہرینہ کی ساری بوریت دور ہو گئی تھی۔

"پتا ہے مجھے تم ایسی ہی بے مروت ہو اور میں بھی تم سے ملنے نہیں آیا۔" وہ کہتے ہوئے گیٹ سے داخل ہو کر اندر کی طرف چل پڑا تو وہ فوراً اس کے پیچھے بھاگی آئی۔ لاؤنج میں رک کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"تائی جان کہاں ہیں؟"

"امی اور خزینہ تو لحاف کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہیں۔" وہ جلے انداز میں بولی تھی۔

"اچھا میں آفس جا رہا تھا سوچا پوچھتا چلوں کچھ منگوانا دنگوانا تو نہیں ہے۔" وہ واقعی اسی مقصد سے آیا تھا۔

"بڑی مہربانی تمہاری کچھ نہیں منگوانا۔" وہ مزید جل گئی تو وہ اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔

"تم شاید بور ہو رہی ہو ایسا کرو تم بھی جا کر سو جاؤ۔ کیونکہ میرا آفس جانا ضروری ہے ورنہ میں تمہیں کمپنی دیتا۔" وہ خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگی تو گہری سانس کھینچ کر صوفے پر آرام دہ انداز میں بیٹھ گیا۔

"میں کہیں نہیں جا رہا۔ اب چائے ہی پلا دو۔"

"ابھی لائی۔" وہ پل میں ساری خفگی بھول کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ حمزہ نے اخبار اٹھا لیا اور شہ سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ پھر چائے کے بعد بھی وہ کافی دیر بیٹھا اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر اس سے اجازت لے کر ہی آفس آیا تھا۔

بارش کی وجہ سے کچھ لوگ تو آئے ہی نہیں تھے اور جو آئے تھے وہ اسی کی طرح لیٹ ہو گئے تھے۔ اس نے شکر کیا کہ وہ اکیلا لیٹ نہیں ہوا اور روم میں آتے ہی اس نے پہلے شہرینہ کو اپنے خیریت سے آفس پہنچنے کا میسج کیا پھر کام میں مصروف ہو گیا۔ لنچ ٹائم تک اسے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملی۔ لنچ کے بعد وہ کچھ پیپرز سائن کروانے کے لیے باس کے روم میں آیا تو انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا اور ایک گہری نظر اس پر ڈال کر پوچھا۔

"پیپرز تیار ہو گئے؟"

"جی سر۔" اس نے فوراً فائل کھول کر ان کے سامنے رکھ دی تو حسان صاحب نے پہلے تمام پیپرز چیک کیے پھر سائن کرتے ہوئے اس سے پوچھنے لگے۔

"تمہارے فادر کیا کرتے ہیں؟"

"جی ان کا انتقال ہو چکا ہے۔" اس نے بتایا تو حسان صاحب نے ایک لحظہ کو نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور

قدرے رک کر پھر سوال کیا۔

''کتنا عرصہ ہوا......؟''

''چھ سال......''

''رہائش کہاں ہے تمہاری؟''

''سمن آباد۔''

''کتنے بہن بھائی ہو؟'' حسان صاحب خود کو مصروف رکھ کر سوال کر رہے تھے۔

''دو۔'' وہ حیران ہو رہا تھا۔

''یہ تمہاری فریش جاب ہے یا اس سے پہلے بھی کہیں کام کیا ہے؟''

''نو سر آئی مین فریش جاب ہے۔''

''ہوں......حسان صاحب نے فائل بند کر کے پرسوچ انداز میں اسے دیکھا پھر پوچھنے لگے۔

''آگے کا کیا پلان ہے تمہارا......؟''

''پلان۔'' وہ الجھا ''کیسا پلان سر؟''

''اس سیٹ سے اس سیٹ تک آنے کے لیے کچھ تو پلان کیا ہوگا تم نے۔'' حسان صاحب نے اس کی پھر اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ ان کی بات سے زیادہ ان کی کھوجتی اور چبھتی نظروں سے پریشان ہو گیا سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ بمشکل خود کو بولنے پر آمادہ کر پایا تھا۔

''نو سر میرے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں۔ اپنی محنت سے میں جی ایم کی سیٹ تک تو پہنچ سکتا ہوں اس سے آگے نہیں۔'' اس کے لہجے کی سچائی حسان صاحب کو اس کا یقین کرنے پر مجبور کر رہی تھی لیکن اپنی حیثیت کا زعم آڑے آ گیا۔

''پھر تم نے شارٹ کٹ کا انتخاب کیوں کیا۔ میری بیٹی کو اپنے جال میں پھنسا کر تم سمجھتے ہو وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ دنوں میں طے کر لو گے۔ نو مسٹر حمزہ! تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ تم جیسے لوگوں کو میں خوب جانتا ہوں۔'' وہ انتہائی سفاکی سے اس پر الزام لگا کر اسے اس کی اوقات یاد دلا رہے تھے اور حمزہ کا بس نہیں چل رہا تھا ایک زوردار طمانچے سے اس شخص کا منہ بند کر دے۔ ٹیبل کے نیچے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے وہ بمشکل ضبط کر رہا تھا۔

''امید ہے تمہارا دماغ ٹھکانے آ گیا ہوگا آئندہ میری بیٹی کو ورغلانے کی کوشش مت کرنا۔'' اسے جی بھر کے ذلیل کرنے کے بعد آخر میں وارننگ دیتے ہوئے اس کے سامنے فائل یوں پھینکی جیسے جا سکتے ہو۔

حمزہ کو وہاں سے اٹھنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کرنی پڑیں۔ روم میں آتے ہی اس نے فائل زور سے پٹخ دی پھر چیئر پر بیٹھتے ہی کمپیوٹر آن کر دیا تاکہ اپنا استعفیٰ ٹائپ کر سکے۔ لیکن اس کا ذہن بری طرح چیخ رہا تھا آنکھوں کے سامنے دائرے بن رہے تھے اور ادھر کی بورڈ پر انگلیاں حرکت کرنے سے قاصر تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر اس نے اپنے سر کو جھٹکے دیے پھر ایک دم اٹھا اور جیسے ہر شے کو ٹھوکر مارتا ہوا آفس سے نکل آیا۔

کتنا خوار ہوا تھا وہ جاب کے لیے لیکن شاکی نہیں تھا۔ کیونکہ اسے امید تھی اور خدا پر بھروسا کہ اس کے کام میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ پھر یہ کیسا اندھیر تھا کہ اس کے کردار کی دھجیاں اڑا دی گئی تھیں۔ اتنی ذلت اس سے

برداشت نہیں ہو رہی تھی اور غصے کے باعث وہ کچھ سوچ بھی نہیں پا رہا تھا۔ جب ہی گھر آیا تو سر درد کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ وہ اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن فاخرہ کہاں آرام سے بیٹھ سکتی تھیں فوراً اس کے لیے چائے بنا کر لے آئیں تو وہ جھنجلا گیا۔

''امی مجھے چائے نہیں پینی میں بس سونا چاہتا ہوں۔''

''بیٹا میں تو اس لیے لے آئی کہ چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لے لو گے تو سر درد میں آرام آ جائے گا۔'' فاخرہ نے رسان سے کہا تو اس نے مجبوراً ان کے ہاتھ سے چائے کا مگ اور ٹیبلٹ لے لی۔

''ٹھیک ہے میں چائے پی کر سو‌ؤں گا۔ آپ یہ دروازہ بند کر لی جائیں۔'' اس نے ایک طرح سے فاخرہ کو جانے کا کہہ دیا۔ پھر چائے پیتے ہوئے اس کے اعصاب قدرے پرسکون ہونے لگے تھے۔ لیکن اس نے کچھ بھی سوچنے سے گریز کیا۔ آخری گھونٹ حلق سے اتار کر خالی مگ ٹیبل پر رکھا پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

ربیکا نے حمزہ کے بارے میں اپنی ممی ثمرہ کو بتا دیا تو اس کے بعد وہ خود مطمئن ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس کے ممی ڈیڈی اس کی یہ بات بلکہ خواہش بھی نہیں ٹالیں گے۔ یہ نہیں تھا کہ حیثیتوں کا فرق اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اسی فرق کے باعث ہی تو اس نے اپنی فرینڈز کو حمزہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ڈیڈی کو اس فرق پر اعتراض ہوگا لیکن ان کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا وہ حمزہ کو اسٹیبلش کر سکتے تھے۔ البتہ حمزہ کی منگنی اسے کھل رہی تھی۔ پھر وہ یہ کہہ کر خود کو تسلی دیتی کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ جب اس کے ڈیڈی حمزہ کو بہتر زندگی دینے کی آفر کریں گے تو وہ پرانے رشتے بھول جائے گا۔

ناولٹ

نگہت سیما

عشق ہے اک کتاب



بہر حال ایک ہفتہ ہو گیا اسے حمزہ کے بارے میں بات کیے ہوئے۔ اس کے بعد ثمرہ اس موضوع کی طرف آئیں ہی نہیں جبکہ وہ منتظر تھی۔ اور اب تو اسے بے چینی بھی لگ گئی تھی۔ اس وقت وہ کمرے سے نکلی تو لاؤنج میں ثمرہ کو شہنیلا کے ساتھ رازداری میں باتیں کرتے دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ پھر بظاہر لاپروا انداز میں آگے بڑھ کر پوچھنے لگی۔

''تم کب آئیں شہنی......؟''

''کچھ دیر ہوئی۔ تم آج آفس نہیں گئیں۔'' شہنیلا نے جواب کے ساتھ پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''بارش کی وجہ سے موڈ نہیں بنا۔''

''ہاں بارش کی وجہ سے میرے بھی کتنے کام رہ گئے۔ اسپیشلی مجھے شاپنگ پر جانا تھا۔'' شہنیلا نے کہا تو وہ فوراً بولی۔

''اب تو بارش نہیں ہے چلیں۔''

''نہیں اب تو موڈ نہیں ہے پھر ابھی ٹریفک کا بھی بہت مسئلہ ہوگا۔ ہے ناں ممی!'' شہنیلا نے خاموش بیٹھی ثمرہ کو مخاطب کیا تو وہ جانے کس سوچ میں تھیں سنا ہی نہیں۔

''ممی شاید مسئلہ کشمیر حل کر رہی ہیں۔'' اس نے ثمرہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو شہنیلا کو جیسے موقع مل گیا۔

''اور تم ہم کیا کر رہی ہو رالی کم از کم مجھے تم سے ایسی حماقت کی امید نہیں تھی۔''

''کیسی حماقت؟'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

''وہ کیا نام ہے اس کا جس کے بارے میں تم نے ممی کو بتایا ہے وہ تو ڈیڈی کے آفس میں کام کرتا ہے۔''

شہنیلا کے لہجے میں تاسف کے ساتھ تمسخر بھی تھا۔ وہ سلگ گئی۔

''پھر ڈیڈی کے آفس میں کام کرنا جرم ہے کیا؟''

''جرم اس کا نہیں تمہارا ہے۔ تمہاری عقل کو کیا ہوا ہے۔ محل میں رہ کر جھونپڑی کے خواب دیکھنے لگی ہو۔ چہ چہ۔'' غصے میں شہنیلا کی آواز تیز ہو گئی تھی جس سے ثمرہ بھی متوجہ ہو گئیں اور باری باری دونوں کو دیکھنے لگیں۔

''میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' اس کا مختصر لیکن حتمی انداز تھا۔ شہنیلا اس کی ضد سے واقف ہونے کے باوجود آپے سے باہر ہو گئی تھی۔

''بکواس بند کرو رالی یہ تمہارا پرسنل میٹر نہیں ہے۔ تمہارے اس اقدام سے ہم سب متاثر ہو سکتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں ایسے دو ٹکے کے آدمی کی کوئی جگہ نہیں سمجھی۔''

اس نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا پھر جھٹکے سے اٹھی اور پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ در و دیوار ہل سے گئے تھے۔

☆ ☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

آج نیل گروں والی گلی میں بڑی رونق لگی ہوئی تھی۔ فیروز عرف مہنگا کی پرسوز آواز پوری گلی میں گونج رہی تھی۔

چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائی کے
نیناں ملائی کے۔بل بل جاؤں تورے رنگ رجوا
اپنی سی رنگ لی رے موسے نیناں ملائی کے

وہ آج بڑے دنوں بعد گھر سے نکلا تھا۔ سرخ رومی ٹوپی، سفید گھیر دار فراک نما لبادہ پہنے وہ گلی کے بیچوں بیچ کھلے میدان میں کھڑا تھا جہاں گلی کی خوشی میں سب اکٹھے ہوتے تھے۔ شادی، بیاہ عید، ہولی، بیساکھی، دیوالی سب تہوار یہاں ہی منائے جاتے تھے۔ تقسیم سے پہلے اس چھوٹے شہر میں یہ واحد محلہ تھا جہاں دو منزلہ سہ منزلہ مکان تھے۔ اب تو خیر بہت تبدیلیاں آگئی تھیں۔ پھر بھی گلی والے گلی کی خوشی میں اسی چوکور میدان میں تقریبات کرتے اور وہ اسی چوکور میدان کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اوپر مکانوں کی کھڑکیاں کھل رہی تھیں۔ پرشوق نظریں کھڑکیوں کی جھریوں سے جھانکتی تھیں اور کچھ بے خوف اور آزاد منش بالکونیوں میں کھڑی نیچے جھانک جھانک کر دیکھتی تھیں۔ وہ ساکت کھڑا تھا اور مہنگا درزی کی آواز پوری گلی میں چکراتی اوپر بالکونیوں اور گھروں تک جاتی تھی۔ پتا نہیں اس میں اور مہنگا میں کیا تال میل تھا کہ جب بھی وہ گھر سے نکلتا مہنگا سلائی کی مشین چھوڑ کر اپنی دکان کے تھڑے پر آکر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اس کی پرسوز آواز ساری گلی میں گونجنے لگتی تھی۔

مہنگا کا اصل نام تو فیروز تھا، لیکن وہ مہنگا کے نام سے مشہور تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سلائی لیتا تھا۔ وہ گلی کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اور مہنگا کی پرسوز آواز اس کے اندر ضربیں لگاتی تھی۔

پریم بھٹی کا مدھوا پلائی کے
متوالی کر دینی رے موسے نیناں ملائی کے
چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائی کے
نیناں ملائی کے

یکا یک اس نے دائیں پاؤں کی ایڑی زمین پر ماری اور دونوں بازو فضا میں پھیلائے۔

چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائی کے

مہنگا کی آواز کا سوز بڑھا

اب وہ فضا میں بازو پھیلائے گول گول گھوم رہا تھا۔ سب اپنی اپنی دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے یا کھڑے پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ جب بھی گلی میں آتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ کڑھائی والے، سلائی والے، کپڑے رنگنے والے سب اپنا اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے لگتے تھے۔ وہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ یہاں ہی اسی گلی میں کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ گھومتے گھومتے اس کی نظریں سبز دروازے والے مکان کی طرف اٹھتی تھیں اور پھر جھک جاتی تھیں۔ سبز دروازے والا مکان جس کی بالکونی کی جیلری سے بوگن ویلیا کی بیلیں لٹک رہی تھیں اور بالکونی میں کھلنے والا دروازہ بند تھا اور بند دروازے والے کمرے میں بیٹھی خدیجہ کی پیشانی پر بل پڑتے تھے اور وہ نخوت سے سر ہلاتی تھی۔

''ہوں۔ ڈھونگی، ڈرامہ باز۔'' اس کے لبوں میں جنبش ہوئی تھی اور پھر وہ اپنی گود میں رکھی کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی تھی، لیکن بند کھڑکیوں اور دروازے سے بھی مہنگا کی آواز اس تک آتی تھی۔

چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائی کے۔ نیناں ملائی کے

''اور یہ مہنگا یہ بھی کم ڈرامے باز نہیں'' خدیجہ پھر بڑبڑائی تھی اور وہ ہاتھ پھیلائے دیوانہ وار چکراتا تھا۔ آس پاس کے گھروں کی گیلریوں اور بالکونیوں میں لڑکیاں عورتیں اور بچے کھڑے تھے، لیکن سبز دروازے والے گھر کی بالکونی ویران تھی اس بالکونی میں موجود دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ مہنگا کی آواز میں اب آنسوؤں کی نمی تھی۔ وہ گھومتے گھومتے ہاتھ پھیلائے بے دم ہو کر یک دم گر گیا۔ یوں جیسے کوئی سفید کونج اوپر بلندیوں پر پرواز کرتی نیچے آگرے اور اس کی سانس رک جائے۔ آدھا بول مہنگا کے لبوں پر ہی رہ گیا تھا۔ وہ دکان کے تھڑے سے کود کر تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا اور اس کے رخساروں کو ہولے ہولے تھپتھپانے لگا تھا، لیکن اس کا سانس رک رک کر چلتا تھا۔ ہولے ہولے سب ہی اپنی اپنی دکانوں سے نکل کر اس کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ گلو بادشاہ اپنی دکان سے اسٹیل کے گلاس میں پانی بھر لایا تھا اور اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا، لیکن اس کی سختی سے بند آنکھوں میں جنبش تک نہ ہوئی تھی۔ حاجی صاحب کو بھی کسی نے اطلاع دے دی تھی اور وہ بھی ہانپتے کانپتے پہنچ گئے تھے لوگوں نے ایک طرف ہو کر انہیں رستہ دیا تھا۔ مہنگا کی مدد سے انہوں نے اسے سیدھا کیا تھا اور اپنے کرتے کے دامن سے اس کی پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطرے پونچھے تھے۔

☆☆☆

یہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا شہزادہ عالمگیر۔ اونچا لمبا، گورا چٹا، تیکھے نقش ایسے کہ نگاہ ایک بار اس کی طرف اٹھتی تو پھر جھکنا بھول جاتی تھی۔ حاجی صاحب نے بہت چاؤ سے اس کا نام شہزادہ عالمگیر رکھا تھا اور وہ تھا بھی تو شہزادوں جیسا۔ جب پہلی بار انہوں نے اسے گود میں لیا تھا تو انہیں لگا تھا جیسے ان کے اندھیرے گھر میں چکا چوند ہوگئی ہو۔ ایسی روشن پیشانی جیسے چاند دمکتا ہو اور اس کی پیشانی آج بھی ایسے ہی روشن تھی چمکتے چاند کی طرح۔

حاجی صاحب کے دادا پردادا بھی اسی گلی کے باسی تھے ان کا یہ آبائی گھر جو شاہ صاحب کی حویلی کے نام سے مشہور تھا۔ گلی کے بالکل آخر میں تھا جس میں وقت کے ساتھ کئی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ حاجی صاحب کی کپڑے کی بہت بڑی دکان سڑک پار بننے والے نئے پلازہ میں تھی اور شہزادہ عالمگیر ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انہوں نے اپنا کانپتا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ ہلکے ہلکے سانس لیتا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور بند آنکھوں پر خوشنما پلکوں کی جھالریں سجی تھیں جو حاجی صاحب کی پکار پر ذرا سا لرزتیں اور پھر ساکت ہو جاتیں۔ بند آنکھوں کے ساتھ بے سدھ پڑا بھی وہ دل کھینچتا تھا۔ پھر کیا تھا ایسا کہ خدیجہ اس شہزادے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔

سترہ سالہ خدیجہ باقر۔ باقر علی رنگ ساز کی دوسرے نمبر والی بیٹی۔ اسے شہزادہ عالمگیر میں کچھ نہ دکھتا تھا اور نیل گروں کی گلی میں افواہیں گردش کرتی تھیں کہ شہزادہ عالمگیر کو عشق ہوگیا ہے اور نوخیز عمر کے نوخیز عشق نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ پتا نہیں وہ کون تھی جس کے عشق نے اسے خوار کر دیا تھا۔ حال سے بے حال، بیگانہ اپنے آپ سے بے خبر۔ یہ بھید کوئی نہیں جانتا تھا۔ شاید مہنگا بھی نہیں۔ جو بچپن کا سنگی تھا یا شاید جانتا ہو، لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں پھوٹتا تھا حالانکہ ایک سال پہلے تک وہ گھنٹوں مہنگا کی دکان پر بیٹھا رہتا تھا اور ہولے ہولے مہنگا سے کچھ کہتا رہتا تھا۔ آٹھویں جماعت تک دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے رہے تھے۔ آٹھویں کے بعد مہنگا کے باپ نے اسے ایک درزی کی دکان پر بٹھا دیا تھا، لیکن شہزادہ عالمگیر اور مہنگا کی دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

شہزادہ عالمگیر اسکول سے کالج پہنچ گیا تھا، لیکن مہنگا سے اس کی دوستی ویسے ہی تھی۔ کالج سے آکر گھنٹوں مہنگا کی دکان پر بیٹھا رہتا اور مہنگا کپڑے سیتے ہوئے بہت دھیان اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا۔ کبھی کبھی دونوں کے مشترکہ قہقہوں سے گلی گونج اٹھتی اور کبھی شہزادے کی فرمائش پر مہنگا اپنی پرسوز آواز میں گانے سناتا۔ ہیر گاتا۔ سال بھر پہلے وہ اچانک ہی غائب ہوگیا تھا اور حاجی صاحب اسے دیوانہ وار ڈھونڈتے رہے تھے۔ پھر اچانک ہی چھ ماہ بعد وہ آگیا تھا۔ حال سے بے حال، خود میں گم، صوفیانہ چولے میں سفید لمبا فراک پہنے سر پر ترکی ٹوپی۔ جانے وہ کہاں رہا تھا کسی کو خبر نہ تھی۔ مہنگا کو بھی نہیں۔ حاجی صاحب اور شہزادے کی ماں زینب بی بی شکر کے سجدے کرتے نہ تھکتے تھے۔ حاجی صاحب نے اسے شہر کے معروف ڈاکٹروں کو دکھایا۔ لاہور بھی لے کر گئے، لیکن اس کا علاج ڈاکٹروں کے پاس

نہ تھا۔ اس کی چپ نہیں ٹوٹتی تھی۔ وہ سارا دن جانے کیا سوچتا رہتا تھا۔ ہفتہ دس دن بعد جب حاجی صاحب کو لگتا کہ وہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ آنکھوں کے خالی پن میں زندگی جھلکنے لگی ہے تو وہ گھر سے نکل پڑتا اور پھر گلی کے بیچوں بیچ ساکت ہو جاتا قدم جیسے آگے اٹھنے سے انکاری ہو جاتے تھے۔ مہنگا اسے گلی میں کھڑا دیکھ کر کام چھوڑ کر اس کی طرف لپکتا۔

"شہزادے رک کیوں گیا ہے۔ چل آ دکان میں آ کر بیٹھ۔ کتنے دن ہو گئے تم نے مجھے اپنے کالج کی باتیں نہیں بتائیں اور نہ ہی مجھ سے کچھ سنا ہے۔ چل میں تجھے ہیر وارث شاہ سناتا ہوں۔" وہ خالی خالی نظروں سے اسے تکتا رہتا تھا پھر فرمائشیں کرتا۔

"وہ سنا مہنگا وہ خسرو کا "چھاپ تلک سب چھینی رے" وہ جو تم پہلے بھی سناتے تھے۔" اور یہ وہ واحد جملہ تھا جو واپس آنے کے بعد اس کی زبان سے لوگوں نے سنا تھا اور مہنگا تو شہزادے عالمگیر کا پکا یار تھا بے دام غلام تھا، وہ اس کی بات مکمل ہوتے ہی اپنی دکان کے تھڑے پر بیٹھ جاتا اور اس کی آواز بلند ہوتی۔ لیکن یہ تو تب کی بات تھی جب وہ چھ ماہ غائب رہنے کے بعد واپس آیا تھا۔ اب تو وہ کچھ نہیں کہتا تھا اس کے گلی میں نکلتے ہی مہنگا کے لب خود بخود گنگنا اٹھتے تھے اور تب سے ہی گلی میں افواہیں گردش کرتی تھیں۔

"اسے کوئی شردا چمٹ گیا ہے۔"

"کوئی پری عاشق ہو گئی ہے یا پھر...... یا پھر اسے عشق ہو گیا ہے اور اس عشق نے اسے پاگل کر دیا ہے۔" باقی افواہیں تو خود ہی ہولے ہولے دم توڑ گئیں، بس یہ ایک افواہ ہی رہ گئی کہ شہزادہ کسی کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو کر حواس کھو بیٹھا ہے۔ وہ گلی کے بیچوں بیچ پڑا تھا اور حاجی صاحب بے قرار ہو کر اسے پکارتے تھے۔

"شہزادے...... شہزادے آنکھیں کھول۔"

اور پھر اس نے آنکھیں کھولیں ویران خالی جیسے ان میں دھول اڑتی ہو۔ وہ بے گانہ نظروں سے حاجی صاحب اور مہنگا کو دیکھتا تھا۔ حاجی صاحب نے بے بسی سے مہنگا کی طرف دیکھا اور مہنگا نے یک دم ہی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا۔ حاجی صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے وہ مہنگا کی مدد سے اسے سہارا دیتے ہوئے گھر لے جا رہے تھے اور ان کے آنسو ان کے رخساروں سے ہوتے ان کی داڑھی بھگوتے تھے اور سبز دروازے والے گھر میں خدیجہ بالکونی والے کمرے سے باہر صحن میں چلی گئی تھی جہاں گلی میں ہونے والا شور اسے سنائی نہیں دیتا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں گود میں رکھی کھلی کتاب کا کوئی بھی لفظ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا اور وہ بار بار ایک ہی سطر کو پڑھنے لگتی تھی لیکن وہ جیسے کتاب کی ہر سطر کے پیچھے سے جھانکنے لگتا تھا۔

وہ شہزادہ عالمگیر جو نگاہ جھکا کر چلتا تھا اور جس کی شرافت اور دین داری کی قسم گلی کا ہر فرد ہی کھانے کو تیار رہتا تھا۔ ہاں وہی شہزادہ عالمگیر ایک روز مہنگا کی دکان سے گھر کی طرف جاتے جاتے جانے کیا یاد آنے پر مڑا تھا اور اس کی جھکی نظریں اٹھی تھیں اور ایسی اٹھی تھیں کہ پھر جھکنا بھول گئی تھیں۔ ہاں وہی شہزادہ عالمگیر اس روز کالج سے واپس آتے ہوئے اس کے راستے میں کھڑا تھا اور اس کی نظریں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتا تھا، اس کے لب ذرا سے وا ہوئے تھے اور پھر اس کی پیشانی پر نمودار ہوتی سلوٹیں دیکھ کر بند ہو گئے تھے۔ خدیجہ کو اس کا یوں گلی میں کھڑے ہو کر اپنی طرف دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا اور وہ ایک تیز غصیلی، ناگوار نظر اس پر ڈالتی سبز دروازے والے مکان میں چلی گئی تھی۔

پھر...... پھر کیا ہوا تھا۔ خدیجہ نے یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔ کچھ ہوا ہوتا تو اسے یاد آتا۔ شہزادہ پھر کبھی اس کے راستے میں کھڑا نہیں ہوا تھا۔ ہاں سال بھر پہلے وہ گھر سے غائب ہو گیا تھا اور پھر چھ ماہ بعد آیا تو یوں۔

"پتا نہیں وہ کہاں گیا تھا اور...... مجھے کیا بھلا مجھے کیا اوہ کہاں گیا تھا اور اسے کسی سے عشق ہوا تھا یا نہیں......" اس نے جھنجلا کر کتاب بند کی اور واپس بالکونی والے کمرے میں آ کر کچھ دیر ساکت کھڑی رہی گلی میں خاموشی تھی وہ دروازہ کھول کر بالکونی میں آئی۔ نیچے کوئی نہیں تھا سب اپنی اپنی دکانوں میں جا کر کام کرنے لگے تھے۔ وہ بوگن ویلیا کی بیل کے پاس خاموش کھڑی نیچے جھانکتی تھی اور کانوں میں مہنگا کی آواز آتی تھی۔

"چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائی کے

نیناں ملائی کے۔"

☆☆☆

عید قریب تھی اور رنگ ساز مصروف تھے۔ خدیجہ کو بھی اپنے اور اپنی بہنوں کے دوپٹے رنگوانے تھے وہ اپنی سہیلی کبریٰ کے ساتھ فضل دین کی دکان پر کھڑی تھی، کئی سال پہلے حاجرہ کا شوہر جمال الدین جو فضل دین کی وفات کے بعد فضل دین کی دکان پر بیٹھتا تھا اچانک ہی کہیں چلا گیا تھا۔ گھر میں جب کھانے کو کچھ نہ رہا تو حاجرہ نے جمال الدین کی جگہ لے لی تھی اور رنگائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ مدد کے لیے ظفری کا چھوٹا بھائی رکھ لیا تھا جس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ پوری گلی والے اس کی عزت کرتے تھے۔ کڑاہی ایک بار پھر گھر کے صحن میں رکھ لی گئی تھی البتہ آرڈر وہ باہر ہی لیتی تھی۔ وہ چاہتی تو کہیں کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لیتی۔ بی اے پاس تو تھی، لیکن اس نے اپنے لیے رنگائی کا کام ہی پسند کیا تھا۔ اس کام میں اسے لطف آتا تھا۔

"حاجرہ آپا یہ اس گرے دوپٹے کے پلو پر سرخ چڑیاں بنانی ہیں اور یہ اس دوپٹے پر موتیا رنگ لگا کر پلو میرون کر دیں۔" خدیجہ نے اسے سمجھایا۔ حاجرہ نے رسید بنا کر اسے دی اور دوپٹوں کا گولا بنا کر اسے کارٹن میں ڈالا۔ خدیجہ کا باپ باقر بھی رنگ ساز تھا، لیکن کچھ عرصہ پہلے وہ دبئی چلا گیا تھا۔

"باقر چاچا کیا عید پر آئیں گے۔" حاجرہ نے کبریٰ کے ہاتھ سے دوپٹا لیتے ہوئے خدیجہ سے پوچھا۔

"نہیں حاجرہ آپا۔" خدیجہ نے شاپر سے آخری دوپٹا نکال کر حاجرہ کی طرف بڑھایا۔

"ابا تو بقر عید پر آئیں گے آمنہ کی شادی ہے نا بڑی عید کی بعد۔" تب ہی گلی میں یک دم شور ہوا۔

"شہزادہ آ گیا...... شہزادہ آ گیا۔" وہ بہت عرصہ بعد گھر سے نکلا تھا۔ شاید دو ماہ بعد۔ خدیجہ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا وہ حاجرہ کو دوپٹے کے متعلق سمجھا رہی تھی کہ مہنگا کی آواز نے لحہ بھر کے لیے اس کے دل کو جیسے مٹھی میں لیا تھا۔ پتا نہیں اتنا سوز کہاں سے آ گیا تھا اس کی آواز میں۔ کبریٰ گردن موڑے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جواب دونوں بازو فضا میں پھیلائے گول گول گھوم رہا تھا۔

"اسے کیا ہوا ہے حاجرہ آپا۔" کبریٰ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس بدرنگا ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے حاجرہ آپا۔" کبریٰ ابھی تک گول گول گھومتے شہزادے کو دیکھ رہی تھی۔

"میرا ابا کہتا تھا کسی بھی رنگدار کپڑے پر رنگ چڑھانے کے لیے پہلے اس کا رنگ کاٹنا پڑتا ہے۔ جب وہ چٹا سفید ہو جاتا ہے تب ہی اس پر نیا رنگ چڑھتا ہے۔ اگر ایسے ہی بغیر پہلا رنگ کاٹے نئے رنگ چڑھائیں تو بدرنگا ہو جاتا ہے اور یہ جو شہزادہ ہے نا......" حاجرہ بڑی عقیدت سے شہزادے کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر بڑی الوہی سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی۔ "یہ بھی بدرنگا ہو گیا ہے اس نے بھی پرانے رنگ پر نیا رنگ چڑھانے کی کوشش کی ہے کبریٰ!۔" حاجرہ نے شہزادے سے نگاہ ہٹا کر خدیجہ کی طرف دیکھا۔

"یہ جو دل کا آئینہ ہوتا ہے نا گڑیا اسے بھی پہلے صاف کرنا پڑتا ہے۔ مانجھنا پڑتا ہے۔ صاف شفاف کرنا پڑتا ہے۔ پرانی ساری تصویریں مٹانی پڑتی ہیں۔ تب نیا رنگ چڑھتا ہے نئی تصویر بنتی ہے۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی اور سیدھی سادی کبریٰ گلی کے بیچوں بیچ دونوں ہاتھ پھیلائے دیوانوں کی طرح گھومتے ہوئے شہزادہ عالمگیر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس کے کپڑے تو چٹے سفید ہیں پھر یہ بدرنگا کیسے ہو گیا ہے۔

خدیجہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی اور وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ پتا نہیں کیوں۔ ہاں پتا نہیں کیوں وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی پھر بھی جب کچھ اور عورتیں آ کر حاجرہ سے پوچھنے لگیں کہ ''وہ کل شام تک کچھ دوپٹے رنگ دے گی'' اور حاجرہ ان کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے دیکھا مہنگا اس کی کمر میں بازو ڈالے اسے گھر کی طرف لے جا رہا تھا۔ آج حاجی صاحب پتا نہیں کہاں تھے۔

''چلو آج یہ ڈرامہ ذرا جلدی ختم ہو گیا۔'' خدیجہ نے سکون کی سانس لی اور کبریٰ کے ساتھ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی کہ آج کبریٰ نے شام تک اس کے گھر ہی رہنا تھا۔

''یہ تمہاری حاجرہ آپا!'' چلتے چلتے کبریٰ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''تم نے کبھی غور سے ان کی طرف دیکھا۔ کتنی کشش ہے ان کے چہرے پر جیسے ان کے چہرے سے کوئی نور پھوٹتا ہو۔ کتنی چمک ہے نا ان کی آنکھوں میں اور ان کی اسکن۔ ہائے...... تمہاری تو پڑوسی ہیں نا تو پلیز ان سے پوچھنا یہ چہرے پر کیا لگاتی ہیں ہزاروں روپے پارلرز پر خرچ کرتے ہیں پھر بھی ہماری اسکن اتنا Glow (گلو) نہیں کرتی ہیں نا۔''

''ہاں'' خدیجہ نے چونک کر اسے اور پھر مڑ کر حاجرہ کی طرف دیکھا۔ بڑے سے سفید دوپٹے کو اچھی طرح سے لپیٹے حاجرہ اٹھ کر اب شاید گھر کے اندر جا رہی تھی۔ عام سی شکل و صورت والی سانولی سلونی حاجرہ کے چہرے پر ایک ملکوتی چمک تھی اور یہ چمک یہ روشنی ابھی کچھ دیر پہلے اسے شہزادہ عالمگیر کی آنکھوں سے پھوٹتی دکھائی دی تھی۔

''تو کیا شہزادہ عالمگیر اور حاجرہ آپا...... اور وہ جو پوری گلی میں افواہیں گردش کرتی ہیں کہ شہزادے کو کسی سے عشق ہو گیا تھا اور اس عشق نے اسے اپنے آپ سے بے گانہ کر دیا تھا۔ بے گانہ اور بے خبر۔ تو یہ عشق اسے حاجرہ آپا سے...... لیکن بھلا کیسے...... حاجرہ آپا تو اتنی بڑی ہیں اس سے۔'' اسے یاد تھا جب حاجرہ کی شادی ہوئی تھی تو وہ آٹھ سال کی تھی اور اس نے ابا سے ضد کر کے سفید نیٹ کا فراک بنوایا تھا اور شہزادہ اس سے دو سال ہی تو بڑا تھا اور حاجرہ آپا تب بیس بائیس کی تو ضرور ہوں گی۔

''میں بھی ناں...... ہاں میں بھی بس۔'' وہ سبز دروازے کو دھکیل کر گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

تو اقبال کے ہاں عشق جو ہے وہ اصل حیات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق کے بغیر زندگی بے معنی ہے اور پروفیسر حامد نصیر کی نظریں پوری کلاس میں سے ہوتی ہوئی خدیجہ پر آ کر ٹھہر گئیں جو چہرہ اوپر اٹھائے پورے انہماک سے انہیں سن رہی تھی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد انہوں نے اقبال کی نظم کو جہاں چھوڑا تھا وہاں سے پھر شروع کیا۔

عشق دم جبریل عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

وہ جب بھی اقبال کو پڑھاتے یوں ہی ڈوب جاتے۔ اپنی یاد ہی نہ رہا کہ وہ تشریح کر رہے تھے وہ بڑے جذب سے بول رہے تھے۔

''سر عشق تو بدنام کرتا ہے رسوا کر کے رکھ دیتا ہے پھر اقبال عشق کو اتنا اعلا و ارفع کیوں کہتے ہیں۔'' خدیجہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے حاجی صاحب کا اکلوتا سپوت آ گیا تھا جسے پچھلے دو سال سے وہ تماشا بنتے دیکھ رہی تھی اور اب تو لوگ صاف کہتے تھے کہ وہ کسی کے عشق میں پاگل ہو گیا ہے اور جب کوئی اس کے سامنے ایسی بات کرتا تو پتا نہیں کیوں اس کی نظریں جھک جاتیں۔ کوئی چور احساس دل میں چٹکی بھرتا۔ کوئی نہیں جانتا تھا وہ کون تھی۔ شاید اس کے ساتھ کالج میں پڑھنے والی کوئی لڑکی بھلا شہزادہ عالمگیر گلی کی کسی عام لڑکی پر دل ہار سکتا تھا۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے، لیکن یہ بھید تھا جو صرف وہ جانتا تھا یا مہنگا یا شاید وہ بھی، لیکن پتا نہیں وہ جانتی بھی تھی یا نہیں یا پھر محض گمان تھا، یقین جیسا گمان۔

اس روز گلی میں اس کے راستے میں کھڑا اسے دیکھتا اور پھر...... ہاں پھر کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ شاید حاجی صاحب جانتے ہوں، لیکن سب کے لبوں پر مہر لگی تھی وہ نہ تو تائید کرتے تھے نہ تردید اور خدیجہ...... خدیجہ بس ایک گمان کے گردن گھمن گیریاں کھاتی تھی چڑتی تھی کڑھتی تھی اور پھر پرسکون ہو جاتی تھی۔ پروفیسر حامد نے بغور اسے دیکھا اس کی پیشانی پر پڑی شکنوں سے ناگواری جھلکتی تھی۔

''کیا آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گی خدیجہ!'' اور خدیجہ باقر نے شہزادہ عالمگیر کی ساری کہانی من و عن بیان کر دی تھی۔

''وہ اچھا خاصا ذہین لڑکا تھا سر۔ گلی والے کہتے ہیں کسی کے عشق نے اسے اس حال میں پہنچا دیا ہے تو ایسا عشق نری رسوائی اور بدنامی کے سوا اور کیا ہے جس نے اسے ہی نہیں اس کے ماں باپ کو بھی خوار کر دیا ہے۔'' پروفیسر حامد نصیر کچھ دیر یوں ہی خدیجہ کی طرف دیکھتے رہے گھور سیاہ آنکھیں جن میں بلا کی چمک تھی۔ دلکش سراپا دمکتی رنگت، خمدار گلابی ہونٹ۔ پھر یک دم جیسے کوئی ادراک ہوا تھا انہیں۔ اس ظاہری سراپے کے علاوہ کچھ اور بھی تھا اس میں۔ اس چھوٹے سے شہر میں گورنمنٹ کا ایک ہی ڈگری کالج تھا۔ جہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ کچھ دن پہلے ہی لڑکیوں کا ایک پرائیویٹ کالج بھی کسی نے شروع کیا تھا، لیکن اس کے اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ خدیجہ نے گورنمنٹ کالج میں ہی ایڈمیشن لینے کو ترجیح دی تھی۔ پہلے روز سب لڑکے لڑکیاں اپنا تعارف کروا رہے تھے تو اپنی باری پر اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔

''میں خدیجہ باقر ہوں اور میرے ابا رنگ ساز ہیں۔'' تو وہ چونکے تھے ہاں کچھ تو تھا خاص جس نے شہزادہ عالمگیر کو ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ انہیں گمان ہوا تھا یقین جیسا گمان۔

بی اے فائنل کی خدیجہ باقر آج سے چار سال پہلے جب اپنا تعارف کروا رہی تھی تو تب بھی وہ انہیں خاص لگی تھی۔ سترہ سالہ خدیجہ باقر میں بلا کا اعتماد تھا اس کی روشن پیشانی دمکتی تھی اور آج بھی وہ انہیں خاص لگ رہی تھی...... کیا شہزادے عالمگیر کے عشق کی آگ اس کی روشن پیشانی پر دمکتی تھی۔

''خدیجہ'' انہوں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ ''اس سے نفرت مت کرو...... اس کے لیے دعا کرو کہ وہ کسی ایک کا ہو جائے۔ دراصل وہ مجاز کی سیڑھی پر کھڑا ہو کر حقیقت کی طرف لپک رہا ہے نہ ادھر کا نہ ادھر کا۔ مجاز اسے اپنی طرح کھینچتا ہے اور حقیقت اپنی طرف اسی کشمکش میں وہ گرتا ہے اور پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے جس روز کسی ایک کا ہو گیا اس روز تماشا ختم ہو جائے گا تو خدیجہ باقر بھلے اس سے محبت نہ کرو، لیکن اس سے نفرت بھی نہ کرو۔'' بات ختم کر کے انہوں نے روسٹرم پر اوندھی رکھی کتاب اٹھا لی تھی۔

''ہاں تو اقبال کہتا ہے۔

عشق ہے ابن سبیل اس کے ہزاروں مقام

اور اسے حاجرہ کی بات یاد آئی تھی۔ اس نے بھی تو کبریٰ سے کچھ ایسا ہی کہا تھا کہ وہ بدرنگا ہو گیا ہے۔ ایک رنگ پر دوسرا رنگ چڑھانا چاہو تو ایسے ہی ہوتا ہے اور اس کی پیشانی پر پڑی ناگواری کی شکنیں معدوم ہو گئیں اور نظریں جھک گئیں۔ پروفیسر حامد کے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی اور خدیجہ نے پہلی بار دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی کہ حاجی صاحب کا اکلوتا بیٹا ٹھیک ہو جائے۔ جو کسی کے عشق میں حواس کھو بیٹھا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا یہ عشق اسے کس سے ہوا تھا بس ایک گمان سا تھا اور گمان ضروری تو نہیں سچ ہو۔ بھلے وہ گمان کسی یقین جیسا ہو۔

خدیجہ نے سر جھٹکا اور پروفیسر حامد کا لیکچر

دھیان سے سننے لگی جو اقبال کی مسجد قرطبہ کی تشریح کر رہے تھے، لیکن دھیان تھا کہ بار بار بٹ جاتا تھا اور وہ شہزادہ عالمگیر کے ٹھیک ہونے کی دعا کرنے لگتی تھی، لیکن کیا سب دعائیں قبول ہو جاتی ہیں نہیں نا تو اس کی دعا بھی قبول نہیں ہوئی تھی۔ کالج سے آتے جاتے اس کی نگاہیں اسے کھوجتیں، لیکن وہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

''شاید وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ تب ہی تو...... تب ہی تو وہ نظر نہیں آتا۔'' اسے تو مطمئن ہونا چاہیے تھا، خوش ہو جانا چاہیے تھا کہ اب وہ سر بازار تماشا نہیں کرتا۔ لیکن پتا نہیں کیا تھا جو اسے بے چین کیے رکھتا تھا۔ عجیب سی بے کلی تھی جو اسے مضطرب رکھتی تھی لیکن نہ وہ دکھائی دیتا تھا نہ مہنگا کی آواز آتی تھی وہ جو مہنگا کی آواز سن کر بالکونی کا دروازہ بند کر دیتی تھی اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ جاتی تھی، اب اس کی سماعتیں اور بصارتیں اسے دیکھنے اور سننے کو بے تاب رہتیں۔ وہ گھنٹوں بالکونی میں کھڑی رہتی تھی۔ سامنے اپنی دکان میں مہنگا سر جھکائے مشین پر نظر آتا اور اس کے کانوں میں آوازیں گونجتی رہتیں کبھی مہنگا کی پر سوز آواز۔

''چھاپ تلک سب چھینی رے۔'' اور کبھی پروفیسر حامد نصیر کانوں میں سرگوشی کرتے۔

''اس سے بھلے محبت نہ کرو خدیجہ لیکن اس سے نفرت بھی نہ کرو۔'' اور کبھی حاجرہ آپا کی آواز ''وہ بد رنگا ہو گیا ہے کبری!''

وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی لیکن یہ آوازیں دل میں چھید کرتی تھیں۔ یہ آوازیں نہیں تھیں، یہ تو بھاری گرز تھے جو دل کے دروازے پر ضربیں لگاتے تھے۔ ایک دو تین ہر ضرب پہلے سے شدید ہوتی تھی۔ اور پھر دروازے ٹوٹ گئے وہ ششدر سی رہ گئی۔ وہ ایک نظر جیسے دل میں ترازو ہو گئی تھی۔

''تو کیا۔ تو کیا وہ......''

عشق ہے ابن سبیل عشق ہے ام

الکتاب'' پروفیسر حامد نصیر کی گمبھیر آواز بازو پھیلائے گول گول گھومتا شہزادہ۔

''ڈھونگی، ڈرامہ باز۔'' اس کے لب ذرا سے وا ہوئے اور وہ وہاں ہی بالکونی میں پڑی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اونچا اونچا...... بلند آواز میں۔

☆☆☆

''شہزادے میری جان آنکھیں کھول میرے بچے کچھ تو بول۔ کچھ تو کہہ اپنے باپ کو اور نہ آزما میری جان۔'' حاجی صاحب شہزادے کے بیڈ کے پاس کرسی بچھائے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔ شہزادے نے آنکھیں کھول کر حاجی صاحب کی طرف دیکھا لال سرخ آنکھیں جن میں وحشت بھری تھی۔ لحہ بھر انہیں اجنبی نظروں سے دیکھنے کے بعد شہزادے نے آنکھیں موندلیں۔ حاجی صاحب کی آنکھیں نم ہوئیں اور آنسو رخساروں پر لڑھک آئے۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے شہزادے کو اسی حالت میں۔

یہ چار ہفتے پہلے کی ہی تو بات تھی وہ اپنا وہی سفید فراک نما لبادہ پہنے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ پھر صحن میں رکا تھا اور اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اوپر دیکھتے دیکھتے یکا یک اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''اللہ'' پہلے آہستہ پھر بلند آواز میں ''اللہ اللہ۔'' ہر بار اس کی آواز پہلے سے بلند ہوتی تھی۔ زینب بی بی اس کی آواز سن کر کچن سے باہر نکلی تھیں۔

''شہزادے'' وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھیں لیکن شہزادہ تو نہ جانے کس کیفیت میں تھا کہ اس نے ان کی طرف دیکھا ہی نہیں وہ مسلسل سر اوپر اٹھائے۔

''اللہ...... اللہ'' کر رہا تھا۔

''کیا چاہیے شہزادے میری جان بول کیا۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا لیکن وہ لہراتا ہوا زمین پر گر پڑا تھا۔ تب سے وہ یونہی غنودگی میں پڑا رہتا۔ ہوش میں ہوتا تو زینب بی بی اور حاجی صاحب کو بے گانہ نظروں سے دیکھتا۔ وہ زبردستی کچھ کھلاتے

پلاتے تو اس کی آنکھیں خون رنگ ہو جاتیں۔ جیسے اپنی بے خودی میں ان کی مخالفت گراں گزرتی ہو اور اب دو دن سے تو وہ مکمل غنودگی میں تھا۔ حاجی صاحب شہر کے سب ہی اچھے ڈاکٹروں کو باری باری دکھا چکے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ایک ڈاکٹر اسے دیکھ کر گیا تھا اور انجکشن لگانے کے باوجود جب اس کی غنودگی نہ ٹوٹی تو اسے اسپتال میں ایڈمٹ کروانے کا مشورہ دے کر چلا گیا تھا۔

''حاجی صاحب یہ دو گھونٹ آب زم زم پلائیں اسے۔'' زینب بی بی اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر آب زم زم لے آئی تھیں۔ حاجی صاحب نے آنکھیں پونچھ کر ان کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور زینب بی بی اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ آب زم زم حلق میں گیا تو شہزادے نے پھر آنکھیں کھول دیں اور بہت دیر تک حاجی صاحب اور زینب بی بی کو دیکھتا رہا، پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ زینب بی بی اس کی آنکھوں کے کونوں سے بہنے والے آنسو پونچھتی جاتی تھیں اور خود بھی روتی جاتی تھیں۔

''میرے بچے بتا تو سہی کیا روگ لگا لیا ہے تم نے، کیا کوئی ہے۔ ہے تو کون......! میں تیرے لیے اس کے سامنے جھولی پھیلا لوں گی۔ اس کے پاؤں پکڑ لوں گی، منت کروں گی۔ پر تم منہ سے بولو تو، میری جان...... نام تو لو۔'' شہزادے کی آنکھوں سے کرب جھلکنے لگا، ہونٹ کپکپائے اور اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کیا بتاتا وہ نام جو لہو میں گردش کرتا تھا۔ اب میں پس منظر میں چلا گیا تھا اور......

''آپ بھی تو کچھ نہیں بتاتے حاجی صاحب۔'' زینب بی بی اب حاجی صاحب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''آپ سے تو ضرور کچھ کہا ہوگا۔ اس نے اپنے دل کی بات۔ وہ جو ادھر ادھر گلی میں لوگ کرتے ہیں۔ آپ سے دوستوں کی طرح ہر بات کرتا تھا۔''

حاجی صاحب نے بے بسی سے انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ بھلا وہ کیا بتلاتے۔ کیا کہتے وہ خود بھی تو کچھ نہیں جانتے تھے۔ بس ایک بار، ایک بار اس نے کہا تھا۔ ''وہ شادی کرنا چاہتا ہے، کسی رنگ ساز کی بیٹی سے۔''

اور انہوں نے کہا تھا۔ ''ہم بھلا کیسے ایک رنگ ساز کی بیٹی کو بہو بنالیں، سب عزیز رشتہ دار انگلیاں اٹھائیں گے، ہم جدی پشتی اصلی کھرے سید اور......''

اس نے چپ سادھ لی۔ کبھی کچھ نہ کہا۔ کچھ کہتا ضد کرتا، لڑتا جھگڑتا تو وہ مان ہی جاتے۔ اکلوتا تھا، لاڈلا اور پیارا تھا، کیسے نہ مانتے۔ لیکن وہ تو ایسا فرماں بردار کہ پھر اس نے لب سی لیے تھے، نہ کوئی ضد، نہ کوئی اصرار۔ دوبارہ اپنی بات دہرائی تک نہیں، ایک بار پھر تو کہتا وہ...... لیکن اس نے تو پھر کبھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ اس گلی میں ہی کتنے رنگ ساز تھے۔ اس نے یہ تک نہ بتایا کون...... کس کی بیٹی اور انہوں نے سوچا تھا، اس عمر میں کبھی یوں ہی دل مچل جاتا ہے، ہاں یوں ہی، لیکن یہ صرف یوں ہی تو نہیں تھا۔ خود شہزادے کو بھی نہیں پتا تھا کہ یہ اس طرح ہوگا۔ ایسے وہ ایک نظر جو اس صبیح چہرے پر پڑی تھی۔ وہ عمر بھر کے لیے اسے اس چہرے کا اسیر کر دے گی۔ وہ گھور سیاہ آنکھیں اس کی نیندیں چرالیں گی۔ وہ چہرا لو دیتا، اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ وہ اس سے بچ کر کہاں جاتا۔

اس کے ذہن میں بس وہ ہی ایک نام گونجتا تھا۔ اسے کہیں قرار نہ تھا۔ وہ دیوانہ وار ادھر سے ادھر نیل گروں کی اس گلی میں چکراتا۔ مہنگا کی دکان پر آکر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ چہرہ۔ وہ نام اس کے خون میں گردش کرتا تھا۔ اس کے وجود میں گم ہو گیا تھا۔ کاش، وہ اس سے کہہ سکتا۔ اسے بتا سکتا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اسے چاہنے لگا ہے، اسے چاہتا ہے۔ لیکن وہ ناگواری اور ناپسندیدگی سے اسے دیکھتیں نظریں۔ کاش وہ اسے بتا سکتا کہ اس کی نظروں میں غلاظت نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک بے ارادہ نظر تھی۔ وہ بس اس ایک نظر کا قصور وار تھا اور یہ بے ارادہ نظر...... اس نے اسے اپنا کب رہنے دیا تھا۔

وہ راتوں کو جاگ جاگ کر سوچتا رہتا کہ کس کے ہمراہ اس کی طرف پیغام بھیجے۔ کون اسے جا کر بتائے کہ اسے اس سے عشق ہو گیا ہے۔ کوئی تو ہو جو اس کے دل کا حال اس تک پہنچا دے۔ اس خدیجہ باقر تک جس نے بے حد ناگواری سے اسے دیکھا تھا، لیکن وہ اس کی رگوں میں اس کے خون میں اس کی سانسوں میں رچ بس گئی تھی۔ وہ اسے اپنا رفیق سفر بنانا چاہتا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں شامل کر کے بتانا چاہتا تھا کہ اس ایک غیر ارادی نظر کے لیے وہ قصور وار ہے۔ اس کا کفارہ ادا کرنا ہے اور اس کا خراج وہ ساری زندگی ادا کرتا رہے گا۔

لیکن حاجی صاحب نے کہا۔ ''یہ بھلا کیسے؟''

اور اس نے لب سی لیے۔ ''ہاں بھلا کیسے۔'' وہ اسے بھلانے کی کوشش کرنے لگا، لیکن وہ اسے بھلانے پر قادر نہ تھا۔ اس نے رات کے اندھیروں میں دن کے اجالوں میں چلتے پھرتے ہر گھڑی خود سے کہا کہ اسے بھولنا ہے، لیکن وہ اسے نہیں بھلا پاتا تھا، نہ وہ ایک نظر جو اس بے بہا چہرے پر پڑی تھی اور نہ وہ ناگوار نظریں جو شہزادے کی طرف اٹھی تھیں۔

اس رات بھی وہ بے قرار ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، ابھی صرف نو ہی بجے تھے، لیکن چھوٹا شہر، دکانیں جلد بند ہو جاتی تھیں۔ البتہ عید اور رش کے دلوں میں مہنگا کی اور بٹنوں، لیسوں والی دکانیں دیر تک کھلی رہتی تھیں۔ لیکن اس روز مہنگا کی دکان بند تھی۔ وہ اس کی دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر سامنے سبز دروازے والے گھر کی بالکونی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ صبیح چہرہ، وہ گھور سیاہ آنکھیں...... وہ ان گھور سیاہ آنکھوں میں چھلکتی ناگواری۔ کیا میں...... میں شہزادہ عالمگیر ایسا ہوں کہ مجھے دیکھ کر کسی کی آنکھوں میں ناگواری چھا جائے، لیکن تھا...... ایسا تھا اس روز خدیجہ باقر کی آنکھوں میں ناگواری تھی، ناپسندیدگی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر ستاروں کی طرف دیکھا۔

''بتاؤ، کیا میں ایسا ہوں۔'' پھر چاند سے پوچھا۔ ''کیا میں...... کیا مجھے اللہ نے ایسا تخلیق نہیں کیا کہ مجھے چاہا جائے۔ پسند کیا جائے، مجھ سے محبت کی جائے۔''

اسے لگا جیسے چاند، ستارے، رات اور اس کی خاموشی سب یک زبان ہو کر کہہ رہے ہوں کہ وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہاں وہ نظر انداز کرنے والا تو نہیں تھا۔ وہ گھور سیاہ آنکھیں اسے دیکھیں ... دیکھیں اور پھر دیکھتی رہیں۔ ان میں پسندیدگی ہو، محبت ہو، اس سے شہزادے عالمگیر کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ بہت شدت سے پیدا ہوئی۔ وہ اسے دیکھے صرف اسے ہی دیکھے۔ ہاں وہ بھی تو اسے دیکھے، وہ گھور سیاہ آنکھیں، وہ دمکتی پیشانی دونوں خواہشیں ہی شدید تھیں۔ سامنے والی خالی بالکونی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

وہ بہت لاڈلا تھا۔ بہت نازک مزاج تھا، بچپن سے لے کر اب تک اس نے کوئی دکھ نہیں دیکھا۔ ابھی بات اس کے دل میں ہوتی تھی تو پوری ہو جاتی تھی۔ جانے کیسے حاجی صاحب اور زینب بی بی اس کے دل کی بات جان جاتے تھے۔ لیکن اب...... اب اس کا نازک دل تڑپ رہا تھا اور تڑپ کم نہیں ہوتی تھی۔ کسی طرح بھی کم نہیں ہوتی تھی۔ حاجی صاحب نے کیوں نہ جانی اس کی تڑپ۔ اس کے دل کی بے چینی...... کیوں نہ اس کی ایک بات سے یہ بھید پالیا کہ یہ صرف چند لفظ نہیں ہیں اس کے دل کی شدید ترین آرزو ہے۔ پر اس نے...... اس نے خود بھی تو اپنی بات دہرائی نہیں تھی۔ لیکن کیسے دہراتا۔ وہ ناگواری وہ ناپسندیدگی جو ان بیش بہا آنکھوں میں ہلکورے لیتی تھی۔ وہ اسے بات دہرانے سے روک دیتی۔

بس ایک بار وہ اسے دیکھے۔ ایسے کہ ان نظروں میں ناگواری نہ ہو...... تو پھر...... ہاں پھر وہ حاجی صاحب سے...... اور بھلا حاجی صاحب اس کی دوسری بار کی گئی بات کو رد کریں گے۔ نہیں نا...... لیکن...... وہ...... ہاں وہ اور وہ کوئی کھلونا تو نہیں تھی۔ جسے لینے کی وہ خواہش کرتا تو حاجی صاحب خرید کر اس کے سامنے رکھ دیتے وہ تو خدیجہ باقر تھی جس کی نظروں میں اس کے لیے ناپسندیدگی تھی۔ وہ رونے لگا، پہلے ہولے ہولے اور پھر تڑپ تڑپ کر۔

''کاش میں اس کی دہلیز کا ایک پتھر ہی ہوتا جو اس کے پاؤں سے لپٹ سکتا۔ خوشبو ہوتا جو اس کے وجود سے لپٹ جاتا، آنسو ہوتا جو اس کی سیاہ آنکھوں کی جھیلوں میں چمکتا اور پھر اس کی لانبی پلکوں پر کپکپا کر اس کے رخساروں پر ڈھلک آتا۔ ان رخساروں کی نرمی محسوس کرتا۔ ہاں میں کچھ ہوتا، کچھ تو ہوتا۔ مٹی کا باریک ذرہ ہی سہی جو اس کے پاؤں کے تلوؤں سے چمٹتا اس کے بالوں کی سیاہی میں کہیں، کھو جاتا، ہاں کچھ ہوتا...... کچھ ہوتا پر شہزادہ عالمگیر نہ ہوتا۔ ناپسندیدہ ناقبول......

اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ وہ تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔ اس کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔ اب برداشت نہیں ہوتا تھا۔ بس وہ دکھ جائے۔ نظر آجائے، نہیں تو شاید وہ یوں ہی مہنگا کی دکان کے تھڑے پر بیٹھا تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔

☆☆☆

وہ رو رہا تھا، بلک رہا تھا۔ جب وہ گلی میں داخل ہوئے تھے۔ وہ دو تھے، سفید فراک نما لبادے، سرخ رومی ٹوپیاں پہنے وہ اس کے پاس آ کر رک گئے تھے۔ لیکن وہ جیسے ان کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی شدت سے رو رہا تھا اور اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر بالکونی تک جاتیں۔ آسمان کی طرف اٹھتیں اور پھر سبز جیفری اور بوگن ویلیا کی بیلوں میں اٹک اٹک جاتیں۔ وہ کچھ دیر یوں ہی اسے دیکھتے رہے، پھر ایک نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کیوں روتے ہو، کسے کھو بیٹھے ہو۔'' وہ کھونے کو تو نہیں روتا تھا، پانے کے لیے تڑپتا تھا۔ اس نے تو پایا ہی نہیں تھا، پھر کھونا کیسا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ وہ اپنے آنسو روک لے، لیکن وہ روک نہیں پا رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

''عشق کی آگ کو آنسوؤں سے بجھاتا ہے۔'' دوسرے کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''پر یہ آگ آنسوؤں سے بجھنے والی نہیں۔ آنسو تو اسے اور بھڑکاتے ہیں صاحبزادے۔''

''عشق'' اس نے اب کے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا اور جیسے پہلی بار دیکھا۔ وہ اس شہر کے تو نہیں تھے اور پھر ان کا لباس، گلی میں جلنے والے بلبوں کی مدھم روشنی میں وہ عجیب سے لگ رہے تھے۔ پر وہ جو کوئی بھی تھے، شاید صحیح کہہ رہے تھے۔ یہ عشق ہی تھا، صرف محبت نہیں تھی، چاہت نہیں تھی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ تھا۔ ہاں یہ عشق ہی تھا...... یہ آگ...... وہ جتنا اسے بجھانے کی کوشش کرتا اور بھڑکتی تھی۔ یہ شاید کوئی درویش تھے۔ کوئی ولی تھے جو اس کی دل جوئی کے لیے اس طرف آنکلے تھے۔ وہ جو اللہ سے تڑپ تڑپ کر دعا کر رہا تھا، شاید اللہ نے انہیں بھیجا تھا، ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے ملتجی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''حضرات میرے لیے دعا کریں، کہ...... کہ وہ......'' اور اسے لگا جیسے اس کی زبان بند ہو گئی ہو۔ لفظ اندر ہی کہیں چکرا کر گم ہو گئے ہوں۔ کیا کہے وہ ان سے کہ وہ نظریں جو اس کی طرف ناپسندیدگی سے اٹھی تھیں وہ...... اس نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔

''تم...... اور تمہارا عشق۔'' پہلے نے اس کے کندھے سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ ''محض دھوکا، فریب، کیا ہے اس عشق میں...... پہلے آرزو...... پھر دید...... دید ہی دید اور پھر وصل...... اور پھر سب ختم، سارا فریب، سارا دھوکا، چمکتی دمکتی ریت کا سراب عشق کرتا ہے تو اس سے کر...... اس سے جو حقیقت ہے دھوکا نہیں ہے، فریب نہیں ہے۔''

''کس سے......'' اور بھلا عشق بھی اپنی مرضی سے ہوتا ہے۔ منتخب کر کے یہ تو ہو جاتا ہے، تو بس ہو جاتا ہے، جس سے بھی ہو جائے ہاں جس سے بھی ہو جائے۔ اس کی سوالیہ نظریں اجنبی درویشوں کی طرف اٹھی تھیں۔

''عشق کرتا ہے نہ تو چل ہمارے ساتھ، چل

تجھے عشق صادق کے اسرار و رموز سکھاتے ہیں۔ ایسے عشق کا کیا فائدہ، یارم جس میں پچھتاوا ہی پچھتاوا ہو۔ طلب صادق پیدا کر نوجوان، عشق صادق کی کھوج کر۔" بات مکمل کر کے اس نے قدم آگے بڑھایا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا، جیسے انہوں نے ہپناٹائز کر دیا ہو یا جیسے وہ کوئی عامل ہوں اور وہ ان کا معمول۔

وہ کون ہے، کہاں سے آئے تھے اور کدھر جا رہے تھے یہ جانے بغیر وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے چلتا وہ غربی محلے کے ایک مکان میں داخل ہوا تھا۔ ڈیوڑھی اور پھر صحن سے گزر کر وہ ایک بڑے ہال نما کمرے میں آئے تھے۔ اندر کمرے میں فرشی نشست تھی اور ایک شخص دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ویسا ہی سفید فراک نما لبادہ پہنے اس کے ہاتھوں میں ایک موٹی سی کتاب تھی، کتاب سے نظریں ہٹا کر اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"مریض عشق ہے، نیا نیا عشق کا روگ لگا ہے۔ ابھی اس کا دل خام ہے۔ عشق کی گرمیاں اس کی برداشت سے باہر ہیں۔" ایک نے بتایا تو زمین پر بیٹھے ہوئے شخص نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

وہ جیسے محظوظ ہوا تھا، گنگناتے ہوئے اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اس کم عمری میں کہاں ٹھوکر کھا بیٹھا ہے۔ ہمارے پاس تمہارے درد کا درماں تو نہ ہوگا، پر بول تو، دل پر رکھا بوجھ ہلکا ہوگا۔ اور وہ جس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ حتیٰ کہ مہنگا کو بھی نہیں۔ مہنگا کا خیال تھا کہ وہ کسی کو دل دے بیٹھا ہے، اس نے نہ تائید کی تھی نہ تردید۔ اس نے نگاہیں جھکائے سب کچھ کہہ دیا۔

"بس ایک نظر کا قصوروار ہوں سر۔ اس ایک نظر نے دل کی دنیا اتھل پتھل کر ڈالی ہے۔ بچپن میں اس خدیجہ باقر کو اس نے کئی بار دیکھا تھا۔ شاید کبھی ساتھ مل کر کھیلے بھی ہوں گے، لیکن یہ ایک نظر اس ایک نظر نے برباد کر ڈالا تھا۔ تینوں نے خاموشی سے اس کی بات سنی تھی، کوئی لمبی چوڑی داستان تو تھی نہیں، چند جملوں میں بات ختم ہوگئی تھی۔

وہ تینوں صوفی ازم کے پیروکار تھے۔ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا شخص پروفیسر خاور تھا جو لاہور کی ایک پرائیویٹ یونی ورسٹی میں پڑھاتا تھا، ان دونوں میں سے ایک کا تعلق ترکی سے اور ایک کا ہندوستان سے تھا، دونوں ترکی کے کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ پروفیسر خاور کی ان سے ملاقات قونیہ میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ روم کی سیاحت کے لیے گئے تھے اور اب وہ دونوں ان کی دعوت پر پاکستان آئے تھے اور یہاں پروفیسر خاور کے ساتھ مل کر صوفی ازم کا پرچار کر رہے تھے۔ پروفیسر خاور یہاں اپنا آبائی مکان فروخت کرنے آئے تھے اور وہ دونوں بھی ان کے ساتھ تھے کہ انہیں نئے نئے شہر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

"تو......" پروفیسر خاور نے ہاتھ میں پکڑی کتاب نیچے رکھ دی تھی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ "سید زادے کو نیل گروں کی بیٹی سے عشق ہو گیا ہے۔ بہت خوب۔ اب کیا اسی عشق میں عمر گھلا دے گا۔ سنبھل جا، لڑکے۔" شہزادے نے بے بسی سے انہیں دیکھا اور سر جھکا لیا۔ پتا نہیں یہ عشق تھا، چاہت تھی، طلب تھی جو بھی تھا بس تھا اور شہزادے کے دل کو چیرتا تھا، تڑپاتا تھا۔

"عشق ہی کرنا تھا تو اس سے عشق کیا ہوتا۔ اس کے عشق میں کھلا ہوتا تو...... عشق کر، پر سچا عشق، ان جھوٹے عشقوں میں کیا رکھا ہے باؤ نورے۔" یہ احمد یار تھا، ہندوستان کے کسی شہر سے تعلق رکھنے والا۔ "ایسا عشق جیسا امیر خسرو نے نظام الدین اولیا سے کیا، تو بھی اس سے لو لگا، یہ کیا کہ مٹی کی مورتوں کے لیے نیر بہاتا ہے۔"

"کس سے۔" شہزادے کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"اس سے۔" سعد البرقی نے اوپر انگلی اٹھائی

اور پھر یک دم کھڑے ہو کر دائیں پاؤں کی ایڑی زمین پر ماری، پھر دونوں بازو فضا میں پھیلا کر گھومنے لگا۔ اس کے لبوں پر کوئی نغمہ بھی تھا، لیکن زبان شہزادے کے لیے نافہم تھی۔ شاید ترکی زبان یا پھر...... یا پھر پتا نہیں کون سی، لیکن لے میں ترنم بھی تھا اور سوز بھی۔ آہستہ آہستہ اس کے رقص میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد احمد یار بھی اٹھ کر سعد البرقی کی طرح دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے رقص کرنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ رقص کرتے کرتے وہ نڈھال ہو کر گر گئے تھے۔ اس سارے عرصے میں شہزادہ دم بخود سا انہیں دیکھتا رہا تھا۔ وہ اتنی دیر کے لیے خدیجہ باقر کو بھی بھول گیا تھا اور اپنی بے کلی بھی۔

"اس رقص میں بہت سکون ہے۔ دل کی کثافتیں دھل جاتی ہیں۔" پروفیسر خاور ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔ وہ بہت توجہ سے ان کی باتیں سنتا رہا، پھر پروفیسر خاور سب کے لیے قہوہ لے آئے۔

"یہ طلب صادق کیا ہے۔ سچا عشق کیا ہے۔ کیسے ہوتا ہے۔" شہزادے کے ذہن میں ہزاروں سوال تھے۔ وہ سوال پر سوال کرتا رہا۔ پروفیسر خاور اور سعد البرقی اس کے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ رات بیت گئی۔ صبح ہوگئی۔ لیکن وہ واپس نہ گیا۔ ان ہی کے ساتھ رہنے لگا۔ ان کی باتیں اسے حیران کرتیں، وہ اپنی خوب صورت آنکھیں پھیلائے انہیں سنتا رہتا۔ سوال کرتا رہتا۔

"اصل اور سچا عشق تو بس وہی ہے اسی سے عشق کرو، اسی سے محبت کرو تو اسی سے۔ باقی سب دھوکا ہے، فریب ہے۔" سعید البرقی کہتا۔ "پہلے آرزو، پھر دید کی خواہش اور پھر پیاس ہی پیاس، اس پیاس میں بڑی لذت ہے، شہزادے عشق میں وصل نہیں ہے، ہجر لامتناہی ہجر، تڑپ ہی تڑپ، اس ہجر میں بڑی لذت ہے شہزادے۔"

☆☆☆

اسے لگتا جیسے وہ کسی نئے جذبے سے روشناس ہو رہا ہو۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو رہا تھا، جس کے متعلق اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ نماز تو باقاعدگی سے پڑھتا تھا، لیکن سجدوں میں لذت کہاں تھی، جس کا ذکر سعد البرقی کرتا تھا۔ اس نے مجاز سے حقیقت کی وادی میں قدم رکھ دیا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچنے لگا تھا، جتنا سوچتا، اتنا ہی اسے مزید جاننے کی خواہش اکساتی۔ لیکن وہ پہلے ہی قدم پر رک گیا تھا۔ دید تو کجا ابھی تو وہ آرزو کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس کے متعلق سوچتا تو پھر سوچتا ہی چلا جاتا۔ ایسے میں وہ خدیجہ باقر کو بھول جاتا اور کبھی ہر خواہش پر خدیجہ باقر کی دید کی آرزو غالب آجاتی، وہ اپنے مرکز سے ہٹ گیا تھا۔ بے سمت ہو گیا تھا۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ گھر میں اس کے چاہنے والی ماں ہے، جاں نثار کرنے والا باپ ہے جو اس کے اس طرح چلے جانے سے بے قرار ہوں گے۔ تڑپ رہے ہوں گے۔ وہ تو جیسے خود کو بھی بھولتا جا رہا تھا، اسے بھی سعد البرقی اور احمد یار کی طرح اس رقص میں سکون ملنے لگا تھا۔ پروفیسر خاور نے اپنا کام نپٹا کر رخت سفر باندھا تو وہ بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھا۔

"یہ بہت کٹھن راستہ ہے شہزادے، واپس پلٹ جا، تیرے ماں، باپ تیری راہ تکتے ہوں گے۔" پروفیسر خاور کو آج اس کے ماں، باپ کا خیال آیا تھا۔ لیکن شہزادہ تو اس پتھریلے راستے پر قدم رکھ چکا تھا۔ بغیر کسی خواہش اور چاہ کے اس نے ایسا تو نہیں چاہا تھا، لیکن ایسا ہو گیا تھا، وہ اس ان دیکھے خالق کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا، جو اس کائنات کا خالق تھا اور اس کے دل میں پیدا ہونے والے ہر جذبے کا بھی وہی خالق تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ سعد البرقی نے کیا فسوں پھونکا تھا کہ خدیجہ باقر کی چاہ پر کسی اور کو جاننے کی چاہ غالب آگئی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا اور جان نہیں پاتا تھا، وہ دیواروں سے سر ٹکراتا، زمین پر ٹکریں مارتا، اسے پکارتا تو کہیں سے خدیجہ باقر جھانکنے لگتی، آنکھوں میں ناگواری لیے،

سکون کہیں نہیں تھا۔ سکون کہاں ملے گا۔

''سکون صرف اس میں ہے۔'' سعد البرقی اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو جاتا اور پھر زمین ان کے قدموں کی دھمک سے لرزنے لگتی، یہاں تک کہ وہ بے دم ہو کر گر جاتے۔

☆☆☆

نہ جانے اسے ان کے ساتھ رہتے کتنا عرصہ ہو گیا تھا۔ اسے شب و روز کا احساس نہیں تھا۔ احمد یار اور سعد البرقی واپس ترکی چلے گئے تھے۔ وہ پروفیسر خاور کے ساتھ رہ رہا تھا۔ پروفیسر خاور کے پاس آنے والے صوفی ازم کی حمایت میں کبھی لمبی تقریریں کرتے تھے، لیکن ان میں کوئی بھی سعد البرقی جیسا نہیں تھا، کبھی کبھی اس کا دل اچاٹ ہو جاتا، پھر ایک روز پروفیسر خاور نے ایک اخبار اس کے سامنے رکھا۔ جس میں اس کی تصویر کے ساتھ حاجی صاحب کی درخواست تھی۔ جس نے اسے دیکھا ہو...... خبر ہو تو...... ایسے اشتہار ہر اخبار میں ہر ہفتے حاجی صاحب چھپواتے تھے۔

''تمہارے والدین تمہارے لیے دکھی ہیں۔ پریشان ہیں۔ شہزادے واپس چلے جاؤ۔ اس کی رضا چاہتے ہو تو والدین کو دکھ مت دو۔ اسے پسند نہیں ہے کہ اولاد، والدین کو تکلیف پہنچائے۔''

اور چھ ماہ بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے بدن پر بھی وہی لباس تھا۔ وہی سفید لمبا فراک نما لبادہ، وہ گلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ شور مچ گیا۔ شہزادہ آ گیا۔ گلی میں سب اکٹھے ہو گئے۔ مہنگا، گلو بادشاہ، ہادی لیس والا سب اونچا اونچا بول رہے تھے اور وہ سب کو خاموش کھڑا تکتا تھا۔ اس کی بے بہا آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے تھے۔ وہ سب کچھ پوچھ رہے تھے۔ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کہاں چلا گیا تھا اور یہ اس نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے، لیکن وہ کچھ نہیں سن رہا تھا، اس کی نظریں تو بھٹک بھٹک کر سبز دروازے والے مکان کی بالکونی پر ٹھہر جاتی تھیں۔ وہ دو آرزوؤں کے درمیان کچلا جا رہا تھا، کبھی ایک آرزو غالب آ جاتی تھی، کبھی دوسری، پھر جیسے وہاں ٹکڑے ٹکڑے پچھلے چھ ماہ کی بے کل کر دینے والی آرزو کہیں چھپ گئی تھی اور ایک ہی آرزو دل و دماغ کو بے بس کرنے لگی۔ اسے دیکھنے کی آرزو ان گھور سیاہ آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنے کی چاہ۔

''شہزادے۔'' مہنگا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا، اس کی آواز بھیگ رہی تھی اور وہ مہنگا کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ روتا رہا، یہاں تک کہ حاجی صاحب کو اس کے آنے کی خبر ہوئی اور وہ اسے گھر لے آئے تھے۔ اور...... آنسو اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

''شہزادے رحم کر خود پر، ہم پر۔ میرے بچے تمہاری یہ حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔'' زینب بی بی کی آواز میں ہزاروں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''اماں، بابا۔'' اس نے پھر آنکھیں کھولیں، پانیوں سے بھری آنکھوں میں بے بسی تھی۔ ''بابا! میرے لیے دعا کریں۔ مجھے سکون نہیں ملتا۔''

''ہمارا تو ہر موئے تن تمہارے لیے دعا کرتا ہے جان پدر۔'' حاجی صاحب نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ زینب بی بی نے تڑپ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور جھک کر اس کی پیشانی پر بوسے دیے جاتی تھیں۔ اگر سکون بازار سے ملتا تو وہ خرید کر لے آتے اپنی جان کی قیمت دے کر بھی، لیکن یہ جنس قابل خرید نہ تھی۔

''یہ سکون کہاں سے ملے گا۔ کیسے ملے گا شہزادے۔'' ان کی سوالیہ نظریں شہزادے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''سکون تو کہیں نہیں تھا۔ کیا کہیں تھا، نہیں نا، اور سعید البرقی کہتا تھا۔ آرزو...... پھر دید...... پھر پیاس ہی پیاس...... ہجر ہی ہجر...... اس راہ میں وصل نہیں۔ بس فنا اور فنا کے بعد بھی صرف پیاس ہی پیاس اور سکون تو وصال میں ہے اور وصال......''

اور وہ دوسرا عشق جس میں پہلے آرزو...... پھر دید...... اور دید کے بعد وصال اور پھر سب ختم، پر

کیسے ختم اور کیسے ختم ہو سکتا ہے، سب کیا وہ کبھی خدیجہ باقر کی دید سے سیراب ہو سکتا ہے۔ کیا کبھی وہ...... اور خدیجہ باقر...... باقر رنگ ساز کی دوسرے نمبر والی بیٹی کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا، ناگواری سے اسے دیکھتی سبز دروازے کو دھکیل کر تیزی سے اندر جاتی۔ اور کوئی اس کے اندر زور سے ہنسا تھا۔ اس کی ڈور کٹ گئی پر...... وہ ادھر بھی لٹکتا تھا اور ادھر بھی......

''اللہ۔'' اس کے لبوں سے نکلا۔ ''ربا'' اس کی آواز پہلے سے زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ وہ ٹھٹکا۔

''سچا عشق تو وہی ہے۔ عشق صادق بس وہی ہے۔ باقی سب کھیل تماشا۔'' سعد البرقی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔ پھر یہ کیا ہے جو سینے کو برماتا ہے۔ جسے دیکھنے اور پانے کی طلب تڑپاتی ہے۔

''ربا۔'' وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگا۔ مچلنے لگا اور حاجی صاحب اسے سنبھالتے سنبھالتے نڈھال ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس نے آنکھیں موند لیں...... اور تکیے پر سر ڈال دیا، اس کا سانس تیز تیز چلتا تھا اور بند آنکھوں سے آنسو بہے جاتے تھے۔

☆☆☆

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

پروفیسر حامد نصیر آج میر کو پڑھا رہے تھے۔ خدیجہ نہ جانے کن سوچوں میں گم فائل کھولے اس پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ پروفیسر حامد کیا کہہ رہے تھے، اس نے سنا نہیں تھا۔ اس نے سر جھٹک کر ان کا لیکچر سننے کی کوشش کی۔

''تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں''

پروفیسر حامد نے خدیجہ کی طرف دیکھا تو خدیجہ نے یک دم سر اٹھایا۔

''لیکن سر وہ عشق جو ادب آداب سے بے نیاز ہو جائے، کیا وہ عشق نہیں ہوتا۔'' اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں کچھ تھا یا پروفیسر حامد نصیر کو محسوس ہوئی تھی۔

''عشق جب اپنی حد سے نکل کر جنون کی سرحد میں داخل ہو جائے تو وہ ادب آداب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

''لیکن عشق تو بذات خود جنون ہے، آپ نے ہی تو کہا تھا۔'' خدیجہ پتا نہیں کیوں آج بحث کر رہی تھی۔ ورنہ تو سر جھکائے سنتی رہتی تھی یا ضروری پوائنٹس نوٹ کرتی رہتی تھی۔ پتا نہیں وہ کسے مطمئن کرنا چاہتی تھی اور کسے دلیلیں دے رہی تھی۔

''ہاں...... لیکن عشق اور جنون کی بھی تو منزلیں ہوتی ہیں خدیجہ...... بے خودی بھی تو عشق کی ایک منزل ہے۔ جہاں کبھی میں تو اور تو میں ہو جاتا ہے اور کبھی ادب و آداب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔'' پروفیسر حامد کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''اور ایسے میں حسین ابن منصور کے لبوں سے ''انا الحق'' نکلتا ہے تو کیا اس کا عشق مشکوک ہو گیا۔ نہیں خدیجہ عاشق اپنی بے خودی کے لیے قصوروار نہیں ہے۔''

''کیوں قصوروار نہیں ہے سر، اسے تو اپنے عشق کو حدود و قیود میں رکھنا چاہیے، جیسا کہ میر کہتا ہے۔''

''ہاں، لیکن میں عاشق کو اس کی بے خودی کے لیے قصوروار نہیں سمجھتا۔''

''سمجھنے سے کیا ہوتا ہے سر، لوگ تو سنگسار کر دیتے ہیں نا۔ جیسا کہ حسین بن منصور کو کر دیا تھا۔''

پروفیسر حامد جیسے لاجواب ہو گئے تھے، لیکن اس نے سوچا۔ ''ہاں بھلا اس کا کیا قصور، میں بھی بس یوں ہی...... یوں ہی۔''

وہ پھر کاپی پر آڑھی ترچھی لکیریں لگانے لگی تھی۔ پروفیسر حامد نے کیا پڑھایا، اس نے سنا ہی نہیں، وہ سن ہی نہیں سکی، وہ تو بس ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔ وہ اپنی بے خودی کے لیے قصوروار نہیں تھا، تو پھر اسے کیوں غصہ آتا تھا۔ اس پر کیوں غصہ کرتی تھی وہ اس پر۔ لیکچر ختم ہو گیا پروفیسر حامد نے روسٹرم سے اپنی کتاب اٹھائی اور خدیجہ جو دروازے کے بالکل پاس والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کے پاس لحہ بھر کو رکے۔

''تمہارے دیوانے کا کیا حال ہے خدیجہ، پھر

کبھی تم نے ذکر نہیں کیا اس کا۔"

"تمہارا دیوانہ...... تمہارا دیوانہ۔" خدیجہ نے پروفیسر حامد کی پوری بات سنی ہی نہ تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں پہلے بے ترتیب ہوئیں، پھر دل اس زور سے دھڑکا جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آجائے گا۔ اندر شور بپا تھا۔ "تمہارا دیوانہ، تمہارا دیوانہ" اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ پروفیسر حامد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"خدیجہ میں نے پوچھا ہے وہ جو تم نے اپنی گلی کے شہزادے کا ذکر کیا تھا اس کا کیا حال ہے، کیا اب بھی وہ اس طرح گلی کے بیچوں بیچ رقص کرتا ہے۔"

اب کے انہوں نے نئے لفظ منتخب کیے تھے۔

"پتا نہیں سر۔" خدیجہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"اتنی بے خبری اچھی نہیں ہوتی خدیجہ، خبر رکھا کرو۔"

"وہ اب گلی میں نہیں آتا سر...... پتا نہیں بیمار ہے یا پھر کہیں چلا گیا ہے یا پھر......"

"میں نے کہا تھا نا ایک راہ...... کوئی ایک راہ...... جب وہ کسی ایک کا ہو جائے گا تو تماشا ختم۔"

"تو کیا وہ......" اس نے پروفیسر حامد کی طرف دیکھا۔ پروفیسر حامد کی نظریں کچھ دیر خدیجہ کے چہرے پر ٹھہریں۔ کچھ تو تھا...... کچھ تو خاص تھا جو پروفیسر حامد...... اور انہوں نے فوراً ہی خدیجہ کے چہرے سے نظریں ہٹالیں کہ وہ عشق میں بھی قرینے اور ادب کے قائل تھے۔ وہ کتابیں اٹھائے تیزی سے باہر نکل گئے، لیکن خدیجہ وہاں ہی فائل پر نگاہیں جمائے بیٹھی سوچتی رہتی کہ کیا کوئی ایک راہ...... پر کون سی......

☆☆☆

شہزادہ آج مہینوں بعد گھر سے نکل کر مہنگا کی دکان کے تھڑے پر بیٹھا تھا۔ اس کی رنگت میں زردیاں گھلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور جسم بے حد لاغر ہو رہا تھا۔ یہ وہ شہزادہ تو نہیں تھا، جو گھر سے نکلتا تو زینب بی بی نظر کی دعا پڑھ پڑھ کر پھونکا کرتی تھیں، یہ تو برسوں کا مریض لگتا تھا، لیکن اس کی سوچی ہوئی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور اس کی نظریں سبز دروازے والے مکان کی بالکونی پر ٹھہری ہوئی تھیں جہاں بوگن ویلیا کے پتوں اور پھولوں کو اپنی انگلیوں سے آگے پیچھے کرتی خدیجہ باقر کی بے قرار نظریں اس کی آنکھوں سے چار ہوئی تھیں۔ بس چند لمحوں کا کھیل تھا شہزادے عالمگیر کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ وہ جو دیکھنا چاہتا تھا، اس نے دیکھ لیا، جو چاہا تھا، پالیا تھا۔

"اور آسودگی موت ہے، بس تڑپ، تڑپ میں ہی زندگی ہے۔" سعد البرقی کہتا تھا۔ شہزادے عالمگیر کے لبوں پر بکھری آسودہ سی مسکراہٹ کو خدیجہ باقر نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرے سکون کو بھی اس نے دیکھا تھا۔ وہ مضطرب نہیں تھا، بے چین نہیں تھا، تو کیا اس نے حقیقت میں کوئی ایک راستہ اختیار کرلیا تھا۔ اس نے بھی تو دعا کی تھی دل کی گہرائیوں سے کہ وہ ان بھول بھلیوں سے نکل آئے، کوئی ایک راستہ مل جائے اسے۔ کسی ایک کا ہو جائے تو کیا وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ اسے تو اب مطمئن ہو جانا چاہیے تھا، لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ بے قرار تھی، جب بے قراری بڑھتی تو وہ بے چین ہو کر بالکونی میں آ کھڑی ہوتی، لیکن وہ نظر نہیں آتا تھا۔ پتا نہیں کہاں تھا، کس سے پوچھتی، کیا پھر کہیں چلا گیا تھا۔

اور پروفیسر حامد کی نظریں اسے کھوجتیں۔ کیا تھا جو اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں کروٹیں لیتا تھا۔ کوئی درد، کوئی گہرا درد اندر ہی اندر دل کو چھیدتا ہوا، پھر انہیں پتا چلا کہ وہ کالج چھوڑ کر جارہی ہے، تو انہوں نے پوچھ لیا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم کالج چھوڑ رہی ہو۔"

"جی......" اس نے نگاہیں جھکا رکھی تھیں۔

"لیکن کیوں خدیجہ۔" وہ بے چین ہوئے تھے۔ "ایگزیم میں صرف چند ماہ ہی تو رہ گئے ہیں۔ کم از کم اپنا بی اے تو مکمل کرلو۔"

"وہ دراصل......" وہ ذرا سا جھجکی تھی۔

"ابا نے اچانک ہی میری شادی طے کردی ہے۔"

"تو کیا تم اس لیے اتنے دنوں سے پریشان ہو، کیا وہاں شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ پسند نہیں ہے وہ تمہیں۔"

نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہے، ابا نے بہتر ہی سوچا ہوگا میرے لیے۔ ابا کے بہت اچھے دوست ہیں وہاں دبئی میں ہی ان کی فیملی رہتی ہے اور ابا نے وہاں ہی رشتہ طے کردیا تھا میرا۔" خدیجہ نے جھکی نظریں نہ اٹھائیں۔ "بس اپنی پڑھائی ادھوری رہ جانے کا دکھ ہے سر۔" پروفیسر حامد نے دل پر ہاتھ رکھا، انہیں لگا جیسے ان کا اپنا دل کسی تیز دھار آلے کی زد میں آگیا ہو۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر خود کو کمپوز کیا۔

"اور پڑھائی تو تم شادی کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہو۔ صرف چند ماہ کی بات ہے۔"

"جی سر...... لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ ہی دبئی لے جائیں گے۔"

"اوہ...... پھر تو...... بہرحال وش یو گڈ لک۔"

"تھینک یو سر! اگر کبھی کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کردیجیے گا۔"

"ارے نہیں۔" پروفیسر حامد کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "تم تو ہمیشہ اچھی اسٹوڈنٹ رہی ہو۔ بہت اوبیڈینٹ (تابعدار) سب اساتذہ کی ریسپکٹ (عزت) کرنے والی۔

"تو کیا کل سے تم نہیں آؤ گی۔"

"نہیں سر۔" خدیجہ باقر نے ان کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھی۔ "کل ابا آجائیں گے اور اسی ہفتے میرا نکاح ہے۔" پروفیسر حامد کے دل پر جیسے پھر کسی نے ہاتھ مارا تھا۔

"خوش رہو۔" انہوں نے رخ موڑا۔ "اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے مڑے۔ "وہ تمہارا شہزادہ عالمگیر...... وہ دو کشتیوں کا مسافر، میں نے تو سوچا تھا کسی روز تمہارے طفیل اس سے ملاقات کروں گا۔ کیسا ہے اب وہ......"

"سر وہ تو...... وہ تو اب کہیں نہیں دکھتا، شاید کہیں چلا گیا ہے یا پھر شاید کسی ایک راہ پر قدم رکھ دیا ہے اور دوراہوں کی بھول بھلیوں سے نکل گیا ہو کہ جب آخری بار میں نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر بہت سکون تھا۔ وہ پہلے کی طرح مضطرب نہیں لگتا تھا۔"

"اوہ تو تماشا ختم ہو گیا۔" پروفیسر حامد کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انہوں نے خدیجہ باقر پر ایک بھرپور نظر ڈالی، جیسے عمر بھر کے لیے آنکھوں میں سمو لینا چاہتے ہوں۔ پھر یک دم اسٹاف روم کی طرف بڑھ گئے۔

اور تماشا واقعی ختم ہو گیا تھا، جس روز خدیجہ کی ڈولی اٹھی اسی شام اس کا جنازہ بھی اٹھا تھا۔ نیل گروں کی گلی کی دوپہر وہاں خدیجہ کی بارات کھانا کھا رہی تھی، رات وہاں شہزادہ عالمگیر کی موت کا کھانا کھایا جارہا تھا۔

ہاں تماشا ختم ہو گیا تھا، اب پتا نہیں اس نے کوئی ایک راہ پکڑ لی تھی یا ان ہی بھول بھلیوں میں فنا ہو گیا تھا اور اگر کوئی ایک راہ مل گئی تھی اسے تو وہ کس راہ کا مسافر بنا تھا۔ خدیجہ سالوں بعد بھی سوچتی ہے۔ "پتا نہیں کس راہ کا...... کاش...... اے کاش!" اور وہ دبئی کے لگژری ولا میں بے چین ہو کر ادھر سے ادھر چکراتی پھرتی ہے۔ ایک کسک سی دل سے اٹھ کر پورے وجود میں پھیل جاتی ہے۔ پھر ایک گمان سا یقین جیسا گمان کچھ دیر کے لیے اسے آسودہ کردیتا ہے۔ لیکن پھر وہی کسک، وہی بے چینی اسے گھیر لیتی ہے۔ پتا نہیں...... پتا نہیں وہ کس راہ کا مسافر بن کر راکھ ہوا۔ کاش...... اے کاش!"

☆☆

ماریہ یاسر

مغرب ہوتے ہی آسمان کی وسعتوں میں پرندے غول کی صورت اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے لگے وہ بان کی چارپائی بڑے سے کچے صحن میں بچھائے انہی غولوں میں ذہن الجھائے لیٹی تھی۔ جب فرید اسے پکارتا ہوا چلا آیا۔

''سلام بھا۔'' اگلے ہی پل سر پہ ٹکے دوپٹے کو دوبارہ سے ٹھیک کرتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرے سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے تو میرے لیے چا بنالا۔'' فرید اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گیا جب وہ آنکھوں کی اداسی دل میں اتارتے ہوئے نئے سرے سے کاموں میں جت گئی۔

''بات سن نیلم!'' چائے چھوٹی سی تپائی پر رکھ کے مڑنے ہی لگی تھی جب دوبارہ سے پکارا گیا۔

''جی بھا' دل میں بسی اداسی بغیر ظاہر کیے اس نے خوش دلی سے اپنے سے بارہ سال بڑے اور اکلوتے بھائی کو جواب دیا۔ اس کا بھائی اس کا ''ویر'' اس گھر کا سربراہ اس کے لیے تو وہ جان بھی قربان کرنے کو تیار تھی۔

''تو آج صوبیہ کو اپنے پاس سلا لے۔ میرے سر میں بڑا درد ہے اور رانی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ایسے ہی فضول میں رانی کو تنگ کرتی رہے گی رات کو۔ ساری رات روتی رہتی ہے تو سنبھال لے آج اس کو۔'' فرید نے اپنی دو سالہ بیٹی کی طرف اشارہ کرتے کہا تو وہ لبیک کہتے ہوئے صوبیہ کو گود میں اٹھانے لگی۔ پاس کی چارپائی پہ لیٹی رانی سے نظریں چراتی وہ صوبیہ کو لیے باہر آگئی۔

''دیکھ فرید تو اب اس کا کچھ بندوبست کرلے' میں بول دیتی ہوں تجھے' فیر نہ کہنا جب میں تیرے سے ناراض ہو کے اپنی بے بے کے گھر چلی گئی تو۔'' وہ نیلم کے نکلتے ہی فرید کے سر ہو گئی۔

''کرتا ہوں کچھ' تو تھوڑا دھیرج رکھ۔ اتنی اتاولی نہ ہو جایا کر۔'' فرید کو بیوی کی جلد بازی پر غصہ آیا۔

''میں اتاولی ہو رہی ہوں' چل ہٹ کتنا ویلا ہو گیا ہے صفدر کے رشتے کو آئے' کئی وار (بار) تو اس کی ماں آ کے رولا ڈال چکی کہ جو اور جتنا لکھوالیا' اس کو لکھ کے دیں گے فر تو اور تیری وہ شہزادی اتنا ویلا کیوں لگا رہے ہو۔'' ان کو جواب دینے میں؟ میں پوچھتی ہوں کہ تم دونوں کو آخر انتظار کس چیز کا ہے۔'' رانی کا بس نہ چل رہا تھا کہ ہتھیلی پر ہی سرسوں اگا ڈالے۔

''دیکھ رانی دل گھبراتا ہے جب صفدر اور نیلم کے حوالے سے سوچتا ہوں۔'' اس نے ہتھیلیاں آپس میں مسلی تھیں۔

''ہاں اس میں گھبرانے کی کیا گل (بات) اے۔ ایک ٹانگ سے معذور ہی تے ہے' یہ اتنی وڈی (بڑی) گل تے نئیں کہ تو پریشان ہو رہا ہے۔'' اس نے فرید کی پریشانی کو چٹکیوں میں اڑا کے رکھ دیا۔ ''اب اتنا کو نہ سوچ' اچھا کماتا ہے۔ خالی ایک سس (ساس) ہی ہے' فر ایک نکے (چھوٹے) جے نقص کو ہی خالی کیوں دیکھ رہا ہے تو میری مان تے آج ہی اس کو ہاں کر آ۔''

''چل دیکھتا ہوں' اس نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلا اور سر پر باندھا صافہ کھول کے لیٹ گیا۔ رانی نے بھی سر پر لپیٹا دوپٹا کھول دیا۔ آخر وہ جو چاہتی تھی ویسا ہی کروا رہی تھی پھر کا ہے کا سر درد۔

باہر صحن میں لیٹی نیلم کے دل کو کچھ ہوا۔ بھائی بھابھی کی ساری باتیں اس کا دل دکھانے کے لیے کافی تھیں۔ وہ صوبیہ کو تھپک رہی تھی لیکن سو اس کی قسمت گئی تھی اور سوئی بھی ایسی کہ اس کے زخمی دل کی آہیں کراہیں اور بے شمار آنسوؤں کے باوجود اٹھنے کو تیار ہی نہ تھی۔

آہ! آخر ویر میرا بھی میرے سے تنگ آگیا ہے جو ایسے مجھے پوچھے بغیر صفدر سے بیاہنے کو تیار ہو گیا۔ اماں کاش تو مری نہ ہوتی' مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ اپنے اس نامراد دل کو کیسے راضی کروں اس بیاہ کے لیے۔'' اس نے آنکھوں سے بہتی جھڑی کو غصے سے رگڑا تھا۔ لیکن وہ تو رکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کے سونے کی ناکام کوشش کی۔

☆ ☆ ☆

''او نیلم گل سن میری۔'' وہ جو صحن میں چھڑکاؤ



کرنے کے بعد اب جھاڑو لگانے لگی تھی کہ رانی کی آواز پر جھاڑو رکھ کے اس کے پاس جا بیٹھی۔

"میں کہتی ہوں کہ تو کون سے شہزادوں کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ پہلے تے کوئی رشتہ ہی نہیں آتا تھا تیرا اب جو یہ ایک آیا تو تو نخرے دکھانے لگی، ناں میں پوچھتی ہوں کہ ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں تیرے میں جو توں راضی ہی نہیں ہو رہی۔ یہ دی چلا گیا تو تجھے کوئی منہ بھی نہیں لگائے گا۔ اس لیے آج فرید آئے تو تو اس کو بول کہ تو اس رشتے کے لیے راضی ہے آئی سمجھ۔"

وہ خود غرض بنی اسے سمجھانے پر تلی تھی۔ وہ جو اتنے دنوں سے عجیب کشمکش کا شکار تھی، اب خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ایک لفظ بھی نہ بولی کہ اس کا دل نہیں مانتا، صفدر کی ایک معذور ٹانگ اسے ہاں کرنے نہیں دیتی۔

"ٹھیک ہے بھرجائی!" کہا بھی تو بس یہی ایک چھوٹا سا جملہ اور اٹھ کے جھاڑو لگانے چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

27 سالہ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے ویر کے فیصلے سے خوش نہ تھی صفدر کا چند سال پہلے ایک حادثہ ہوا جس میں اس کی داہنی ٹانگ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شکل و صورت بھی واجبی سی تھی گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ محنت مزدوری تو نہ کر سکتا تھا اس لیے گاؤں میں ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان ڈال لی، اپنی صلح جو طبیعت کے باعث اسے اچھی خاصی آمدنی ہوتی جس کی وجہ سے وہ دکان بڑھا گیا۔

پہلے صفدر کی ماں کی آنکھوں کو کوئی لڑکی نہ بھاتی تھی کئی لڑکیاں دیکھتی اور کیڑے نکال کر رد کر دیتی لیکن بیٹے کی معذوری کے بعد اس کے رویے میں بھی فرق آگیا وہ فرید کے پاس بڑی ہی آس لے کر گئی اور ہر طرح سے اسے اور نیلم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

اس رشتے سے کوئی خوش ہوا نہ ہوا رانی ضرور خوش ہوئی تھی اس کے دل کی مراد جو پوری ہونے والی تھی اس لیے اس نے ہر طرح سے فرید کو اس رشتے پر راضی کرنے کی کوشش کی تھی اور بالآخر وہ ہو ہی گیا جو رانی چاہتی تھی اس نے صفدر کے سنگ رخصت کر کے نیلم سے جان چھڑا ہی لی۔

"خود تو جیسے حور پری ہو، نخرے تو ایسے کرتی تھی جیسے کوئی شہزادہ آئے گا اسے بیاہنے۔" اس نے سانولی سلونی سی نیلم کو دلہن بنے دیکھا تو چبا چبا کے بولی تھی، آہستہ آواز ہونے کے باوجود بھی کچھ فاصلے پر لال جوڑے میں ملبوس نیلم نے باآسانی آواز سن لی شکر تھا کہ باقی سب مہمان اپنی اپنی خوش گپیوں میں مشغول تھے نہیں تو انہیں ایک اور موقع مل جاتا اس کی قسمت پر افسوس کا اظہار کرنے کا۔ بنا کسی خوشی کے احساس کے وہ صفدر کی دلہن بنی اس کے سنگ چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

لال گھونٹ سر پر ڈالے وہ اپنی انگلیاں موڑ رہی تھی۔ زبردستی لگائی گئی مہندی کی خوشبو بھی اپنی موت آپ مر گئی تھی اس نے آنکھ سے گرا آخری قطرہ اپنی ہتھیلی پر سمیٹ لیا اور دل کو مطمئن کرنے کی کوشش میں لگ گئی جب دروازہ کھلا اور لاٹھی کی ٹک ٹک کی آواز ابھری وہ اندر چلا آیا۔

"السلام علیکم، روایتی دولہوں کی طرح اس نے بھی سلام سے شروعات کیں لیکن نیلم کی آواز اس کے حلق سے نکلتے ہی معدوم ہو گئی۔ صفدر اب اس کے قریب بیٹھ چکا تھا ہاتھ میں پکڑی سہارا لاٹھی بیڈ کے ساتھ ہی کھڑی کر دی۔ نیلم کی نگاہ اٹھی اور اس لاٹھی پر آ ٹکی۔

"میں جانتا ہوں نیلم کہ تو اس بیاہ سے خوش نہیں ہے۔" وہ اس کے دل کا بھید بنا کہے ہی جان چکا تھا۔ نیلم کی نگاہ ایک پل کے لیے اس کے چہرے پر آرکی وہاں دکھ کرب کی تحریر ہر طرف پھیلی تھی ایک لمحے کے لیے نیلم کے دل کو کچھ ہوا۔

"دیکھ نیلم میں اپنی یہ خامی تو نہیں پھیر سکتا۔" اس

نے اپنی لاٹھی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پر میں تیرے سے ایک وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ میں تجھے اس گھر میں اپنی حیاتی میں کوئی کمی کوئی دکھ نہیں سہنے دوں گا میں تیرا بہت ہی خیال رکھوں گا۔ جو دکھ پریشانیاں تو میکے میں دیکھتی آئی ہے وہ سب ادھر ہی رہ گئیں اب میں تجھے ہور (اور) کج بھی نہ دکھ پہنچنے دوں گا۔"

وہ جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کے اپنے دونوں ہاتھوں میں یوں چھپانے لگا گویا کوئی بہت ہی قیمتی شے ہو جو چھن جانے کا خطرہ ہو۔ اس کے مردانہ سخت ہاتھوں میں نیلم کا سانولا ہاتھ چھپ سا گیا۔ جو مہندی لگنے کے بعد کچھ اور سنولا گیا تھا۔ وہ چپ چاپ صفدر کی باتیں سن رہی تھی اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش بھی نہ کی۔

"دیکھ نیلم میں سمجھ سکتا ہوں کہ تجھ پر کیا گزری ہو گی تو نے بڑی مشکلوں سے یہ فیصلہ کیا ہو گا ظاہر ہے کہ لنگڑا بندہ کس کو اچھا لگتا ہے۔ بڑا اوکھا کم (کام) ہوتا ہے معذوروں سے ویاہ کرنا، میں تجھ سے کبھی بھی نہیں کہوں گا کہ تو میرے سے پیار کی باتیں کر یا میرے لاڈ اٹھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ویاہ تیرے لیے بڑا اوکھا ہو گا۔ پر یقین رکھ میں اس کے علاوہ کبھی تجھے اور کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ نگاہیں جھکائے ایک ایک لفظ بڑی دقتوں سے ادا کر رہا تھا گویا ٹانگ سے معذوری اس کی اپنی غلطی ہو جس پر وہ اس وقت شرم محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں بلب کی پیلی روشنی پھیلی تھی جیسے وہ بھی نیلم کی قسمت پر سوگ منا رہی ہو۔ نیلم کے دل کو اداسی نے آگھیرا وہ جس سے منہ بنائے بیٹھی تھی وہی بندہ اسے تسلی اور دلاسے دے رہا تھا آئندہ زندگی کے بارے میں۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی صفدر کے ہاتھ میں چھپا ہوا تھا۔

"تجھے کس نے کہا کہ یہ ویاہ میرے لیے اوکھا ہے (مشکل ہے) میں خوش ہوں تیرے سے شادی پہ تو الٹا سیدھا مت سوچ۔" اسے خود بھی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ یہ الفاظ کیسے ادا کر گئی لیکن اب کہنے کے بعد اسے اپنے اندر سکون سا اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

پچھلے چند دنوں میں جس اذیت اور بے سکونی کا وہ شکار تھی وہ اب ٹھہراؤ میں بدل چکا تھا۔ اس نے دل سے اس شخص کی اچھائی کو محسوس کیا اور جو بھی جیسا بھی وہ تھا اب اس کا سر کا سائیں تھا۔ اس کے تسلی دینے پر صفدر نے چونک کے اس کی طرف دیکھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے۔" تھوڑی دیر پہلے تک دل جو ہر قسم کے احساس سے عاری تھا اب گدگدا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ٹھہری ہوئی تھی۔ صفدر کو اس کی بات سچی لگی تھی۔

"سچ، تو دل سے بول رہی ہے ناں۔ میرا دل رکھنے کو تو نہیں بول رہی۔" ایک آخری بار اس نے اپنی تسلی کرنی چاہی۔ نیلم کا سر نفی میں ہلا تھا صفدر خوشی سے نہال ہو گیا اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

"قسم سے بڑا خوش ہوں میں آج۔ چل اسی خوشی میں تجھے مٹھائی کھلاتا ہوں، تو رک میں ابھی لاتا ہوں ساتھ والے کمرے میں اماں نے بڑی مٹھائی لا کے رکھی ہے کل پورے گاؤں میں بانٹنے کے لیے۔" خوشی اس کے لہجے، اس کے لفظوں سے چھلک رہی تھی۔

"بس دو منٹ میں آیا۔" کہہ کے وہ لاٹھی پکڑ کے سہارے سے اٹھنے لگا تھا۔ نیلم نے اس کے ہاتھ سے وہ لاٹھی لے کر رکھ دی۔

"آج کے بعد تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی اب میں جو آگئی ہوں۔ خوش دلی سے کہتے ہوئے وہ اسے سہارا دے کر اٹھانے لگی۔ اس لمحے اسے اپنی قسمت پر ایک ذرہ برابر بھی افسوس نہ ہوا بلکہ صفدر جیسا خیال کرنے والا شوہر ملنے پر فخر سا ہونے لگا۔ کیا ہوا جو وہ ایک ٹانگ سے محروم ہے، اس کے پاس ایک پیار بھرا دل تو تھا۔ یہی نیلم کے لیے کافی تھا۔ وہ اب اس کا سہارا بننے کے لیے دل سے تیار تھی۔ دور آسمان پر موجود تارے بھی ان کی خوشی میں خوش ہو کے زیادہ روشن دکھائی دینے لگے۔ اس کا سہارا بننے کے لیے دل سے تیار تھی دور آسمان پر موجود تارے بھی ان کی خوشی میں خوش ہو کے زیادہ روشن سے دکھائی دینے لگے۔

مصباح علی سید

از میر اور مریم آسٹریلیا کے شہر وکٹوریہ میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیبہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ غیر معمولی خوب صورت اور معصوم روائیبہ کی سالگرہ جندب نے وہاں کے مشہور نیشنل گرین فورسٹ میں ارینج کی۔ جندب ازمیر کے پرانے دوست رضا حیات کا بیٹا ہے۔ جو آسٹریلیا میں پڑھ رہا ہے' جندب اور روائیبہ کی پرخلوص دوستی ہے۔ جندب اسے پسند بھی کرتا ہے' مگر اظہار نہیں کرتا۔

میرزکا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں مانے ہوئے زمیندار اور اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ بیوی وفات پاچکی ہے۔ ان کے دو بیٹے خیام زکا' حنبل زکا ہیں۔ خیام کی دو بچے احتشام اور ازلان ہیں۔ ان کی بیوی آئمہ روایتی زمیندارنی اور حویلی پر حکمران ہیں۔ میرزکا کی والدہ ماں جان فالج کی مریضہ ہیں۔

زینب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار ہے' لیکن حنبل کی پرکشش شخصیت کے سحر میں بری طرح جکڑی ہے اسی لیے اپنے ہر آنے والے رشتے کو ٹھکراتی رہتی ہے۔

شہروز کمال ایک اکھڑ دماغ شخص ہے۔ دولت مند ہونے کے ساتھ رنگین مزاج بھی ہے۔ صبرینہ سے پسند کی شادی کرنے کے باوجود اس سے اکتایا رہتا ہے۔ وجہ چار بیٹیوں کی اوپر تلے پیدائش ہے اور وہ بیٹے کا تمنائی ہے۔



اماں جان کی طبیعت شدید خراب ہوتی ہے وہ اپنے بیٹے ازمیر سے ملنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ جب کہ میرزکا کی ان سے ناراضی چل رہی ہے کیوں کہ ازمیر نے ان کی سالی کو طلاق دے کر آسٹریلین کرسچن لڑکی مریم سے شادی کی تھی' لیکن اب ماں کے اصرار پر حنبل زکا ازمیر کو پاکستان بلانے کے لیے قائل کرلیتا ہے۔

رضا حیات کی بیٹی ماہم کی منگنی ہے انہیں پتا چلتا ہے ازمیر پاکستان آرہا ہے وہ شرکت کی دعوت دے دیتے ہیں۔

ازمیر مریم دونوں پاکستان آتے ہیں۔ کچھ ناراضی کے اظہار کے بعد میرزکا نے انہیں معاف کردیا روائیبہ کو نہ لانے پر خفگی کا اظہار بھی کیا۔

دسویں قسط

مکمل ناول



آئمہ کی تلخ آواز میں التجاسی ابھر رہی تھی۔ وہ ہر صورت اسے قائل کرنا چاہ رہی تھیں کہ اب ان باتوں کا قطعاً فائدہ نہیں مگر سبرینہ کسی صورت ٹلنے والی نہیں تھی۔ اس کا دل بے طرح سے زخمی ہو چکا تھا۔ عدن کی سسکیوں اور آنسوؤں میں اور بہت سے معصوم آنسو محسوس ہونے لگے۔ وہ ننھیال پہنچ کر بمشکل کچھ دیر وہاں رکی تھی۔ بچوں کو خالہ کے پاس چھوڑ کر ڈرائیور کے ساتھ حویلی آگئی۔ اور گڑگڑاتے ہوئے آئمہ بیگم کی منتیں کر رہی تھی۔ اول تو اسے یوں اچانک دیکھتے ہی آئمہ کے ماتھے پہ تحیر سے شکنیں پڑیں تھیں۔ اور اب اس کا مطالبہ۔

"سبرینہ، ایک بات کان کھول کر سن لو...... تم نے اتنا بڑا رسک کشتیاں جلا کر لیا تھا۔ اب تم گڑھے مردے کیوں اکھاڑنے آئی ہو...... حنبل کچھ دیر کے لیے باہر گیا ہے۔ آتا ہی ہو گا۔ اس کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی ناں ......قیامت آجائے گی قیامت......خدا کے واسطے اس وقت چلی جاؤ۔ حنبل واپس چلا جائے میں کوئی صورت نکالوں گی تمہیں ملوانے کی۔"

"وہ ہے کہاں آخر...... جب تو آپ کہہ رہی تھیں حویلی میں رہے گی۔" سبرینہ کی آواز آنسوؤں میں بھیگتی جا رہی تھی۔ اور آئمہ کی آواز غصے اور خوف سے پھٹنے لگی۔

"نہیں رکھا حنبل نے...... تمہیں پتا نہیں ہے اس کے غصے کا...... مارنے کو دوڑ رہا تھا...... مجھے کیا پتا تھا ہاسپٹل والے کون کون سے ٹیسٹ کروالیں گے۔ سلویٰ نے میری جان عذاب میں پھنسا دی۔"

ازلان کے کان میں ماں کا یہ جملہ بہت واضح پڑا تھا۔ دماغ میں گول چکر اٹھنے لگے۔ بات واضح تو نہیں ہو رہی تھی اتنی سمجھ لگ گئی تھی بات روائیہ چاچی کی ہو رہی ہے۔ لاشعوری طور پر اس کے قدم سٹنگ روم کی جانب آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔

سبرینہ پھر سے منمنا رہی تھی۔

"وہ پاکستان میں تو ہے......؟"

"بھاڑ میں ہے......" آئمہ بیگم کا صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا۔

"تمہیں وہ وقت یاد ہے، جب تم سب کچھ کرنے کو تیار تھیں سب کچھ...... بیٹا، بیٹا، بیٹا یہ فیصلہ تمہاری خوشی اور رضا کے لیے سلوی نے کیا تھا۔ تب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس وقت تمہاری ممتا کہاں تھی، جواب برسوں بعد جاگ گئی۔"

"ممتا سوئی کب ہے آپا......؟" کتنے آنسو سبرینہ کے ٹوٹے تھے۔ "اس کو تو سولی پر چڑھا کر گلا گھونٹا تھا میں نے اور جس کے لیے یہ سب کچھ کیا، اتنی اذیت برداشت کی...... وہ تو تب بھی نہ ملا، اجڑ گئی میں، تباہ برباد ہو گئی۔ میرا گھر روائیہ کی آہیں لے ڈوبیں...... میری وجہ سے وہ گھر سے نکلی اور میں......" اس کے ناک کی ریزش زور سے کھینچنے کی آواز ازلان تک آرہی تھی۔ "مجھے تو زندگی نے اجاڑ کے باہر پھینک دیا۔ آپا میں اس کی منتیں کر لوں گی۔ اس کے پاؤں پکڑ لوں گی۔ مجھے ایک بار میری بچی سے ملوا دو......خدا کے لیے آپا۔"

"سبرینہ میں تیری منتیں کر رہی ہوں ......فی الحال یہاں سے چلی جا......تو معافی کا سوچ رہی ہے، حنبل حویلی کے در و دیوار گرا دے گا۔ چلی جا......سلوی سے جا کر بات کر وہ تجھے سمجھائے گی۔" سنتے ہوئے ازلان کے قدم من من بھاری ہو گئے تھے وہ کسی ٹرانس کی صورت سٹنگ روم میں داخل ہوا وہ پھٹی آنکھوں سے ماں اور سبرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ آئمہ تو اسے دیکھتے ہی بوکھلا گئیں......فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھیں۔ انجانے میں ان کے منہ سے توجیہات ابلنے لگیں۔

"وہ تجھے بتایا تھا ناں ......شہروز کمال کے حادثے کا ......بس سبرینہ بے چاری بہت ہی صدمے میں ہے۔" وہ بنا پلک جھپکے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔

"پانچ ماہ بعد صدمہ ابل رہا ہے......؟"

"ہاں تو اس کے بعد ہم آج ہی تو مل رہے ہیں، فوتگی پر تو میں تھوڑی دیر کے لیے گئی تھی نا۔" وہ

بھنوؤں کے سرے جوڑے صرف ماں کے بیان کن رہا تھا۔ اتنا تو اسے پہلے دن سے یقین تھا وہ بچی حنبل چاچو کی نہیں ہے، لیکن پھر کس کی ہے، ایک سوالیہ نشان آنکھوں کے آگے جھولتا تھا۔ اس ایک شیطانی رات کا لمحہ لمحہ سوچتے اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو ہوتیں کہ کہیں وہ کچھ بھول تو نہیں رہا، شیطانی سرور نے اس کی یادداشت پر پردہ ڈال دیا ہو؟ آخر اس دن اس کی ماں نے اس کے منہ پر تھپڑ کیوں مارا تھا۔ وہی کوریڈور میں ملی تھیں، انہوں نے کچھ دیکھا ہو گا، تب ہی وہ بیٹے کے گناہ پر پردہ ڈالتی رہیں......مگر آج کی حقیقت تو بہت مختلف اور تکلیف دہ تھی۔ اس نے ماں کے من گھڑت جواز نہیں سنے تھے آنکھیں سکڑے صرف اتنا پوچھا تھا۔

"آپ خدا بن گئی تھیں؟ آپ نے کیسے سوچا اللہ اپنی برابری کرنے پر، آپ کو ڈھانپ لے گا۔"

"کک کیا بکواس کر رہا ہے تو......" آئمہ نے ہڑبڑا کر کہا اور کٹیلی نگاہ سے سبرینہ کو کھا جانے کی حد تک دیکھا۔ جیسے اس کے آجانے سے ساری مصیبت پڑی ہو، کم بخت نہ آتی نہ یوں صفائیاں دینی پڑتیں۔ وہ ذرا ازلان کے قریب ہوتے رعب سے کہنے لگی تھیں۔

"چلو تم اپنے کمرے میں جاؤ کچھ نہیں کیا میں نے ......ایسے ہی خواہ مخواہ میں۔" وہ ماں کی بوکھلاہٹ پر استہزائیہ ہنسا تھا۔

"ہونہہ۔ واقعی آپ نے کچھ نہیں کیا۔" وہ اپنا بایاں ہاتھ پھیلا کر اسے الٹ پلٹ کر پچھتاوے سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں سمجھتا تھا میری یہ سزا زیادہ ہے۔" اس نے اپنی آخری دو انگلیوں کو بند کیا عجیب خوف ناک سی مٹھی بن گئی۔ "لیکن اب سوچ رہا ہوں یہ تو بہت کم ہے۔" اس نے نگاہ ہاتھ سے ہٹا کر آئمہ کو دیکھا۔

"میں تو آپ کا بھی بیٹا ہوں امی۔"

"ازلان۔" آئمہ زور سے بولیں۔ سبرینہ اٹھ کر ازلان کے پاس آگئی اس کا بازو پکڑ کر لجی انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ازلان ...... مجھے اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ مجھے ایک بار ...... ایک بار اس بچی سے ملوا دو۔" ازلان نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔

"آپ نے غلطی کی آپ کو سزا مل گئی، جنہوں نے نہیں کی، انہیں پانچ سال کی سزا کیوں ملی۔ کبھی سوچا آپ نے سبرینہ خالہ......آپ کے معافی مانگنے سے معافی مل جائے گی ......اللہ ایسے معاف نہیں کرتا۔" اس نے ایک ایک لفظ اتنا جما کر کہا تھا جیسے وہ سخت ترین تجربے سے گزرا ہو، وہ کرکٹ کھیلنے کا شیدائی تھا۔ اپیل کو وہ اس کی زندگی کا خاصا رہے تھے۔ جب سے انگلیاں کٹی تھیں بیٹ کو دیکھ کر اسے رونا آتا تھا۔ بال گھماتے بائیں ہاتھ کی گرفت بال سے ہٹ جاتی تھی۔ وہ ان دونوں کے سامنے بہت جم کر وضاحت دے رہا تھا۔

"اللہ معاف نہیں کرتا......جس دن میری یہ انگلیاں کٹیں، تب مجھے پتا چل گیا تھا، اگر بندہ زیادتی پر چپ رہے، اللہ چپ نہیں رہتا، وہ بدلہ لیتا ہے، وہ معاف نہیں کرتا۔ چاچو چاچی کے صبر پر، اللہ ہمیں معاف نہیں کرے گا۔"

غصے اور دکھ سے ازلان کی آواز رندھ گئی تھی۔ آئمہ اسے سمجھانے کے لیے اس کی آستین سے بازو پکڑ کر اپنے قریب کرنے لگیں مگر اس نے جھٹکے سے بازو چھڑایا۔ اس کی آنکھیں بھرا گئی تھیں وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔ آئمہ اسے روکتی پیچھے لپکی تھیں۔ مگر وہ تن فن کرتا لاؤنج سے باہر برآمدہ پار کر گیا تھا۔ اور آئمہ "ازلان، ازلان" پکارتی یک لخت چپ ہو گئیں۔ ان کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی تھی۔ حنبل برآمدے میں قدم رکھ رہا تھا اور ازلان جیپ کی جانب بڑھ چکا تھا۔ آئمہ کو حواس باختہ دیکھ کر وہ متحیر سا ہوا تھا۔

"کیا ہوا......خیریت؟"

"ہاں......ہاں وہ......" انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "وہ ازلان کو بلا رہی تھی۔"

"کہاں گیا ہے وہ؟" حنبل نے ذرا کی ذرا گردن پھیر کر دیکھا جیپ تب تک گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔

"پتا نہیں کہاں کا کہہ رہا تھا سمجھ میں نہیں آیا۔" آئمہ کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود ماتھے اور ہتھیلیاں پسینے سے شدید نم ہونے لگیں۔ حنبل پھیکا سا مسکرایا۔

"آپ تو ایسے پریشان ہو رہی ہیں۔ جیسے وہ گھر سے بھاگ گیا۔ چلیں اندر باہر بہت سردی ہے۔"

"ہاں۔" کہتے ہوئے آئمہ بیگم کی ابھی نگاہیں گیٹ پر جمی تھیں۔

"اچھا چلیں ...... میں پتا کرتا ہوں۔" حنبل نے اپنا سیل نکال کر ازلان کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔ تب ہی سبرینہ کمرے سے نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور آئمہ نے اسے سخت تیز نگاہ سے چپ رہنے کی تنبیہہ کی تھی حنبل نے سر کے خم سے سبرینہ کو سلام کیا اور ایک جانب ہو گیا تھا۔ مسلسل ٹون جانے کے باوجود وہ فون پک نہیں کر رہا تھا۔

اس کی سرخ ہوتی آنکھیں گہرے پانی سے بھری تھیں اور وہ جیپ چلا نہیں اڑا رہا تھا۔ کتنے گناہ، غلطیاں، کوتاہیاں آنکھوں کے آگے آ، آ رکتیں۔ اسے وہ وقت یاد آنے لگا جب اچانک اس کی ماں نے ڈاکٹر بدلی تھی۔ صرف ازلان سے نفرت میں ماں کی بات مان لی۔" وہ کتنی معصوم تھی، ماں پر اعتبار کرتی تھی، مجھ پر کرتی تھی، چاچو پر کرتی تھی ......ہم سب نے اس کے اعتبار کو اپنے اپنے طریقے سے توڑا۔" کٹے ہاتھ سے اس نے ایک اور گیئر لگایا جیپ کی اسپیڈ بڑھ گئی۔ جو اس سے غلطیاں ہوئیں سو ہوئیں مگر اس نے کتنا چاہا تھا یہ گھر اب نا ٹوٹے۔

روائیہ کے حویلی چھوڑ دینے پر وہ خاصا مضطرب ہوا تھا اوپر سے حنبل ذکا جرمنی چلا گیا تھا۔ اگر اسے حنبل کا ارادہ پتا چل جاتا وہ کسی نہ کسی طرح انہیں روک لیتا مگر اس نے شدید خاموشی میں چند دن گزارے اور عین جانے کے وقت پتا چلا تھا وہ جا رہا ہے۔ بعد میں اس نے روائیہ کا ٹھکانا ڈھونڈا تھا۔ رضا حیات کی لینڈ لائن پر مسلسل آنے والی کالز سے پتا چلا تھا وہ ان کے پاس موجود ہے۔ ہدایت اللہ سے ایڈریس لے کر ازلان اس سے ملنے گیا تھا۔

وہ رضا حیات کا ڈرائنگ روم تھا۔ وہ درمیانی صوفے پر جم کر بیٹھا تھا۔ رضا حیات اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ عائشہ نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تو لیا تھا مگر ان کا رویہ بے حد سرد تھا۔ بالکل اس ماں کی طرح جس کی بیٹی کے ساتھ سسرال والے زیادتی کر کے بے عزت کریں تو ماں ان لوگوں کی شکل دیکھنا نہ چاہے۔ وہ چائے پانی کے انتظام کا کہہ کر وہاں سے فوراً ہٹ گئیں اور ملازمہ کے ہاتھ روائیہ کو کہلوایا تھا۔

"ازلان آیا ہے۔"

روائیہ نے سنتے ہی شدید برہمی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں تھی چہ جائیکہ ملے۔ شروع میں روائیہ کو یقین تھا یہ سب ازلان کا کیا دھرا ہے' اسی نے لیبز رپورٹس میں کچھ گڑبڑ کی ہے۔ ورنہ حنبل کم از کم اتنے کم ظرف نہیں کہ روائیہ کو چھوڑنے کے لیے کسی جھوٹ کا سہارا لیتا اور ویسے بھی ازلان تو پہلے سے ہی چاہ رہا تھا ان کا رشتہ خراب ہو...... تب ہی اتنی گھٹیا حرکت کرنے لگا تھا۔ وہ کارگر نہ ہوئی تو اس نے کوئی اور چال چلی ......تو اب ملنے کا مقصد' یقیناً میں خلع کا مطالبہ کروں اور پھر وہ اپنی معافیوں سے میرے دل میں ہمدردی پیدا کرے۔ نہیں۔" نہ اسے خلع چاہیے اور نہ ہی کسی جائیداد پراپرٹی میں حصہ...... وہ اب ان لوگوں پر تھوکنا بھی نہیں چاہتی۔ اس کا صاف جواب ملازمہ نے آ کر ازلان کو بتا دیا۔ وہ چند منٹ سوچتا رہا پھر ملازمہ کی ہی نشاندہی پر اٹھ کر اس کے کمرے میں آ گیا۔

"آپ نے انکار کیوں کر دیا مجھ سے ملنے سے...... جب کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" بیڈ کی پائنتی پر بیٹھی روائیہ نے اسے کٹیلی نگاہ سے دیکھا تھا۔

"اور میں ملنا نہیں چاہتی...... اس لیے جا سکتے ہو۔"

"کیوں......؟"

"تم بہت اچھی طرح جانتے ہو۔" روائیہ اپنے ٹھوس انداز میں بیٹھی رہی وہ اس کے انداز پر کچھ پشیمان ہوا پھر اپنے تئیں دلیل سے بات شروع کرنے لگا تھا۔

"دیکھیں اگر تو یہ بچی میری کزن ہے، تو یہ ہمارا خون ہے۔ اس سے ملنے سے کم از کم آپ نہیں روک سکتیں......اور اگر نہیں تو پھر آپ کو بتانا ہو گا یہ کون ہے، کس کی بیٹی ہے۔" روائیہ کے تو سنتے ہی تن بدن میں آگ دہک گئی۔ وہ جھٹکے سے اٹھی اور تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"تم ہوتے کون ہو مجھ سے پوچھنے والے...... تمہیں یہ حق دیا کس نے ہے۔" اس کے انداز سے لگتا تھا وہ تھپڑ مار دے گی اس کے چہرے پر' وہ بھی ایک قدم پیچھے ہو گیا تھا۔ اور قدرے بدلے لہجے میں بولا تھا۔

"مسئلے چھپ جانے سے حل نہیں ہوا کرتے......انہیں سوچنا پڑتا ہے، آپ ادھر آ گئیں، چاچو جرمنی چلے گئے...... ایسا کیسے چلے گا۔"

حنبل کا جرمنی جانے کا سن کر روائیہ کا دل جکڑ کر کھلا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی حنبل اتنا کٹھور، بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں کیا ذرا سی بھی اس کی اہمیت نہیں تھی جو ایسے آرام سے چلا گیا۔ اسے اپنے بدن کے مساموں میں چنگاریاں جاتی محسوس ہوئیں جی چاہا اس دنیا کو تلپٹ کر دے۔ چہرے پر بدلتی کیفیت کے آثار ازلان سے مخفی رکھنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔ سامنے بے بی کاٹ میں رابی سو رہی تھی اس کے معصوم بے فکر خراٹوں کو دیکھ کر اس کا دل مزید کٹ گیا۔

"کتنی بدنصیب ہے، اس کا باپ اسے اون کرنے (اپنانے) کو تیار نہیں۔" اس کی مستقل خاموشی ازلان کو کھلی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتا رابی کے کاٹ کی جانب بڑھا تھا اور جھک کر اسے اٹھانے ہی لگا تھا۔ میکانکی انداز میں وہ آگے لپکی اور اپنے دونوں ہاتھ رابی کے کاٹ پر جماتے اسے تند نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"خبردار جو میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا، میں تمہارا غلیظ سایہ بھی اس پر پڑنے نہیں دینا چاہتی۔" روائیہ کو غصہ جانے کس بات پر تھا کہ اس کے لہجے میں تیر، نیزہ جیسی کاٹ تھی۔ اس کے تنفر انداز پر ازلان بھی یک لخت ہی تپ گیا تھا۔

"جس حرکت پر آپ کو غصہ ہے، اس میں، میں اکیلا شامل نہیں تھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھے جم کر بول رہا تھا "اگر میں گناہ کے لیے بڑھا تھا تو پارسا آپ بھی نہیں تھیں۔ مانا میرے اندر شیطان تھا، مگر وہ سو رہا تھا اسے آپ کے قہقہے اور خوشبو نے جگایا تھا...... آپ کو نہیں پتا تھا، آپ کا شوہر گھر پر نہیں ہے، تو کیوں نکلی تھیں رات کی تنہائی میں باہر...... دل بہلانے آئی تھیں ناں ...... آپ نہیں جانتیں، میں آپ کا محرم نہیں تو پھر نامحرم سے فری ہونے کا کیا مطلب تھا، مرد کا گناہ سب کو دکھائی دیتا ہے، اکسانے والی کا کوئی گناہ نہیں ہونہہ۔" اس نے تنفر سے گردن جھٹکی۔ روائیہ کی آنکھوں میں چھلکتا تنفر بڑھتا جار ہا تھا۔ وہ اسے اس کی غلطی کیا جتا رہا تھا۔ وہ تو اس رات ہی اپنی غلطی جان گئی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں لگی تھی۔ نئی تو وہ بات تھی جو وہ بعد میں چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

"اور پھر کون سا آپ کو عقل آ گئی...... کیوں گئی تھیں جنید سے رات کو ملنے اور جانے ایسی کتنی غلطیاں کی ہوں گی آپ نے، جن کا نتیجہ یہ بچی ہے۔" روائیہ کو لگا تھا اس کی آنکھوں میں یک لخت بہت سا کانچ کسی نے چبھو دیا ہو، خود سے سرزد ہونے والی غلطیوں کا دکھ اور اس کے جملوں کی تضحیک سے اس کی سانس تک زخمی ہو گئی۔

"میری بات یاد رکھنا، اچھائی اور برائی سب میں موجود ہے، ہم سے غلطی ہوتی ہے تو کبھی مقابل سے بھی ہو جاتی ہے۔" اس کی برداشت جواب دے گئی وہ دھاڑ کر بولی تھی۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔"

"خود کو بار بار کٹہرے میں لانے کا مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے۔ جا رہا ہوں۔" وہ کہہ کر دروازے کی جانب بڑھا پھر رک کر پلٹا اور جتا کر بولا تھا۔ "اور میرے چاچو اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ آپ کی بار بار کی غلطیوں کو گود میں پالتے پھریں۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا اور اس کے جانے کے بعد وہ کتنا روئی ہوگی یا اپنی غلطیوں اور اپنے ساتھ ہوئی غلطیوں کا کتنا موازنہ کیا ہوگا یہ امر تو خیر لازم تھا لیکن اس دن کے بعد ازلان نے کبھی قطعاً رابطہ نہیں کیا تھا وقت بیت گیا۔ بہت کچھ کھلتا رہا مگر چل سو چل زندگی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے حادثات و واقعات کے بعد زندگیاں رک نہیں جاتیں ٹوٹتے جڑتے تاروں کی طرح مگر زندگی آگے بڑھتی رہتی ہے اور بڑھتی رہے گی۔ ابھی تو صرف پانچ برس بیتے تھے۔ اور ان میں بہت سے معنے کھل گئے تھے۔

وہ جواب تک رابی کو روائیہ کی غلطی سمجھ رہا تھا آج حقیقت کھلتے ہی اپنے جملوں سے کی گئی تضحیک اپنے منہ پر پڑ رہی تھی۔ ڈھلتے دن کے ساتھ دھند مزید بڑھنے لگی سخت خنکی اور خون کا تلاطم اس کی آنکھوں اور چہرے کو سرخ کر رہا تھا۔ اگر ازلان کے بس میں ہوتا تو وہ آج جیپ کو پر لگا کر اڑانے لگ جاتا اور پل میں اسلام آباد پہنچ جاتا۔ انگلیاں کٹنے کی سزا جتنی اس پر کارگر ہوئی تھی اگر ایسے ہی ہر چور پر ہونے لگے تو یہ دنیا جنت بن جائے اپنی ماں کے کیے گناہ کا صرف ایک کفارہ تھا جو اس کی سمجھ میں یک لخت آیا' فوراً اسے ساری صورت حال روائیہ کو بتا دینی چاہیے اور پھر سب اچھا اچھا ہو جائے گا۔ یہ انسان بھول جاتا ہے جب ماضی کی مٹی میں برائی بوئی جائے تو مستقبل میں اچھا اگنے کی خواہش صرف دیوانے کی سوچ ہو سکتی ہے۔ گندگی کو دفنانا نہیں جلانا چاہیے، دفنانے سے تو تعفن پھوٹتا ہے۔ وہ ماضی کو دفنا کر خوش نما خواب سجائے تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ حنبل کی بار بار آتی کالز سے ڈیش بورڈ پر رکھے موبائل میں تھرتھراہٹ ہوتی وہ اچک کر نگاہ ڈال لیتا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دیتا۔ فون نہ رکنے پر بالآخر اس نے موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

"جی چاچو۔" حنبل کو اس کی آواز خاصی رندھی سی لگی تھی۔

"یار کہاں گئے ہو تم...... بہت پریشان ہو رہی ہیں۔"

"وہ میرے جانے سے پریشان نہیں ہو رہیں۔ انہیں میری واپسی سے خوف آ رہا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" حنبل کو اچنبھا ہوا۔

"مطلب میں واپس آ کر بتاؤں گا...... صبح تک لوٹ آؤں گا...... میرا انتظار کرنا۔"

"یار کیوں تنگ کر رہے ہو، بتاؤ کہاں جا رہے ہو؟" حنبل کے درشتی سے کہنے پر اس نے گہری سانس لی تھی۔ گیئر بدلتے ہوئے چوڑی سڑک کی طرف موڑ کاٹا تھا۔

"کفارہ ادا کرنے...... بتا دیجیے گا امی کو میں سب کا کفارہ ادا کرنے اسلام آباد جا......" جیپ ابھی پوری طرح مڑی بھی نہیں تھی۔ چوڑی سڑک پر بنے گودام سے اناج سے لوڈڈ ٹرک اسی جانب بڑھ رہا تھا۔ شدید دھند، تیز ڈرائیو اور آنسوؤں کا دھندلکا دماغ پہلے ہی الجھا ہوا تھا۔ وہ اس ٹرک کی پھیلتی ہیڈ لائٹس پر غور نہیں کر سکا۔ آن واحد میں ازلان کی جیپ پورے زور سے ٹرک سے ٹکرائی اور ایک ہی ٹکر سے وہ اڑتی ہوئی کھیتوں میں جا گری تھی۔

☆☆☆

وہ پیزا ہٹ کے بڑے سے ہال میں پہلی میزوں میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہ نئی طرز کے بنے ٹرانسپرنٹ آفس پر جمی تھی۔ جہازی سائز آفیشل لیدر کرسی پر اسمتھ بیٹھا اس سیاہ فام لڑکی پر پوری طرح متوجہ تھا۔ میرڈین نے ان دو چار ماہ میں اسے کئی بار اس کے ساتھ مصروف دیکھا تھا دیکھنے میں وہ عام سیاہ فام لڑکی تھی بڑی بڑی آنکھوں موٹے ہونٹوں اور بھدی ناک والی، اس نے اپنے انتہائی چھوٹے کیے سیاہ بال زرد گولڈن رنگ رکھے

تھے۔ بات بات پر قہقہہ لگاتے وہ کسی کو اچھی لگتی تھی یا نہیں البتہ ایسے محسوس ہوتا تھا وہ اسمتھ کو بہت اچھی لگتی ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے قہقہے کا بھرپور ساتھ دیتا تھا۔ اور سفید فام میرڈین اندر تک کلس جاتی تھی۔

اس نے جب جب انہیں ساتھ دیکھا وہ بنا کوئی ردعمل ظاہر کیے غیر محسوس طریقے سے سامنے سے ہٹ گئی۔ لیکن آج ایسا کیا تھا وہ وہاں سے نہیں اٹھی تھی بلکہ اپنی کہنیاں ٹیبل کی سطح پر جمائے مسلسل انہیں تک رہی تھی چہرے پر پتھریلے تاثرات تھے۔ ویٹرس نے دوبارہ آ کر مینو کارڈ اس کے پاس رکھتے ہوئے آرڈر پوچھا تھا۔ اور یہ بھی بتایا کہ مسٹر اسمتھ اپنی میٹنگ میں مصروف ہیں اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے منتظر رہنے کا کہا اور اسے ٹال دیا۔ لوگ ٹیبلو پر آتے، کھاتے، اٹھتے چلے جاتے۔ وہ جوں کی توں بیٹھی تھی۔

یہ پیزا ہٹ اب پہلے والا معمولی سے کارنر میں بنا پیزا ہٹ نہیں رہا تھا۔ بلکہ اب یہ پانچ منزلہ عمارت میں بدل چکا تھا اور ہر فلور پر دسیوں میز کرسیاں تھیں۔ جن پر سارا دن رش لگا رہتا تھا۔ پانچ سال پہلے پیزا ہٹ کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اسمتھ نے آگے تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا جب بہتر ڈگری لینی ہی بہتر کمانے کے لیے ہے، وہ تو بغیر ڈگری کے بھی بہتر کمانے لگا ہے۔ اس نے اپنی تمام طاقت ادھر لگانی شروع کر دی تھی۔ محنت عروج بخشتی ہے یہ اسمتھ کو دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ شروع میں اس کے تعلیم چھوڑنے جیسے احمقانہ فیصلے پر میرڈین کو بہت غصہ آیا تھا۔

"مجھے تم سے ایسی حماقت کی امید نہیں تھی۔ اسمتھ...... وہ ہمارا بائیو آرگنیزم پڑھنے کا پلان...... اور پھر اس کے بعد تم آٹھ دس گھنٹے کی جاب کر کے بہتر زندگی گزار سکتے ہو، خود کو فیملی کو وقت دے سکتے ہو اور پیزا ہٹ یہ تمہارے ٹائم کو جکڑے گا۔"

"خود اور فیملی کے لیے وقت نکالنا اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ میں مینج کر لوں گا۔" اس نے قطعیت سے کہا تھا۔

"واقعی تمہارا دماغ تمہارے رنگ کی طرح سیاہ ہے۔" پھر وہ اس کے پیزا ہٹ پر بہت دن نہیں آئی، بلانے پر بھی نہیں...... تاکہ اس کے کام کو فرق پڑے...... کچھ دن وہ تنگ ہوا پھر اس نے ایک ویٹرس رکھ لی۔ کام کرتا رہا۔ میرڈین نے بائیو آرگنیزم میں بی ایس کیا تھا۔ کچھ دن کی ناراضی کے بعد وہ آ جاتی تھی مگر اسے تنگ کرنے، اس کے کیے ہر کام میں نقص ڈھونڈتی اور وہ اپنے دانت پھاڑ کر ہنستا رہتا۔ جیسے ہی میرڈین کو ایک فوڈ لیب میں جاب ملی اسے اسمتھ کو تنگ کرنا کا بہتر موقع مل گیا تھا۔ اس کے تیار کردہ کھانے کے مختلف سیمپل چیکنگ کے بہانے لے جاتی۔ ایک دن اسمتھ نے خفگی کا اظہار کیا تھا۔

"تمہیں کوئی اور فوڈ پوائنٹ نہیں ملتا اپنی انسپکشن کے لیے......" اس نے زبان کو زور سے تالو سے بجاتے ہوئے "نچ" کی آواز کے ساتھ نفی میں سر ہلا...... اسمتھ نے اسے گھور کر دیکھا......

"کیوں؟"

"کیوں کہ تم پر شک ہے، اتنی جلدی کوئی کیسے، اتنی ترقی کر سکتا ہے۔ کہیں تو گڑبڑ ہوگی۔" ان دنوں اس کا پیزا ہٹ اوپن ایریے سے سمٹ کر ایک جدید عمارت میں سما رہا تھا۔

"پھر ملا کچھ......؟ اس نے استفہامیہ میرڈین کو دیکھا جو چاروں اطراف سراہتی نگاہیں گھما رہی تھی۔

"مل جائے گا...... فکر نہیں کرو...... پھر میں تمہیں اندر کروا دوں گی۔"

"بالکل جب مل جائے گا تب...... فی الحال تو تمہیں اندر کروانے کا انتظام کرتا ہوں۔ آئے دن میرے کھانوں پر ڈاکا مارتی ہو۔"

"میں ڈاکا نہیں مارتی۔" وہ ٹھوس انداز میں بولی اور پاس رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ "انسپکشن کے لیے سیمپل لے کر جاتی ہوں۔"

"تین تین، چار چار پیز ے...... انسپکشن کے لیے، لیب میں ٹیوبز کے بجائے دیگیں رکھی ہیں

کیا۔" اس کے جتا جتا کر کہنے پر وہ کھل کر ہنسی اور ہنستی چلی گئی اسمتھ اس کے مسکراتے گال محویت سے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے لطیفہ سنایا ہے؟"

"لطیفہ میں سناؤں گی۔" وہ محظوظ ہو کر بولی۔

"تمہارے کھانے اتنے معیاری نہیں ہوتے کہ میں اپنی لیب ٹیوبز خراب کروں...... وہ تو سزائے موت پانے والے قیدیوں کی پارٹی پر بھیجے جاتے ہیں، تاکہ پتا چلے کس پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔" ویٹرس نے اس کے پاس نئی تیار کردہ ریسپی کے پیزے لا کر رکھے تھے۔

"اب تم مجھ سے مار کھاؤ گی۔" وہ مصنوعی ڈپٹتے ہوئے آگے جھکا...... میں اپنی دوستی کو بزنس سے الگ رکھتا ہوں، سمجھیں......!"

"ہاں ہاں بالکل۔" میرڈین نے پیزا اپنی جانب کھسکاتے میز کی سطح پہ کہنیاں جمائیں ادا سے ہاتھ موڑتے اس پر ٹھوڑی ٹکائی۔ اس کی سبز آنکھیں اسمتھ کی سیاہ آنکھوں پہ جمی تھیں۔ وہ بے نیازی سے بولی۔ "لیکن اسمتھ اور میرڈین دو ایسی چیزیں ہیں جو دوستی سے بہت آگے ہیں۔ اس لیے ان کا کچھ الگ نہیں ہو سکتا۔" اس کے جملے سے اسمتھ کے گالوں پر مسکراہٹ رینگتے رینگتے پھیل گئی۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے پر جمی تھیں اور محبت کا نرم تاثر ابھر رہا تھا۔ چند پل خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اسمتھ نے سرگوشانہ انداز میں کہا تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی۔" میرڈین کے مسکراہٹ میں پھیلے ہونٹ مزید پھیل گئے سبز آنکھوں میں اقرار کی چمک ابھری مگر وہ میرڈین کیا جو آرام سے اقرار کر لے...... اس نے اسمتھ کو زچ کرنے کے انداز میں نفی میں سر ہلاتے کہا۔

"اگر انکار کروں تو۔" مقابل بھی ہنسوز، شوخیلا اسمتھ تھا فوراً ٹیبل سے ہاتھ اٹھاتے قدرے پیچھے ہوا کرسی کی بیک سے پشت جما کر بیٹھا تھا۔

"تو میں شکر کروں گا...... میری ایک چورنی سے جان چھوٹ گئی۔"

"واٹ۔" وہ شاکنگ انداز میں چلائی تھی اور اگلے ہی پل تازہ پیزا اسمتھ کے چہرے پر چپکا ہوا تھا اور پھر دونوں نے قہقہے مار مار کر اپنے احمق ہونے کا کچھ دیر ثبوت دیا تھا۔ پیزا چپکے چہرے کے ساتھ وہ اس وقت کہیں سے بھی پیزا ہٹ کا آنر نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ بہت اپنا اور بہت قریب محسوس ہوا تھا لیکن اس وقت پیزا ہٹ کے ہال میں میز پر بیٹھی تنہا میرڈین کو ٹرانسپرنٹ آفس میں بند اسمتھ بہت دور ...... بہت دور لگ رہا تھا خاص کر جب وہ اس سیاہ فام کے ہنسنے پر کھلکھلاتا۔

میرڈین کا جی چاہا کوئی چیز اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارے کم از کم اگلے چند دانت تو توڑ ہی دے۔ بہت انتظار کے بعد وہ کرسی دھکیل کر اٹھی اپنا بڑا سا ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکایا اور جانے کے ارادے سے آگے بڑھی تھی۔

☆☆☆

ٹھٹھرتی سردی کی اس شام نے ہر جانب اپنی سیاہی اتار دی تھی۔ تمام در و دیوار اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ سیاہ گھپ، سر دسناتا اور ہڈیوں کو منجمد کر دینے والی اس خوف ناک سردی میں آئمہ بیگم کا تن من اپنی دہکائی آگ میں جھلس گیا تھا۔ جھلسے بدبودار کوئلہ نما بدن سے دھوئیں کا تعفن پھوٹنے لگا تھا۔ یہ ان کی اپنی بچھائی بساط تھی۔ اور اس بساط میں سیاہ و سفید کی مالک بنی کسی سلطانہ کی طرح سلطنت چلا رہی تھیں مہرے ہلاتے ہی تمام بساط ان پر ہی الٹ دی گئی۔ دوسروں کو گرم جھونکوں کے سپرد کرتے ہوئے ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گرد باد بھی بنائے ہیں جس میں اگر پھنس جاؤ تو پہلے وجود دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے پھر دور بہت دور پھینک دیا جاتا ہے۔ بالکل ویسے ہی گرم لو آئمہ بیگم نے چلائی تھی گرد باد میں اللہ نے بدل دی اور اب وہ اس میں پھنسی، پٹی اور دور پھینک دی گئیں جو ہولی انہوں نے پانچ سال پہلے منائی تھی اسے رنگ اب اللہ نے چڑھائے تھے صدمے سے ان کا ذہن بالکل الٹ چکا تھا۔ انہیں دیکھ کر کسی پاگل کا گمان اگر ہوتا تو غلط نہیں تھا۔

جیسے ہی ایمبولنس حویلی کے گیٹ سے اندر

داخل ہوئی، حویلی میں قیامت مچ گئی تھی۔ جب جیپ کھیتوں میں گری، گرتے ہی اس کے آئل کنٹینرز سے آئل رسنے لگا، جس نے فوراً آگ پکڑ لی ازلان شدید زخمی ہوا تھا جلتی جیپ سے باہر بھی نہ نکل سکا۔ ارد گرد کتنے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ جن کی مدد سے اسے جلا بجھا سہی مگر زندہ جیپ سے نکال لیا تھا اور فوراً شہر اسپتال پہنچایا گیا۔ حویلی اطلاع دے دی گئی۔ خبر سنتے ہوئے حنبل کو اپنا دل باقاعدہ چھری سے کٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ فوراً اسپتال کی جانب نکلا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ازلان جا چکا تھا۔ تکلیف، صدمہ، اذیت یہ لفظ بہت چھوٹے اور بے معنی ہو گئے تھے حنبل کے احساسات کے آگے جب وہ اس کی ایمبولنس کے ساتھ حویلی پہنچا تھا۔ میرزکا لاہور میں سی۔ ایم (وزیراعظم) سے اپنی اہم میٹنگ چھوڑ کر بھاگے۔ خیام کو ڈیرے سے لانا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ تو اس گھر کے مضبوط مردوں کا حال تھا جن کی اگلی نسل کا اکلوتا نقش مٹ گیا تھا اور عورتیں...... اعشال کو زینب پکڑ کر لاؤنج سے باہر لا رہی تھی وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر ہی دھم سے بیٹھ گئی تھی تھر کی طرح پیاسی آنکھیں تھیں، منہ سوکھ کر کھلا۔ وہ ساکت بیٹھی لوگوں کے بڑھتے ہجوم کو دیکھے جا رہی تھی۔

آئمہ بیگم کا رویہ بالکل فطری انسان کا تھا جسے باہوش و حواس کند چھری سے کاٹا جا رہا ہو اور وہ تڑپ تڑپ جائے۔ وہ اس کی چارپائی کی پٹی پکڑے اس پر گر گر جا رہی تھیں۔ سلویٰ کو انہیں قابو کرنا مشکل ہو گیا تھا اور سبرینہ صحن کے کونے میں بیٹھی صرف آسمان کو دیکھ رہی تھی بالکل ایسے جیسے وہاں سے اسے اللہ کی غضب ناکی نظر آ رہی ہو۔ حنبل کو آئمہ کی پل پل بگڑتی حالت کا پتا چلا تو زینب سے کہا تھا۔

"انہیں وہاں سے اٹھا کر، کسی طرح لاؤنج میں لاؤ۔"

بے حد مشکل سے سہی مگر زینب، سلویٰ، خالہ گلزاری۔ انہیں کھینچ کر لاؤنج تک لے آئی تھیں۔

وہاں خیام صوفے پر ڈھے ہوئے تھے حنبل پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر فوراً تھام لیا۔

"کیوں کر رہی ہیں آپ ایسے...... اس نے بہت تکلیف سے جان دی ہے، چیخ چلا کر اسے مزید تکلیف مت دیں۔"

"اسے تکلیف کیوں ہوئی...... مجرم تو میں ہوں حنبل۔" وہ زور سے چلائی تھیں۔ "حنبل وہ تیری بات مانتا ہے تو اسے اٹھا۔ وہ اٹھ جائے گا۔ وہ مجھ سے ناراض نکلا تھا میں اس کی ہر بات مان لوں گی میں سب سے معافی مانگ لوں گی۔ میرا ازلان مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

ان کی شدت سے گریہ زاری پر حنبل نے ان کے گرد اپنی بازو لپیٹ دیے۔ اس کی اپنی آواز گھٹ گئی تھی لفظ نکلنے مشکل ہو رہے تھے۔

"پلیز۔" وہ ہذیانی جھٹکے سے اس کے حصار سے باہر نکلیں۔

"حنبل...... مجرم میں ہوں...... سزا مجھے ملے نا...... ازلان کا کوئی قصور نہیں۔" انہوں نے ایک دم حنبل کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "خدا کے واسطے مجھے معاف کر دے۔ کسی طرح میرے ازلان کو اٹھا دے...... میں روائیہ کے پاؤں پکڑ لوں گی۔"

سلویٰ تحیر کا جھٹکا کھا کر دو قدم پیچھے ہوئی تھی اسے اندازہ نہیں تھا اس کی اتنی سمجھ دار آپا مصیبت پڑنے پر سب کچھ اپنے منہ سے اگل دیں گی۔ اس نے اپنی حیرت پر لمحے میں قابو پایا۔ کیوں کہ ابھی تک حنبل آئمہ بیگم کی ذہنی کیفیت پر ترس کھا رہا تھا۔ سلویٰ بہن سے لپٹتے ہوئے انہیں وہاں سے ہٹانے لگی تھی لیکن آئمہ نے ہیجان میں اسے پرے دھکا دیا تھا۔

"دور ہٹ جا، مجھ سے کم بخت...... یہ سب تیرا کیا دھرا ہے۔" پھر حنبل کی جانب دیکھتے ہوئے انگشت سے سلویٰ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا ...... اس کا بویا فتور ہے یہ۔"

"بھرجائی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" حنبل کا دلاسا دیتا انداز آئمہ کے کانوں میں نہیں جا رہا تھا وہ تو سفید کپڑوں میں لپٹے بیٹے کو دیکھ کر تمام حواس کھو بیٹھی

تھیں اور سلویٰ سب سے بڑی دشمن محسوس ہو رہی تھی۔

"اس نے میرے دماغ میں فتور ڈالا تھا۔ حنبل اس نے کہا تھا، ازلان کا شریک دنیا میں آنے والا ہے، ازلان کا حصہ دار برابر کھڑا ہونے والا ہے۔ یہ کہتی رہی مجھ سے...... سب کچھ اس کا منصوبہ تھا۔

روائیہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بے گناہ ہے حنبل...... میں اس کے پاؤں پکڑلوں گی حنبل...... جو تجھے پتا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے اس کا چندا سا بچہ چھینا میرا اپلا پلایا اللہ نے چھین لیا ہے...... وہ بھی جب، جب سہرا سجنے والا تھا۔"

وہ بدحواسی میں جانے کیا سے کیا کہتیں زمین پر بیٹھ گئیں اور اپنا سر میز کے کنارے پر مار رہی تھیں۔ وہاں پر بیٹھے کھڑے تمام افراد ورطہ حیرت تھے۔ سلویٰ خوف زدگی سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی دیوار سے جا لگی۔ خالہ گلزاری نے تو جیسے ہی سنا تھا انہیں چھپنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی کہ اب ان کا کیا بنے گا۔ اعشال نے لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا ماں کے منہ سے اتنی بری سفاکیت سن کر اسے باقی افراد کی زندگی خطرے میں لگی تھی۔ خیام ذکا، میر ذکا گم صم تھے سو تھے، حنبل جوں کا توں کھڑا تھا زمین ہی نہیں در و دیوار، چھت آسمان ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹتی ہوئی محسوس ہوئی نظریں اس کی بھر جاتی پر تھیں دکھائی اسے شدید ٹھاٹھیں مارتا سیلاب آ رہا تھا جس کی ہر چھل پہلی سے زیادہ اونچی آتی خوف ناک غراہٹ کے ساتھ۔ آئمہ بیگم چپ نہیں کر رہی تھیں اپنے منہ پر تھپڑ مارتے، شدت غم سے گردن زور زور سے پیچھے کو پھینکتے تمام اعتراف کر رہی تھیں۔ ان کا دماغ پانچ سال پیچھے جا رہا تھا۔

روائیہ کو ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور ان کی گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ روائیہ نے ازلان کے ساتھ جانے کے بجائے ہدایت اللہ کے ساتھ جانے کو ترجیح دی تھی۔ آئمہ نے ہی سلویٰ کو منتیں کر کے ساتھ جانے کا کہا تھا۔ کاش وہ تب سلویٰ کو نا بھیجتیں۔ انہیں اس کے اندر کی جلن کا پتا تو تھا پھر بھی غلطی کر گئیں۔ وہاں اسپتال میں ہی اسے گھبرائی پریشان سبرینہ ملی تھی۔ اور روائیہ کی ڈاکٹر سے اشارۃً بچے کے بارے میں پوچھا تھا۔ روائیہ نے جانے سنا تھا یا نہیں وہ فائل اٹھا کر باہر آ گئی تھی البتہ سلویٰ کٹیلی نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا جب اس کے ذہن نے منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اور آئمہ ڈپٹ کر بولی تھیں۔

"تو پاگل ہوگئی ہے کیا......"

"جی آج آپ پاگل کہہ رہی ہیں، کل عقل مند ہی کہیں گی جب ازلان کے برابر کھڑا ہو کر زمین کا بٹوارہ کروائے گا...... اور آپ کا بیٹا تو خیر ویسے ہی بے وقوف ہے، آدھا بھی وہ لے سکے تو بڑے بات ہے۔ جس چالاک باپ کی اولاد دنیا میں آ رہی ہے ناں...... اس سے کئی گنا آگے ہی ہوگی۔"

"حنبل ازلان کی جان جیتا ہے۔" آئمہ نے دلیل دی۔ سلویٰ نے ناک سے مکھی اڑانے کے انداز میں ہونہہ کہا۔

"اپنی اولاد سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔" آئمہ تو اس کی بات پر چپ سی تھیں وقت آنے پر دیکھا جائے گا مگر سلویٰ باز نہیں آئی تھی اس کے اندر کا حسد چین نہیں لینے دے رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا اس بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم کروا دے اور حنبل بے اولاد رہے، آخر اسے ٹھکرانے کی کوئی تو کسک ہو اور جب سبرینہ کی دن بدن بگڑتی صحت اور پریشانی کا پتا چلا تھا تو دماغ الگ راستے پر چل پڑا تھا۔

"کیا تو فضول باتیں کرتی رہتی ہے سلویٰ...... میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔"

"اس لیے نہیں آتیں آپ کے دماغ پر دیور کی محبت نے پٹی باندھی ہوئی ہے۔" اس پٹی نے تو بہن کی بے عزتی محسوس نہیں ہونے دی۔"

"یہ بات مت کر سلویٰ...... تجھے کیا پتا کتنی تکلیف ہوئی تھی اس رشتے پر مجھے، میری بہن کو ٹھکرا کر اسے لایا گیا تھا...... مگر میں ان لوگوں سے نہیں ہوں جو شور ڈال ڈال کر اپنا دکھ ہر کسی کے آگے گا کر بدنام ہوں۔ میں نے اس گھر پر، گھر والوں پر حکومت کرلی ہے اور حاکم اگر منافق ہو تاں کوئی اس کے خلاف نہیں اٹھتا، وہ اپنی منافقت سے سب دبائے رکھتا ہے۔"

"اچھا...... !وہ استہزا میں ہنسی آپ کی حکومت ہی گرانے والا آنے والا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے آجانے سے آپ کی دیورانی صاحبہ مضبوط نہیں ہوں گی...... آپ میری بات لکھ کر رکھ لیں پھوپھا میر ذکا آپ کی عزت ضرور کرتے ہیں لیکن محبت اپنی بیگم سے ہی ہے اور وارث آجانے کے بعد آپ خود رنگ دیکھ لیتا ان کے...... اور وہ حنبل!"

حنبل کا نام لیتے ہی اس کا منہ کڑوے پانی سے بھر گیا

"وہ تو پہلے ہی حسینہ کا دیوانہ ہے۔ خیر آپ کی مرضی، میں تو یہ چاہ رہی تھی کسی کا بھلا ہو جاتا آپ کا بھی خطرہ ٹلتا...... اور ویسے بھی اسی کے باپ نے پھوپھی حاجرہ کی زندگی میں زہر گھولا تھا۔ اگر بیٹی کفارہ ادا کردے گی تو کیا حرج ہے۔ انت بھلا سو بھلا...... کسی کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا۔"

آئمہ بیگم خاموش رہیں حکمرانی ان کی فطرت میں تھی جو ابھی تک قائم بھی تھی مزید مقابل کو دبا کر مضبوط کی جا سکتی تھی۔ سو ان کے خاموش اشارے سلویٰ کے منصوبے میں آسانی پیدا کرتے رہے اور اللہ کی ڈھیل کو کامیابی سمجھتی رہیں۔ حالانکہ اللہ کی ڈھیل کامیابی نہیں مہلت ہوتی ہے اور انسان مہلت کو حق سمجھتا ہے۔ کتنا بے وقوف ہے ناں انسان حق سمجھ کر خدائی دعوے کرتا ہے اور جب اللہ کی خدائی جلال میں عود کر آتی ہے تو آباد بستیاں ان ہی سرکشوں پر الٹ دی جاتی ہیں یا جل تھل کر کے ہر چیز پانی بن جاتی ہے بار بار سرکشوں کی مثالیں سامنے کھلی ہیں۔ مگر بجتی مٹی سے بنا انسان اس قدر اکڑ چکا ہے جسے توڑنے کے لیے چھوٹے وار نہیں بڑے بڑے وار لگانے پڑتے ہیں جیسے آئمہ پر بہت بڑا وار ہوا تھا۔

ان کی خواہش تھی اس حویلی پر ان کی راج دھانی رہے، وارث اکلوتا ازلان ہی رہے۔ وارث اکلوتا ہی رہا مگر اللہ نے اس کا وجود بدل دیا تھا۔

روائیہ سے محبت جتا جتا کر حنبل کو جتنا انہوں نے مقروض کر لیا تھا اگر وہ یہ سب کچھ کسی اور کے منہ سے سنتا تو کبھی یقین نہ کرتا مگر یہ تو مجرم اپنے منہ سے اعتراف کر رہا تھا۔ رو رو کر، پیٹ پیٹ کر وہ ہذیانی کیفیت میں یہ تک بتا گئیں۔ اپنے آپ کو بچانے کے چکر میں جندب پر شک ڈالا...... ورنہ لڑائی جھگڑے میں ڈاکٹر خود بول پڑتی۔"

"حنبل مجھے معاف کر...... خدا کے لیے کوئی ازلان کو اٹھا دے۔ میں سب سے معافی مانگ لوں گی۔" وہ ایک ہی بات دہرا کر اپنا آپ نوچتی رہیں اور حنبل ایسا پتھر کا بنا کھڑا تھا کہ اکلوتے بھتیجے کو کندھا دینا تک مشکل ہو گیا تھا۔ پہلی بار زندگی میں اسے اپنے قدموں میں واضح لرزش محسوس ہوئی تھی۔ روائیہ کا بھیگا چہرہ، نفی میں ہلتا سر اور اس کے کندھے پر مدد کے لیے بڑھتا کانپتا ہاتھ...... حنبل کو لگ رہا تھا یہ سب مناظر مل کر آج اسے قبر میں اتار رہے ہیں۔ وہ چاہنے کے باوجود اپنے اوپر گرتی منوں مٹی ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ وہ چلانا چاہ رہا تھا چیخنا چاہ رہا تھا۔ ویسی ہی دھاڑ جیسی اس کے اندر سے نکلتی تھی جس سے حویلی کانپ جاتی تھی مگر اب پورا زور ہونے کے باوجود سب مفقود تھا۔ میر ذکا کا کبھی کا کہا جملہ۔

"اتنا غصہ مت کیا کر، یہ تجھے برباد کردے گا۔"

ہاں وہ برباد ہو گیا تھا۔ کسی کے ہاتھوں تو کیا ہونا تھا۔ اسے تو اپنے غصے نے برباد کیا تھا۔ سارا زمانہ مل کر زور لگا لیتا روائیہ بری ہے۔ لیکن وہ تو اسے جانتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہلنے والی، فوراً سے گھبرا جانے والی اس کی بیوی' معصوم تو ہو سکتی ہے، ایسا گناہ کیسے کر سکتی ہے، مگر اس کے غصے نے ساری عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔

غصہ حرام ہے، جب حرام چیز خون کو حرارت بخشے گی تو بہت سی غلطیاں تو ہوں گی۔ غصے میں دلیلوں کے راستے شیطان بہت روشن ہوتا ہے، اس کا دکھایا جھوٹ سچ پر چھا کر جگمگا جاتا ہے۔ وہی جگمگاہٹ تو آگ ہے، جس تک لے جانے کی ابلیس نے اللہ سے شرط لگا رکھی ہے، غصے میں قتل ہوتے ہیں، غصے میں طلاق ہوتی ہے، غصے میں خودکشی ہوتی ہے، غصے میں قطع رحمی ہوتی ہے۔ آہ یہ غصہ......! ہر صورت انسان کا تعلق انسان سے توڑتا ہے یہ غصہ...... اسی لیے تو اس سے بچنے کے طریقے بتائے گئے ہیں، بیٹھ جاؤ، چپ کر جاؤ، پانی پیو...... تاکہ اللہ کی بنائی اچھائی حرارت کو قابو کرے اور حنبل میں سب اچھائیاں تھیں سب کر سکتا تھا سوائے غصے کو قابو کرنے کے اس کا غصہ بولتا نہیں تھا کھنک کھنک کر بجتا تھا۔ سب کا خیال تھا اس کا غصہ سب کچھ ٹھیک کر سکتا ہے، حالانکہ حرام چیز کب کچھ ٹھیک کر سکی ہے، کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا سب تلپٹ ہو گیا تھا سب کچھ...... حنبل کا سب کچھ...... آہ!

☆☆☆

وہ چند قدم آگے بڑھی تھی ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ اب وہ کھڑا تھا اور وہ لڑکی بھی، ایسے لگتا تھا کہیں جانے کے لیے نکلنے والے ہوں۔ میرڈین کے اندر بہت کچھ چھن سے ٹوٹا۔ سست روی سے گاہکوں سے بھرے ہال کے درمیان وہ چلتی بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ دل بار بار اکسا رہا تھا پلٹ کر دیکھے اب وہ کیا کر رہا ہے، یقیناً اس سیاہ فام کا ہاتھ پکڑے آفس سے باہر نکل رہا ہوگا۔ وہ بہت خوش ہوگا اسے اس کی ہم نسل لڑکی مل گئی۔ جو اپنی باتوں سے اس کا دل بہلا لیتی ہے، میں تو ہر وقت جھگڑتی ہی تھی اس کے پرپوزل کو بھی ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ شاید وہ اس کا پرپوزل قبول کر چکی ہو اور اب ایک اچھا دن گزارنے کی غرض سے اٹھنے لگے ہوں۔ وہ یقیناً یہاں سے کسی واٹر چینل پر جائیں اچھا ڈنر اور تفریح کے بعد فلم دیکھنے جہاں اسمتھ کو بہت شوق ہے کسی کے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھنے کا اسے وہ وقت یاد آنے لگا جب اسمتھ بار بار اسے فون کر کے کہہ رہا تھا۔

"رولیکس میں زبردست فلم لگی ہے۔"

"لیکن میرا پیپر ہے، اسمتھ مجھے تیاری کرنا ہے۔"

"بعد میں کر لینا۔" اس کا انداز ملتجی تھا۔ "پیپرز تو چلتے رہتے ہیں۔"

"فلم بھی تو چلتی رہتی ہے۔" میرڈین اس وقت پڑھنا چاہ رہی تھی مگر اسمتھ کی گفتگو التجا کا روپ دھار گئی۔

"لیکن ڈیئر میرا آج دل کر رہا ہے...... پلیز، پلیز۔"

"تمہارا دل ہر الٹے کام پر ہمکتا ہے۔ اینڈ نو پلیز اگلے فرائے ڈے پکا۔" اسمتھ نے غصے میں آ کر کال کاٹ دی تھی۔ اسے یقین تھا وہ پھر کال ملائے گا۔ جب اگلے دن بھی اس نے کال نہیں کی تو میرڈین نے خود کر لی وہ اسمتھ تھا فوراً سے مان جانے والا ہلکی پھلکی ناراضی کا اظہار کر کے مان گیا تھا۔

"اب جب تمہارا دل کرے گا، میں بھی نہیں جاؤں گا۔" یہ دھمکی اس نے ضرور دی تھی لیکن میرڈین کو پتا تھا اس کی ایسی دھمکیاں صرف اور صرف نام کی ہوتی ہیں۔ وہ ابھی اسے کہے مجھے فلاں جگہ کام ہے، تم بھی آ جاؤ یہ ممکن نہیں کہ وہ نہ آئے۔ اتنی محبت کرتا تھا میرڈین سے۔ پھر محبت کے بیچ یہ لڑکی کہاں سے آ گئی جو کئی دنوں سے مسلسل اس کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔

میرڈین سینے پر ہاتھ لپیٹے آہستہ آہستہ آگے چلتی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اس نے لمبی مسافت طے کی ہے حالانکہ وہ صرف چند قدم چلی تھی۔ ابھی تو وہ اس ہال سے بھی نہیں نکلی تھی گردن پھیر کر پیچھے دیکھنے سے خود کو روکتی بس رو دینے والی تھی۔ اس سیاہ فام لڑکی کی بھدی شکل بھی اسے کھٹک رہی تھی۔

"کتنی خوش ہوگی وہ اتنے بڑے ہوٹل کا آنر

اس پر فریفتہ ہو رہا ہے اور کچھ ہی دیر میں اسے پرپوز کرنے والا ہے۔ خوش ہونا بھی چاہیے اسے اسمتھ مل رہا ہے۔ وہ اسمتھ جو دل کا صاف اور کورا ہے، جو دل سے محبت کرتا ہے۔ وہ ہوٹل کا آنر تو اب ہوا ہے میں نے تو اسے تب چاہا جب اس کی جیب میں چند ڈالرز بھی نہیں ہوتے تھے اور تب بھی جب اس کے باپ نے اسے ایک سرد بارش میں گھر سے نکال دیا تھا کیوں کہ اس کے اخراجات ضرورت سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔

میں نے اسے اپنے روم میں جگہ دی تھی۔ اسے اپنے بیڈ پر سلایا تھا اور خود دور کارپٹ پر ایک کونے میں سو گئی تھی۔ اسمتھ کو کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ پیزا ہٹ جو آج اتنا بلند کھڑا ہے اس کی بنیاد میں میری بھی محنت شامل ہے بھلے تھوڑی لیکن میں نے کی تو تھی۔ میں کالج کا کام رات کو جاگ کر کرتی تھی دن میں اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ اگر مذاق میں کچھ شرارتیں کیں، کیا اس کی سزا یہ بنتی ہے مجھ سے کنارہ کشی کر لی جائے۔ اتنی بے وقعت تھی میں اس کی زندگی میں ...... کیا میری شرارتوں کو میری چوری سمجھتا رہا۔

سبز آنکھوں میں بھرا پانی ایسے لگ رہا تھا صبح کی سبز گھاس پر بہت سی شبنم اکٹھے آ گری ہو۔ وہ بیرونی دروازے کو دھکیل کر باہر نکل آئی اس کے بڑھتے قدموں کو یکدم بریک لگا اس کا ہینڈ بیگ کسی نے اسٹریپ سے پکڑ کر روکا تھا۔ میرڈین رکی اور گردن پھیر کر پیچھے دیکھا۔

☆☆☆

وہ صوفہ بیک پر سر پھینکے خالی خالی نگاہوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ جسم بالکل بے جان ہو چکا تھا۔ اپنا آپ اسے غیر مرئی سا لگنے لگا تھا۔ ہزار چاہنے کے باوجود کہ وہ یہاں سے اٹھے، مبرینہ سے اپنا بچہ لے روائیہ کے پاس جائے، معافی مانگے، اسے سب بتائے مگر اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ سر اٹھا سکے۔ بس بہت سا رونا چاہ رہا تھا، بے حد رونا، دماغ مختلف باتوں میں الجھ رہا تھا۔ اسے وہ رات یاد آ رہی تھی جب روائیہ حویلی چھوڑ گئی تھی، کتنی اذیت ناک تھی وہ رات! ساری رات کسی دلدل میں پھنسے وجود کی طرح ڈوبتے گزاری تھی۔ صبح ہوتے ہی آئمہ پاس آ بیٹھیں، کتنی دلیلوں سے آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے روائیہ کی محبت صاف کرنے کی کوشش کی تھی کتنی صاف گوئی سے کہا تھا۔

"کاش حنبل تو اسے لے جاتا، وہ ان عورتوں میں سے تھوڑا تھی جو مرد کے بغیر گزارہ کر لیتی ہیں۔ شروع شروع میں تو اسے بہت یاد آتا تھا، بہت بے کل رہتی تھی تیرے پاس جانے کو، پھر پتا نہیں وہ کم بخت کہاں سے یاد آ گیا...... فون پر فون، فون پر فون...... شادی پر جانے کے لیے جیسے اتاولی تھی تجھے بتا نہیں سکتی، میں کیا منع کرتی اسے، پیار سے سمجھاتی رہی...... اور جب تیرے کیس کا پتا چلا پھر تو ساری ہی بدل گئی...... تیرے آنے کی امید ہی نہ رہی ہو، اکتائی، بے زار...... کھانے کو دوڑتی...... صرف رضا حیات کی فیملی کے ساتھ ہنس کے فون پر باتیں کرتی تھی...... آہ...... اکیلی تو ڈاکٹرز کے پاس جاتی رہی، مجھے تو بتایا ہی جب تھا، جب چھپانا مشکل ہو گیا تھا، ایک ہی بات حنبل کچھ نہیں کہے گا...... میں اسے منا لوں گی...... میں مرتی کیا نہ کرتی...... اس کی اپنی جان کو خطرہ پڑ جاتا تھا اگر کچھ کر کرا دیتی...... یونہی سوچتی رہی چل میں ہی پردہ ڈال دوں گی...... اللہ تو پردہ رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے نا...... وہ کم بخت ہاسپٹل والے ٹیسٹ نہ کرواتے میں تجھے کبھی ایسی اذیت سے نہ گزارتی عمر گزر جاتی یونہی پردہ ڈالے۔"

روہانسی لہجے میں محبت جتلاتے آئمہ نے کتنی دلیلیں صفائیاں دی تھیں اور وہ سانس روکے جبڑے جمائے ساکت سا پڑا رہا تھا۔ اور اب اس کا دل رک رک جا رہا تھا آخر بھرجائی نے یہ سب کیوں کیا۔ صرف بہن کو ٹھکرانے کی سزا یا اپنی ایک پھوپھی زاد سے اتنی محبت دوسرے پھوپھی زاد کو تباہ کر دیا۔

اسے کمرے میں بند آج تیسرا دن تھا قبرستان کیسے گیا، کیسے واپس آیا، کون لایا اسے خود یاد نہیں تھا

باہر افسوس کرنے والوں میں کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے اسے کوئی خبر نہیں تھی۔ سب کو یہی پتا تھا حنبل بھتیجے کے صدمے میں ہے، زینب کتنی بار کھانا رکھ کر گئی۔ پرانا رکھا اٹھا لے جاتی نیا رکھ جاتی۔ اب جب دوپہر کو رکھنے آئی تو وہاں ہی کارپٹ پر بیٹھ گئی چپ خاموش "کچھ دیر لفظوں کی ادھیڑ بن کے بعد بولی تھی۔

"صاحب جی......!"

حنبل نے چونک کر دیکھا تھا۔ کتنی ضعیف، بیمار لگ رہی تھی وہ...... اسے پانچ سال پہلے والی زینب یاد آ گئی تب بھی وہ ایسے ہی پاس آ کر بیٹھی تھی۔ تب یہ نمک حلالی کی کمائی قسمیں کھا رہی تھی۔ اس کا میں نے کیا بگاڑا تھا۔ اس نے کس چیز کا بدلا لیا حنبل کی نگاہ میں کاٹ ابھر آئی۔ زینب نے شرمساری سے سر جھکائے گھٹنے سمیٹے اور اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا لی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آہستگی سے بولنے لگی اس کے لہجے میں پچھتاوے تھے۔

"صاحب جی...... میں سمجھتی رہی میری اجڑی زندگی میرے گناہ کی سزا ہے، جس رات مجھے قمرالدین نے دھتکارا اس رات مجھے روائیہ بی بی یاد آئی تھیں، لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتی تھی جو کچھ میں نے اس روز آپ سے کہا تھا۔ اس میں بس تھوڑا ہی غلط تھا اور وہ غلط فہمی میں نے کسی کے کہنے میں آ کر نہیں کیا تھا۔"

حنبل نے ناگواری سے آنکھیں بند کر لیں جیسے اس کی بات سننا نہ چاہتا ہو۔ مگر وہ دیکھ کب رہی تھی اپنی روانی میں بولے جا رہی تھی۔ "وہ کیا کہتے ہیں ناں دل...... بس اس دل کے کہنے میں آ کر۔"

حنبل کی آنکھیں کھل گئیں مگر تک چھت رہا تھا اور کانوں میں اس کی آواز تھی غم زدہ شرمندگی سے بوجھل...... "دل تو دل ہے ناں...... مالک غلام سب کا ایک جیسا، نرم گرم...... سرخ خون سے بھرا اس میں ایک سی خواہشیں ہوتی ہیں...... یہ امارت و غربت کے فرق نہیں سمجھتا۔" اس کے جملوں سے حنبل کی آنکھوں میں انہونا تحیر ابھرا "بس اس دل نے کہا تھوڑا سا لفظوں کو بدل دے شاید تیرا کام بن جائے...... لیکن صاحب جی میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے اسے ان کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا، لیکن وہ جندب نہیں تھا۔"

حنبل کے ماتھے پر حیرانگی کی شکنیں گہری ہوئیں۔ "اور نہ ہی وہ رضا صاحب کا گھر تھا اپنی حویلی......" وہ کہہ کر پل بھر کو رکی حنبل کو بھی اچنبھا ہوا "اپنی حویلی کی بات ہے...... آپ کو گئے مشکل سے مہینہ ڈیڑھ ہی ہوا تھا...... آدھی رات کے وقت...... میں تو جی برآمدے کی لائٹ بند کرنے گئی تھی بی بی کے کمرے کا پردہ ہٹا ہوا تھا...... میں نے خود ازلان صاحب کو ان سے دست درازی کرتے دیکھا تھا۔"

حنبل کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک کھل گئی تھیں سر میکانکی انداز میں صوفہ بیک سے ہٹا کر سیدھا ہوا "مرے شخص کے بارے میں بات کرنا ہے تو برا...... لیکن جی۔" جو اس نے دیکھا وہ آہستہ آہستہ سب بتا رہی۔ "میں نے تو جی بس اتنا ہی دیکھا تھا پھر انہوں نے فون اٹھا کر ان پر پھینکا تھا۔ میرے پاؤں سے گملا گر گیا تھا جی، وہ یک لخت باہر نکل آئے۔ میں وہاں سے ہٹ گئی تھی...... آئمہ باجی کو سارا پتا ہے۔ وہ اچانک آ گئی تھیں۔ میں تو نوکر ذات ہوں نا...... کچھ بول بھی نہیں سکتی۔ صاحب جی مجھے اتنا پتا ہے اس رات کے بعد روائیہ بی بی بہت ڈری رہتی تھیں...... ازلان صاحب سے کتراتی تھیں شاید اسی لیے شادی پہ ساتھ نہ لے گئی ہوں...... میں نے دیکھا تھا ان کے آتے ہی وہ کمرے میں بند ہو جاتی تھیں۔"

حنبل کو ایسے لگ رہا تھا اس کے دماغ میں کوئی مسلسل کیلیں ٹھوکے جا رہا ہو تکلیف سے اسے سانس آنا مشکل ہو رہا تھا اس کا دل کیا زینب کا گلا گھونٹ دے۔ اسے چپ کروا دے یا وہ اسی وقت مر جائے۔ آخر وہ جرمنی سے آیا ہی کیوں؟ اتنے بڑے بڑے دھماکے کیا ضروری تھا اسے پتا چلتے؟ ماضی کی گرد نے جو ڈھانپ دیا سو ڈھانپا رہتا؟ یہ سچ تھا وہ حقیقت جاننے کے لیے اللہ سے فریاد کرتا تھا مگر اتنی تلخیاں حقیقت میں...... کبھی بھی نہیں، حنبل کو لگا اس کا وجود مردہ ہو رہا ہے اور اسے آخری ہچکی آنے والی ہے۔ مگر زینب بولے جا رہی تھی۔

"وہ بات بھی سچ تھی جب وہ رات میں جندب صاحب کے کمرے سے نکلیں۔ تحفے تھے ان کے ہاتھ میں...... میں نہیں جانتی کیا سچ تھا کیا جھوٹ البتہ جب میں تحفے ان کے کمرے میں دینے گئی۔ وہ آپ سے فون پر بات کرتے ہوئے بہت رو رہی تھیں۔ میں نے اس روز لفظوں کی ردوبدل کی...... میں سمجھتی تھی اللہ نے مجھے اجاڑ کر اس کی سزا دی۔ لیکن رات اماں نے بتایا...... انہیں تو ساری باتیں پتا ہیں۔ بچہ تو ان کے سامنے تبدیل ہوا تھا۔ اماں کو آئمہ باجی نے مستقل اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا...... ماں باپ کے گناہوں کی سزا کچھ تو اولاد بھگتی ہے ناں جی۔ کچھ میری سزا، کچھ میری اماں کی...... میں اجڑ کر بھگت رہی ہوں...... لیکن جی ازلان صاحب......"

"زینب چپ کر جاؤ۔" کھنچتی ہوئی سانسوں کے درمیان حنبل دھاڑ کر ایسے بے دم ہوا جیسے کوئی استھما کا پرانا مریض ہو۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا سانس کھینچ کھینچ کر آ رہی تھی۔ زینب نے اٹھ کر پانی پکڑایا اس نے ہاتھ سے گلاس پرے دے مارا۔ گلاس کرچیوں میں بکھر گیا۔ ہر طرف کانچ کے نوکیلے ٹکڑے چمک رہے تھے، حنبل کو لگا وہ ان ٹکڑوں کی نوکوں پر رقص کر رہا ہے۔ زینب نے جلدی جلدی کانچ سمیٹا اور باہر نکل گئی۔

حنبل اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے بیٹھا تھا رگیں ایسے تنی تھیں جیسے خون کے پریشر سے پھٹ جائیں گی۔ جو کچھ زینب کہہ کر گئی تھی اس کے سترویں حصے پر بھی اسے یقین نہ آتا اگر اس کے ذہن میں ازلان کے ذومعنی شرمندگی و معافی جیسے جملے نہ گونجنے لگتے۔

"کفارہ ادا کرنے 'بتا دیجیے گا میں، ہم سب کا کفارہ ادا کرنے اسلام آباد جا رہا ہوں۔"

"چاچو...... مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" پھر اس نے بات بدل دی تھی جو کہنا چاہتا تھا کہہ نہیں پایا تھا۔ اور جب اس کے بائیں ہاتھ کا پوچھا کتنا عجیب جواب تھا۔

"جب ہم اپنے مقام کو بھول جائیں، حادثات سزا کے طور پر ہوتے ہیں۔ بس سزا ہے یہ۔"

"کیا کیا تھا اس نے...... کیسی سزا؟ حنبل کا ذہن الجھتا جا رہا تھا انہی الجھنوں میں ازلان کے جملے بازگشت کی طرح گڈمڈ ہونے لگے۔

"ہوتی ہیں کچھ غلطیاں، خطائیں، گناہ، معافی مانگ لینی چاہیے، ہو سکتا ہے کبھی ماضی میں کرنے کی کوشش کی ہو، آپ نہیں جانتے ہو۔"

"ازلان......! زور سے چلاتے حنبل نے اپنا سر صوفے کی بیک پر پٹخا اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ اس کی زندگی میں شاید ایسا پہلی بار ہوا تھا اسے بے تحاشا رونا آ رہا تھا اپنی بے بسی پر، اپنی بے حسی پر...... اپنی سفاکیت پر...... آنکھوں کے دونوں کناروں سے بہتے پانی کے بیچ اب اسے بہت اچھی طرح یاد آ رہا تھا۔ وہ شادی پر جانے سے پہلے ہی کچھ اور طرح سے باتیں کرنے لگ گئی تھی۔ اس کی باتوں میں خوف بڑھ گیا تھا اسے بار بار بلاتی تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ازلان کے نام پر درشتی سے بولتی تھی۔

"اف میں کیوں نہ سمجھ سکا۔"

ہچکیوں کے درمیان اس کی خود کلامی جاری تھی

"میں نے اسے اس وقت تنہا کیا، جس وقت اسے سب سے زیادہ میری ضرورت تھی، اس نے کتنے مان سے اسپتال میں میرا بازو پکڑا تھا۔ میرے غصے پر وہ حیران تھی...... یا اللہ وہ سوری کس چیز کی کر رہی تھی...... کیا میں اس قابل ہوں اس سے پوچھ سکوں اس کا سامنا کر سکوں۔ جن لوگوں پر اعتبار کر کے اسے تنہا چھوڑ گیا تھا، کیا کیا انہوں نے اس کے ساتھ، اولاد تک چھین لی۔ کیا اب کوئی معافی کے قابل ہے۔ ان سب کا کفارہ ہو سکتا ہے۔" پھر اسے وہ دن یاد آیا جب وہ اسے فون کر رہی تھی۔ اس نے ازلان سے بات نہیں کی تھی اور میں نے خود کیا کیا۔ اس کی بات تک سننا

گوارہ نہیں کی...... کیا اب وہ میری بات سنے گی...... تھوک دے گی میرے منہ پر، پتا نہیں کس حال میں ہوگی...... نکاح کے وقت رضا حیات کو میں نے کتنے اعتماد سے کہا تھا۔

''آپ بے فکر رہیں آپ کی بیٹی اب میری بیوی ہے'' کون سا اس کا حق ادا کیا میں نے ...... لباس، خوراک صرف یہ تو بیوی کو نہیں چاہیے ہوتا...... اسے تحفظ بھی چاہیے ہوتا ہے، کیا کیا اس کے تحفظ کے لیے میں نے، مجھے ایک زمانہ عقل مند سمجھتا ہے، سب ٹھیک کر دینے والا...... بھلا ایک غصے میں پاگل انسان کبھی کچھ ٹھیک کر سکا ہے، وہ خود کو ٹھیک نہیں کر سکتا، کسی کو کیا کرے گا، بات تو تحمل کی ہے۔ مجھ سے زیادہ عقل تو موچی نذیر کو ہے...... جو لعنت بھیجتا ہے ایسی مردانگی پر جو عورت کو صفائی کا موقع نہ دے۔ ''لعنت ہے تمہاری مردانگی پر حنبل ...... لعنت، تف ہے تم پر......''

وہ اپنا سر بے طرح صوفہ کی بیک پر مارتے خود کو کوسنے لگا تھا۔ پرانا حنبل تو پانچ سال پہلے ہی دم توڑ گیا تھا لیکن تب غم و غصے کو بمشکل دبا رکھا تھا مگر آج شرمندگی خفت نے بالکل چر مر کر دیا اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی اسے اب یاد آنے لگا تھا وہ چمن توڑ کر گئی تھی، گلدان پٹخ کر گئی تھی، وہ سب ختم ہی تو کر گئی تھی۔ یک دم اسے ظہیر تقی یاد آیا۔

''ظہیر تقی خدا تمہیں کبھی معاف نہ کرے، تمہاری وجہ سے میں واپس نہ آ سکا ...... کاش اس آفیسر کی جگہ تم مجھے مار دیتے، کاش میں مر جاتا یہ سب کچھ یوں سننا نہ پڑتا...... ابھی اللہ جانے اور کیا کیا کچھ ہوا ہوگا اس کے ساتھ۔''

وہ جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا بے دردی سے آنسو صاف کیے ناک بری طرح سے رگڑ دی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت دیر شاور لے کر تازہ دم ہو کر باہر نکلا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے بال بنائے اسپرے کیا، والٹ، پاسپورٹ اٹھا کر پاکٹ میں ڈالا اور اپنی واچ پر ٹائم درست کرتے ہوئے کپڑوں کی الماری کی جانب بڑھا اپنے مختصر سامان کا بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکلا تھا۔ وہ ابھی چند قدم چلا تھا سامنے سے سلویٰ اسی کے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی ایک ادا سے گردن اکڑائے پاؤں جما کر رکھتی۔

اسے دیکھتے ہی حنبل کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اگر وہ اس وقت خود پر قابو کھو دیتا تو یقیناً چند منٹ بعد سلویٰ ٹکڑوں میں بٹی حویلی کے کتوں کے آگے ہوتی۔

وہ ماتھے پر تیوری ڈالے تند نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پاس آ رکی......!

''اب جب تمہیں سچ پتا چل ہی چکا ہے، تو میں نے سوچا تم سے مل ہی آؤں۔'' وہ جواباً کچھ نہیں بولا بس جبڑوں کا آپس میں دباؤ بڑھ گیا تھا ہاتھ میں پکڑے بیگ کا ہینڈل سختی میں ٹوٹنے کو ہو گیا۔

''یہ مت سمجھنا حنبل میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔''

''ہونہہ......'' حنبل استہزا میں بولا تھا ''تم اس لفظ کو ادا کرنے کے قابل ہو......؟'' اس کا چبھتا لہجہ سلویٰ کو انی کی طرح لگا گھورنے کے انداز میں دیکھنے لگی۔

''تمہارے لیے تو یہی سزا بہت ہے، اللہ نے تمہیں ماں جیسے رتبے کے قابل ہی نہیں سمجھا۔''

''میری بات یاد رکھنا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا بالکل اس کے قریب ہو گیا تھا ''تمہارے کان معصوم قلقاریوں کے لیے ترسیں گے، تاحیات۔''

''بد دعا دے رہے ہو۔'' وہ اکڑ کر بولی۔

''نہیں التجا کر رہا ہوں، رب سے۔'' وہ کہہ کر آگے کی جانب بڑھ گیا۔ سلویٰ کو اس کے جملے تیر کی طرح کاٹ گئے تھے دونوں کا رخ مخالف سمت تھا اور وہ رخ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

''میری بات سنتے جاؤ حنبل ذکا۔'' حنبل کا اٹھتا قدم رک گیا، رخ نہیں پھیرا ''عورت کو مرد سے ہارنے میں فطری لطف آتا ہے، مگر مچھ کے آنسو

بہاتی رہے مگر اندر سے پسند کرتی ہے اس ہار کو...... لیکن اگر مرد اسے دوسری عورت سے مات دے، تو وہ ناگن بن کر مقابلہ کرتی ہے۔'' حنبل ایڑھی کے بل گھوما دو قدم واپس آ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھ کر کہا تھا۔

''پھر تیار رہو...... ناگن سر کچلوا کر مرتی ہے۔''

''اچھا!'' وہ تحیر بھرے استہزا میں ہنسی۔ ''دیکھ لیں گے، فی الحال تو تم اپنا کچلتا سر بچاؤ۔''

''میرا سر اللہ بچائے گا...... تم نہیں۔'' وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اعشال نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے حنبل کو نکلتے دیکھا وہ بھاگ کر باہر آنا چاہتی تھی انہیں روکنے کے لیے مگر اس کے قدموں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ انہیں روک سکتی اور کس ہمت سے روکتی اس کی بے پناہ محبتوں کا صلہ کیا دیا تھا؟ اس نے شدت غم کے سبب کھڑکی سے اپنی نگاہ ہٹالی۔ پانی سے لبالب بھری آنکھیں بیڈ پر بے سدھ پڑی آئمہ پر تھیں۔ جن کی حالت تین دن سے شدید خراب تھی مسلسل نیند کے انجکشن اور ڈرپ پر چل رہی تھیں جیسے ہی نیند ٹوٹتی چیختی چلاتیں، کینولا کھینچ کر اتار دیتیں ہاتھ سے خون بہنا شروع ہو جاتا عجیب و غریب مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگ جاتیں پھر سے انہیں دوا دے کر سلا دیا جاتا۔ وہ سوتی ماں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''امی کیوں کیا تھا آپ نے ایسا...... آپ تو چاچو کو بیٹا کہا کرتی تھیں، ایک ماں اپنے بیٹے کو اتنا بڑا دکھ کیسے دے سکتی ہے...... واقعی آپ کا بیٹا صرف ازلان تھا تب ہی تو اس کے دکھ میں آپ حواس کھو بیٹھیں...... چاچو کا تو آپ کو دکھ محسوس ہی نہیں ہوا، سب کچھ ویسا ہی تو چلتا رہا تھا حویلی میں۔''

وہ روتے روتے ان کے پاس قدموں میں بیٹھ گئی...... ''کاش ایک بار...... صرف ایک بار مجھ سے ہی پوچھ لیا ہوتا، بتا ہی دیا ہوتا، میں آپ کو کبھی ایسا نہ کرنے دیتی...... ٹھیک ہے چاچی مجھے بھی پسند نہیں تھیں یقیناً آپ کو بھی نہیں ہوں گی۔ لیکن آپ اتنی منافقت کے ساتھ کیسے جی سکتی ہیں۔ میں بھی آپ کی بیٹی ہوں، مجھے تو منافقت نہیں آئی، جو محسوس کرتی تھی منہ پر کہتی تھی۔ آپ اتنی بڑی اداکارہ کیسے بن گئیں جلن میں ...... اتنا سب کچھ کر لیا۔ چاچی کو لوٹتے، لوٹتے اپنے ہاتھ خالی کر بیٹھیں...... میرا دنیا میں اکلوتا بھائی ...... وہ اب نہیں رہا...... چاچو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے وہ اب نہیں آنے والے سب ختم ہو گیا سب آپ نے ختم کر دیا امی۔'' دہرے ہوتے ہوئے اعشال دھواں دھار رو رہی تھی۔

وہ بہت تیزی سے باہر کی جانب نکلا تھا برآمدے کے اسٹیپ اترتے وقت اس نے قریب بنے مہمان خانے سے خیام ذکا کو نکلتے دیکھا۔ ان کی گرتی پڑتی چال میں کسی بیمار بوڑھے کا گمان ہو رہا تھا۔ جوان بازو کٹ کر گرا تھا غم سے نڈھال تو ہونا ہی تھا۔ انہوں نے ملتجی نگاہوں سے حنبل کو دیکھا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو......؟''

''جہاں سے مجھے آنا نہیں چاہیے تھا۔'' خیام کے چہرے پر مزید درد کی لہریں امڈ آئیں آواز پژمردہ سی نکلی۔

''اتنی تکلیف میں، مجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہو؟''

وہ چند پل بے بسی سے انہیں دیکھے گیا اور بہت درد سے کہا تھا۔

''پتا نہیں اس وقت ہم دونوں میں سے زیادہ تکلیف میں کون ہے، آپ یا میں!''

وہ کہہ کر رکا نہیں تھا قدم تیزی سے باہر کی جانب بڑھ رہے تھے پھر جانے کیا دماغ میں سمائی اس نے اپنی لینڈ کروزر کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ جھٹکے سے اس میں بیٹھ کر اڑاتا باہر لے گیا تھا۔ خیام ذکا چاہنے کے باوجود اسے روک نہیں سکے اس کی رفتار دیکھ کر دل سے دعا نکلی تھی ''اللہ خیر ...... بہت تیزی میں گیا ہے۔'' ازلان کی ڈیڈ باڈی دیکھ کر ان میں بچا کچھ بھی نہیں تھا اور جب آئمہ کی سفاکیت کا اقرار ان ہی کے منہ سے سنا دل چاہا تھا انہیں کھڑے کھڑے اس گھر سے بے دخل کر دیں۔ مگر ان کی

حالت ایسی رہی کہاں تھی بے دخل کر کے کیا ملنا تھا یہی سزا بہت تھی جو قدرت نے گوداجاڑ کر دے دی تھی۔

☆☆☆

دونوں جانب درختوں سے گھری شاہراہ پر اس کی گاڑی فراٹے بھرتی تیزی سے شہر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ بلا سوچے سمجھے اپنے کمرے سے نکلا تھا کہ بس اب اسے حویلی چھوڑ دینی چاہیے چند دن کہیں بھی گزارے گا پھر سیٹ کنفرم کروا کر اسے واپس چلے جانا چاہیے مگر یک لخت خیام زکا سے بات کرتے ہوئے اسے اپنے بیٹے کا خیال آیا تھا۔ اس کا کیا قصور ہے وہ کیوں کسی دوسرے کے گھر میں پلے اس نے فوراً ارادہ بدلا اور شہروز کمال کے گھر جانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ تقریباً شہر فیصل آباد میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں سے اس کا گھر کچھ ہی مسافت پر رہ گیا تھا۔ جب حنبل کی نگاہ گاڑی کے فلنگ گیج پر گئی گیس بالکل ختم ہونے کے برابر تھی گاڑی کہیں بھی کسی وقت بھی رک سکتی تھی۔ اس نے گاڑی قریبی پٹرول پمپ پر روکی۔

شدید سردی کے باعث سی این جی اسٹیشنز پر بے پناہ رش ہونے لگا تھا۔ ایک تو گھریلو استعمال میں گیس کا استعمال کچھ بڑھ جاتا تھا دوسرے ملک کے اپنے مسائل تھے جن سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وسائل بڑھنے کے بجائے گھٹ ہی رہے تھے۔ پٹرول پمپ سے بھی باہر تک لگی لمبی قطاروں میں حنبل نے بھی اپنی گاڑی لگا دی۔ اسے رہ رہ کر ہدایت اللہ پر غصہ آ رہا تھا۔ جسے یہ تک نہیں پتا تھا گیس ختم ہو رہی ہے گاڑی میں سلنڈر تبدیل کروانا ہے۔ کچھوے کی چال رینگتی گاڑیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں حنبل کی گاڑی بہت پیچھے تھی وہ گاڑی بند کر کے قدرے آرام سے بیٹھ گیا۔ آنکھیں موندی سر بیک سے ٹکا لیا۔

☆☆☆

شہروز کمال کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی تنگ کرنے لگا تھا۔ یا سبرینہ کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی ہر شرارت پر کھول جاتی اور اچھی خاصی پٹائی کر دیتی تھی۔ چند دن پہلے کی بات تھی وہ سوئی ہوئی تھی عدن نے چپکے سے پنکھا آن کر دیا۔ اچھی خاصی ٹھنڈ اوپر سے پنکھے کی چبھتی ہوا۔ سبرینہ نے اس کے دو لگائے تھے۔ رو دھو کر وہ چپ کر گیا لیکن آج تو حد ہو گئی دعا اور وہ لان میں بنے سوئمنگ پول کے پاس کھیل رہے تھے جانے کیسے دعا اس میں گر گئی۔ شدید ٹھنڈ اور یخ پانی۔ بروقت ملازم کے دیکھ لینے سے جلد ہی اسے نکال لیا تھا لیکن عدن کی سبرینہ نے ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی۔ حبہ بھاگ کر درمیان میں آ گئی۔

''کیا ہو جاتا ہے مما آپ کو...... کیوں بھائی کو مار رہی ہیں۔'' حبہ نے عدن کا بازو کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

''دعا کو پانی میں دھکا دے دیا ہے...... اب کیا اسے عقل نہ سکھاؤں ذرا بات نہیں مانتا بہت تنگ کرنے لگا ہے یہ۔''

''مما...... یہ تنگ آپ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کرنے لگا ہے...... کیا آپ کو محسوس نہیں ہوتا ڈیڈی کے بعد سے آپ بہت بدل گئی ہیں، بات بات پر غصہ اور ڈیڈی تو اسے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ وہ مس کر رہا ہے یہ...... مت مارا کریں ایسے۔'' اس نے اسے قریب کرتے ہوئے اس کے نرم گال چوم لیے ''ڈیڈی کو بہت پیارا تھا یہ۔''

''تمہارے باپ کے پیار کی وجہ سے ہی یہ سب کچھ ہوا۔ پتا نہیں میری بچی کس حال میں ہے، کہاں ہے۔'' وہ منہ میں کچھ بڑبڑائی پھر عدن کو اپنے قریب کر لیا۔ وہ سہمی سہمی گہری آنکھوں سے سبرینہ کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا جس میں اچھی خاصی خفگی کا عنصر تھا۔ سبرینہ کو یک لخت اس پر ترس آیا اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ کتنی دیر اس کے ساتھ لپٹا رہا اور تب سبرینہ کو محسوس ہوا تھا۔ اسے تو عدن سے کبھی محبت ہوئی نہیں۔ وہ تو اس کا خیال ایک ضرورت کی طرح رکھتی تھی۔

ممتا اور ضرورت میں بہت فرق ہوتا ہے، کبھی کسی دوسرے کے بچے سے وہ جذبات تھوڑا ابھر سکتے ہیں جو اپنے وجود کے حصے کے لیے ہوں بس ضرورت سمجھ کر پالتی رہی۔ شہروز کمال کے بعد تو وہ ضرورت بھی ختم ہو گئی تھی۔ اپنے کیے پر صرف غصہ آتا تھا جو عدن پر ڈانٹ ڈپٹ کی صورت نکل جاتا پھر رو رو کر اللہ سے معافی مانگتی۔ اس وقت بھی بہت دیر خود سے لپٹا کر اسے ممتا محسوس نہیں ہوئی تھی، صرف شرمندگی اور پچھتاوا بڑھا تھا۔ اسے خود سے الگ کرتے بہت نرمی سے بولی تھی۔

''مجھے معاف کر دینا عدن ...... ایم ویری سوری۔'' وہ فوراً سے بولا۔

''مجھے ڈیڈی کے پاس جانا ہے۔ پلیز۔''

''مت ایسے کہا کرو......'' سبرینہ نے اسے گھر کا اور پھر حبہ سے کہا تھا ''جاؤ اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔''

وہ تو سامنے سے ہٹ گیا تھا مگر سبرینہ اچھی خاصی الجھ گئی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے سب کو پتا چل جانے کے بعد کیا یزدکا کی فیملی اب عدن کو اس کے پاس چھوڑے گی حنبل ایسا کسی صورت نہیں کرے گا۔ پھر...... پھر وہ لوگوں کو کیا بتاتی پھرے گی۔ کہاں گیا اس کا بیٹا...... اپنی بیٹیوں کو کیا جواب دے گی۔ سوچ سوچ کر دماغ کی رگیں پھٹنے کو ہو جاتیں، وجود دلدل میں اتر جاتا...... اور اپنی بچی کیا وہ اسے مل جائے گی...... کیا اب اس کی بہنیں اسے قبول کریں گی۔

کچھ بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا ہاں البتہ عدن کا چلے جانا سو فیصد ممکن تھا۔ کچھ اسی لیے بھی اس نے اپنے اور عدن کے درمیان واضح لکیر کھینچ لی تھی اس کے دل میں ممتا تو عدن کے لیے شاید ہی کبھی ابھری ہو، بس اسے لپٹاتے چومتے، گود میں لیتے ایک سرد سا تاثر رہتا تھا۔ لیکن اس بچے کے دل میں تو تھا یہ میری ماں ہے اب وہ اپنے واضح رویے سے اسے خود سے دور کر رہی تھی۔ تاکہ اسے زیادہ دقت پیش نہ آئے۔

☆☆☆

اس کی گاڑی تقریباً فلنگ ہونے کے قریب ہی تھی پانچ، چھ گاڑیاں درمیان میں تھیں کہ اس کا موبائل زور زور سے بجنے لگا۔ اس نے دو تین بار کاٹا...... پھر یہ تسلی کر کے ابھی اسے فلنگ شیڈ تک پہنچنے میں بھی کم از کم بیس پچیس منٹ لگ جائیں گے۔ وہ گاڑی سے نیچے اترا اور پٹرول پمپ سے خاصا دور ہٹ کر بات کرنے کے لیے اس کا نمبر ملایا تھا۔ بات وہ گاڑی میں بیٹھ کر بھی کر سکتا تھا مگر ان دنوں ملک میں جس طرح کے واقعات آئے دن ہو رہے تھے۔ خاص طور پر پٹرول پمپ پر لائٹر جلانا موبائل استعمال نہ کرنا واضح واضح لکھ کر لگا رکھا تھا۔ اخلاقی طور پر وہ پمپ سے ذرا ہٹ کر نمبر ملا رہا تھا اور پمپ سے اس ہٹی ہوئی جگہ پر بھی گاڑیوں کی لمبی قطار جوں کی توں تھی تین دن فلنگ اسٹیشن بند رہنے کے بعد آج تو گیس کھلی تھی جس کو ایمرجنسی نہیں تھی وہ بھی گاڑی لے کر آ گیا تھا۔ پہلی ہی نون پر اس نے عجلت میں فون اٹھایا تھا۔ جندب کا خیال تھا وہ ڈپٹ کر بولے گا بندہ فون کاٹ رہا ہے تو کوئی وجہ ہی ہوگی مگر اس کے بولنے سے پہلے وہ بہت برہمی سے بولی۔

''کہاں ہو تم...... ابھی تک پہنچے کہ نہیں......؟''

''پٹرول پمپ پر سرکس دیکھ رہا ہوں۔''

وہ چڑ کر بولا تھا...... دیکھنا ہے، تو آ جاؤ......''

''کیا مطلب......؟'' روائیہ کی آواز میں تحیر ابھرا تھا۔

''تمہیں پتا ہے ناں، آج گیس کھلی ہے...... ساری عوام ٹوٹ پڑی ہے پمپ پر۔ میں بھی یہاں صبح نو بجے سے خوار ہو رہا ہوں...... ایک بجنے والا ہے۔''

''اوہ سوری۔'' اس کے لہجے میں مصنوعی تاسف ابھرا ''میں بھی کوئی ٹریفک پرابلم ہے۔''

''اٹس اوکے، میں فون بند کرنے لگا ہوں۔''

وہ جلدی سے بولی تھی۔

''بات سنو۔''

''ہوں...... اب کیا ہے......؟''

''پلیز میٹنگ سے پہلے ایک بار وہ پیپر پڑھ لینا

، جو پوائنٹس لکھ کر دیے تھے اور تمام سیمپلز تسلی سے انہیں دکھاتا۔ انہیں یقین دہانی کرواتا اس سے اچھا کام اور کہیں نہیں ملے گا۔"

روائیہ کے پاس ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی طرف سے آرڈر تھا انہیں کچھ خاص لباس تیار کروانے تھے۔ جس کے لیے اس نے آج جندب کو فیصل آباد اس کمپنی کے پاس بھیجا تھا، آنے کو وہ خود بھی آسکتی تھی لیکن رابی کی طبیعت سردی کی وجہ سے کچھ خاص بہتر نہیں تھی سو جندب کی منتیں کر کے اسے بھیجا تھا۔

"اوکے، اوکے...... اور کچھ۔"

"نہیں بس...... پلیز یہ کام کروا دو...... میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" وہ استہزا میں ہنستا واپس چلتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب آرہا تھا۔

"جی بالکل...... جیسے میں تو جانتا ہی نہیں تم کتنی احسان فراموش ہو...... اوکے۔" اوکے کہتے ساتھ اس نے فون بند کیا ایک گہرے رنگ کی لینڈ کروزر کے پاس سے گزرتے ہوئے جندب کی نگاہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص پر گئی تھی بہت کوفت زدہ، اکتاہٹ بے زاریت سے بھرا وہ شخص بار بار اسٹیرنگ پر مکے مار رہا تھا۔ ایک اچٹتی نگاہ میں وہ کسی سے ملتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جندب رکا تو نہیں تھا مگر ذہن میں کچھ کھٹک رہا تھا۔ اس کی گاڑی کی باری آنے ہی والی تھی وہ جلدی سے دروازہ کھول کر بیٹھا اور گاڑی کو تھوڑا آگے بڑھایا۔ اپنی گاڑی کی فلنگ کے بعد وہ دوسری جانب سے نکل رہا تھا پھر ایک غیر ارادی نگاہ اسی شخص پر گئی تھی اب وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا چہرے پر وہی بے زاریت تھی۔ جندب کے دماغ میں یک لخت کچھ کلک ہوا تھا اس نے اپنی گاڑی ایک جانب کھڑی کی اور اتر کر اسی شخص کی سمت بڑھا تھا۔

"ہیلو...... آر یو حنبل ذکا......؟" گاڑیوں کی لمبی قطار کو کوفت سے دیکھتے ہوئے وہ عقب سے آئی ہیلو پر مڑا تھا۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ بمشکل چند پل لگے تھے اسے پہچاننے میں حویلی میں پہلی بار روائیہ کو لانے والا لڑکا پورا کا پورا نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اقرار میں آہستگی سے سر ہلاتے اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔

"آپ جندب......؟"

"جی۔" جندب نے سرد لہجے میں کہتے ہاتھ بہت گرم جوشی سے بڑھایا تھا دونوں کی آنکھوں میں خاموش شناسائی تھی۔

"کیا حال ہے......؟"

"جی الحمدللہ آپ سنائیں آپ ٹھیک ہیں میرا مطلب ہے آپ کچھ بہتر نہیں لگ رہے۔" جہاں تک جندب کو یاد پڑتا تھا وہ بہت خوب صورت پرکشش مرد تھا۔ خوب صورتی نئے دیکھنے والے کو اب بھی لگتی تھی مگر رنگت میں زردی گھلی اور آنکھوں کے گرد حلقوں نے کچھ متاثر کر رکھا تھا۔ وہ پھیکا سا مسکرا کر ٹال گیا۔

"نہیں سب ٹھیک ہے۔"

"اور گھر میں سب خیریت، انکل دوسرے بھائی......؟" جندب کے استفسار پر اس نے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن جندب بات سے بات نکالنا چاہ رہا تھا۔

"آپ جرمنی سے کب آئے۔"

"کچھ دن پہلے......" وہ پھر چپ ہو گیا کچھ خاموشی کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

"تم آسٹریلیا ہوتے تھے......؟"

"جی...... ہوتا تھا...... پانچ سال پہلے اچانک آنا پڑا تھا...... بس اب ادھر ہی جاب کر لی۔" اس کا جواب سن کر حنبل ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ اندر جو بھی توڑ پھوڑ تھی وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا جندب بھی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ناگواری سے گاڑیوں کے بڑھتے رش کو دیکھنے لگا۔ وہ چاہ رہا تھا حنبل اس سے کچھ پوچھے بات کرے کہ پانچ سال پہلے کیوں اچانک آنا پڑا کیا وجہ تھی پھر وہ اسے بتائے مگر وہ چپ رہا سو اسی نے بات چھیڑی۔

"پاکستان میں انرجی کا پرابلم بڑھ گیا ہے۔

پٹرول گیس کے لیے بہت خوار ہونا پڑتا ہے۔" حنبل اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

"میں نے تو لمبا سفر کرنا چھوڑ دیا ہے، آج بھی صرف روائیہ کے پرسنل کام کی وجہ سے آنا پڑا۔" بے شک حنبل اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر روائیہ کے نام پر جو تکلیف اس کی آنکھوں اور چہرے پر اتری تھی وہ جندب سے چھپ نہیں سکی۔ اور اس نے صرف یہی دیکھنے کے لیے روائیہ کا نام خاص طور پر لیا تھا اور وہ بھی حنبل تھا لاکھ چاہنے کے باوجود اس نے کچھ نہیں پوچھا تھا بلکہ ادھر ادھر ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔ اگر پانچ سال پہلے اسے جندب یوں مل جاتا شاید وہ اس کے ٹکڑے کر دیتا مگر اس وقت وہ بہت تحمل سے پاس کھڑا رہا جندب بھی مایوس ہو کر جانے کے لیے مڑنے لگا تھا۔

"اچھا بھائی میں اب چلتا ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔" وہ آگے ہو کر حنبل سے گلے ملا۔ "اگر رکے تو لگ جائے گا اسلام آباد چکر، اللہ حافظ۔" وہ الگ ہوتے ہوئے آگے چل پڑا تھا۔ روائیہ کے نام پر ابھی تک حنبل کا سارا وجود سنسنا رہا تھا۔ وہ بمشکل آٹھ دس قدم آگے بڑھا ہو گا جب اسے عقب سے آواز آئی۔

"جندب رکو......" وہ میکانکی انداز میں پلٹا تھا اسے یقین تھا وہ ضرور اسے پکارے گا۔ وہ تیزی سے واپس آیا۔

"جی......" حنبل کی نگاہ اس کے چہرے پر تھی ہموار سانسوں کے درمیان اس نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

"روائیہ اسلام آباد ہوتی ہے۔"

"جی۔" جندب کا لہجہ ٹھوس تھا "وہ ایک اپارٹمنٹ میں تنہا رہتی ہے، آپ کی بیٹی کے ساتھ۔" جتا کر کہتے آخری جملے پر حنبل یکسر بدلے لہجے میں تلخی سے کہہ رہا تھا۔

"میری بیٹی نہیں ہے وہ......"

"ہو سکتا ہے ایسا ہو...... مگر روائیہ یہی بتاتی ہے۔"

"اس نے کیا بتانا ہے...... اسے خود نہیں پتا۔"

اس نے ناگواری سے گردن جھٹکتے ہوئے کہا پھر خاموشی کا پردہ آگرا...... جندب بھی منتظر نگاہوں سے اسے دیکھے گیا اب کیا کہے گا...... کچھ دیر بعد وہ پوچھ رہا تھا۔

"تمہارے پاس کچھ وقت ہو گا...... مجھے بات کرنی ہے۔" اور اسی وقت کے انتظار میں جندب پانچ سال سے خوار ہو رہا تھا۔ وہ تو اسے جرمنی جا کر ڈھونڈنے تک پر تیار تھا بس کسی طرح معاملہ کلیئر ہو اور زندگی ڈگر پر آئے۔ اب بھلا اسے کیا اعتراض ہوتا تھا۔ ہاں البتہ ایک ضروری میٹنگ کرنا تھی۔ مگر وہ اتنی بھی اہم نہیں تھی کہ وہ نادر موقع گنوا دیتا اس نے فوراً حامی بھری تھی۔

"جی ضرور...... آئیں۔"

پٹرول پمپ کے قریب بنے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ کرتے مشورہ دیا۔

"ادھر چلتے ہیں۔" وہ ریسٹورنٹ کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ حنبل نے دونوں کہنیاں ٹیبل پر پھیلا رکھی تھیں اور قدرے آگے ہو کر بیٹھا تھا نظریں ٹیبل کی سطح پر تھیں جب کہ جندب سینے پر بازو لپیٹے کرسی کی بیک سے کمر ٹکائے بہت آرام دہ سا بیٹھا تھا اس کی تمام تر توجہ حنبل کے ہلتے ہونٹوں پر تھی۔ وہ کچھ دیر ہی چپ بیٹھا تھا پھر لفظوں کو محتاط جملوں میں سمو کر آہستہ آہستہ اسے سب بتانے لگا۔ ایک تکلیف دہ واقعہ خود اس کے لیے اس وقت اور بھی تکلیف دہ ہو گیا۔ اس کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں تھا وہ اپنے گھر والوں کی یا اپنی ذاتی زندگی کے معاملات اس طرح کسی تیسرے بندے سے ڈسکس کرے گا۔ وہ شخص جو غلط صحیح ہر معاملے میں اپنی فیملی کی حجت و دلیل کے ساتھ طرف داری کرتا ہو آج کسی تیسرے کے سامنے ان کی غیر ذمہ داری بتا رہا ہو۔ خیر تیسرا بھی کوئی ایسا اجنبی نہیں رہا تھا۔ اس سے بہت سا معاملہ تو چھپا نہیں تھا ہاں البتہ جو سچ چھپا تھا اسے مناسب طرح داری رکھتے ہوئے بتا دیا تھا۔ جو پہلو اس نے اپنا خاندانی وقار بچانے کے لیے حذف

کر لیا تھا۔ وہ آئمہ بیگم کی سنگ دلی تھی۔ جندب کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں مگر وہ خاموشی سے مسلسل اس کی بات سنے جا رہا تھا۔

حنبل نے ایک زخمی سانس بھر کر کچھ توقف کیا پھر ٹوٹے لہجے میں بولا تھا۔

''بس یار ہو جاتی ہیں ایسی غلطیاں بھی ......دراصل سبرینہ آپا سلوئی کی بچپن کی سہیلی ہیں ......ان کا رونا ......ان کے مسائل، ان کے شوہر کی دھمکیاں، واسطے دراصل انسان کا بالخصوص عورتوں کا سہیلیوں کے لیے دل بہت نرم ہوتا ہے۔ بھرجائی کو تو کانوں کان خبر نہیں ہوسکی تھی۔''

آخری جملے کی آواز صرف ادا کرتے ہی نہیں کانوں کے پردوں میں داخل ہوتے ہوئے بھی حنبل کو شدید استرے چلنے کا گمان ہوا تھا ''آہ......اگر انہیں ذرا سی بھنک بھی پڑ جاتی وہ کم از کم ایسا نہ ہونے دیتیں ......وہ تو سلوئی، سبرینہ کو جان سے مار دیتیں ......اسی حقیقت کے کھلنے پر تو صدمے سے ان کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ ایک طرف ازلان کا صدمہ دوسری طرف سلوئی سبرینہ کی خود غرضی ......دراصل شہروز کمال کے رویے کے آگے مجبوری تھیں۔''

اس نے کچھ دیر توقف کیا تا کہ اپنے کہے جملوں کی اذیت کو خود میں جذب کر سکے۔

''بھرجائی ...... مجھے بہت روکتی رہی تھیں، خاموش کرواتی رہیں......روائیہ کو بھی روکا ......مگر یار میرا اپنا دماغ خراب ہوگیا تھا، بالکل جیسے کسی پاگل کا دماغ الٹا ہوا ہوتا ہے اسی لیے ہی...... مجھے سیاہ سفید کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا اور پھر...... مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا روائیہ کس بات پر سوری کر رہی تھی۔ یار میں واقعی اس سے محبت کرتا تھا، کرتا ہوں ...... مجھے یقین نہیں آ رہا تھا مگر اس کا سوری......'' اتنی ساری گفتگو میں جندب پہلی بار مخل ہوا وہ بھی پھیکا استہزا لیتے۔

''اچھی محبت تھی آپ کی ......اپنی محبوبہ کی نیچر جان ہی نہ سکے......سالوں نہ سہی، چند ماہ تو اس کے ساتھ گزارے ہی تھے، آپ کو محسوس نہیں ہوا اسے تو بات بات پر سوری کرنے کی عادت ہے......وہ تو بے جان چیزوں سے سوری کر لیا کرتی تھی کسی سے گفتگو کے دوران چھینک آ جائے تب سوری کر لیتی تھی، کوئی چلتا چلتا ٹکرا جائے اس سے سوری کر لیتی تھی، کبھی کسی کو غباروں سے سوری بولتے دیکھا؟''

جندب کی نگاہوں کے سامنے فیری میں کھڑی روائیہ گھوم گئی جو غباروں کو بکے سمیت چھوڑ دینے اور بگلوں کے خوف سے پھڑ پھڑانے پر یک لخت انہیں سوری کہہ رہی تھی۔ حنبل اب چپ ہوگیا تھا جیسے لفظ کہیں گم ہوگئے ہوں۔

''روائیہ تو بتاتی تھی آپ بہت سمجھ دار، عقل مند ہیں......پھر آپ نے اسے ایک موقع کیوں نہیں دیا۔ اس کا موقف کیوں نہیں سنا، محبت میں اتنی سی گنجائش تو نکلتی ہے نا۔''

''جندب! غصیلا شخص کبھی عقل مند، سمجھ دار نہیں ہوسکتا، وہ تو بے وقوفی اور پچھتاووں کے درمیان لٹکتا رہتا ہے......خیر۔'' اپنی عزت نفس تو اسے آج بھی عزیز تھی اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔

''تم سے بات کرنے کا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ جس موقع پر میں نے اسے چھوڑا، اس سے کیا معافی مانگنی، میں خود بھی کبھی خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا......تم سے بات کرنے کا مقصد یہ ہے ......قصور میرا ہے، میرے بچے کا نہیں۔ چند پل کا بچہ اپنی ماں سے دور کر دیا گیا، ماں باپ زندہ ہیں اور وہ کسی تیسری گود میں ہے، میں اسے لینے ہی شہروز کمال کے گھر جا رہا ہوں، اگر روائیہ اسے لینا چاہے تو یہ اس کا حق ہے، تم اس سے پوچھ لو......ورنہ میں بچے کو اپنے ساتھ جرمنی لے جاؤں گا۔'' جندب نے ایک متاسفانہ ہنکارا بھرا تھا۔ ویٹر نے ان دونوں کے لیے کافی لا کر رکھی تھی اور دونوں ڈسپوزایبل کپ جوں کے توں پڑے ٹھنڈے ہوگئے تھے۔

''آپ پہلے بھی ایسے ہی چلے گئے تھے، خاموشی سے بنا بتائے......وہ آپ کے نکاح میں ہے

، کیا اس کا یہ حق نہیں ہے آپ اس سے ملیں اسے بتائیں۔''

''مجھ میں اسے فیس کرنے کی ہمت نہیں ہے۔''

''پانچ سال پہلے جو کچھ کہا تھا......وہ بھی سامنے کھڑے ہو کر ہی کہا تھا۔ پھر اب غلطی کا اعتراف سامنے کر لینے سے کیوں گھبرا رہے ہیں۔''

جندب کے سادے سے انداز میں کہہ دینے پر حنبل گردن جھٹک کر رہ گیا۔

''جندب غلطی کا اعتراف کر لینا کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ بات اس اعتراف کی تلافی کی ہوتی ہے......اور جو کچھ میں کر چکا ہوں اس کی کوئی تلافی ہو نہیں سکتی۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولے گیا۔ ''اور میں اس گلٹ کے ساتھ جینا چاہتا ہوں، کہ میں...... حنبل ذکا نے اپنے سب سے قریبی، سب سے خوب صورت رشتے کے ساتھ اچھا نہیں کیا......اس کا کوئی حق ادا نہیں کیا......اس گلٹ کی اذیت ہی میری بہت بڑی سزا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی کافی کا مگ اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں اپنے اندر اتار لیا۔ جیسے اپنی بات مکمل کر کے اب اٹھنا چاہتا ہو۔

''لیکن میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتا۔'' جندب نے بھی ٹھنڈی کافی پینی شروع کی۔ ''میں آپ سے اچھی امید رکھتا ہوں۔ آپ ابھی جرمنی نہیں جا رہے، کچھ ویٹ کریں ......میں ممی ڈیڈی سے بات کرتا ہوں، کوئی بہتر سلوشن (حل) نکالتے ہیں۔''

جندب چپ ہو کر کافی پینے لگا اور پھر خالی مگ واپس رکھتے ہوئے کھوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''میں نے جب رانی کو دیکھا وہ بمشکل چند ماہ کی تھی پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر بالکل بھی نہیں لگا تھا کہ وہ روائیہ کی بیٹی ہوسکتی ہے۔ لیکن میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا، وہم سمجھتا رہا......جیسے جیسے وہ بڑی ہوئی بالکل مختلف نین نقش، رنگت آواز بال......وہ دو سال کی ہوگی تب میں نے ویسے ہی اپنی ماں کے سامنے کہہ دیا تھا، یہ بچی اپنے ماں باپ سے ملتی نہیں ہے......تو مجھے بہت ڈانٹ پڑی تھی۔ کیونکہ روائیہ اس کے لیے بہت پوزیسو، کیئرنگ ہے۔ بچی بھی بہت اچھی ہے، مجھ سے بہت اٹیچ ہے...... مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہا جب روائیہ کو پتا چلے گا وہ کیا ردعمل کرے گی۔ کیا وہ یقین کر لے گی۔ بہت مشکل ہے......زندگی ایک بار پھر اسے بہت ٹف ٹائم دینے والی ہے......آہ۔''

اس نے سرد آہ کھینچی تھی۔ اس بات کا حنبل نے کوئی جواب نہیں دیا صرف چہرے پر دکھ کا سایہ آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''یا ایسا ہے سبرینہ سے کہیں وہ آ کر کسی طریقے سے بات کریں، ہوسکتا ہے ان کی بات کا وہ یقین کر لے۔'' حنبل نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں...... یک لخت تو وہ اس کی بات کا بالکل یقین نہیں کرے گی، کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اور ویسے بھی پیدائش کی تکلیف کے بعد جو بچہ گود میں آتا ہے جذبات تو اس سے جڑ جاتے ہیں۔ کون تصدیق کرواتا پھرتا ہے اپنا ہے یا نہیں ......میں بھی نہ کرواتا اگر ہاسپٹل میں وہ سب نہ ہوتا......اور اب پانچ سال گزر جانے کے بعد بہت تکلیف دہ حقیقت ہوگی اس کے لیے۔ یا پھر ایسا ہے۔ جیسا چل رہا ہے چلتا رہے...... جہاں اسے کھونے کے گلٹ میں زندگی گزرے گی وہاں یہ بھی سہی میں نے اسے اس کی اولاد سے ملوایا تک نہیں۔''

''نہیں۔'' جندب نے نفی میں سر ہلایا اور کرسی دھکیل کر اٹھا۔ ''نہیں یہ زیادہ زیادتی ہے......کرتے ہیں کچھ......اسے اعتبار کرنا چاہیے کرے گی وہ۔''

اب وہ دونوں مصافحہ کرتے ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہتے ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے پھر یک دم ہی جندب نے کہا تھا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں......دیکھنا چاہتا ہوں روائیہ کا بیٹا۔''

حنبل نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں اس کی گاڑی سے پیچھے کھڑی گاڑیاں کٹ لگا کر آگے خالی ہوتی جگہ پر بڑھ چکی تھیں اس

کی گاڑی اسی طرح کھڑی تھی۔تو جندب نے ہی مشورہ دیا۔

''آپ پمپ والے سے بات کرلیں۔گاڑی واپسی پر لے لیں گے......فی الحال میری میں چلتے ہیں۔''

اور پھر وہ دونوں جندب کی گاڑی میں بیٹھے شہروز کمال کے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔

ڈیش بورڈ پر رکھا جندب کا موبائل بہت دیر سے چمک رہا تھا۔اس پر بہت سے میسج آرہے تھے۔ اور پھر وہ تھرکنا شروع ہوگیا نمبر دیکھ کر اس کا دل نہیں کیا اٹھانے کو مگر جس تسلسل سے ٹون بج رہی تھی اسے اٹھانا ہی پڑا اس نے اسپیکر آن کرتے ہوئے موبائل کان سے لگایا تھا۔

''ہیلو۔''

''کہاں مرے ہوئے ہو تم۔''

اسپکر سے نکلتی اس کی آواز گاڑی میں پھیل گئی۔ حنبل ذکا ایک لمبے عرصے کے بعد اس کی آواز سن رہا تھا۔اسے لگا زہر میں بجھی کند چھری سے اس کی ایک ایک رگ کٹ رہی ہو دل کی دھڑکن خود بخود غیر معمولی ہوگئی۔خود کو نارمل پوز کرنے کے لیے اس نے کھڑکی کے پار بھاگتے مناظر دیکھنے شروع کردیے۔ البتہ اندر کی نمی سے چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

''میں نے کہاں جانا ہے۔'' جندب کے جواب پر وہ پھٹ کر بولی۔

''تم جا بھی نہیں سکتے کہیں۔''

''میری بات تو سنو۔''

''کیا سنوں میں ...... ادھر سے پانچ فون آچکے ہیں ، آپ کا نمائندہ نہیں آیا......کیا بتاؤں انہیں...... اگر نہیں جانا تھا ایٹ لیسٹ (کم از کم) انکار کردیتے ، میں خود چلی جاتی...... مجھے زندگی میں کوئی مخلص ملا ہی نہیں ہے۔سب خود غرض ہیں۔'' حنبل نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرتے زخم رسیدہ سانس لی تھی۔

''میں تمہارے ہی کام میں لگا ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے ، رہنے دو تم...... میں نے تمہیں کہا بھی تھا ، یہ کانٹریکٹ مجھے ہر صورت چاہیے مگر تم سیریس ہوتے تب ناں......''

''اچھا سوری......میں کل کر آؤں گا۔''

''بس رہنے دو۔'' اس نے فون غصے میں بند کر دیا تھا۔جندب نے حنبل کے تاثرات جانچنے کے لیے ہی اسپیکر آن کیا تھا لیکن اس کا چہرہ بالکل سرد پتھریلا سا محسوس ہو رہا تھا۔

''بڑا کنٹرول ہے اس بندے کو۔'' اس نے فون ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے سوچا تھا ''مجال ایک بات پوچھ لے،کون سا کانٹریکٹ، کیا کام۔''

☆☆☆

نا امیدی اس کے چہرے پر اداسی بن کر چھلک رہی تھی۔ سینے پر ہاتھ لپیٹے وہ آہستہ آہستہ پیزا ہٹ کے ہال سے باہر نکل رہی تھی۔سبز آنکھیں پانی سے بھر چکی تھیں مگر وہ پانی چہرے پر پھسلنے کے بجائے اندر کی جانب کہیں دل کے حصے پر تڑ تڑ گر رہا تھا۔ یک لخت ہی اس کا اٹھا قدم رک گیا اسے کسی نے بیگ کی اسٹریپ سے پکڑ کر روکا تھا۔

''اے چورنی کہاں جا رہی ہو۔'' اس نے مڑ کر دیکھا تھا سامنے کھڑا اسمتھ بھنوئیں اچکائے اس سے ہی پوچھ رہا تھا۔

''آئیں اور چل بھی دیں۔کیا آج پیزا نہیں کھاؤ گی۔'' اسمتھ دانتوں کی نمائش بہت اچھی کیا کرتا تھا اور اس وقت میرڈین کا دل چاہا اس نمائش کو نہس نہس کردے۔سبز آنکھوں میں درشتی سی ابھری مگر اسمتھ کی نگاہ ان میں بھرے پانی پر تھی۔اس نے اپنی انگشت دونوں آنکھوں کی جانب گھماتے استفسار کیا تھا۔

''یہ یہ......کیا ہوا ہے؟ آنکھیں بہنے کا مرض تو نہیں ہوگیا تمہیں۔'' وہ ہونقوں کی طرح اپنی جیب میں رومال ٹٹولنے لگا۔

''اسمتھ کون ہے یہ۔'' شارٹ اسکرٹ والی سیاہ فام لڑکی نے بہت ادا سے پوچھا تھا ساتھ ساتھ

اپنے سر پر رکھے گولڈن رنگ کے گھنگریالے گھونسلے میں انگلیاں چلانے لگی۔

''یہ......''

اسمتھ ذو معنی تجسس پیدا کرتے نرمی سے بولا تھا۔

''میری سب سے بڑی دشمن ہے اور میں اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔تا کہ ہم اچھے سے دشمنی نبھا سکیں۔'' اسمتھ کے شوخ انداز میں کہے گئے جملے پر سبز آنکھوں میں نا امیدی کے بجائے نرم مسکراہٹ کا تاثر ابھرا تھا۔ہونٹ پھیلتے ہوئے رخسار مسکرائے یک لخت دونوں آنکھوں سے ان پر پانی چھلک گیا۔وہ بے اختیار ہی اسمتھ کے گلے جا لگی۔

''اے......کیا ہوا......کیا ہوا میری تمہیں......کسی نے کچھ کہا ہے۔'' اسمتھ اچھا خاصا بوکھلا گیا تھا۔اس کی پشت سہلاتا استفسار کر رہا تھا۔وہ کچھ رو لینے کے بعد اس سے الگ ہوئی ناک کی نمی اندر کھینچتے درشتی سے اس سیاہ فام لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

''کون ہے یہ،تمہارے ساتھ کیوں ہوتی ہے؟

''اوہ......'' اسمتھ کے ہونٹ گولائی میں سکڑے البتہ ہیلن کی سیاہ آنکھوں میں غصہ اتر آیا تھا۔ وہ کندھے اچکا کر بازو پھیلاتے لڑاکا لہجے میں بولی تھی۔

''ہیلن آئز ہوں میں ......اسمتھ کی گرل فرینڈ ......اس کے آفس میں ڈیٹ مانگ رہی تھی۔'' وہ جتا جتا کر بول رہی تھی اور اسمتھ دونوں لڑکیوں کے سامنے کھڑا باری باری ان کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

''ہونہہ......'' ہیلن کو میرڈین کا شک بے حد برا لگا تھا اس نے غصے سے گردن جھٹکی اور اسمتھ کو ناگواری سے دیکھا تھا ''میرا بوائے فرینڈ ابھی زندہ ہے اور اس سے......'' اس نے اسمتھ کو ناپسندیدگی سے تولا ''بہت خوب صورت......سنبھال کر رکھو اپنے کوے کو ......جس کے دانت ہی باہر لٹکے رہتے ہیں۔'' وہ غصے سے پاؤں پٹختی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اتنی غیر متوقع عزت افزائی پر اسمتھ کی آنکھیں ہی نہیں منہ بھی حیرت سے پھٹ گیا تھا اور جب وہ وہاں سے

جانے لگی۔اس نے دو تین بار اسے روکنے کے لیے ہانک لگائی تھی۔

''اے......اے بات سنو ہیلن۔'' مگر ہیلن نے مڑ کر نہیں دیکھا۔تو اسمتھ میرڈین پر برس پڑا۔

''تم ہمیشہ میرا نقصان کروالی ہو......بندہ علیحدگی میں پوچھ لیتا ہے مگر نہیں ...... تمہیں تو تفتیش کرنا تھی۔''

''ہاں کرنا تھی۔'' وہ پورے استحقاق سے بولی۔''میں بہت دنوں سے برداشت کرتی رہی ،مگر تم ہو ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ اپنے دانت گنواتے رہتے ہوا سے۔''

''ہنس کے بات کرنا مجبوری ہے......بزنس کرنا چاہتی ہے وہ......اچھی خاصی انویسٹمنٹ کرنے لگی تھی میرے ساتھ......ایک تم ہو سارا کانٹریکٹ خراب کر دیا۔پتا نہیں اب وہ آتی بھی ہے یا نہیں۔''

''اس کی بہت فکر ہو رہی ہے تمہیں۔''

میرڈین کا روٹھا لہجہ حق جتلاتا سا تھا ''جو چند سال کے لیے انویسٹ کر رہی ہے۔میری فکر نہیں ہے جو ساری زندگی تم پر انویسٹ کرنا چاہتی ہے۔''

اسمتھ کے چہرے پر چھائی خفگی آہستہ آہستہ نرم تاثر میں بدل گئی وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کے چہرے پر ذرا سا جھکا تھا۔

''ریلی......''

''کیوں تمہیں یقین نہیں ہے......پاگل ہوں، تمہارے آگے پیچھے گھومتی ہوں۔''

''وہ تو تم ہو۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے سیدھا ہوا تھا میرڈین کو غصہ چڑھ گیا۔اس نے خوب جتا کر اونچا سا کہا تھا۔

''ہاں ہوں......اور ثبوت کے طور پر ہی تمہارا انتخاب کیا ہے۔''

پھر......!

پھر پیزا ہٹ کی سڑک اور دیواروں نے دونوں کا اونچا قہقہہ سنا تھا۔

☆☆☆

یہ نئی طرز کا کشادہ سیا بنا لاؤنج تھا جس کی آرائش سلیقہ شعاری کی گواہ تھی۔ وہ دونوں بہت دیر صوفوں پر بیٹھے سبرینہ کا انتظار کرتے رہے۔ سبرینہ کو یقین تھا یہ دن ضرور آئے گا بھلے اس نے عدن کو وہ محبت نہیں دی تھی جو ایک ماں کے اختیار سے بھی باہر ہوتی ہے لیکن اس کی پرورش تو کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ سوتا جاگتا، کھاتا پیتا تھا یک دم سے اس کا یوں زندگی سے بے دخل ہو جانا بہت مشکل امر تھا مگر یہ ہونا تھا وہ خود کو بہت سمجھا بجھا کر عدن کا ہاتھ تھامے حنبل کی عدالت میں پیش ہوئی تھی۔

لمحہ بھر تو حنبل عدن کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ گول چہرے والا سرخ سفید سا بچہ اس کی آنکھوں کا رنگ اور دیکھنے کا انداز اتنا ہی معصوم تھا جتنا کہ روائیہ کا ہوا کرتا تھا۔ اس وقت وہ جتنی اجنبیت سے حنبل اور جندب کو دیکھ رہا تھا اسے وہ وقت یاد آ گیا جب روائیہ پہلی بار حویلی آئی تھی۔ وہ ایسے ہی ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اور چہرے پر اجنبی سا خوف تھا۔

حنبل اٹھ کر اس کی جانب بڑھا اور اسے خود میں بھینچ لیا۔ کتنے پل وہ اس کے سینے میں دبکا کسمساتا رہا۔ اپنے جذبات کو قابو کرنے میں اس کی گرفت بچے پر بڑھ رہی تھی۔ جندب نے اٹھ کر حنبل کے کندھے کو ہلکا سا تھپکا تھا۔ وہ اس کا سر اور گال چومتے ہوئے اسے گود میں اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ عدن حیرت سے حنبل کو دیکھ رہا تھا۔ پھر گود سے ماں کی جانب پھسلنے کی کوشش کی حنبل نے اسے پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ سبرینہ سر جھکائے اپنے خالی ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ سہما سا عدن بہت آہستگی سے بولا تھا۔

''مما......''

سبرینہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دو آنسو ٹپک پڑے۔ عدن کے لیے پہلی بار اس کی آنکھ میں پانی آیا تھا۔ اس کے چھن جانے کے احساس سے تکلیف ہوئی تھی۔ ورنہ اس کے دکھ تکلیف درد کسی بات پر وہ احساس پیدا نہیں ہوتا تھا جو اپنی بچیوں کے لیے ہوتا تھا۔ ایک تو معلوم تھا اپنی اولاد نہیں دوسرا شہروز کمال کا روا رکھا سلوک خواہ مخواہ عدن سے چڑ پیدا کر گیا تھا اور اب اس کی التجائیہ سا ''مما'' کہنے پر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اس کے چہرے کو پیار سے چھوتے ہوئے سمجھا رہی تھی۔

''عدن آپ کے ڈیڈی کہہ رہے تھے ناں، آپ کو کسی اچھے بورڈنگ اسکول میں داخل کروائیں گے، ان انکل کا بورڈنگ اسکول ہے...... جب آپ وہاں رہو گے آپ کے ڈیڈی آپ سے ملنے آ جائیں گے۔'' عدن کو کچھ سمجھ میں آیا تھا یا نہیں حنبل کو البتہ غصہ آ گیا تھا۔

''آپا اسے بتائیں اسے بورڈنگ نہیں، اس کے اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں...... میں اس کا باپ ہوں۔ آپ نے اس کی زندگی پر ڈاکا مارا تھا۔''

سبرینہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس حقیقت کو جذب کیا۔ پھر نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی تھی۔

''حنبل اس کی عمر اتنی نہیں ہے کہ یہ سب سمجھ سکے...... کچھ وقت دو اسے، تعلق بناؤ اس سے۔''

''ہونہہ......'' حنبل نے بے بسی سے گردن جھٹکی ''آپ نے یہ اچھا نہیں کیا...... میرے بچے کی نفسیات تباہ ہو جائے گی۔''

جندب نے آگے بڑھ کر عدن کو اس کی گود سے لے لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا مزید گفتگو بچہ سنے، اس بچوں کو بہلانا بہت اچھا آتا تھا اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا لاؤنج سے باہر کی جانب نکلا۔

''آپ کو اللہ سے ذرا خوف نہیں آیا۔ آپا کیسی ماں ہیں آپ...... اتنا بڑا رسک لے کر اپنی ڈیلیوری کروائی اگر آپ کی بچی کو کچھ ہو جاتا...... تو، تو بھی آپ کو تکلیف نہ ہوتی۔ بیٹا تو مل گیا تھا ناں۔ کسی کا سہی تھا تو آپ کے پاس۔'' سبرینہ ایسے تھی جیسے زمین میں دھنسی جا رہی ہو۔

''میں بہت بری ہوں حنبل...... مگر شہروز نے جس طرح دھمکا......''

''ہاں تو اللہ سے بیٹا ہی کیوں مانگتی رہیں۔

اپنے شوہر کے لیے ہدایت بھی تو مانگ سکتی تھیں۔ وہ اس کی بات کاٹ کر اتنی زور سے دھاڑا حبہ، عشا بھاگ کر آئیں اور لاؤنج کے دروازے کے پاس ہی رک گئیں۔

''جو اللہ بیٹا دینے پر قادر ہے، وہ آپ کے شوہر کو ہدایت نہیں دے سکتا تھا؟ اس کے دل میں آپ کی، آپ کی بچیوں کی محبت نہیں ڈال سکتا تھا؟ کیا اس کی رحمت سے مایوس ہو گئی تھیں جو میرا بچہ چھینا آپ نے۔'' بولتے ہوئے حنبل کی آواز بھرا گئی تھی۔

''اپنا گھر بچانے کے لیے میرا گھر تباہ کر دیا آپا آپ نے، بیٹا، بیٹا، بیٹا...... آپ کا گھر تو بیٹا بھی نہ بچا سکا۔ اس سے کہیں بہتر تھا آپ اللہ سے اپنا گھر بچانے کی دعا کرتیں، شہروز کی محبت مانگتیں ...... لیکن نہیں...... آپ تو اللہ کو راستہ دکھاتی رہیں۔ بس گھر بچانے کا ایک ہی راستہ ہے بیٹا دے دے ...... صرف بیٹا۔'' اس نے دانت جماتے سبرینہ کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

''اللہ کو اپنے راستے بہت اچھے معلوم ہیں۔ سبرینہ آپا، اللہ کی انگلی پکڑنے کے بجائے اسے ہاتھ تھمایا جاتا ہے...... ہم اسے راستہ نہیں بتا سکتے، وہ راستے بتاتا ہے۔ بہت برا کیا آپ نے، بہت برا اپنے ساتھ بھی، اپنی بچی کے ساتھ بھی اور میرے خاندان کے ساتھ بھی۔'' وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکلنے لگا پھر پلٹ کر کہا تھا۔

''سر جھکا کر رو لینا آپ کے گناہ کی معافی نہیں ہے، دعا کرنا عدن کی ماں آپ کو معاف کر دے۔ اور آپ کی بیٹی بھی۔''

حنبل کے وہاں سے نکلتے ہی سبرینہ دھپ سے صوفے پر ڈھے گئی تھی۔ اس کا بدن اندر سے سارا لرز رہا تھا بالکل اسی طرح جس طرح معمول کے کام کرتے ہوئے اچانک سے سلوئی کی کال آنے پر لرزہ تھا۔

''جلدی سے ہاسپٹل پہنچو...... روائیہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ آپا اسے لے کر آ رہی ہیں۔ آدھے پونے گھنٹے تک پہنچ جاؤ۔''

''لیکن سلوئی ...... میں کیسے آ سکتی ہوں ...... ابھی ایک مہینہ ہے میری ڈیٹ میں۔'' اس کے منمنانے پر سلوئی ڈپٹ کر بولی تھی۔

''پھر تم بیٹھ کر اپنے مہینے گنتی رہو...... بعد میں مت رونا۔''

''لیکن میری آئمہ آپا سے پرسوں بات ہوئی تھی۔'' سبرینہ نے اسے پھر وضاحت دی۔ ''وہ کہہ رہی تھیں کسی طرح روائیہ کے چند دن اوپر کر لیں گے، کل تک تو اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

''اس کے اور کتنے دن اوپر کریں۔ دس دن اوپر ہو چکے ہیں۔ رات سے طبیعت خراب ہے اس کی مزید کیسے روکیں...... اور ویسے بھی موقع بہت اچھا ہے۔ سنا ہے حنبل اگلے ہفتے آ رہا ہے...... اور تمہارا بھی تو میاں دبئی گیا ہوا ہے۔ آرام سے سب ہو جائے گا...... اب دیر مت کرو...... ورنہ بعد میں مت کہنا۔'' اور فون کٹ گیا۔ جس کٹے دل سے وہ لرزتی ہوئی ہاسپٹل گئی تھی اس کا دل جانتا تھا۔ چاروں بیٹیوں کو ساتھ لگائے سارے رستے روتی گئی تھی۔ جب بھی خود کو بے بس سمجھ رہی تھی اور اب بھی۔ حبہ اور عشا بہت کچھ سن لینے کے بعد سمجھ کچھ نہیں پا رہی تھیں۔ دونوں تیزی سے ماں کے پاس آئیں اور جھنجوڑ کر پوچھ رہی تھیں۔

''مما...... یہ سب کیا ہے۔ انکل عدن کو کیوں لے گئے۔ ہمارے بھائی کو کیوں لے گئے وہ بتائیں ناں وہ عدن کی کس ماں کا ذکر کر رہے تھے...... آپ چپ کیوں ہیں بتاتی کیوں نہیں، کیا اب ہم اپنے بھائی سے کبھی نہیں ملیں گے۔ بتائیں ناں چپ کیوں ہیں۔ کیا عدن ہمارا بھائی نہیں تھا۔''

وہ روتے ہوئے ماں کے گھٹنوں پر سر رگڑنے لگیں سبرینہ نے ان کے سر پر اپنا سر ٹکا لیا تھا۔

''نہیں عدن تمہارا بھائی نہیں تھا حبہ معاف کر دو مجھے ...... خدا کے واسطے معاف کر دو...... میں نے اپنے گناہ کی بڑی سزا پالی۔ گھر بھی

برباد ہو گیا اولاد بھی دھتکار دی۔ میں بہت گناہ گار ہوں، مجھے معاف کر دو۔“

☆☆☆

عدن حنبل کی گود میں کچھ سہما ہوا بیٹھا تھا اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا یہ کون ہیں اور اسے کہاں لے جانا ہے...... ”مما کے پاس۔“

”بیٹا وہ آپ کی مما نہیں ہیں۔“ حنبل کی نرمی سے کہنے پر جندب نے التجائیہ حنبل کو دیکھتے آہستہ سے کہا تھا۔

”پلیز اتنی جلدی مت کریں۔ اس کی شخصیت بالکل ٹوٹ جائے گی۔“ حنبل کے چہرے پر تکلیف دہ سایہ ابھرا تھا۔

”یار تم نے زو (چڑیا گھر) دیکھا ہے۔“ عدن نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا لگتا ہے......“ اس نے پھر سر ہلایا اور جلدی سے بولا ”ڈیڈی مجھے لے کر جاتے تھے۔“

”اچھا......“ جندب اب اس سے دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ ”حنبل انکل کے گھر بہت پیارا زو (چڑیا گھر) ہے......وہ دیکھنا ہے۔“

اس نے سر اٹھا کر حنبل کی آنکھوں میں دیکھا وہ محبت سے اسے ہی دیکھ رہا تھا عدن نے ڈرتے ڈرتے اقرار میں سر ہلایا حنبل نے اس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

”میری جان......“

میرے ڈیڈی وہاں ہوں گے......؟ وہ آہستگی سے پوچھ رہا تھا۔ حنبل نے اس کی تسلی کے لیے پیار سے اسے سمجھایا تھا۔

”اگر آپ روؤ گے نہیں تنگ نہیں کرو گے، تو انہیں بلالیں گے......“

”مما کو بھی......“ ضبط کے باوجود حنبل کی ناک نمی سے بوجھل ہونے لگی تھی......صرف اثبات میں سر ہلایا۔

”آپیاں......؟“

”یار جسے کہو گے بلالیں گے......مگر تم تنگ نہ کرنا......ٹھیک۔“

عدن امید اور خوف کے درمیان بد مزا سا ہو کر باہر کے مناظر دیکھنے لگا۔ حنبل کا شفقت سے بھرا ہاتھ اسے سلکی بالوں میں پھرتا عدن کو نیند کی وادی میں لے گیا تھا۔

☆☆☆

عدن کی کاغذی حیثیت شہروز کمال کے حوالے سے تھی۔ جرمنی لے جانے کے لیے اس کے پیپرز تیار کروانا اتنا آسان مرحلہ نہیں تھا۔ اپنے تمام تر ذرائع لڑا کر بھی کم از کم پندرہ بیس دن آرام سے لگ جانے تھے۔ اور اتنے دن وہ حویلی تو کسی صورت اپنے بیٹے کو لے کر نہیں جائے گا یہ اس نے وہاں سے نکلتے ہی طے کر لیا تھا۔ اور جندب نے یہی سمجھایا تھا آپ تھوڑا انتظار کر لیں روائیہ کو اس ساری سچویشن کے لیے تیار کر لیتے ہیں۔ اسی لیے وہ اسلام آباد کے ایک ریسٹورنٹ میں ٹھہرا تھا۔

حنبل سے مل کر جندب کو خوشی ہوئی تھی یا کسک اسے یہ واضح نہیں تھا۔ بس اتنا تھا پانچ سال بہت ہوتے ہیں۔ اب جو ہونا ہے وہ ہو جائے۔ روائیہ کا راستے میں فون آنے کے ڈر سے اس نے اپنا فون ہی آف کر دیا تھا۔ حنبل پٹرول پمپ سے اپنی گاڑی لے جا کر اپنے راستے جا چکا تھا اور جندب اپنی منزل کی جانب البتہ دونوں میں طے تھا کہ رابطہ رکھیں گے۔ جندب نے گھر پہنچ کر سب سے پہلے آسان انداز میں سب کچھ رضا حیات اور عائشہ کو بتایا تھا۔ رضا حیات تو بات سمجھ بھی چکے تھے عورتوں کی سیاست پر حیران بھی تھے البتہ عائشہ تو مسلسل سینہ تھامے ڈاکٹروں ہسپتالوں کو کوس رہی تھیں۔

”آئے ہائے...... اب کیسے پتا چلے کس کا بچہ کون سا ہے، پتا نہیں کم بخت کس کس کا بدل دیتے ہوں گے۔ اب یہ بھی ہو گیا بچہ گود لیتے ہی تصدیق کرواؤ......یہی کسر رہ گئی تھی۔ انتہا ہو گئی ظلم کی......کیسے مغفرت ہو گی ان ڈاکٹروں کی...... توبہ۔“

کبھی گال پیٹتیں، کبھی سوچنے بیٹھ جاتیں۔ کچھ دیر رضا حیات انہیں دیکھتے رہے پھر زور دے کر کہا تھا۔

”یہ کام تم ساری رات بھی کر سکتی ہو، فی الحال یہ سوچو روائیہ کو کون اور کیسے بتائے گا۔“ لفظ ”کون“ پر انہوں نے جندب کی جانب دیکھا تھا اور اس نے دست برداری کے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے تھے۔

”مجھے مت دیکھیں، مجھ میں ہمت نہیں ہے اس سب کی۔“

”ہاں تو تم کیوں بتاؤ گے۔“ عائشہ قطعیت سے بولیں۔ ”آ کر بتائے نا وہ......جس نے طعنے دے کر نکالا تھا، مانگے معافی، ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے......کیسی اللہ نے منہ کی مار ماری ہے......بڑے عقل مند بنتے تھے اور وہ میرزا کا......اب کھودے قبریں سبرینہ، سلوئی کی، کیسے کروفر بنے تھے۔ ایسے اللہ رسی کھینچتا ہے ظالم کی۔“

”اچھا تم تو اب چپ کرو۔“ رضا حیات پریشان تھے۔ ”یہ عورتیں بڑے بڑے کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔“ رضا حیات کی بات پر عائشہ کو اتفاق نہیں تھا ناگواری سے گردن جھٹکی۔ پھر جندب نے ہی مشورہ دیا تھا۔

”میں حنبل کو کہہ دیتا ہوں، کل کسی وقت آ کر گھر پر روائیہ سے مل لے......کیا خیال ہے؟“

انہوں نے سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں گھر نہیں۔“

”کیوں......؟“ جندب کو حیرانگی ہوئی۔

”پتا ہے گھر میں بندہ شیر ہوتا ہے، تمیز، لحاظ، ادب سب بھول سکتا ہے، میں سوچ رہا ہوں حنبل کو کہتے ہیں اس کے آؤٹ لیٹ پر چلا جائے۔ ویسے ہی ملنے......بچے کا ذکر نہ کرے۔ دیکھو پھر وہ کیا کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ ہم بھی اس کا ذہن بناتے ہیں۔“

”چلیں ٹھیک ہے، میں نے صبح اس سے ملنے جانا تو ہے، حنبل سے کہہ دوں گا تب ہی آجائے۔“

☆☆☆

شدید دھند ہونے کے باوجود جندب اس کے آنے سے بھی پہلے اس کے آؤٹ لیٹ پر پہنچ چکا تھا اور اسے اندازہ تھا وہ اس سے بہت برہم ہوگی کیونکہ وہ اس کا کام نہیں کر سکا تھا۔ مگر جو کام وہ کر چکا تھا وہ بھی بہت اہم تھا اور بتانا اس سے زیادہ مشکل اور جب حنبل اس کے آفس میں داخل ہوا تھا صورت حال خاصی غیر متوقع ہوگئی تھی۔ دبوسی روائیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ یقیناً حنبل اسی دن وہاں سے چلا جاتا اور کبھی دوبارہ سامنا کرنے کی کوشش بھی نہ کرتا اگر رضا حیات خود جا کر اس کی منتیں نہ کرتے۔

''حنبل تمہاری فیملی نے جو کچھ کیا وہ سب ایک طرف...... تمہارا رویہ ایک طرف، جو کچھ ہو چکا ہے وہ اب زندگی سے مٹ نہیں سکتا مگر کسی حد تک سدھر سکتا ہے...... روائیہ کا رویہ فطری ہے، وہ بار بار غصے میں آئے گی، مگر اب برداشت کی باری تمہاری ہے...... اس کے بچے کے بارے میں آگاہ کیے بغیر تم نہیں جا سکتے۔''

جندب نے کئی بار باتوں میں روائیہ کا ذہن بنانے کی کوشش کی مگر اس کا انداز پتھریلا ہی تھا۔ ادھر عدن خاموش ہوتا ہوتا بیمار سا لگنے لگا تھا۔ جندب نے ہی مشورہ دیا تھا۔

''سبرینہ کو بلائیں...... عدن سے ملاقات ہو جائے گی اور روائیہ کو آ کر وہ خود حقیقت بتائے۔''

اور وہ ایک سرد دن تھا جو ڈھل رہا تھا جب حنبل سبرینہ اور عدن کے ساتھ اس کے گھر پر آیا تھا۔ عدن سبرینہ کو مل کر بھی خوش نہیں ہوا تھا بس مزید چپ ہو گیا تھا اور وہ دونوں ابھی گاڑی میں ہی تھے اور حنبل روائیہ کے روبرو کھڑا کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ گہری آنکھیں بلا کا اعتماد لیے اس کی تھکی ماندی بھوری آنکھوں میں گڑھی تھیں۔ بھوری آنکھوں میں التجا تھی، مسافت کی تمام تر تھکاوٹ کے باوجود شرمندگی شکار رہی تھیں۔ روائیہ کے منہ سے ''نفرت'' کا لفظ اسے ہضم نہیں ہوا تھا۔ حنبل کو اتنا یقین تھا وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں شاید نفرت نہیں۔

اسے یہاں اسلام آباد ایک ریسٹ ہاؤس میں رہتے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو چکا تھا۔ عدن کے پیپرز تیار ہو چکے تھے بس آج آخری کوشش کے طور پر وہ آیا تھا تاکہ کبھی زندگی اس سے گلہ نہ کرے کہ وہ اس کی اولاد سے اسے ملوا نہ سکا۔

''تمہاری بات نہ سن کر جو میں نے غلطی کی تھی۔ خدا کے لیے تم اس غلطی کو مت دہراؤ...... یہ غلطیاں عمر بھر کا روگ بن جاتی ہیں۔'' سینے پر ہاتھ لپیٹے روائیہ نے اپنا رخ موڑ لیا۔ ''میری ایک بات دل سنبھال کر سن لو...... میں غلط نہیں تھا، لیکن میں نے غلط کیا، تم بھی غلط نہیں ہو لیکن میں چاہتا ہوں تم غلط مت کرو، میرے ساتھ بے شک جیسا مرضی کرو...... مگر بچے کے ساتھ نہیں۔'' اس کی گردن ویسے ہی تنی رہی سامنے درختوں کے ہلتے پتے دیکھے گئی۔ جیسے مکمل ناگواری کا احساس۔

''مجھے پتا ہے اس وقت میری آواز تمہیں تکلیف دے رہی ہے، لیکن اس سے زیادہ اذیت بھری حقیقت ہے میرے پاس۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ جندب کا دل بھی تیز دھڑک رہا تھا۔ جیسے آنے والے لمحے کا خوف ہو۔ رضا حیات اور عائشہ نے تو سنتے ہی کہہ دیا تھا۔

''ہم اس وقت موجود نہیں ہوں گے۔ ہم سے اس کا ردعمل دیکھا نہیں جائے گا۔''

''تو کیا اس کی ساری اذیتیں دیکھنے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں۔''

جندب برہم ہوا مگر ماہم نے اسے سمجھا بجھا کر بھیجا تھا۔ ''تم اس کے پرانے دوست ہو، اسے تم سے حوصلہ ملے گا۔''

لیکن اس وقت حنبل کے منہ سے نکلتے لفظ اس کا اپنا حوصلہ توڑ رہے تھے۔

''روائیہ...... رابعہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔'' وہ میکانکی انداز میں پلٹی تھی آنکھیں بھوکی شیرنی کی طرح پھٹ گئیں استہزا میں زخمی قہقہہ لگایا تھا۔

''اچھا...... واؤ...... زبردست۔'' اس نے کسی ملکہ کی طرح تالیاں بجاتے اس کی بات کو سراہا اور جندب کی جانب مڑی۔

''سنا تم نے...... رابعہ میری بیٹی نہیں ہے...... ہاہاہا...... پانچ سال پہلے وہ اس شخص کی بیٹی نہیں تھی، اب اتنے عرصے کی ریسرچ نے یہ ثابت کیا وہ میری بیٹی بھی نہیں ہے، خوب۔'' اگلے دانت جماتے اس کا لہجہ یک دم تلخ ہو گیا۔

''زمین سے نکلی تھی، یا درخت پر اگی تھی۔ بارش میں تو نہیں برسی تھی وہ...... پھر کہاں سے آ گئی میری گود میں......؟'' حنبل کے لب ہلنے ہی لگے تھے کہ سبرینہ گیٹ سے اندر داخل ہو چکی تھی اس کے ساتھ عدن چلتا آ رہا تھا، انہیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر روائیہ کی آنکھوں میں اچنبھا سا تھا۔ سبرینہ کو تو وہ پہچان چکی تھی مگر عدن ڈرا سہا عجیب سا کنفیوژ بچہ، اس نے اسے صرف اچٹتی نگاہ سے دیکھا وہ صرف سبرینہ کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کیا کہتی ہے۔ وہ قدم قدم آگے بڑھی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''روائیہ میں تمہاری گناہ گار ہوں...... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔'' حنبل صحیح کہہ رہا ہے، رابعہ تمہاری بیٹی نہیں ہے، مجھ بدنصیب کی بیٹی ہے وہ جسے اس کی ماں نے خطرناک حالت میں چھوڑ کر، تمہارا بیٹا ہتھیا لیا تھا...... صرف گھر بچانے کے لیے۔'' سبرینہ روتے ہوئے دہری ہو گئی تھی۔ روائیہ جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔

''یہ عدن، تمہارا بیٹا ہے روائیہ۔''

سبرینہ کی انگشت بچے کی جانب تھی۔ دوبارہ بھی روائیہ نے ایک اچٹتی نگاہ کے سوا اس بچے کا جائزہ تک نہیں لیا تھا۔

سبرینہ بے طرح روتی ساری حقیقت بتا رہی تھی آنسو بہہ بہہ کر اس کے سارے چہرے پر پھیل گئے۔

''میں شہروز سے ڈر گئی تھی، لیکن دیکھو قدرت نے مجھ سے کیسا انتقام لیا، شہروز نہیں رہا، اور گود خود خالی کر دی میں نے...... میں برباد ہو گئی۔ روائیہ میں بیٹیوں کی ماں ہوں، مجھے تمہاری آہوں سے بہت ڈر لگ رہا ہے، تمہاری آہ نے مجھے تو برباد کر دیا۔ اللہ نہ کرے، کہیں میری بچیوں کے نصیب......''

اس سے آگے اس سے بولا نہیں گیا۔ وہ دھواں دھار رونے لگی۔

''میں تمہارا بیٹا عدن، تمہیں لوٹانے آئی ہوں۔ میری بیٹی رابعہ......''

سبرینہ کے لفظوں کی بازگشت سے اسے لگا کہ زمین بری طرح کانپ رہی ہے، درخت در و دیوار یہاں تک کہ سامنے کھڑے تمام افراد زلزلے کی حالت میں لگ رہے تھے۔ زلزلے سے سرکتی زمین پر ایک ایک قدم پیچھے کیا جانب ہٹتی موم سے بنی مورتی کسی کٹھ پتلی کی مانند لگتی تھی۔

اس کی آنکھیں ناقابل یقین حد تک پھیلتی جا رہی تھیں، دہانہ کھل گیا تھا۔ نفی میں سر آہستہ آہستہ ہلاتے وہ مزید پیچھے ہوتی گئی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے...... یہ جھوٹ ہے، نہیں،

ناولٹ

فراق

صدف آصف



یہ نئی چال ہے۔'' وہ ایک ایک قدم الٹے پیروں چل رہی تھی آنکھوں میں کوئی عزم ابھرا۔ اس کی آنکھوں کے عزم میں خون اترنے لگا۔ ''یہ لوگ قابل اعتبار نہیں ہیں...... صرف جھوٹے ہیں...... میری بیٹی بہت سے لوگوں کی موجودگی میں دنیا میں آئی تھی، پھر کیسے کوئی کہہ سکتا ہے، وہ میں نے جنم نہیں دی مجھے آج بھی اس کی پیدائش کی تکلیف یاد ہے۔'' اس کے پیدا ہونے سے دو دن پہلے کی رات بہت اذیت سے اس نے کاٹی تھی رات کی سیاہی، درد کی لہریں اسے بھولتی نہیں تھیں۔ بھرجائی کے دوا دینے کے باوجود درد میں کمی نہیں آ رہی تھی۔ اور جس دن ایمرجنسی میں اسے بھاگتے دوڑتے لے جایا گیا اس کی حالت بہت خراب تھی۔

اس وقت بھی روائیہ کو کمر کے نچلے حصے میں درد کی شدید لہر اٹھتی محسوس ہوئی جو تیزی سے اس کے سارے پیٹ میں زخموں کی طرح پھیل رہی تھی ڈاکٹر نے اسے فوراً آپریشن تھیٹر میں پہنچایا تھا اس کا اسٹریچر لابی سے بھگاتے لے جا رہے تھے سلوٰی، آئمہ پاس ہی بھاگ رہی تھیں، سلوٰی کے موبائل پر بار بار فون آ رہا تھا۔ اسے اس وقت بھی یاد تھا او۔ٹی کا دروازہ کھلتے ہوئے اس نے آخری بات یہی کی تھی۔

''بھرجائی ...... مجھے ضبل بہت یاد آ رہا ہے...... میرے بچے کا خیال رکھنا۔'' اسے لگتا تھا شاید سارے لفظ بھرجائی نے ابھی نہیں سنے تھے۔ اسے جھٹ پٹ میز پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف ڈاکٹرز ہی تھے ہاتھوں پر گلوز چڑھائے، چہرے ماسک سے ڈھکے اور بہت سی روشنی تھی ایک آکسیجن ماسک اس کی ناک پر چڑھا تھا۔ شدید روشنی میں ڈھکے چہرے دھندلانے لگے۔ آخری بار اس نے اپنے بدن پر بہت سی انگلیاں سرکتی ہوئی محسوس کیں وہ آہستہ آہستہ غنودگی میں جا رہی تھی اس کے کانوں میں آوازیں مدھم ہوتی بند ہو گئیں۔ جانے کتنے پل، سال صدیاں کتنا عرصہ گزرا تھا جب اسے دوبارہ اپنے جسم میں جان آتی محسوس ہوئی ایک جملہ سنا تھا اس نے شاید ڈاکٹر لبنیٰ کی آواز تھی۔ ''جلدی کرو فوراً لے جاؤ......''

ہاں تو جلدی تھی نا ن...... کوئی بچہ بہت دور رو رہا تھا بلی کے بچے کے مشابہہ آواز جیسی آواز...... دور ہوتی گئی...... اس کی طبیعت ٹھیک جو نہیں تھی اسے انکوبیٹر کی ضرورت تھی اسی لیے جلدی لے جایا گیا ہو گا، پھر سبرینہ کیسے کہہ سکتی ہے رابعہ میری بیٹی نہیں میں نے خود اس کی آواز سنی تھی، میں نے اپنی جان کے بدلے اسے لیا تھا۔ جیسے جیسے آواز دور ہو رہی تھی اس کے ہاتھوں پر لگی سوئیوں میں تیز دوائیاں گردش کرنے لگیں۔ کان سن ہوتے ہوتے بند ہو گئے وہ پھر سے نیند میں چلی گئی تھی۔

پھر اس کی آنکھ ایک چھوٹے سے کمرے میں کھلی تھی۔ بہت تکلیف تھی اسے لگا تھا اس کے دھڑ کو دو حصوں میں کر کے ایک بیڈ پر ڈال دیا گیا ہے، اس کے ہاتھ بے حد بھاری تھے جیسے ان پر پتھر رکھ دیے گئے ہوں سینہ کندھے، کندھوں کی پشت اور گردن کے پٹھے شدید اکڑاؤ کا شکار ہو کر یہ بتلا رہے تھے شاید وہ مفلوج ہونے لگے ہیں اس بے بسی کے عالم میں خالہ گلزاری اس کے پاس آئی تھیں انہوں نے مسکرا کر سر پر ہاتھ پھیرتے کہا تھا۔

''اللہ نصیب اچھے کرے، بچی ہوئی ہے...... تھوڑی بیمار ہے کچھ دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔'' اسے اپنا مفلوج ہوتا جسم بھول گیا تھا۔ کٹا پھٹا دھڑ یاد نہیں رہا تھا۔ یک لخت اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

''کہاں ہے وہ ...... مجھے اسے دیکھنا ہے۔''

اب سبرینہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ میں نے اسے جنم نہیں دیا۔ اسی فالج شدہ بدن کی ٹیس اب بھی اتنی ہی شدت سے محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ہذیانی کیفیت میں پوری طاقت سے دھاڑی تھی۔

''چلے جاؤ یہاں سے، جندب ان سے کہو یہ چلے جائیں۔''

(باقی آئندہ)

☆☆

خوشیوں نے "مرشد ولا" پر ڈیرہ کیا ڈالا، ہر طرف محبت کی پرسکون ہوا چلنے لگی۔، دن بھر سے جاری رونق اور شور وغوغا کے بعد، اسد مرشد کے دل میں کچھ لمحے تنہائی، میں حنا کے بارے میں سوچنے کی خواہش جاگی، وہ غیر محسوس انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا اور یار دوستوں کی محفل سے پیچھا چھڑاتے ہوئے، بڑے ہال سے اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ دروازہ پار کرتے ہی، گردن گھما گھما کر اپنے کمرے کا جائزہ لیا، جس کی سج دھج ہی نرالی تھی ۔جدید انداز کی ڈیکوریشن، اس پر بھاری قیمتی فرنیچر کی سجاوٹ نے یہاں کی ہیئت ہی تبدیل کر دی تھی، اسد نے اچانک ناک سکیڑی۔ تازہ کیے ہوئے وائٹ واش کی تیز بو اس کے نتھنوں میں داخل ہوئی تو طبیعت پر ناگواری سی چھا گئی مگر کچھ دیر بعد یہ احساس زائل ہو گیا اور وہ چار سو پھیلی تنہائی بہت پرسکون اور اپنی اپنی سی لگنے لگی، وہ کمرے سے متصل بالکنی میں پڑی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

''بس ایک رات کا فاصلہ تو رہ گیا ہے''، اسد مرشد نے سیاہ آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھ کر سوچا۔

'' زندگی کتنی مہربان ہوتی ہے''۔اسد نے آنکھیں موندیں، ایک سرشاری سی اس کے وجود پر چھاتی چلی گئی،

''تم ۔۔واقعی میری ہونے والی ہو؟''۔اس کے بھرے بھرے لب ہلے۔حنا کا مسکراتا چہرہ تصور میں چلا آیا تو دل میں گدگدی سی ہوئی، وہ خود کو آسمان کی وسعتوں پر اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا کہ، دھڑ۔۔۔دھڑ۔۔۔دھڑام۔دھڑام سے زمین پر آ گرا۔

''کیا ۔۔آفت ہے؟'' اسد ہڑبڑا کر بولا ۔۔پہلے تو بڑے زوردار انداز میں دستک دی گئی، اس کے بعد ایک دھما کے بعد دروازہ پورا کھل گیا، اس کے حسین خیالوں میں دراڑیں پڑ گئیں۔اس نے کھلی آنکھوں سے درجن بھر لڑکوں کا اپنی جانب بڑھتا ہوا ریلا دیکھا۔

☆☆☆

حنا اشرف بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی، اشرف علی اور ان کے دو بھائی، ایک ہی محلے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے، ان تینوں بھائیوں کی بیویاں، پھوپھی۔ماموں اور خالہ زاد تھیں، کیوں کہ ان کے یہاں خاندان سے باہر شادی کا رواج نہیں تھا۔حسن اتفاق سے ان تینوں بھائیوں کے یہاں تین تین بیٹے ہوئے اور بیٹی کی خواہش تینوں بھائیوں کی آنکھوں میں پلنے والا مشترکہ سپنا تھا، قدرت کی مہربانی سے اس کی تعبیر اشرف علی کو مل گئی۔اسی لیے جب رخسانہ کی گود میں پریوں جیسی حنا آئی تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔تینوں گھروں میں لڑکی کی پیدائش پر خوشی کی یکساں لہر دوڑ گئی، اشرف علی نے بہت بڑے پیمانے پر خوشیاں منائیں، اور خاندان بھر میں مٹھائی تقسیم کی، مگر حنا کے ناز سب نے مل کر اٹھائے، جب تک وہ چھوٹی رہی، تب تک وہ اپنی تائی اور چاچی کی آنکھوں کا تارا بنی رہی۔باری باری کبھی تایا اور کبھی چاچا کے گھر بلوائی جاتی، ہر کوئی اسے گود میں لیے پھرتا ۔وہ بس ہاتھوں میں رہتی مگر جوان ہونے پر اس کی معصومیت اور خوب صورتی پر فدا ہوتے ہوئے تائی اور چاچی نے بیک وقت اپنے بڑے بیٹوں کا رشتہ دے ڈالا۔اشرف علی اور رخسانہ کشمکش و پیچ میں پڑ گئے کہ کس کو ہاں کہیں اور کس کو نہ کہیں۔

ایسے میں بڑے بھائی شرافت نے بہت سوچ بچار کے بعد چپکے سے منجھلے بھائی اشرف کو ایک ایسی تدبیر بتائی، جس پر عمل کرتے ہوئے، خاندان میں پیدا ہونے والا جھگڑا ٹل گیا اور ان کی بیویاں خاموشی سے پیچھے ہٹ گئیں، رخسانہ نے پہلے تو سکون کا سانس لیا مگر بعد میں تجسس سے مغلوب ہو کر شوہر سے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہوئی جو جٹھانی اور دیورانی خود ہی اس رشتے سے دست بردار ہو گئیں، ۔اشرف علی نے بتایا کہ بھائیوں نے اپنی بیویوں کے کان میں کزن میرج کے حوالے سے ایک بات ڈال دی کہ طبی تحقیق کے مطابق خاندان میں کئی نسلوں تک مسلسل شادیاں ہونے کی وجہ سے آنے

والی اولاد میں ممکنہ معذوری یا نقائص کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔رخسانہ نے بھی اس نہج پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا اور بیٹی کی شادی غیروں میں کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ سب تو خیر بہانے تھے، دراصل حنا کی قسمت تو اسد کے ساتھ بندھ چکی تھی، پھر وہ دونوں کیسے ایک نہ ہوتے۔

☆☆☆

''اوہ۔۔یہ نوشے میاں تو یہاں چھپے ہوئے ہیں''اسد جن سے چھپ کر اس جائے پناہ میں آیا تھا ۔۔ان سب نے ایکا کر کے اس کے کمرے میں ایک ساتھ دھاوا بول دیا۔

''بھائی۔۔۔انسانوں والی حرکتیں کب سیکھو گے؟''اسد نے چڑ کر اپنے دوست سرور سے پوچھا، جو جہیز کے نئے نکور بیڈ پر الٹا لیٹا ہوا تھا۔

''نوشے میاں۔۔ہماری چھوڑ دو۔۔۔ہم تو سب سیکھے سکھائے ہیں۔۔فی الحال اپنی فکر کرو''ان سب نے کورس میں جواب دیا اور چھت پھاڑ قہقہہ لگایا گیا۔

''کیا مطلب۔۔۔میں کچھ سمجھا نہیں'' اسد نے تپ کر پوچھا۔

''دیکھو۔۔یار۔۔آج تمہاری ۔۔آزادی کی آخری رات ہے۔۔اس لیے یہاں بیچلرز پارٹی منائی جائے گی۔۔اور تمہیں۔۔شوہر بننے کے سنہری اصول ازبر کرائے جائیں گے''ایک اور دوست طالب نے جوش میں مکمل الفاظ استعمال کیے۔

''کیا۔۔۔مطلب۔۔ا؟'' اسد نے پھاڑ سا منہ کھولا، مگر کسی نے جواب دینا گوارا نہ کیا۔ایک نے جا کر سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔

''دیر۔۔ میرا گھوڑی۔ چڑھیا'' سب نے مل کر دھمال مچایا، خود بھی پسینہ پسینہ ہوئے، اسد کو بھی تھکایا۔

اس کے بعد کوئی ''ادھر گرا۔۔کوئی۔۔ادھر گرا کی تفسیر بنا، جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہیں لیٹ گیا، اور جہاں گرا وہاں ہی مچا گیا۔اسد نے دانت کچکچا کر اپنے سجے ہوئے کمرے کا حال برا ہوتے دیکھا۔

☆☆☆

طاہرہ نے اپنی بہو حنا کو ایک کلینک میں دیکھ کر پسند کیا تھا، کئی دنوں سے ان کا بخار نہیں ٹوٹ رہا تھا ۔اسد ان دنوں آفس کی طرف سے دوسرے شہر گیا ہوا تھا، اسی لیے طاہرہ ایک کے بعد ایک گھر میں رکھی ہوئی دواؤں کو خود پر آزماتی چلی گئیں، مگر ایک سے بھی فائدہ نہیں ہوا، ویسے بھی شوہر کے انتقال کے بعد ان کے اعصاب بہت کمزور ہو گئے تھے، اگر بیمار پڑ جاتیں تو سنبھلنے میں کافی وقت درکار ہوتا، اسی وجہ سے اسد ماں کو چھوڑ کر کہیں آیا جاتا نہیں تھا مگر اب آفس کی طرف سے جانا مجبوری تھی۔اس کے باوجود وہ روزانہ ماں کی فون پر خیر۔۔خیریت لیتا رہتا۔

ماں کو کال ملائی، ان کی بھاری آواز سنتے ہی وہ سمجھ گیا، کہ طاہرہ بیگم پر گھریلو نسخے کارآمد ثابت نہیں ہوئے، گھر سے دور ہونے کی وجہ سے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔اس نے کچھ سوچ کر بڑی خالہ کو کال ملائی،، جو دو گلیاں چھوڑ کر رہائش پذیر تھیں۔بھانجے کی درخواست پر شاہدہ اپنے بیٹے سلیم بیگ کے ساتھ بہن کو پکڑ کر زبردستی فیملی ڈاکٹر کے کلینک لے گئیں۔۔ڈاکٹر رضوان کے پاس مریضوں کی لمبی قطار تھی، وہ اپنی باری کے انتظار میں جا کر بنچ پر بیٹھ گئیں۔

ڈاکٹر رضوان احمد کے علاج سے حنا کی ممی رخسانہ کو بھی ہمیشہ فائدہ ہوتا تھا، اسی لیے ان کا اس ڈاکٹر پر پرانا اعتقاد تھا۔حنا کو شدید قسم کا فلو ہوا تو وہ بیٹی کی نہ نہ کے باوجود اسی دن اتفاق سے وہاں آئی ہوئی تھیں۔جہاں طاہرہ بھی موجود تھیں۔

رخسانہ نے پرچی بنوائی اور اپنی باری کے انتظار میں اسی بنچ پر بیٹھ گئیں، جہاں طاہرہ اور شاہدہ پہلے سے براجمان تھیں۔ان لوگوں کی باری آنے میں دیر تھی، وقت گزاری کے لیے آپس میں بات چیت شروع کر دی۔حنا کی چھوٹی سی تیکھی ناک سرخ ہو رہی تھی۔۔سر میں درد تھا۔وہ ہائے ہائے کرتی بار بار ممی کے شانے پر ہاتھ رکھے جا رہی تھی۔طاہرہ نے

بڑی توجہ سے حنا کو دیکھا، اس کی بھولی اداؤں پر انہیں پیار آنے لگا۔ رخسانہ بیٹی کی تکلیف پر تسلی دینے کے ساتھ۔ ان دونوں سے بڑے اخلاق سے باتیں کرنے میں محو ہو گئیں۔ طاہرہ کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر حنا پر جا کر ٹھہر رہی تھیں۔ وہ بلاشبہ حسن کا جیتا جاگتا شاہکار تھی، سرد قد، متناسب سراپا، گلابی کھلی کھلی رنگت، نشیلی آنکھیں، اور سنہری گھنے بال،، ان کے دل میں ایک دم خواہش جاگی کہ حنا کو اپنی بہو بنالیں۔ طاہرہ نے بڑی بہن کو اشارے کنایوں میں بات سمجھائی تو وہ ان لوگوں سے مزید خوش اخلاقی برتتے ہوئے۔ دوستی بڑھانے میں لگ گئیں۔ باتوں باتوں میں پتا لگایا گیا کہ حنا کا کہیں رشتہ وشتہ تو طے نہیں ہوا۔ رخسانہ بھی بیٹی کے لیے ان کی خصوصی دلچسپی کو سمجھ رہی تھیں۔ اٹھنے سے قبل فون نمبرز کے تبادلے ہوئے۔ اور ایک دوسرے کو گھر آنے کی تاکید کے ساتھ اجازت طلب کی گئی۔

اس کے بعد دونوں خاندانوں میں ایک دو دفعہ رسمی سا آنا جانا ہوا۔ اسد کی گھر واپسی ہوئی تو پتا چلا۔ ماں کو وہ گوہر نایاب مل گیا ہے، جس کی تلاش جاری تھی۔ وہ اس عجلت پر حیران رہ گیا۔ طاہرہ اس فیملی سے اچھی طرح سے مطمئن ہو چکی تھیں اس کے بعد ایک دن اسد کا رشتہ لے کر پہنچ گئیں اور جلدی شادی کرنے پر زور دیا۔ رخسانہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے، اس پر شوہر کی بے توجہی، مگر وہ اتنے اچھے رشتے کو کھونے کے حق میں نہیں تھیں، چنانچہ سب کی رضامندی سے یہ رشتہ طے پا گیا۔

☆☆☆

جگمگاتے "مرشد ولا" پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد طاہرہ کی آنکھوں میں طمانیت جھلکنے لگی۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ اور ملازمہ کو لوازمات سے بھری ٹرے اٹھانے کا اشارہ کیا اور کچن سے باہر نکل آئیں۔

"اللہ...... میرے بچے کی خوشیوں کی حفاظت فرمانا۔" دل ہی دل میں دعائیں مانگتی وہ اسد کے بند دروازے کے آگے جا پہنچیں۔

"چلو...... بچوں...... چائے پی لو۔" طاہرہ بیگم نے دروازہ کھٹکھٹانے کے ساتھ ہی زور کی آواز لگائی۔

"آنٹی آ گئیں۔" سب سے پہلے جلدی جلدی کمرہ سمیٹا' اس کے بعد شریفوں' مسکینوں والا منہ بنا کر دروازہ کھولا۔

"آنٹی! آپ کے ہاتھوں کی چائے کا چسکا لگ گیا' ورنہ اسد کے لیے یہاں کون ٹھہرے" ٹرے تھامتے ہوئے طاہر کو مسکا لگایا اور فوراً دروازہ بند کر دیا گیا۔

"سب بہت ہی شریر ہیں۔" طاہرہ لڑکوں کی شرارت پر مسکراتی ہوئی اپنے کمرے میں آرام کرنے چل دیں۔

کارپٹ پر بیٹھ کر سکون سے چائے اور وائے کے مزے اڑائے گئے،۔ اس کے بعد اسد مرشد کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی تیاری مکمل ہو گئی۔

"آج کل کی بیویاں۔ توبہ توبہ۔۔۔ اللہ بچائے۔" ایک نے ناک سے درد بھری آواز نکالی۔

"سب نے مل کر "اللہ بچائے" کی گردان شروع کر دی۔ اسد پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

"ایک بات کا دھیان رکھنا۔۔ تم آنٹی کے واحد سہارا ہو،۔۔ کہیں۔ ہاتھ سے نہ پھسل جانا۔" سجاد نے سنجیدگی اختیار کی،

"صحیح۔۔۔ بات۔۔۔ ہے" حاضرین محفل نے زبردست طریقے سے تائید کی۔

اس کے بعد اپنی اپنی باری پر سب نے لوشے میاں کے کان رج رج کر بھرے۔۔۔ مستقبل کی ایسی منظر کشی پر زرد کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس اسد کا رنگ پیلا پڑ گیا تھوڑی دیر پہلے من میں اٹھنے والے کومل جذبے مرجھانے لگے،۔

"میرے۔۔۔ بھائی۔۔۔ مرد بننا۔ پہلی رات میں ہی۔ جورو کے غلام نہ بن جانا" ایک کزن نے مدبر بننے کی ناکام کوشش فرمائی۔

"ہاں۔ تو۔۔۔ یہ نہ ہو موصوف۔ کہ۔ بھابھی کے پاؤں دھو دھو کر پینے لگے۔" ارشد نے طنز فرمایا حالانکہ وہ خود بیوی کے اشاروں پر ناچنے کے معاملے میں خاصی شہرت پا چکا تھا۔

"میں تو بس۔۔۔ ایک ہی مثال دوں گا۔۔ گربہ کشتن۔۔۔ روز اول۔" ایک اور کزن احمر بھی چہکا، ویسے وہ خود بیوی کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا۔

"بس۔۔۔ کر دو۔۔ یار!" اسد نے سب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"سن۔۔۔ اوئے۔ اپنے۔ نام "اسد" کی لاج رکھنا اور بھابھی کو شیر کی نگاہ سے دیکھنا" پرانے دوست عقیل نے جوش میں آنکھ میں آنکھ ڈال کر صلاح دی۔

"میں ان میں سے نہیں۔۔۔ جو۔۔ شادی کے بعد بدل جاتے ہیں۔" اتنا کچھ سننے کے بعد۔۔ اسد نے بھی ہمت کر کے بڑھک ماری۔

"تمہارے جیسے بہت دیکھے۔۔۔ ایک رات میں ہی بیوی کے پلو سے بندھے نظر آؤ گے۔۔" ارشد نے ایک آنکھ میچ کر کہا اس کے ہونٹوں سے چپکی مکارانہ مسکراہٹ پر وہ جل بھن کر رہ گیا۔

"میں بدلتا ہوں یا نہیں۔۔۔ یہ۔۔ تو۔۔۔ وقت ہی بتائے گا" اسد نے ان سب کی باتوں سے تنگ آ کر جوش میں خود سے عہد کیا۔۔

"میاں۔ اسد بات یہ ہے کہ تم چھوٹی خالہ کے اکلوتے بیٹے ہو" خالہ زاد سلیم بیگ نے پیچھے سے آ کر کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"جی۔۔ سلیم بھائی" اسد نے ان کی بات کی تائید کی۔

"ابھی خالو کے انتقال کا صدمہ ان کے دل سے کم نہیں ہوا ہے" سلیم کے لہجے میں افسردگی چھائی۔

"میں۔۔ بھی اس موقع پر پاپا کو بہت مس کر رہا ہوں" وہ آسمان کو تکتے ہوئے نم لہجے میں بولا۔

"بس اسی بات کا خیال رکھنا اور شادی کے بعد ماں کو بھول مت جانا۔" سلیم بیگ نے کر معقول انداز میں سمجھانا چاہا۔ بات دل پر جا لگی۔

"آپ۔۔۔ بے فکر ہو جائیں۔ میرے لیے۔ امی سے بڑھ کوئی نہیں" اسد کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"۔ ایں۔۔ مگر۔۔ اس بات کو بھی مت بھولنا کے۔ بیوی کا بھی تم پر حق ہو گا۔۔" سلیم بیگ اس کے جذباتی پن سے واقف تھے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے اور جلدی سے کہا۔

"میری۔ زندگی میں امی کا مقام سب سے افضل ہے" اسد نے سلیم کی پہلی بات پر غور کیا اور دوسری کو نظر انداز کر دیا۔

شادی سے ایک رات قبل دوستوں کے چڑھائے میں آ کر بے وقوفوں کی طرح نئی دلہن کو قابو کرنے کے گر سوچنے لگ گیا۔

☆☆☆

کمرے میں پھیلی پھولوں کی خوشبوؤں نے ماحول کو رومان پرور بنا دیا، مگر مجال ہے جو اس حسین رات نے دلہن بنی حنا پر ذرا سا بھی اثر چھوڑا ہو۔ رات بیتتی چلی جا رہی تھی، سر جھکائے اپنے دولہا کے انتظار کی کوفت سہتے سہتے حنا اب بور ہونے لگی،۔ کمرے کی خاموشی میں دیوار پر آویزاں گھڑی کی ٹک ٹک سیدھی دماغ میں جا کر لگ رہی تھی۔

"اف۔۔ اللہ۔۔ دو بجنے والے ہیں" اس نے لمبا گھونگھٹ سرکا کر اوپر کیا اور نگاہ اٹھا کر ٹائم دیکھا۔

رشتے کی ایک نند اسے کمرے میں بارہ بجے بٹھانے کے بعد سے جو گئی تو کوئی اور اس طرف آ کر نہ پھٹکا۔۔۔ اجنبی جگہ پر، تنہائی کے احساس سے دوچار دلہن بنی حنا نے ایک طویل سانس لے کر خود کو ریلیکس کرنا چاہا۔ سیل فون ہاتھ میں لے کر ماں سے بات کرنے کا سوچا، مگر پھر ان کی پریشانی کے خیال سے واپس رکھ دیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اپنی چلبلی فطرت کے برعکس ماں کی نصیحتوں کو گرہ سے باندھے، وہ اتنی دیر ایک جگہ ٹک کر بیٹھ گئی، اس کے لیے یہ بھی بہت تھا۔

"بھوک۔۔ لگ رہی ہے" اسے یاد آیا کہ گھبراہٹ میں اس سے ٹھیک طرح سے کچھ کھایا بھی نہیں گیا۔

گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا، بھوک کا احساس

شدید ہوا، سائڈ ٹیبل پر ایک پلیٹ میں نفاست سے سجی مٹھائی اور فروٹ رکھے دکھائی دیے، منہ میں پانی بھر آیا، سیب کھانے کو دل بری طرح سے للچایا، پھر جھجک آڑے آ گئی۔

"محترم ۔ یہ نہ کہیں ۔۔ کہ دلہن کتنی ندیدی نکلی پہلی رات کی کھانے پینے کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرلیا" اپنی پوزیشن کا خیال آیا۔ تو ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

اسے کچھ اور نہ سوجھا تو کلچ کھول کر اندر جھانکا، منہ دکھائی میں ملنے والے چند لفافوں کے بیچ سے جھانکتی ایک مزے دار چاکلیٹ یقیناً نبیلہ کی عنایت تھی ۔ مسکراہٹ اس کے نازک گلابی لبوں کو چھو گئی۔ خالہ زاد نبیلہ کو دعائیں دیتے ہوئے، حفظ ماتقدم کے طور پر دروازے کی طرف دیکھا، پھر جلدی جلدی ریپر اتارا۔ اور زندگی میں پہلی بار چاکلیٹ دو بائٹ میں ختم کر ڈالی، کچھ آسرا ہوا۔

انتظار کی کوفت برداشت کرتے، کچھ دیر اور گزری تو کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا، فان کلر اسکیم سے سجائے گئے روم میں سکون، سادگی اور نفاست کا گہرا رنگ چھایا ہوا تھا۔ نگاہوں میں پسندیدگی کی لہر ابھری، وسیع و عریض بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر نفیس سا تازہ گلابوں کا فلاورارینجمنٹ، مزاج پر اچھا اثر چھوڑ گیا، اس نے راج ہنس کی طرح گردن اٹھا کر باقی چیزوں کا باری باری جائزہ لیا۔ دریچوں پر قیمتی گولڈن براؤن، پردے، دیوار کے ساتھ لگا۔ براؤن لکڑی سے بنا کتابوں کا شیلف، جس پر ترتیب سے سجایا گیا ادبی خزانہ، اسد کے باذوق ہونے کا مکمل ثبوت تھا، مگر وہ اس حسین شب زفاف کے حوالے سے خود کو بدذوق ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ من میں ایک بار پھر غصہ عود آیا۔ کمرے سے باہر نکل کر دیکھنے کا ارادہ کیا۔

"ایسا لگ رہا ہے ۔۔۔ سب ۔ نئی دلہن کو یہاں بٹھا کر بھول گئے ہیں" ۔۔ حنا ڈر کر باہر نہ نکلی اور بیڈ پر دوبارہ بیٹھ کر پہلو بدلنے لگی۔

"اف ۔۔ کیا مصیبت ہے" اپنی چوڑیوں میں پھنسے کامدار دوپٹے کو الگ کرتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

بے قرار نگاہیں اچانک ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے سے جا ٹکرائیں تو پہلی بار اپنے سراپے کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے دل باغ باغ ہو گیا

'واہ ۔ آج تو میری ٹور ہی نرالی ہے' ۔ سراہنے میں بالکل کنجوسی نہیں کی گئی ۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔

"سب ٹھیک ہی تعریف کر رہے تھے ۔۔" خوش دلی سے سوچا، واقعی ہلکے پھلکے میک اپ میں اس کا ملکوتی حسن عود آیا تھا، پلک پلک بنی سنوری، جڑاؤ زیورات سے مزین وہ حنا اشرف تو نہیں رہی۔ نکاح نامے پر سائن کرنے کے بعد ۔۔ حنا اسد بن چکی تھی ۔۔ مگر جس کی ہو چکی تھی، اس کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔

☆☆☆

آج طاہرہ بڑی دھوم دھام سے اپنی بہو رخصت کرا کر لائیں تو سکون کا سانس لیا۔

"اللہ کا کرم ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں ہی بیٹے کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہو گئی ہیں۔" تشکر سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ سونے کے لیے بستر کی طرف بڑھیں تو کمرے کی کھڑکی سے بیٹے کو لان میں مضطرب انداز میں ٹہلتا پایا تو پریشان ہو کر باہر کی جانب بڑھتی گئیں۔ دل میں عجیب سے وسوسے جاگ اٹھے۔

طاہرہ نے بیٹے کی اس غلط حرکت پر جی بھر کر جھاڑ پلائی، بھلا کوئی نئی دلہن کو اس طرح سے چھوڑ کر رات گئے لان میں چہل قدمی کا شوق پورا کرتا ہے۔ محترم نے کان دبا کر ماں کی ڈانٹ سنی، لان کے کونے پر رکھے جوتوں کو پاؤں میں اڑسا اور کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دھیرے سے دروازہ کھولا، نیم اندھیرے کمرے میں آنکھوں کو مانوس ہونے میں کچھ دیر لگی۔

حنا کھٹکے کی آواز پر چونک کر سیدھی ہو گئی، شرم نے آ گھیرا تو، کامدار دوپٹے کا گھونگھٹ چہرے پر الٹ دیا، اسد نے بیڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے دلہن بنی حنا کو نگاہ بھر کر دیکھا۔

"دولہا بننا بھی آسان نہیں" جامہ وار کے پٹکے کو اتار کر ڈریسنگ پر رکھتے ہوئے سکون کا سانس لیا۔ سلکی گھنے بال ماتھے پر بکھر کر خوب روئی میں اضافہ کرنے لگے ۔۔

"اسد مرشد ۔۔ آپ پر شیروانی بہت بچ رہی ہے" حنا نے دوپٹے کی آڑ سے دیکھا اور شوخی سے پسندیدگی کی سند دے دی۔

"انہیں کیا ہوا؟" اسے ایک ہی جگہ جمے دیکھ کر سوچا۔ اسد کے پروجاہت چہرے پر سوچ کی پرچھائیں دھندلانے لگیں۔

"کیا یہ شادی سے خوش نہیں ہیں؟" ۔ حنا کا دماغ سوالات کا آماجگاہ بن گیا۔

اس کی گردن بھاری دوپٹے کا بوجھ اٹھائے اٹھائے جھکنے لگی ۔ چند منٹ بعد تو وہ بری طرح سے بے زار ہو گئی، اسد اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"کہیں ۔۔ کسی اور کو تو نہیں پسند کرتے ۔۔ جب ہی تو اتنی دیر میں کمرے میں قدم رکھا ہے" اسے اپنی ناقدری چبھنے لگی۔ اسد کا نظر انداز کرنا بالکل بھی نہیں بھایا ۔ وسوسے جاگ اٹھے۔ حنا کو اب شدید غصہ آنے لگا۔

"ہاں ۔۔ نہیں ۔ تو ۔ بہت ۔ سہہ لیا ۔۔ اب تو چینج کر کے سو جاتی ہوں" حنا نے منہ بسور کر فیصلہ کیا، ابھی وہ مہندی لگے پاؤں بیڈ سے نیچے اتارنے والی تھی کہ، صاحب بہادر چلتے ہوئے، پہلو میں آ بیٹھے۔ حنا کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی ۔۔ مگر یہ کیا۔ مہاراج نے اتنی دیر بعد شرف باریابی بخشنے کے بعد جو پہلا جملہ بولا، مہارانی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"محترمہ ایک بات کان کھول کر سن لیں۔" اسد یوں شروع ہوا ۔۔ جیسے ان دونوں میں قدیم بیر چلا آ رہا ہو۔

"سن رہی ہیں نا۔" اسد نے چٹکی سے سنہری کامدار آنچل سرکایا۔ اب کی بار اس کے لہجے کی سختی اور انداز، پر حیرت ہوئی۔

"جی ۔۔۔" حنا نے پٹ سے آنکھیں بند کی اور دھیرے سے جواب دیا، ہولے ہولے لرزتی پلکوں میں اسد کا دل اٹکنے لگا، سر جھٹک کر خمار سے نکلا۔

"میری امی ہی ۔۔ میرا سب کچھ ہیں۔" وہ بڑے عقیدت سے پھر شروع ہوا۔

"لو ۔۔ اس میں ۔ کیا نئی بات ہے؟ ۔۔ میری ممی خود مجھے بہت عزیز ہیں ۔۔ اب یہ کوئی اس وقت بتانے والی بات ہے ۔۔ حد ہے جی۔" حنا کا بس چلتا تو وہ اسے دلیل دے کر خاموش کرا دیتی۔

"میں ۔۔ ان کا اکلوتا بیٹا ہوں" ۔ اسد نے بڑے فخر سے کہا، اسے دولہا کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

'شکر ہے بتا دیا ۔۔ مجھے تو یہ بات پتا نہیں تھی ۔۔!'

حنا نے طنز سے پلکوں کی چلمن اٹھائی، زبان چپ تھی، مگر ذہن ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔

"آنکھیں ۔۔ تو بہت حسین ہیں۔" دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں،، اسد ان نشیلی آنکھوں میں کھونے لگا۔

"جورو کے غلام۔" برا ہو ان دوستوں کا ۔۔ جن کے طعنے۔ غلط وقت پر کانوں میں اودھم مچانے لگ گئے۔

"نہیں ۔ ہوں ۔۔ کسی کا غلام"۔ اس نے فوراً انکار میں سر ہلایا۔ دلہن کی جگہ شیلف میں رکھی بک کو شوق سے دیکھا۔

"پاپا کے انتقال کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا، مگر امی کا دل بہلانے کے لیے راضی ہونا پڑا۔" ۔۔ اسد کو خود بھی نہیں پتا تھا کیا بولنا ہے کیا نہیں ۔۔ حنا کا حسن اسے بے دست و پا کیے دے رہا تھا۔

"میں کوئی دل بہلانے والا کھلونا ہوں" اسے یہ بات خاصی ناگوار گزری ۔۔ سارے گدگداتے خیالات ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

"اب یہ آپ کا فرض ہے کہ نہ صرف امی کا خیال رکھیں۔ بلکہ ان کی ہر بات مانیں ۔۔ ورنہ ۔۔" اس کی لمبی تقریر کا لب لباب ۔، حنا کا، دماغ ماؤف ہونے لگا۔

"ورنہ ۔۔۔ کیا ۔۔" مہین سی آواز میں پوچھ

ہی لیا۔

''ورنہ۔۔باہر کا دروازہ کھلا ہے۔'' اسد نے کھٹاک سے جواب دیا۔

''ہائیں۔''۔نگاہوں میں بے یقینی کی پرچھائیاں ہلکورے لینے لگیں۔۔اسد کو نظر ملانا مشکل ہوا۔

حنا کا ذہن اس کی ایک ''ورنہ۔۔'' میں اٹک کر رہ گیا۔

''میں اس سلسلے میں کوئی شکایت نہیں سنوں گا۔۔'' بیوی کی بے توجہی محسوس کرکے وہ تھوڑا زور سے بولا۔

''اچھا۔۔جی'' حنا نے چونک کر سر ہلایا اور بے دردی سے پھول سے ہونٹ کاٹے، وہ تو محبت بھرے التفات کی منتظر رہی۔۔یہاں کھلی بے عزتی۔ہوگئی۔۔۔

''شریک حیات سے پہلی ملاقات۔وہ بھی۔اتنی بدمزا''۔حنا کا حلق کڑوا ہوا۔

''میٹھی زندگی کے لیے یہ کڑوی ڈوز دینا ضروری تھی''۔نئی دلہن کے چہرے پر پھیلے تاثرات، پڑھ لیے گئے، دھڑکتے دل کو تسلی دی گئی۔

''یہ۔۔تھی۔ابتدا۔آگے آگے۔۔دیکھیے ہوتا ہے۔۔کیا؟''۔۔وہ اسد کے رویے پر دکھی ضرور ہوئی، مگر ڈرنے والی نہیں تھی۔

''یہ۔۔آپ کی منہ دکھائی ہے۔'' اسد کو خیال آہی گیا، شیروانی کی جیب سے سرخ مخملیں باکس نکالا، جس میں سونے کی نازک سی چین بند تھی۔

''تھینک یو۔۔'' اس نے بھی پرتکلف انداز اپنایا۔اور بے دلی سے باکس سائڈ میں رکھ دیا۔

''تھوڑی سی نرمی دکھانی چاہیے۔۔''۔وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اسد کے دل نے مصلحتوں کو ایک طرف رکھنے کی گردان شروع کردی۔

''منہ دکھائی دیکھی نہیں'' کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو سوال کرڈالا۔

''منہ دکھائی۔۔ایسے۔۔دی جاتی ہے'' اس نے مخملی ڈبا مرمریں انگلیوں میں تھام کر سامنے کردیا۔

وہ نگاہیں چراتا، کپڑے بدلنے واش روم کی جانب بڑھ گیا۔واپس لوٹا تو وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی خیالوں میں گم تھی۔

اسد نے بیڈ پر دراز ہوکر اسے تکنا شروع کردیا۔ براؤن آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک ابھری۔

☆☆☆

اسد کی بے تکی باتوں نے حنا کی نیند اڑادی۔وہ بزدل نہیں تھی جو اسد کے رویے پر آنسو بہا بہا کر اپنی طبعیت خراب کرلیتی۔اسے اپنے حقوق کے لیے لڑنا آتا تھا۔شادی کی پہلی رات وہ اس طرح کے سلوک کی متمنی نہ تھی۔مگر ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی۔اس نے خود کو تسلی دی۔

اسد نے بے تکے انداز میں ماں کی عظمت منوانا چاہی، یہ سوچے بغیر کہ ضد سے کبھی کبھی کوئی کام بنے ہیں۔۔اس نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے دوپٹے سے جھانک کر چند گھنٹوں قبل شوہر کے عہدے پر فائز ہونے والے شخص کو دیکھا۔

اسد سوتے ہوئے بہت معصوم لگ رہا تھا۔ماتھے پر بکھرے سلکی بال، حنا کا دل چھونے کو مچل اٹھا۔

''شوہر نامدار۔۔طے پایا۔۔ باہر کا کھلا دروازہ۔۔آپ سے ہی بند کرواؤں گی۔ورنہ۔۔'' اس نے سرخ ہوتی آنکھیں میچیں۔

''میں آپ کی امی کی ایسی خدمت کروں گی۔۔آپ بھی یاد رکھیں گے۔۔'' حنا کے چہرے پر عجیب سے رنگ بکھر گئے۔

رشتوں سے محبت حنا کی گھٹی میں شامل تھی۔مگر پہلی ہی رات شوہر کی بے مہری ناقابل فہم تھی۔حنا نے مہندی لگے ہاتھوں کو مروڑا۔

''میں رونے والوں میں سے نہیں۔۔۔میں تو رلادوں گی۔۔جناب'' حنا نے اذیت سے مسکرا کر سوچا۔

''ڈیئر۔۔ہبی۔۔آج تو۔آرام سے سوئیں۔کل سے

کھلنے والا۔ایک نیا محاذ دیکھے گا۔۔آپ کی نیندیں۔۔کیسے اڑتی ہیں۔،'' حنا نے اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو دھیرے سے چھوا، شرارت سے اسد کو زبان چڑائی اور شہزادیوں کی طرح اپنا شرارہ چٹکی سے اٹھا کر، لباس تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

شادی کے دوسرے دن حنا۔اسد کے ساتھ میکے پہنچی تو ان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا گیا، وہ بلیو بھاری کام والے سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی رخسانہ نے بے ساختہ بیٹی کا صدقہ اتارا۔سب اس کے ارد گرد جمع ہوگئے، مگر وہ خلاف عادت کچھ چپ چپ سی لگی۔

''کیا بات ہے؟'' رخسانہ نے موقع ملتے ہی بیٹی سے پوچھا۔بیٹی کو خاموش دیکھ کر طبیعت گھبرائی۔

''کچھ نہیں۔۔ممی۔۔۔کچھ بھی تو نہیں۔'' اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

''سچ۔بولو۔۔کچھ تو ہوا ہے'؟' رخسانہ نے بیٹی کے قریب ہوکر سرگوشی کی۔

''کیوں پریشان ہورہی ہیں۔'' حنا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ماں کے گلے میں باہنیں ڈالیں۔

''تم دونوں۔۔چپ چپ ہو۔۔سسرال میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا'؟' رخسانہ کو کرید لگی ہوئی تھی۔

''نہیں۔وہاں۔سب ٹھیک ہیں'' حنا ماں کے سوالوں سے گھبرا کر اسد کے برابر میں جا بیٹھی، جو اس کے ابو سے محو گفتگو تھا، اسد نے نگاہ اٹھائی، بلیو سوٹ میں اس کی گوری چمکتی رنگت، رات کے رویے پر تھوڑا افسوس ہوا۔

''بیٹے۔جی۔یہ چکن لونا''۔اشرف علی نے اسد کی پلیٹ میں لیگ پیس رکھنا چاہا۔

''نہیں۔۔انکل۔۔بہت کھالیا'' اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کردیا۔

ان لوگوں نے داماد کی خاطر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، مگر اسد کا انداز پرتکلف سا رہا۔وہ چند نوالے کھانے کے بعد ہاتھ روک بیٹھا۔۔رخسانہ نے بے حد اصرار سے داماد کو مزید کچھ پیش کرنا چاہا، تو اس نے سہولت سے انکار میں سر ہلا دیا۔

''اچھا۔اب۔۔اجازت دیجیے'' اسد نے لیمن ٹی ختم کرتے ہی، وہاں سے جانے کے لیے پر تولے۔

''بیٹا۔۔ابھی تو آئے ہو'' رخسانہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا، مگر شوہر کی تادیبی نگاہوں پر وہ دبک گئیں۔

''جی۔۔۔اصل میں۔ مجھے ولیمے کے کچھ انتظامات دیکھنے ہیں'۔۔ویسے بھی شام کی تقریب میں آپ لوگ آتو رہے ہیں'' اسد کے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ آئی۔رخسانہ ابھی جواب دینے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی تھیں کہ اس نے بیوی کو چلنے کا اشارہ کیا۔

''چلیں۔۔۔دیر ہورہی ہے۔'' اسد کا انداز جتاتا سا تھا، حنا جلدی سے سنہرا کلچ ہاتھ میں تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔رخسانہ نے اس وقت مصلحتاً خاموشی اختیار کی مگر وہ دل ہی دل میں داماد کی سنجیدگی اور بیٹی کی خاموشی پر ہول گئیں۔

''مجھ سے کہیں کوئی غلط فیصلہ تو نہیں ہوگیا'' رخسانہ نے اپنے تھرتھراتے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔

☆☆☆

''میرے مالک۔۔ایسے دوست کسی دشمن کو بھی نہ دینا۔'' حنا نے بہت جلد شوہر نامدار کے ہوش ٹھکانے لگادیے۔اسد آسمان کی طرف دیکھ کر دہائی دیتا۔

''ایک۔۔منٹ۔۔حنا۔۔سنو۔۔'' وہ پکارتا رہ جاتا، اسے مسلسل اگنور کیے۔۔اپنے کاموں میں لگی رہتی۔اسد کی انا کو بڑی زوردار ٹھیس پہنچی۔

''سب نے کہا تھا۔فرسٹ امپریشن از دا لاسٹ امپریشن۔۔۔مگر یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ گیا، بیوی رعب میں آنے کی جگہ مجھے ہی نیچے دکھانے لگی،''۔اسد دکھی دل کی فریاد بن گیا۔شاید حنا کا لیے دیے سے رہنا۔کشش میں اضافے کا سبب بنا۔

اسد کرتا بھی تو کیا۔شادی کے کچھ دنوں بعد سے ہی بیوی کی پتلی کمر اور متوالی چال نے اس کے

ہوش اڑا کر رکھ دیے۔ آفس سے واپسی پر جب وہ بیوی کو بڑے اہتمام سے تیار شیار دیکھتا تو نئے ارمان جاگ اٹھتے۔ دل میں خواہش پنپتی کہ بیوی برابر میں آ کر بیٹھے، ناز نخرے اٹھائے مگر وہ ناک چڑھائے ادھر سے ادھر کام کرتی رہتی۔

ان دونوں کی زندگی بغیر کسی جذبے اور احساس کے گزر رہی تھی۔ اسد تھک ہار کر بیوی کو اپنی جانب راغب کرنے کی تگ و دو میں لگ گیا مگر وہ اس کے ہتھے ہی نہیں چڑھتی۔ اگر چائے کا بہانہ بنا کر بلاتا، تو حنا میاں کو کپ پکڑا کر باہر کی راہ لیتی، اسد پیچھے سے تنہا بیٹھ کر کڑھنے لگتا اور چائے ٹھنڈی ہو جاتی۔

وہ کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام بناتا تو حنا زبردستی ساس کو ساتھ لیتی اور بصد اصرار فرنٹ سیٹ پر بٹھا دیتی۔ اسد پیچھے بیٹھی بیوی پر مرر سیٹ کر کے حسرت سے تکتا رہ جاتا۔

دونوں کسی تفریح گاہ پر جا کر بھی باتوں میں مگن ہو جاتیں اور اسد برابر میں بیٹھا ادھر ادھر کے نظارے دیکھتا یا ان کی گھریلو ٹائپ باتوں پر سر دھنتا۔ حنا کی نگاہیں طاہرہ سے گپ شپ لگاتے ہوئے اسد کے بے زار چہرے پر پڑتیں تو اسے ہنسی کے فوارے کو اپنے لبوں تلے دبانا ضروری ہو جاتا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسد اپنی غلط باتوں پر شرمندہ ہو کر پیش قدمی کرے، کیونکہ وہ حق پر تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسا ہی ہونا ہے آثار تو ظاہر ہونے لگے تھے۔ اسد کی نگاہیں اس کا طواف کرتیں تو وہ اپنی کامیابی پر مسکرا اٹھتی۔

☆☆☆

''مرشد ولا'' میں حنا، طاہرہ اور اسد تین ہی نفوس تھے، زندگی اتنی مشکل بھی نہیں تھی، جتنی حنا کو پہلی رات لگی۔ بے جا دخل اندازی نہیں تھی۔ ایک بات جو اس کے حق میں جاتی تھی وہ ساس کا سادہ مزاج اور نفس لکھ ہونا، اگر خدانخواستہ وہ روایتی کہانیوں جیسی ظالم نکلتیں تو اسے بلاوجہ کئی محاذوں پر برسرپیکار ہونا پڑتا۔۔۔ طاہرہ اور حنا کی جلد ہی بہت اچھی دوستی ہو گئی۔ اب ان دونوں کا زیادہ وقت ایک دوسرے کی سنگت میں گزرتا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حنا نے پہلے دن سے انہیں بہت اہمیت دی۔۔۔ وہ طاہرہ کو اپنے ہر پروگرام میں شامل رکھتی۔ یہاں تک کہ اگر کبھی ان کی طبیعت خراب ہو جاتی تو، ساس کے منع کرنے کے باوجود حنا جا کر ان کے برابر میں سوتی۔ اور اسد ساری رات تارے گنتا رہ جاتا۔

وہ دو دن میکے میں گزار کر خوش خوش لوٹی تو اسد کا موڈ آف لگا۔ ساس کے پاس جانے کا سوچ کر دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔

''ارے۔ کہاں جا رہی ہو؟'' اسد نے عجلت میں آواز دی، پر حنا نے سنی ان سنی کر دیا۔

''ایک منٹ۔ یار۔۔ جواب تو دو''۔ اسد نے بلبلا کر اس کی نرم دودھ جیسی کلائی تھام کر پوچھا۔ چوڑیاں بج اٹھیں۔ وہ اسے گھورنے لگی۔

''امی نے فون پر بتایا تھا کہ ان کی طبیعت بھاری ہو رہی ہے۔ اس لیے سوچا۔ دوا دے دوں۔'' حنا نے دھیرے سے ہاتھ چھڑایا اور بے اعتنائی برتتے ہوئے کمرے سے جانے لگی۔

''جلدی واپس آنا'' اسد نے بلاوجہ ہدایت دی۔ جانتا تھا کرنی اس نے اپنے من کی ہے۔

''آپ سو جائیں۔ ورنہ۔ صبح آفس سے لیٹ ہو جائیں گے۔'' حنا کے گلابی لبوں پر قاتلانہ مسکراہٹ سج گئی۔ وہ بے بس ہونے لگا۔

''اف۔۔۔ سنو۔ ارے۔۔ رکو۔ تو۔'' اسد پکارتا رہ گیا اور حنا یہ جا وہ جا ہو گئی۔

''اسد میاں! لوگوں کے کہنے میں آ کر بلاوجہ پھنے خان بن گئے۔ کچھ اپنی عقل ہی استعمال کر لی ہوتی۔ چلو۔ بھگتو''۔

اپنے ہاتھوں سے بنے گئے جالے میں بری طرح سے پھنس چکا تھا۔۔ پھر کس بات کا واویلا۔

☆☆☆

''ہنی کل سنڈے ہے، تو کیا خیال ہے، شاپنگ نہ کر آئیں۔'' اسد نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔'' حنا نے کمرے کو سمیٹتے ہوئے

صاف انکار کیا۔

''یار کافی عرصہ ہو گیا ہے ہم ایک ساتھ باہر نہیں نکلے، اسی بہانے کچھ آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔'' اسد نے روڈ لہجے کے باوجود اسے منانا چاہا۔

''کیا ضرورت ہے؟'' اس نے مڑ کر کٹیلی نگاہوں سے دیکھا اور پھر کام میں مصروف ہو گئی۔

''ایسا کرنا۔ تم اپنے لیے کچھ نئے سوٹ خرید لینا۔ بلکہ جو دل چاہے۔ سنا ہے موسم کے لحاظ سے نئی کلیکشن آئی ہوئی ہے۔'' اسد نے اس کے تیزی سے چلتے ہوئے نرم ہاتھوں کو تھاما اور رشوت دینا چاہی۔

''جی بڑی زبردست کلیکشن آئی ہوئی ہے'' حنا نے ہاتھ چھڑا کر جواب دیا۔

''تمہیں۔۔ کیسے پتا؟'' اسد نے حیرت سے پوچھا۔

''نبیلہ نے بتایا تھا۔ اسی لیے میں نے امی کے ساتھ دوپہر میں جا کر ساری شاپنگ کر لی ہے۔۔'' اس نے مزے سے آنکھیں پٹپٹا کر جواب دیا۔

''کوئی۔۔ کام تو میرے ساتھ بھی کر لیا کرو''۔ اسد نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کچھ کہا۔ آپ نے؟'' اس نے انجان بن پوچھا، بیوی کی کمر پر جھولتی ناگن سی چوٹی۔ مسلسل اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔

''نہیں۔۔۔ میری۔۔۔ یہ مجال'' وہ تپ کر بولا۔ حنا مسکراتی ہوئی رات کی روٹیاں ڈالنے کچن کی طرف چل دی۔

کھانے کے بعد وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اسد کی نگاہیں اس پر ٹک گئیں۔ وہ سرخ اور سیاہ پرنٹڈ سوٹ میں بہت حسین لگ رہی تھی۔

''یار! تم میں تو بیویوں والی کوئی ایک ادا بھی نہیں ہے۔'' اسد کا لہجہ خمار آلود ہوا، لہجے میں شکایت ابھر آئی۔

''اچھا۔۔۔'' ریموٹ سے چینل بدلتی، حنا کے اندر تک سنسناہٹ پھیل گئی۔ مگر۔ وہ ظالم حسینہ بنی اسکرین کو تکتے ہوئے بولی۔

''بیوی کو تو مجھ سے زیادہ ٹی وی عزیز ہے'' اسد نے کچھ دیر بعد لطیف سی چوٹ کرنا چاہی۔

''آپ کو بھی تو ایسی ہی بیوی کی چاہ تھی'' حنا نے تنک کے جواب دیا۔

''میں۔ نے ایسا۔ کب چاہا تھا۔؟'' اسد کا موڈ بری طرح سے آف ہونے لگا۔ رومانس، بڑھنے سے پہلے زمین بوس ہو گیا۔

''پہلی رات کے سارے سبق ازبر ہیں'' حنا کے لہجے میں طنز اتر آیا۔ وہ مایوس ہو گیا۔

''میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔۔'' غصے میں سلیپر پہنی اور با آواز بلند صدا لگاتے ہوئے باہر کی راہ لی۔ حنا کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

''اسد صاحب۔۔ میں کوئی ارزاں، حقیر شے تو نہیں تھی۔'' حنا کے کانوں میں ناگوار جملوں کی بازگشت ہونے لگی تو اس نے پاؤں سمیٹ کر گھٹنوں میں منہ دے لیا۔ ان تلخ یادوں سے چھٹکارا پانا کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔

''مجھے۔۔ کسی بھی رشتے کو صرف اس وجہ سے خوش نہیں رکھنا تھا کہ بدلے میں خیرات کے طور پر بیوی کا مقام حاصل ہو، ورنہ باہر کا راستہ۔ دکھا دیا جائے۔'' حنا بڑبڑائی۔۔ وہ بیوی اور خیراتی میں فرق واضح کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''اسد میاں! شادی کے بعد اکیلے واک کرنے پر جرمانہ عائد ہو سکتا ہے'' اسد خاموشی سے سیدھی سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی بائیک سوار نے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''سلیم بھائی۔۔ آپ۔ اس وقت۔ کہاں جا رہے ہیں؟'' اسد نے مڑ کر کزن کو دیکھا تو پوچھا۔

''بس۔ صبح کے ناشتے کا سامان لینے بیکری تک جا رہے ہیں۔۔ چلیں بائیک پر بیٹھ جائیں۔ آپ کو کولڈ ڈرنک پلاتے ہیں'' سلیم بیگ نے فوراً آفر کی۔ وہ کھانے پینے کے شوقین آدمی تھے۔

''نہیں۔۔ بھائی۔ رہنے دیں۔ دل نہیں چاہ رہا

ہے" اسد نے بےزاری سے سرہلایا۔

"کیوں میاں۔۔دل کو کیا ہوا؟ وہ تو آپ بھابھی کو دے چکے ہیں۔۔۔اب کس بات کا غم منا رہے ہیں؟" سلیم بیگ نے خوش مزاجی دکھانا چاہی۔

"یہ ہی تو رونا ہے۔۔۔ان کو ہمارے جذبات کی قدر ہی نہیں۔" اسد کو اس وقت ایک ہمدرد کی ضرورت تھی۔ مسکین سا منہ بنایا۔

"کمال ہے۔ بھابھی ایسی لگتی تو نہیں۔ اچھا۔ ایک منٹ ٹھہریے گا" انہوں نے بائیک سائیڈ میں کھڑی کی اور اس کے ساتھ پیدل قدم بڑھانے لگے۔

"ہاں۔۔ بھائی۔۔کیا ہوا؟" سلیم کا لہجہ پر تجسس ہوا۔

"کیا۔۔بتائیں۔۔۔اور کیا چھپائیں۔" اسد نے فلسفیوں کا انداز اپناتے ہوئے سرد آہ بھر کر کہا۔

"جو بھی بتائیں۔۔۔ذرا تفصیل سے۔۔۔اور جلدی۔۔؟" سلیم بیگ نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"آپ۔۔ کو رت جگے والی رات یاد ہے نا؟۔ جب سارے دوست مل کر مجھے مشورہ دے رہے تھے کہ بیوی پر پہلی رات ہی رعب جمادو، ورنہ سر پر ساری عمر ناچے گی" اسد نے فوراً ہی انہیں یاد دلایا۔

"ہاں۔۔ کچھ یاد تو آرہا ہے۔ شاید۔ آپ اس وقت خود کو کسی دیس کا شہزادہ سمجھ رہے تھے۔" سلیم بیگ سوچ میں پڑ گئے۔۔ پھر شرارتی انداز میں گویا ہوئے۔ کیوں کہ وہ خود اس خالصتاً مردانہ محفل میں موجود تھے۔ اسی لیے انہیں سب کچھ یاد آگیا۔

"ان مشوروں نے ہی پھنسوا دیا۔" اسد نے کہا۔

"کیا۔۔ مطلب۔۔ ہم سمجھے نہیں۔۔؟" انہوں نے حیرت سے منہ پھاڑا۔

"سلیم بھائی! اس سامنے والے پارک میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ تا کہ۔ آرام سے بات ہو سکے۔" اسد نے اشارہ دیا تو وہ راضی ہو گئے۔

"بس۔ بھائی تو یاروں نے مروا ڈالا، شادی کی پہلی رات حنا کو رعب میں لینے کے لیے دھمکا دیا

۔ اگر امی کو خوش رکھو گی تو ٹھیک ہے۔ ورنہ باہر کا راستہ کھلا ہوا ہے" اسد نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔ وہ دونوں سنگ مرمر کی بنچ پر ایک دوسرے کے مقابل چہرہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔

"ایں۔ ہمیں آپ سے اس حماقت کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔۔کوئی شادی کی پہلی رات نئی دلہن سے اس انداز میں بات کرتا ہے۔۔۔ مانو ٹکڑا توڑ کر ہاتھ میں رکھ دیا۔" سلیم بیگ کے گھورنے پر اسد نے پہلو بدلا۔

"وہ۔۔بس۔۔۔سب نے ایسے سمجھایا تو میں بھی ان لوگوں کی باتوں میں آ گیا۔" اسد نے سر جھکا کر جرم کا اعتراف کیا۔

"میاں۔۔۔سب گئے بھاڑ میں۔۔۔آپ کی اپنی عقل کیا گھاس چرنے گئی ہوئی تھی۔" وہ کف افسوس ملنے لگے۔

"ان باتوں کے بعد تو بھابھی نے خالہ جان سے بیر باندھ لیا ہوگا؟ روز دنگل فساد ہو رہے ہوں گے۔ مرشد ولا تو اکھاڑے کا منظر پیش کر رہا ہوگا؟" سلیم بیگ نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اظہار تشویش کیا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول تو پہلے سے کہیں زیادہ خوش گوار ہو گیا ہے۔۔ حنا بہت اچھی طرح سے ساس اور سسرال نبھا رہی ہے۔۔ مگر۔۔۔" اسد کے چہرے سے پھیکا پن جھلکا۔

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہیں؟ سیدھی بات بتایئے؟" سلیم بیگ نے اسد پر نہ سمجھ میں آنے والی نگاہ ڈالی۔

"وہ امی کی فرماں بردار بہو تو بن گئی۔۔۔ مگر پیار لٹانے والی بیوی نہ بن سکی" اس نے نگاہیں جھکا کر اعتراف کیا۔

"ایں۔۔۔ہا۔۔ہا۔۔ہا۔۔ یہاں تو وہ مثال صادق ہوئی کہ "الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔" سلیم کے قہقہے کی گونج دور تک گئی۔

"حنا نے ہر بات میں امی کو اتنی اہمیت دی کہ میں "زیرو" ہو کر رہ گیا۔ ہر کام امی کی مرضی کا۔ ہر بات ان سے پوچھ کر......آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ ہنی مون پر صرف امی کی وجہ سے نہیں گئی کیوں کہ ان دنوں وہ بیمار تھیں۔" اسد نے منہ لٹکایا۔

"اس کا مطلب ہے آپ۔ جیسے نامعقول کو کافی معقول بیوی ملی ہے" سلیم بیگ چھوٹی بھاوج سے متاثر نظر آئے۔

"میری کیفیت کو سمجھیں۔۔ مذاق نہ اڑائیں۔۔۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ۔ ہم میاں بیوی۔ ہو کر بھی۔ ایک دو دفعہ کے سوا۔ کہیں اکیلے۔۔ آ۔۔جا۔۔ نہیں سکے، حنا کے پیر ساس کے بغیر گھر سے باہر نکلتے ہی نہیں۔" اسد کے انداز مظلومیت پر سلیم بیگ کو ہنسی آئی۔

"ویسے۔ میاں۔ جو ڈیڑھ ہوشیار بنتے ہیں۔۔ ان کا یہ ہی انجام ہوتا ہے۔۔ بھائی۔۔ جو لوگ تمہیں چڑھا رہے تھے۔ ان کا تعلق اس قوم سے ہے جو خود بھی اپنی بیویوں سے ناخوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش دیکھنا نہیں چاہتے۔" سلیم بیگ کو جانے کون کون سی مثالیں یاد آئیں۔

"آپ کو ہنسی آرہی ہے۔۔۔ میرا برا حال ہے۔۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ تنہا ڈنر کرنے۔۔ لانگ ڈرائیو اور سینما جانے کو ترس گیا ہوں۔۔" اسد چڑ کر بولا۔

ہو۔۔ ہو۔۔ ہو" سلیم بیگ کی ہنسی کوشش کے باوجود نہیں رک پائی۔

"واہ۔ واہ۔ اس زمانے میں ایسی بہو۔۔ حنا بھابھی پر۔ آفرین ہے۔۔ خالہ تو بہت خوش ہوں گی؟" سلیم نے تھوڑی دیر بعد پوچھا، جو انہیں غصے میں گھور رہا تھا۔

"شروع۔۔ شروع میں تو امی اپنی بہو کی سعادت مندی پر جھوم اٹھیں۔۔ مگر اب تھوڑا جھجکتی ہیں۔ انہیں بھی اس بات کا احساس ہے کہ۔ شادی کے بعد سے بہو بیٹے کو تنہائی میسر نہیں آئی۔ وہ۔ اکثر ہمارے ساتھ کہیں جانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ کبھی۔ طبیعت خرابی کا بہانہ بناتی ہیں تو۔ کبھی کچھ۔ اور۔ پر ان کے منع کرنے کے بعد۔ حنا بھی پروگرام ملتوی کر دیتی ہے۔۔۔ کہتی ہے جب امی کی طبیعت ٹھیک ہو گی تو اکٹھے جائیں گے۔" اسد کا اترا چہرہ اس کے جذبات کی مکمل ترجمانی کرنے لگا۔

"میرے بھائی! آپ کی داستان امیر حمزہ۔۔ بہت دلچسپ نکلی۔ لوگوں کی سا‌سیں بیچ کی دیوار بنتی ہیں۔۔ مگر یہاں تو۔ خالہ۔ ہی۔۔ آہم۔ آہم۔۔" سلیم بیگ کھنکارتے ہوئے پھر کھلکھلائے۔

"طعنے مت دیں یہ بتایئے کہ۔۔ اب کیا کروں؟" اسد نے تپ کر کہا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔

"صرف ایک کام کریں۔ محبت کو خود سے دور جانے نہ دیں"۔ سلیم بیگ نے اس کو ایک خاص انداز میں اسے دیکھا، وہ سرہلانے لگا۔

تھوڑی دیر مزید بیٹھنے کے بعد جب سلیم بیگ کی منکوحہ نے فون کر کر کے انہیں پاگل کر دیا تو۔ دونوں نے اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔۔ وہ پارک کے داخلی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بھی کزن کی حالت زار پر ہنسنے سے باز نہ آئے۔ اسد نے خوں خوار نگاہوں سے سلیم بیگ کو گھورا۔

☆☆☆

طاہرہ کی طبیعت پورے پندرہ دن خراب رہی اسی وجہ سے حنا کو میکے جانے کا ٹائم نہیں مل سکا، صبح ہی صبح اچانک رخسانہ کی کال آگئی، حنا کے بڑے بھائی عفان کے لیے لڑکی دیکھنے جانا تھا، انہوں نے سمدھن سے کافی اچھے انداز میں بات کی اور پھر حنا کو میکے بھیجنے کا کہا ساتھ میں دو چار دن رکنے کی بھی اجازت طلب کی، طاہرہ کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ انہوں نے خوشی خوشی بہو کو چند دنوں کے لیے اپنے گھر جا کر رہنے کی اجازت دے دی۔ حنا بھی اپنے اندر اتری یاسیت سے تھوڑا گھبرانے لگی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسد کو معاف نہیں کر پا رہی تھی۔ اسد کی اکڑ بھی تو کم نہیں ہو رہی تھی، نگاہیں بولتیں، مگر زبان سے لفظ

نہ نکلتے شاید انا کا معاملہ تھا۔ حنا نے گرین سگنل ملتے ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک بیگ میں چند جوڑے رکھے اور چھوٹے بھائی عرفان کو کال کردی کہ وہ آکر لے جائے اور۔ اسد کے آفس سے لوٹنے سے قبل ہی اپنے گھر روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

''ایں۔ میاں۔ آپ اس وقت؟۔'' سلیم بیگ نے جیسے ہی دروازہ کھولا، اسد کو سامنے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں پوچھا، وہ آفس سے سیدھے خالہ کے یہاں چلا آیا تھا۔

''بس۔ میں۔ آپ کے پاس تھوڑا وقت گزارنے آیا ہوں'' اسد نے اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بتایا۔

''کیوں۔۔۔ خیر تو ہے۔ بھابی والا معاملہ سلجھا۔۔ یا ابھی تک الجھن میں ہو؟'' انہوں بیٹھک میں بیٹھنے کے بعد اسے گھورا اور معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔

''خاک سلجھا۔۔۔'' اسد نے سر پر ہاتھ مار کر بے ساختہ کہا۔۔

''بھئی۔۔ واہ۔ ابھی تک الجھے ہوئے ہو۔'' وہ گلاسوں میں کولڈ ڈرنک نکالنے کے بعد شگفتگی سے بولے۔

''سلیم ۔۔ بھائی۔۔ میں یہاں داد وصول کرنے نہیں ۔۔ اپنے مسئلہ کا حل پوچھنے آیا ہوں'' اسد نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے چڑ کر جواب دیا۔

''میاں۔۔ برا مت مانیئے گا۔ مگر ہم نے ساری باتوں پر غور کیا۔ تو بھابھی تھوڑی حق پر دکھائی دیں۔'' سلیم بیگ نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''وہ۔۔ کیسے۔؟ میں نے ایک بات سمجھائی تھی۔۔ پتھر تھوڑی مارا تھا۔ مگر وہ تو ضد پر اڑ گئی ہے۔'' اسد نے جھنجلا کر انہیں دیکھا۔

''اوں۔ دیکھیں۔۔ بھائی! نئی دلہن سے۔۔ بات کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔۔ وہ لڑکی جو اپنے گھر بار اور پیاروں کو چھوڑ کر دوسرے گھر میں قدم رکھتی ہے تو۔ اندر سے پہلے ہی سہمی ہوئی ہوتی ہے۔۔ اس پر ایسا دھمکاتا انداز تخاطب۔۔ توبہ توبہ۔ آپ نے تو ہیرو کی جگہ ولن بننے میں کوئی کسر نہیں، چھوڑی۔'' سلیم بیگ نے دال موٹھ کی پھنکی ماری۔

''اب کیا کروں۔۔۔؟'' اس نے مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''۔ اچھا۔۔ سنیے۔۔ ہم نے آپ کی باتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ نے پہلی ملاقات میں ہی بیوی کو بلاوجہ اپنے پیروں تلے دبانے کی جو بھونڈی سی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے بھابھی پر ضد سوار ہوگئی۔ تاریخ میں تریا ہٹ، راج ہٹ اور بالک ہٹ مشہور ہیں۔۔۔ مگر ان میں سے سب سے خطرناک تریا ہٹ یعنی عورت کی ضد سمجھی جاتی ہے۔'' سلیم بیگ نے فضا میں دیکھتے ہوئے ۔فلسفیانہ انداز اختیار کیا۔

''یہ بات تو آپ کئی بار کر چکے ہیں۔۔ کوئی حل؟۔'' اسد نے کہا۔۔ سلیم نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کروایا۔

''آپ نے بھابھی سے شادی کی پہلی رات جو کچھ بھی کہا اس سے تو صاف لگ رہا ہے کہ۔ آپ کو۔ لائف پارٹنر کی نہیں بلکہ۔ خالہ کے لیے ایک کام والی ماسی کی ضرورت ہے۔ جو۔۔ بنا تنخواہ کے دن رات ان کی خاطر مدارات میں مصروف رہے۔۔ بھابھی نے آپ کی بات پر حرف بہ حرف عمل کیا۔'' سلیم بیگ نے ساری باتوں کا خلاصہ پیش کیا۔

''یہ۔۔ غلطی تو ہوئی ہے۔ مگر۔ کیا کرتا۔ ڈر گیا تھا۔۔ خاندان میں۔ اوپر تلے۔ کئی۔ ایسے واقعات ہوئے کہ وہ لڑکے جو شادی سے قبل ماں بہنوں پر جان چھڑکتے تھے۔۔ بیوی کے آتے ہی۔۔ گھر والوں کو دشمن کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس عورت کی محبت کو بھول گئے جس نے پچیس سال محنت و مشقت سے پالا پوسا۔ اس کے بن کر رہ گئے جو۔ پچیس دن پہلے زندگی میں شامل ہوئی تھی۔'' اسد نے کچھ سوچ کر صفائی دینا چاہی۔

''ادھر دیکھو۔ بھائی۔ کیا۔ میرے ہاتھ کی۔ پانچوں انگلیاں برابر ہیں۔۔ نہیں ۔۔ نا۔۔ پھر تمام لڑکیاں کیسے برابر ہوسکتی ہیں؟ اس لیے پہلی رات ہی بیوی کو باہر کا دروازہ دکھا دینا۔۔ یعنی نامعقولیت کی حد ہے۔'' سلیم نے اسد کے سامنے اپنا چوڑا مردانہ پنجا لہرا کر پوچھا۔

''ہاں۔۔ یہ بات تو ٹھیک کہی'' وہ مان بیٹھا۔ ان کی بات اسد کے دل کو لگی اور وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''ایک بات یاد رکھیے گا، کوئی بھی رشتہ برا نہیں ہوتا، ہمارے رویے درمیان میں زہر گھول دیتے ہیں، لہجوں کی تلخیاں دکھوں کی وجہ بنتی ہیں'' سلیم بیگ کا انداز ناصحانہ ہوا۔ اس نے غور سے سننا شروع کر دیا۔

☆☆☆

اسد نے راستے سے سفید بیلے کے بہت سارے گجرے خریدے اور ہاتھوں میں تھامے خوشی خوشی اپنے کمرے میں داخل ہوا، سلیم بیگ کی مثبت باتوں نے اس کے اندر ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔ وہ آج ہر حال میں اپنی روٹھی ہوئی زندگی کو منانے کا تہیہ کر بیٹھا تھا، مگر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، ایک ویرانی، ایک تنہائی کا احساس جاگا۔ اس نے بوکھلا کر پورا کمرہ چھان مارا۔

ای۔۔ ای۔۔۔ یہ آپ کی بہو دکھائی نہیں دے رہی۔'' اس نے جوتے اتارتے ہوئے دروازے کی سمت منہ کر کے بے چینی سے ماں کو پکارا۔

''کیوں تمہیں نظر نہیں آرہا کہ یہاں کوئی ہے نہیں'' طاہرہ مسکرا کر بولتیں ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

''وہ ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ حنا کہیں گئی ہوئی ہے کیا؟'' اس نے باتیں بنا کر ماں کو ٹٹولا۔

''ہاں۔۔۔ وہ میکے گئی ہوئی ہے'' طاہرہ نے وارڈ روب سے کرتا شلوار نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اطلاع دی۔

''کیا مطلب۔۔ ایسے اچانک۔۔ مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا؟'' اسد پر غصہ سوار ہوا، کرسی پر کپڑے پھینک کر تیز لہجے میں بولا۔

''بیٹا۔۔ کچھ تو خیال کرو۔۔ بہو۔ کتنے دنوں سے ہماری وجہ سے میکے رہنے نہیں گئی۔'' انہوں نے دبے لفظوں میں سمجھایا۔

''ہاں۔۔ تو کیا ہوا۔ جانا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔۔'' وہ غصہ میں الٹا سیدھا بول گیا۔

''اس میں غصہ کرنے والی کیا بات ہے، آخر لڑکیاں میکے جاتی ہی ہیں؟'' طاہرہ نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا

''کیا۔ محترمہ۔۔ ایک کال بھی نہیں کرسکتی تھیں؟'' اس نے ہونٹ چباتے ہوئے، طیش میں مٹھیاں بھینچ لیں۔

''لڑکے۔۔ کچھ تو عقل سے کام لو۔ دنیا داری بھی نبھانی ضروری ہے۔۔ تم خود تو جاتے نہیں ہو۔۔ کم از کم اسے تو جانے دیا کرو۔'' طاہرہ نے بیٹے کو جھاڑ پلا کر خاموش کرانا چاہا۔

''وہ۔۔ مگر۔۔'' ماں کی بات پر اسد کے منہ سے بے ربط لفظ نکلے پھر اس نے۔ غصے سے منہ موڑ لیا۔

''ویسے بھی اسے اپنے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے جانا ہے، رخسانہ نے تمہیں بھی بلوایا ہے'' طاہرہ نے دھیرج سے اصل بات بتائی۔

''کچھ بھی ہے۔۔ اسے میری اجازت کے بنا نہیں جانا چاہیے تھا۔۔'' اس کی سوئی ایک بات پر جا اٹکی۔

''بیٹا۔۔ تم آخر کب سدھرو گے۔ تمہارا جذباتی پن مجھے خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں بڑی چوٹ نہ کھا بیٹھو۔۔'' طاہرہ آخر کار ہار مانتے ہوئے دکھی لہجے میں بولیں۔

اسد نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا، وہ ماں کو کیسے بتاتا کہ اپنے غصے اور جذباتی پن کے ہاتھوں وہ حنا کو

کھونے چلا تھا، ایک دم اٹھا اور ماں کی نگاہوں سے دور چلا گیا۔ لان میں بیٹھ کر اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف رہا، کافی دیر بعد واپس کمرے میں لوٹا تو ایک سکوت قائم تھا۔ وہ دشمن جاں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس چلی آئی، اس کی بولتی آنکھیں، آواز کی کھنک، دلکش سراپا، بہت کچھ ایسا تھا جس کا نہ ہونا۔ اسے۔ ڈسٹرب کر رہا تھا۔ اسے ایک دم تنہائی سے وحشت ہونے لگی، دل اسی کا طلب گار ہوا جا رہا تھا، جو مسلسل بے اعتنائی برت رہی تھی۔

"ایک رات کی غلطی کی سزا کتنی طویل ہو گئی"۔ وہ متوحش ہوا۔ سوچوں سے چھٹکارا پانے کے لیے ماں کو بتا کر خالہ شاہدہ کے گھر دوبارہ چل دیا۔

☆☆☆

حنا پسندیدہ چاکلیٹ ملک کا کپ تھامے لان میں آ گئی، اسے اپنے پرانے کمرے میں ایک گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی، یا شاید اس کی روح اندر سے گھٹ رہی تھی۔ تنہائی میں بیٹھ کر سوچا تو آگہی کے بند دروازے وا ہوتے چلے گئے۔۔، میکے سے شدید محبت کے باوجود، اس کا ذہن "مرشد ولا" میں ہی اٹکا ہوا تھا، وہ خود تو بھائی کے ساتھ یہاں آ گئی تھی مگر وجود کا اہم حصہ "اپنا دل" وہیں چھوڑ آئی۔

نم گھاس پر چپل اتار کر چلنا، اس کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا، مگر اس وقت وہ کسی بھی خوش گوار احساس سے عاری بس چہل قدمی کیے جا رہی تھی، اسد کی اداس، شکوہ کرتی نگاہیں اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئی تھیں۔ وہ عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہونے لگی۔

حنا نے سب کچھ بھلا کر جب بھی اسد کی پیش قدمی کا جواب محبت سے دینا چاہا، پہلی رات کی ساری باتیں ذہن میں فلم کی طرح چلنے لگ جاتیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے درمیان تلخ کلامی ہو جاتی۔ تاہم شوہر کے ساتھ مسلسل برسرپیکار رہنے کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر تھکن کا شکار ہو گئی۔ جب سے اسے بغیر بتائے میکے آئی تھی، اس کا دل جانے کیوں بار بار بھر آ رہا۔۔

"کہیں ایسا نہ ہو۔ انا کا کھیل مہنگا پڑ جائے۔ میری بے رخی سہتے سہتے۔۔ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور چلیں جائیں۔" حنا کی چھٹی حس بے دار ہوئی تو وہ گھبرا گئی، لمبے بال شانوں پر بکھر کر ماحول کو مزید افسردہ بنا رہے تھے۔

"اتنے خراب ہیں۔۔ ایک کال کر کے خیریت بھی نہیں پوچھی۔" من میں شکوہ ابھرا۔

"نہیں۔۔ بہت زیادہ ناراض تو نہیں ہو گئے؟" وسوسے چین لینے نہیں دے رہے تھے۔

"میں۔۔ بھی اب مرشد ولا نہیں جاؤں گی" غصے کی ایک لہر اٹھی تو نیکھی ناک اچکا کر سوچا۔

"مگر۔۔ اسد کی بغیر زندگی۔۔؟"۔ یہ سوال اسے تڑپا گیا، ذہن ایک دم تلپٹ ہونے لگا۔

"۔۔کوئی چانس نہیں۔۔" اس نے لان میں لگی رات کی رانی کے پاس کھڑے ہو کر اعتراف کیا، چہار سو پھیلا اندھیرا اتنا برا لگا کہ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اندر روشنی کی جانب چل دی۔

☆☆☆

"ہاں۔۔ میاں۔۔ بھابھی کو پھول پسند آئے؟" سلیم بیگ کا انداز چھیڑنے والا ہوا۔ وہ دونوں چھت پر چہل قدمی کے لیے آ گئے تھے۔

پھول تو واقعی بہت خوب صورت تھے، مگر جب میں گھر گیا تو وہ اپنی امی کے گھر جا چکی تھی" اسد نے دانت کچکچا کر بتایا۔

"اوہ۔۔۔ یعنی پیسے ضائع ہو گئے" وہ زور سے ہنستے ہوئے مذاق اڑانے لگ گئے۔

"سلیم بھائی۔۔۔ میں بہت سیریس ہوں۔۔ اب کیا کروں؟" اسد نے ان کی جانب دیکھ کر پوچھا

"جو کیا ہے۔۔ اس کی سزا تو بھگتنی پڑے گی" سلیم بیگ نے شوخ انداز میں اسے دیکھا۔

"اچھا، بابا۔ ساری خطائیں میری۔ مان لیا، آگے کا بتائیں" وہ ہار مان کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ سلیم بیگ نے باباؤں کی طرح آنکھ بند کر لی، انہیں لگا اسد کے ضدی پن کو کم کرنے کے لیے ابھی

مزید پالش کی ضرورت ہے، ایک دم شروع ہو گئے۔

"ہمارا خیال ہے کہ بھابھی مزاجاً۔ اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی ہیں۔ بہت ساری باتیں انسان ماحول سے سیکھ جاتا ہے۔۔ بس تھوڑا وقت درکار ہوتا ہے۔۔ اگر آپ پہلے دن ہی انہیں اپنی محبت کا احساس دلا دیتے اور۔ بعد میں سہولت سے خالہ کا مسئلہ ڈسکس کرتے تو وہ کوئی اعتراض نہیں کرتیں۔۔ بلکہ۔۔ اس طرح سے۔ وہ فرماں بردار بہو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی بیوی بھی ثابت ہوتیں"۔ سلیم بیگ نے سنجیدگی سے کہا۔ اسد نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"یوں۔ ہر چیز کا توازن برقرار رہتا۔ اور معاملات نارمل رہتے۔۔ گھر کو مستحکم رکھنا صرف ایک عورت کی ذمہ داری نہیں۔۔ اس میں مرد کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مگر آپ کی جلد بازی نے سب بگاڑ کر رکھ دیا۔۔" سلیم بیگ نے تحمل سے سمجھا دیا۔

"کیا۔ اب۔ بگڑی بات بن سکتی ہے؟" اسد کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"کچھ نہیں بگڑا ہے۔۔ بس۔ بیٹا۔۔ اب آپ کی صلاحیتوں کا امتحان ہے۔" سلیم بیگ اسد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چہکے۔

"مطلب۔۔ کیا کروں؟" اسد نے ان کی جانب دیکھا۔ مگر وہ گم صم سے سوچ میں پڑے رہے۔

"چلیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ بہت رات ہو گئی۔۔ اب میں۔ چلتا ہوں امی انتظار میں سوئی نہیں ہوں گی" اسد جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"۔۔ بھائی۔ جلد باز۔ سنیں۔ تو۔۔ آپ کی مدد کرنے کے لیے۔ ہم ایک بہت اہم کام۔۔ اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔" سلیم بیگ کے معنی خیز انداز نے اسے جاتے جاتے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔

"وہ۔۔ کیا؟" اسد میں ایک دم جوش و خروش بھر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ حضرت کتنے تکڑم باز ہیں۔۔ اسی لیے تو اپنی بپتا سنائی۔

"ذرا۔۔ کان ادھر لائیں"۔ سلیم بیگ نے اس کے کان میں دھیرے سے کچھ کہا تو وہ ایک دم ہنسنے لگا، چہرے پر اطمینان چھا گیا۔

☆☆☆

حنا کتنے دنوں بعد رہنے آئی تو رخسانہ کا خوشی سے برا حال تھا۔ انہیں یوں لگا جیسے ٹھنڈا، خوش گوار ہوا کا جھونکا آیا ہو۔ بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، ان کی موجودگی سے ہی گھر کی رونق میں اضافہ ہوتا ہے اور جانے کے بعد اداسی چھا جاتی ہے۔، رخسانہ نے حنا کی اداسی محسوس کی تو اپنی چھوٹی بہن فرزانہ کی تینوں بچیوں کو فون کر کے اپنے یہاں بلا لیا، جن کی اس سے خوب گھٹتی تھی، جب سے وہ آئی تھیں، ایک ہلا مچا ہوا تھا۔ نبیلہ نے عفان کا رشتہ طے ہونے کی خوشی میں اس سے ٹریٹ کے لیے پیسے مانگے، مگر وہ ان لڑکیوں کے ہتھے نہیں آ رہا تھا۔ حنا ایک کونے میں گھس کیا بیٹھی سب کو "ٹریٹ" کے لیے لڑتے جھگڑتے دیکھ رہی تھی۔

'ہنی۔۔۔ آ جاؤ۔۔ بھیا سے مل کر۔ مقابلہ کریں۔۔" حنا کو پکار پڑی مگر اس نے منہ بنا کر انکار میں سر ہلا دیا۔

"یہ۔۔ لڑکی تو۔۔ شادی کے بعد بالکل بور ہو گئی ہے۔۔" نبیلہ نے اس پر جملہ بھی کسا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھی مسکراتی رہی۔

"توبہ ہے۔ لگتا ہے شادی کے بعد حنا میں کوئی بوڑھی روح سما گئی ہے؟" رخسانہ نے بیٹی کے بدلتے انداز پر تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

وہ بیٹی کو گھورتے ہوئے سوچ میں پڑ گئیں۔۔ وہ لڑکی جس کی شرارتوں سے پورا گھر عاجز رہتا تھا، بات بہ بات بھائیوں کی جیب خالی کروانے کے چکر میں سب کی سردار بنی رہتی تھی اب کس قدر بدل گئی ہے، کسی چیز میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔

"کیا حنا اپنے سسرال میں خوش نہیں ہے؟" رخسانہ نے سوچا تو ان کا دل نیچے کی جانب ڈوبنے لگا۔

☆☆☆

حنا کو آج اپنے سسرال واپس جانا تھا، رواج کے مطابق رخسانہ نے اسد اور اس کی ماں کو ڈنر پر انوائٹ کرلیا۔ نبیلہ کو بھی بلوالیا گیا تا کہ وہ ان کی کاموں میں مدد کرسکے۔ رخسانہ ابھی مینیو ترتیب دے رہی تھیں کہ ان کے سیل پر اسد کی کال آگئی ،انہوں نے بڑے سبھاؤ سے فون آن کر کے کان سے لگایا۔

''ہیلو۔ جی۔۔ اسد بیٹا!'' رخسانہ نے کہا تو دوسری جانب سے بھی بڑی خوش اخلاقی دکھائی گئی۔

''آنٹی۔۔ پلیز۔۔ ہیلپ می۔۔'' داماد جی نے سنسر کے ساتھ اپنی ساسو ماں سے حال دل شیئر کیا۔

''مگر۔۔ وہ۔۔'' رخسانہ نے گھبرا کر کہا، تاہم اسد نے اپنی لفاظیوں سے انہیں شیشہ میں اتارلیا۔

''ٹھیک ہے۔۔ بیٹا۔۔ جیسا آپ کہیں۔'' رخسانہ داماد کی منصوبہ بندی پر کھل کر مسکرائیں اور رازداری کا وعدہ کرنے کے بعد فون رکھ دیا۔

☆☆☆

حنا اداسی سے سر نیہوڑائے اپنے بیڈ پر لیٹی تھی، ایک دم زور کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور رخسانہ نے اندر قدم رکھا۔

''تم۔۔ ایسے ہی پڑی ہو۔۔۔'' انہوں نے بیٹی کو گھورا۔

''جی۔۔ بس۔۔ اٹھ رہی ہوں'' اس نے لیٹے لیٹے جمائی لے کر جواب دیا۔

''ہنی۔ کم آن۔ اٹھو۔ اور۔ جا کر شاور لو''۔۔ رخسانہ نے ہدایت دینے کے بعد دیوار گیر گھڑی میں ٹائم دیکھا پانچ بجنے والے تھے۔

''اچھا۔۔ نہ۔۔ ان لوگوں کو تو ڈنر پر آنا ہے'' حنا پر مطلق اثر نہ ہوا، تکیہ منہ پر رکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔۔ تو اگر پہلے تیار ہو جاؤ گی تو کوئی حرج ہے'' رخسانہ اسے کیسے بتاتی کہ اب تو پلان تبدیل ہو گیا ہے۔

''اوکے۔۔ ممی۔'' حنا ماں کی بات پر کاہلی سے اٹھی مگر بستر سے قدم نیچے نہیں رکھا۔

''افوہ۔۔ اب اٹھ بھی جاؤ۔'' رخسانہ نے بیٹی کے مرمریں بازو کو کھینچ کر اسے اٹھایا۔

''اچھا۔۔ ٹھیک ہے۔۔ جارہی ہوں'' وہ مجبوراً سر ہلا کر بولی اور واش روم کی جانب بڑھ گئی۔

''ذرا۔۔ اچھا سا تیار ہونا'' رخسانہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔ اسد کے آنے سے پہلے وہ حنا کو ہر طرح سے آراستہ دیکھنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی اچانک موسم ابر آلود ہو گیا، برسات کی ایسی جھڑی لگی کہ ہر شے کو بھگو دیا، رم جھم پھوار نے کچھ دیر میں ہی تیز موسلا دھار بارش کا روپ دھار لیا۔ یہ ساون کی پہلی بارش تھی۔ برستے اداس ساون میں وہ اپنے کمرے میں تنہا کھڑا حنا کی یادوں میں گم ہو گیا۔

برستی بارش کو شفاف گلاس وال کی کھڑکی سے دیکھتے ہوئے، اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکا، دشمن جاں سے ملنے کو دل مچل اٹھا۔ سسرال جانے کے لیے اس نے بارش رکنے کا ارادہ کیا تھا، مگر ان برستی بوندوں نے من میں خواہشات کا طوفان جگا دیا، دل اُس کو دیکھنے کا تمنائی ہوا، جس نے اسد کو سمجھا ہی نہیں اور اس کی چاہت سے انکار کر کے روح میں پلنے والی محبت کے وجود کی شدت سے نفی کر دی۔ یہ جانے بنا کہ، اس کا تلخ رویہ ان کی شادی شدہ ساز زندگی کے تار بکھیر رہا ہے۔

بارش کا زور ٹوٹا تو اپنے خیالات سے چھٹکارا پاتے ہوئے۔ اسد بڑے اہتمام سے تیار ہوا اور سسرال جانے کے لیے کار پورچ کی جانب بڑھنے لگا، ایک بار پھر گد گداتی بوندا باندی نے اس کا استقبال کیا، سیاہ بالوں پر پانی کے قطرے موتی کی شکل میں بکھر گئے، خوش گوار فضا، کا اثر اس کے مزاج پر پڑا، بالوں کو جھاڑتا ہوا کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور سرشاری سے

گنگناتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔ راستے میں ایک بار پھر پھوار پڑنے لگی، اسد نے کار کے وائپر کا استعمال کرتے ہوئے بڑے احتیاط سے گاڑی چلائی اور راستے میں پھسلن ہو رہی تھی، کیوں کہ بارش پھر سے تیز ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اسد، عجلت میں کار پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے حنا کے بڑے سے گھر میں داخل ہوا، حنا، شیڈ میں اپنی کزن کے ساتھ کین کی کرسیوں پر براجمان موسم کا لطف اٹھا رہی تھی۔

''ساسو ماں نے میری ہدایات پر مکمل عمل درآمد کروایا ہے۔'' اسد نے حنا کا مکمل جائزہ لیا، اور دل ہی دل میں خوش ہوا۔ دشمن جاں خوب بجی سنوری، دلرباسی لگ رہی تھی۔

ارے اسد بھائی۔۔۔ آپ زیادہ۔ بھیگ تو نہیں گئے؟'' نبیلہ نے بہنوئی کو دیکھا تو کھڑے ہو کر اپنی نشست پیش کی۔

''نہیں۔۔ سالی صاحبہ۔۔ شکر ہے جب۔ یہاں پہنچا۔ اس وقت۔ بارش میں کمی آچکی تھی، اس لیے بچت ہو گئی''۔ اسد نے بالوں پر سے پانی کے چند قطروں کو جھاڑتے ہوئے بشاشت سے جواب دیا۔

وہ سیاہ کڑھائی والے کرتے اور سفید شلوار میں بہت فریش دکھائی دے رہا تھا، اس کے گورے پیروں میں سیاہ پشاوری چپل بہت اچھی لگ رہی تھی، حنا نے ایک بھرپور نگاہ ڈالی دل کی دھڑکن معمول سے ہٹ گئی مگر وہ بظاہر انجان بنی رہی۔

''اوکے۔۔ لو برڈز۔۔ ایسے حسین موسم میں میرا یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں۔۔ آپ دونوں مل کر موسم کو انجوائے کریں، میں چائے بھجواتی ہوں'' نبیلہ نے شرارتی انداز میں کہا اور تھوڑا جھک کر انہیں وش کیا۔

''واہ۔۔ اللہ سب کو ایسی عقل مند سالی سے نوازے'' اسد نے مسکرا کر کہا تو نبیلہ مزید پھول گئی۔ حنا اشارے کرتی رہ گئی اور وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ دونوں پاس ہوتے بھی اپنے اپنے خیالوں میں کھو گئے، چند لمحوں کی خاموشی ان کے بیچ در آئی۔ اسد کی بھٹکتی نگاہیں اس پر جا کر مرکوز ہو گئیں۔ حنا نے اسے نظر انداز کرنے کے لیے جان بوجھ کر ریلنگ پر بکھرے بارش کے قطروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔

''آہم''۔ اسد کھنکارا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''اوہ۔۔ ہو۔ محترمہ کی ناراضی قائم و دائم ہے۔'' اسد نے مسکرا کر سوچا۔

''ہنی۔ میں۔ یہ۔ تمہارے لیے۔۔ کچھ۔۔ لایا ہوں۔'' اسے خیال آیا تو مسکرا کر گجروں کا پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔

''شکریہ۔۔۔'' توقع کے برخلاف حنا نے اس کے ہاتھوں سے تازہ بیلے اور گلاب کے گجرے لے لیے۔

پھول اس کی کمزوری تھے، اسی لیے فوراً انہیں پہننے کی کوشش میں مصروف ہو گئی مگر، ایک ہاتھ سے پہننا مشکل ہو رہا تھا، اسد پہلے تو دلچسپی سے دیکھتا رہا پھر آگے ہو کر بڑی نرمی سے اس کی کلائی کے گرد خوشبو دار گجرے لپیٹ دیے۔ حنا کے چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی۔

''امی۔۔ کہاں۔۔ ہیں؟'' اسے ایک دم ساس کا خیال آیا تو اسد سے پوچھا۔

''انہیں۔ شاہدہ خالہ اور سلیم بھائی اپنے گھر لے گئے ہیں''۔ اسد کی باچھیں خوشی سے چری جا رہی تھیں۔

''وہ کیوں۔ انہیں تو۔ ہمارے گھر ڈنر پر آنا تھا۔'' وہ مضطرب ہو کر بولی۔

''یار۔۔ میں آ گیا۔ ہوں۔ نا۔ ان کا بیٹا۔ یہ۔ کافی نہیں ہے'' اس نے شرارت سے ایک آنکھ میچ لی۔

''ایسے۔۔ کیسے۔۔؟۔ چلیں۔۔۔ ہم امی کو

لے کر آتے ہیں" وہ ایک دم پریشانی سے سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

"یار۔ میں نے۔ رخسانہ آنٹی کو فون کر کے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ کہ۔ دعوت کا۔ اہتمام نہ کریں۔ امی نہیں آئیں گی۔۔ اور۔۔ مابدولت۔ بھی یہاں کھانا نہیں کھائیں گے" وہ شوخ ہوا۔

"کیا مطلب۔ میں سمجھی نہیں۔۔؟" حنا کے پلے کچھ نہ پڑا تو پوچھا۔

"آج ایک نئی تاریخ رقم ہونے جا رہی ہے۔ کیوں کہ۔ مابدولت۔ اپنی مسز کے ساتھ باہر ڈنر کریں گے۔" اسد نے سینے پر ہاتھ باندھ کر جھکتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ چونک گئی۔

"نہیں۔۔۔ میں امی کے بنا کہیں نہیں جاؤں گی" اسے سب کچھ یاد آیا تو تھوڑا اٹیلا پن دکھایا۔

"بات سنو۔ ہر انسان کی اپنی پرسنل لائف ہوتی ہے۔۔ کبھی کبھی اسے پرائیوسی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔۔ مگر جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔۔ تم نے تو امی پر قبضہ جما لیا۔۔ ارے بھئی۔۔ ان کا رشتے داروں سے ملنا ملانا ایک دم ختم ہو کر رہ گیا ہے، اسی لیے وہ سلیم بھائی کے اصرار پر ایک ہفتے کے لیے اپنی بہن کی طرف رہنے چلی گئی ہیں" اسد نے مزے سے کہا اور سر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر اس کے تاثرات سے لطف اٹھانے لگا۔

"کیا۔ یہ۔۔ یہ۔۔ سب۔ امی نے آپ سے کہا ہے؟" وہ ایک دم شاک رہ گئی۔۔ اسے طاہرہ سے ایسی باتوں کی امید نہیں تھی۔

"کون سی بات؟" اسد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"امی۔۔ پر قبضہ جمانے والی بات" وہ مایوس سی دکھائی دی۔

"نہیں۔۔۔ جاناں۔۔ وہ تو آپ کی تعریف کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں کہتیں۔۔۔ یہ۔ تو۔ امی کے لائق وفائق بیٹے کے ارشادات ہیں۔" اسد نے گھبرا کر جلدی سے ماں کا معاملہ کلیئر کیا۔۔ کہیں حنا کے دل میں کوئی اور غلط فہمی جنم لے کر ایک نئی مصیبت کھڑی کر دے۔

"اوہ۔۔۔ اچھا۔" حنا کو ساری بات سن کر تسلی ملی۔

"اب گزری باتوں کو بھول جاؤ۔۔۔ پلیز۔۔" اسد نے درخواست کی۔

"آپ جیسا چاہتے تھے۔۔۔ میں ویسی ہی بن گئی۔۔۔ اب کیا گلہ؟" حنا نے اذیت سے آنکھیں بند کر لیں۔

"سنو۔۔ مان جاؤ، شکوے شکایت کے لیے تو زندگی پڑی ہے۔" اسد نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر منانا چاہا۔

"سب کچھ اتنا آسان نہیں رہا ہے۔۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ میں نے شادی کی پہلی رات سے اب تک کسی اذیت محسوس کی ہے؟"، بے رخی سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"کیسی۔۔۔؟" اسد نے سوال کیا، وہ چاہتا تھا کہ حنا کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔

"ایک ایسی مجرمہ، جو بغیر جرم کے سزا کاٹ رہی ہو" حنا کے لہجے میں دکھ بول اٹھے۔

"سوری۔۔۔ ہنی۔۔ مگر یقین کرو۔۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔۔ تمہاری بے رخی کی سزا سے بھی بڑی کوئی سزا ہے جو میں نے جھیلی ہے۔ چلو۔ اب۔ سب بھول جاؤ۔ حساب برابر ہو گیا ہے" اسد نے جلتی آنکھوں پر انگلی پھیر کر کہا۔

"کوئی۔ حساب چکتا نہیں ہوا" حنا اب اسد کو تنگ کرنے لگی۔

"ہنی۔۔ کیا۔ ایسا ممکن نہیں کہ ہم سب کچھ بھلا کر ایک نئی شروعات کریں۔" اسد نے اس کے چہرے پر نرمی دیکھی تو فوراً ہاتھ بڑھایا۔۔

"میں۔۔ نہیں مانتی" اس نے ایک ادا سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

"مان جاؤ۔۔ نا۔" اسد نے بڑی آس سے بیوی کو دیکھا۔

"اوں۔۔" حنا نے پلکیں اٹھائیں، شوہر کی آنکھوں میں سچائی کا عکس ہلکورے لیتا دکھائی دیا۔

"اچھا۔۔۔ بابا۔۔ یہ دیکھو۔۔ کان پکڑتا ہوں۔۔ غلطی ہو گئی۔" اسد اٹھ کر حنا کے پاس گیا، اور اس کے کانوں کی نازک لویں چھو کر بولا،

"ہی۔۔ ہی۔۔ ہی" وہ اس کی معصوم سی شرارت پر بے اختیار ہنستی چلی گئی۔

"آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا" اسد کے لہجے میں یقین تھا، بیوی کی جانب بڑے خلوص سے ہاتھ بڑھایا۔

"اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔۔ بھولیے گا نہیں" حنا نے اس کے پھیلے ہوئے چوڑے مردانہ ہاتھ پر بالآخر اپنا نازک سا حنائی ہاتھ رکھ دیا۔

"اب نہیں بھولوں گا۔۔ ویسے۔۔ بھی۔۔ یار۔ کیا کروں۔ پہلی شادی تھی نا۔۔۔ دوسری باری میں یہ غلطی نہیں دہراؤں گا۔" اسد نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

"کیا۔۔۔؟" حنا نے اسے گھورا،

"سو۔۔۔ سوری۔" وہ ایک دم ڈرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

"جناب۔۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود۔ آپ میں۔ دوسری شادی کا حوصلہ ہے۔؟" حنا ایک دم ہنس دی

"نہیں۔ بابا۔ ایک ہی تجربہ بہت ہے۔" اسد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سکون کا سانس لیا۔

☆☆☆

وہ دونوں ڈنر کرنے ایک شاندار ریسٹورنٹ میں آئے ہوئے تھے۔ کہ اچانک بادل زور سے گرجے، تو حنا کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا، وہ ڈر کر پیچھے ہوئی تو اسد نے اسے تھام کر اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ حنا شرما گئی۔ پلکوں نے لرزنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ بارش شروع ہوتی انہوں نے گھر جانے کا فیصلہ کیا گھر پہنچتے ہی اسد واش روم میں چینج کرنے چلا گیا جب وہ واش روم سے باہر آیا تو حنا ٹیرس میں کھڑی بانہیں پھیلا کر بارش کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اسد اس کی بچوں جیسی حرکتوں کو دلچسپ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

آج اس کے سامنے اپنی بیوی کا ایک نیا شرارتی روپ آیا تھا۔

"آپ کو برسات کیسی لگتی ہے؟ حنا نے لمحے بھر کو آنکھیں میچیں، مٹھی میں برستی بوندوں کو قید کرتے ہوئے اسد سے سوال کیا۔

"ظاہر ہے بارش کس کو اچھی نہیں لگتی۔ مجھے بھی بہت پسند ہے" وہ سرشاری سے بولا۔

"اچھی لگ رہی ہو"، حنا کا معصوم اور سادہ انداز، ہوا سے بے قابو ہوتا، جامنی آنچل، بالوں میں چمکتے نقرئی موتی، چاند سا چہرہ، حنائی ہاتھوں میں چھلکتی رنگیں چوڑیاں۔۔ اسد اس کی قربت میں مدہوش ہوا جا رہا تھا۔

"شکر ہے میں نے، محبت کو خود سے دور جانے نہ دیا یوں۔ میری زندگی مکمل ہو گئی۔" اسد نے آنکھیں بند کر کے سرشاری سے سوچا۔

میں نے ایک پل کا پیار نہیں زندگی بھر کا ساتھ پا لیا" حنا نے مسکرا کر اسد کے نزدیک ہوتے ہوئے سوچا۔

کچھ حسین لمحے، انمول گھڑیاں، اور انوکھی باتیں۔ دلوں پر نقش بن کر رہ جاتی ہیں، ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتیں، امر ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے محسوس کیا جیسے شب فراق گزر گئی ہو۔ زیست کا اصل حسن اور اچھوتا پن، ان خوبصورت لمحوں میں سمٹ آیا ہو۔

☆☆

سم آشنا

سیما بنت عاصم

"خدا غارت کرے ان موبائل کمپنی والوں کو۔ فون کے نمبر دینے کے ایک نہ دو، ہزار اصول ایجاد کر لیے ہیں۔ اب ہم اپنے بڑے بوڑھے لمبی لمبی لائنیں بھگتا کر کے نیا شناختی کارڈ بنوائیں۔ پھر نیا نمبر ملے گا۔ ان خوش بختوں کو کون سمجھائے کہ اب تو چل چلاؤ ہے۔ کچھ گزر گئی، کچھ گزر جائے گی۔ دفع دور اک موبائل کا نمبر لینے کے لیے موئے سو آزار۔ اور اس موبائل کے بغیر تو سمجھو بندہ، دنیا سے بے خبر۔"

نور جہاں گھر بھر میں تلملاتی پھر رہی تھیں۔ موبائل کمپنی کی اسی "بے رخی و بے حسی" کے سبب ان کا اپنا موبائل اک کونے میں پڑا سسک رہا تھا۔ مہینہ بھر میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو زمانے بھر سے کٹ کر رہ گئی تھیں اب اس کا کیا، کیا جائے کہ خود ان کا اپنا شناختی کارڈ عرصہ ہوا منسوخ ہو گیا تھا۔ اب کون دنیا کی منتیں ترلے کرتا پھرے۔ کہ اپنے شناختی کارڈ پر اک نمبر لے دو محلّہ کے کسی ناتھے نگوڑے کے کارڈ پر نمبر نکلوایا۔ مگر ہائے ری قسمت۔ اس کی گز بھر کی زبان پر کس کر دو جھانپڑ کیا جڑ دیے۔ اس نے انتقاماً نمبر ہی بلاک کروا دیا (لوکر لو گل) اب اپنا نمبر لینے کی کیا تدبیر ہو، وہ جس سے پوچھتیں، اس کی اپنے نام سے پہلے ہی پانچ چھ سم نکلی ہوتیں۔ اور اک یہ موئے سم فروخت کرنے والے تھے۔ گھر گھر مفت کے نمبر یوں بانٹتے پھرتے جیسے خدائی فوجدار ہی تو ہوں۔ منسوخ شناختی کارڈ اگر منظور بھی کر لیتے تو ان کے موئے انگوٹھے کا نشان کبھی کام ہی نہ آتا۔ اک وہ کالا کلوٹا پرویز پڑوسی تھا۔ مفت کی شراب ملا کو حلال۔ جب گلی میں کوئی ٹیم آتی۔ اک آدھ سم لے کر ڈال ہی دیتا۔

"ارے واہ۔" پرویز کا خیال آتے ہی ان کے دماغ میں اک نیا نکور آئیڈیا کلبلایا۔ کیوں نہ اس کالے کلوٹے پرویز ہی سے کسی کونے کھانچے میں پڑی کوئی سم لے لی جائے۔ ابھی پچھلی ہفتے ہی تو اس نے گلی میں آئی ٹیم سے اک نئی نکور سم خریدی تھی۔

اور نور جہاں کی خطا یہ رہی کہ فی الفور اپنا یہ خیال اپنی اکلوتی بیٹی مہر کے کانوں میں انڈیل دیا۔

"اے لو۔ امی تمہیں کوئی اور نہ جڑا؟" مہر بدک اٹھی تھی۔

"اے ہے بی بی۔۔ اس میں اتنی نیلی پیلی ہونے والی کیا بات ہے۔ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔"

ارے امی۔ تمہیں کیا پتا۔ پرویز پرلے درجے کا بے غیرت۔ اپنی بیوی ذکیہ کے لیے سم خریدتا ہے۔ اس کی کئی سم ذکیہ کے موبائل پر چلتی ہیں۔ ذکیہ کا کردار کیسا ہے یہ بھی کوئی بتانے والی بات ہے۔ آپ نے اس کی سم لے لی۔ تو اس نمبر پر اس کے ہزاروں کے فون آیا کریں گے۔ انہیں کون بھگتے گا۔؟"

مہر کی بات ٹھیک ہی تھی۔ مگر اس کا آخری جملہ بظاہر انہماک سے ٹی وی پر کارٹون دیکھتی۔ اس کی چھ سالہ بیٹی نورالعین عرف چھوٹی کے دماغ میں کھٹ سے فٹ ہو گیا تھا۔ نور جہاں کا خیال تھا کہ پرویز و ذکیہ نہ سہی کسی نہ کسی کے ذریعہ تو وہ نئی نکور سم حاصل کر ہی لیں گی مگر۔ نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن والی بات ٹھہری۔ جا بجا سر پھوڑ کر تا چار انہیں ذکیہ ہی کے سامنے منہ پھوڑنا پڑا۔ اور ذکیہ کے تو مانو سن کر تلووں سے لگی سر پر بجھی۔

"اپنی سم آپ کو دے دوں؟ پھر اس پر میرے ہزاروں دوستوں کے جو فون آئیں گے انہیں کون بھگتے گا۔؟" انہوں نے مہر کا جملہ جوں کا توں انہیں لوٹایا تو نور جہاں سٹپٹا اٹھیں۔ بیوہ نانی نے مطلقہ بیٹی، اور بیٹی نے پرلے درجے کی چغل خور، چھوٹی کی طرف دیکھا یہ آگ ضرور کسی دشمن کی لگائی ہوگی۔ وہ دشمن تھا، گھر کا بھیدی نورالعین۔ ہو نہ ہو یہ اسی آفت کی پرکالا کا کارنامہ تھا۔ ہر وقت ذکیہ کے منے سے کھیلنے کے بہانے ذکیہ کے گھر گھسی رہتی۔ کیا مجال جو تولہ بھر بات اس کے پیٹ میں ٹھہر جائے۔ مگر بات تو سنبھالنی ہی تھی۔

"اے نوج۔ ذکیہ یہ کس نے کہا تم سے۔؟"

"جس کسی نے کہا، کچھ غلط نہیں کہا۔ میں خوب



جانتی ہوں، میرے پیٹھ پیچھے آپ کی زبانیں کیا زہر اگلا کرتی ہیں۔ دوسروں کو کچھ کہنے سے پہلے اپنے گریبان میں بھی جھانک لیا کریں۔ طلاق شدہ کا لیبل تو مہر پر بھی لگا ہے۔ دنیا اس کے لیے کیا کچھ کہتی ہے، کبھی کان دھر کر سنیں تو پتا چلے۔" پرلے درجے کی آوارہ اور بدزبان ذکیہ صاف انہیں آئینہ دکھا کر چلتی بنی تو نور جہاں کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں۔ اب اس میں ان کا کیا قصور کہ مہر کی شادی کے معاملہ میں ان سے دغا کی گئی۔ ذکیہ کے سدھار نے پر مہر نے کس کس کو دو ہتڑ چھوٹی کی کمر پر لگائے۔ اس نے دو ہی دھموکوں میں صاف اگل دیا کہ مہر کا یہ تنفر بھرا جملہ چٹخارے لے کر ذکیہ کے کانوں تک پہنچانے میں اسی کا کمال تھا۔ مہر نے دو اور لگائے، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

نور جہاں گھر بھر میں تلملاتی پھریں۔

"اری جا۔ کہا ہے تو پھر کہا ہے۔ اور کون سا غلط کہا ہے۔ موئی اچھال چھکا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو زمانے بھر میں اپنے کالے کرتوت اور گز بھر کی زبان سے بدنام ہے یہ ذکیہ۔ اک مر گیا، اک سے طلاق لے لی۔ اب یہ نکھٹو پرویز پال رکھا ہے۔ گرمی کے بہانے گلی میں چارپائی ڈال کے زمانے بھر کے مردوں پر ڈورے ڈالنا تو کوئی اس سے سیکھے۔ اور پارسا ایسی بنتی ہے جیسے دودھ کی دھلی، نور کی نہائی ہو، ادھر ٹکڑا توڑ لیا۔ ادھر ٹکڑا توڑ لیا۔ بچے کو کمر پر لاد کر زمانے بھر سے چیلیں کرتی پھرتی ہے۔ موئی آوارہ۔"

نور جہاں کو ذکیہ سے کچھ زیادہ ہی خار تھا۔ سارا دن بچہ کمر پر لادے، گھر گھر جھانکتی پھرتی۔ ان کی غلطی یہ رہی کہ محلہ کی بچی سمجھ کر اپنی ضمانت پر سامنے والے گھر کا پورشن کرائے پر دلا دیا۔ اور ذکیہ کا صبح شام ڈیرا ان ہی کے گھر رہتا۔ روٹی ان کے گھر کھاتی۔ ڈکار اپنے گھر مارتی۔ اور کھا کے تھالی میں چھید کرنا تو کوئی اس سے سیکھے۔

"اللہ ماری نیکی گلے پڑ گئی۔ اس بار میری بی سی کھل جائے، میں سڑک کی طرف دروازہ کھلوا کر رستہ ہی بدل لوں گی اس موئی کی منحوس صورت صبح و شام دیکھنے سے تو جان چھوٹے گی۔ ہونہہ! نمک حرام۔ زمانے بھر کی۔"

نور جہاں کا بس نہ چلتا کہ کیا کر ڈالیں۔ گھر بھر میں بڑبڑاتی پھریں۔

☆☆☆

نور جہاں کی بی سی کھلی۔ اور جانے من میں کیا سمائی کہ ساری کی ساری پچھلی طرف کے پورشن کی درستگی میں ٹھکانے لگا دی۔ سڑک کی جانب دروازہ کھلوایا۔ اور ہائے ری دنیا کی دربدری۔ ایک کے بعد ایک کرائے داروں کی آمد کا سلسلہ نہ شروع ہو گیا۔ لکشمی خود چل کر گھر آئے، پھر کون کافر تھا کہ منہ پھیرتا۔ کرایہ بھی ایک نہ دو آٹھ ہزار۔ خیر سے دو کمرے اک صحن۔ باتھ روم وغیرہ سب تھا، اور راستہ بھی الگ۔ مانو نور جہاں کی لاٹری کھل گئی۔ ایک نہ دو آٹھ ہزار کا، آسرا بنا۔ اگرچہ مہر نے بہتیرا واویلا کیا۔

"امی زمانہ خراب ہے۔ جانے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑ جائے قبضہ کر کے بیٹھ گئے تو ہم اکیلی عورتیں کیا بگاڑیں گی۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے، ہماری دال روٹی کو کافی ہے۔" مگر وہ نور جہاں ہی کیا، جو کسی کے کہے پر کان دھر جائیں۔ ان کے دماغ کو جو چڑھ جاتی۔ چڑھ جاتی۔ مشورہ تو یوں بھی اپنے مشیر سمیت بھی ان کے دل کو نہ لگتا تھا۔

"اے بی بی۔ دوسروں کی جڑ بنیاد کھنگالنا تو کوئی تم سے سیکھے۔ ہم نے کسی کے ساتھ برا کیا ہو گا۔ تو برا پائیں گے۔ کر برا تو ہو برا۔" اس سادگی پہ کوئی نہ مر جائے اے خدا۔

اس وقت نور جہاں کو کون سمجھاتا کہ اللہ بھی اپنے بھلے بندوں کا ہی امتحان لیتا ہے۔ مہر کی مثال ان کی نظروں کے سامنے تھی مگر چشم پوشی کی انتہا۔

"اے ایسی کون سی گنگا بہہ رہی ہے۔ اک تمہارے مرحوم ابا کی پنشن ہی تو آتی ہے، کل چھ ہزار، کچھ تمہاری سلائی کڑھائی۔ اب اتنے میں بندہ کیا اوڑھ لے، کیا بچھا لے، کیا کھا لے۔"

ان کی بات سچ ہی تھی۔ آمدنی محدود تھی۔ زندگی مفلس کی ردا اور نور جہاں کے من میں جو سما جاتی۔ وہ حرف آخر کہلاتی اتنا تو مہر بھی جانتی تھی۔ سو ہار سی گئی تھی۔

اب مکان کرائے پر چڑھانے کی ٹھان ہی لی ہے تو کوئی ڈھنگ کا تو کرایہ دار تلاشیے۔ غضب خدا کا اک نہ دو آٹھ افراد۔ ان کا خرچ کم ہو گا کیا؟"

"ارے گھر کا گھر کمپنی فیکٹری میں کمانے جاتا ہے۔ دن بھر گھر میں بس دو بچیاں رہتی ہیں۔" انہیں یہی پٹی پڑھائی گئی تھی۔

"تو روٹی تو گھر سے ہی پکا کر لے جائیں گی نا۔ استری کیا لانڈری سے کروائیں گے۔ پانی کی ٹنکیاں بھر بھر کے آدھا کرایہ بلوں میں پھنک جائے گا۔"

"کھانے کو نصیب ہو گا تو پکے گا نا۔ شکلیں نہیں دیکھیں۔ صاف فاقہ زدہ نظر آتی ہیں۔ بھوکے ننگے لوگ۔" "ارے امی۔ خدا سے ڈریے ہم سے کیا روٹی مانگنے آ رہے ہیں، اور یاد رکھیے ایسے لوگوں کے مزاج بھی آسمانوں پر ہوتے ہیں۔"

اور مہر کی بات بعد ازاں صدفی صد سچ ثابت ہوئی تھی۔ پہلا قدم دھرتے ہی انہوں نے سب سے پہلے کرائے نامہ سے انکار کیا۔

"ہمارا اپنا گھر موجود ہے۔ گیارہ مہینے رہنے کا ارادہ ہی نہیں تو گیارہ مہینے کا کرایہ نامہ کاہے کے لیے سائن کریں۔"

"ہائیں۔" نور جہاں کے دیدے چوپٹ کھل گئے۔ جب اپنا گھر موجود ہے تو کرایہ پر لینے کی کیا تک بنتی ہے۔ خیر، ان کی دھکڑ پکڑ کو کچھ قرار نصیب ہوا، صرف چند مہینوں کی تو بات تھی۔ گزرتے پتا بھی نہ چلتا۔ گمان تھا کہ نہ بنی تو صاف سیدھا باہر کا دروازہ دکھائیں گی۔ چلو جی، اپنا رستہ ناپو، چلتے پھرتے نظر آؤ۔ تم اپنے گھر خوش۔ ہم اپنے گھر خوش مگر کچھ گمان حلق میں اٹک جاتے ہیں۔

گھر کے سامان کے نام پر دو کرسیاں، ایک چارپائی، ایک چٹائی آئی۔ جبکہ ایک کمرہ خالی پڑا منہ چڑاتا رہ گیا۔

اس کمرے کے لیے صاحب خانہ کے داماد بوریا بستر اٹھائے چلے آئے۔ کہ صرف سامان رکھنے کے لیے ایک کمرہ چاہیے، رہائش کا نام بھی لیں تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔ اس سامان رکھنے کا بھی وہ معاوضہ ادا کرنے کو تیار تھے اور پھر ہزار کے نوٹ سے ان کی مٹھی گرم کر کے لبوں پر قفل بھی لگا دیا ادھر صاحب خانہ ہاتھ جھاڑ، صاف ایک طرف ہو گئے۔

"اس سے آپ ہی نمٹیے ہم نے شہ پکڑا دی تو ہمارے گھر ڈیرا ڈال لے گا، ہم اس کا ذمہ نہیں لیں گے۔ پہلے ہی یہ ہماری چھاتی پر پڑا ہے۔ اس کا بچہ ہماری بیٹیاں سنبھالتی ہیں۔ یہ نامراد اس بچے کے بہانے تین وقت روٹی ادھر ہی کھاتا ہے۔ ہمارا اپنا سکہ کھوٹا ہے، میکے میں بھی ڈھنگ سے روٹی تک نہیں پکائی۔ میاں کا، کما کر گھر چلا رہی ہے۔"

مگر نور جہاں کے دل و دماغ کو ہزار کے نوٹ کا خمار چڑھ چکا تھا۔ اک سامان رکھنے کے چند ہزار کیا برے تھے۔ اس سمیت ایک پورشن دس ہزار سے اوپر کا پڑتا۔ بقیہ کے لیے داماد صاحب نے حالات کے دکھڑے رو کر کچھ دن بعد کا وعدہ کر لیا مگر ان کے فرشتوں کو بھی کیا خبر تھی کہ داماد میاں بھلا کہاں ٹھکانا الگ کرنے والے، سسرال کے دم سے تو ان کے گھر کا کارخانہ چلتا تھا۔ بیگم صاحبہ کمانے جاتیں وہ مزے سے بچہ لیے دن بھر سالیوں میں بیٹھے ہلکی ٹھٹھول کرتے نظر آتے۔ بہانے سے ایک کمرے میں ساماں ٹھونسا اور پھر دیگر کے ہمراہ پڑاؤ بھی ڈال لیا دگنی بجلی کا خرچ۔ دھڑا دھڑ گیس کے چولہے جلنے لگے۔ پانی کی ٹنکی وہ صبح بھرتیں شام تک خالی ہو جاتی۔ پھر ایک شور سا مچ جاتا۔ انہیں موٹر چلاتے ہی بن پڑتی۔ پھر اسی پر بس نہ رہی۔

کرایہ داروں کے گھر ایک کے بعد ایک الیکٹرانک آئٹم کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوا۔ فریج، ٹی وی، واشنگ مشین۔ خیر سے سب ہی کچھ آ گیا اور مہر کے فرمان کے صدفی صد مطابق، آدھا کیا، سارا کرایہ بلوں میں پھنک کر رہ گیا۔ وہ خون کے گھونٹ بھر کے رہ گئیں۔ کچھ دن گزرے داماد

صاحب نے اسکوٹر اچھال اچھال کر داخلی دروازے کے درمیانی حصے سے جو نکالی تو دروازہ ہاتھ میں آرہا۔ جسے چوری چھپکے ڈوریاں دھاگے باندھ کر کس لیا گیا۔ نور جہاں نے جو سنا تو ان کی ہوم منسٹر کے سر پر جا سوار ہوئیں۔ مگر وہ الٹی گلے پڑ گئیں۔

''آپ جانیے آپ کا گھر جانیے۔ ہم کا ہے کے لیے دروازہ مرمت کروائیں' دروازہ تو آپ کی نواسی نے ٹکر مار کر توڑا تھا۔''

''اے لو۔ چھوٹی نہ ہوئی بارہ من کی بھینس ہوگئی کہ ٹکر ماری اور دروازہ دو ٹکڑے!''

زمانے بھر کی لتری ذکیہ نے اپنے من من بھر کے دیدوں سے دیکھا تھا۔ مگر وہ مانتیں تب نا۔ انہوں نے بیٹی، داماد کے ادھر پڑاؤ کی بات کی تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

''تو ہماری بیٹی ہمارے گھر نہ رہے گی تو کیا آپ کے گھر رہے گی۔ کسی حال سے ہے۔ اس نکھے، نامراد کے در پر پڑی رہی تو بھوکا نہ مار ڈالے گا۔''

واہ ری دنیا کی ڈپلومیسی۔ کہاں تو وہ بیٹی داماد کا ذمہ لینے کو تیار نہ تھیں۔ اور کہاں مرغی کی طرح پروں میں سمیٹ کر ہاتھ دھر بیٹھی تھیں۔ واہ جی واہ۔ کیا کہنے اس شان بے نیازی کے۔ پھر بات الیکٹرک سامان پر آئی۔

''سامان تو ہمارا اپنا ہے۔ کمال کرتی ہیں آپ۔ ہمارے بچے ٹی وی دیکھنے کیا آپ کے گھر آئیں گے۔ واشنگ مشین نہ ہوئی تو کپڑے کیا گلی محلہ والے دھو کے دیں گے؟''

واہ جی واہ۔ اچھی زبردستی تھی۔ چوری اور سینہ زوری۔ اس پر دھونس ایسی، جیسے آٹھ ہزار میں مکان سمیت انہیں خرید لیا ہو۔ انہوں نے چڑ کر مکان خالی کرنے کو کہا تو توتے کی طرح آنکھیں پھیریں۔

''کس خوشی میں خالی کردیں۔ ہم نے کوئی مکان اک آدھ مہینہ رہنے کے لیے لیا تھا کیا۔ لے لیا تو لے لیا۔ جب خالی کرنا ہوگا۔ آپ کو بتادیں گے۔''

''آپ کا اپنا گھر جو خالی پڑا ہے۔ وہاں جا پڑیئے۔''

''اتنا سستا پڑتا ہے کیا۔ بوریا بستر لے کر کبھی بھی منہ اٹھا کر چل دیں۔ اس گھر میں بجلی، گیس، پانی کچھ نہیں ہے۔''

''تو بلوں میں ساجھا کیجیے۔''

''کاہے کے لیے ساجھا کیجیے۔ آپ کو آٹھ ہزار کس بات کے دیتے ہیں۔ یاد رکھیے، اپنے مرشد کے حکم کے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ اور اپنے گھر تو ہم اپنی بیٹی کی شادی بھگتا کر ہی جائیں گے۔''

''ہائیں۔'' نور جہاں کے دیدے چوپٹ کھل گئے۔ اس بات کا تو سارے فسانے میں کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ بھرے کنبے کا بار بھگتانے ہی میں جان گلے میں آگئی تھی۔ شادی کے جھمیلوں میں تو دیوالیہ ہی نکل کے رہ جائے گا۔ اف خدایا۔ وہ کہاں پھنس گئی تھیں۔

نور جہاں سر پکڑ کر اس گھڑی کو تیں۔ جب مہر کی بات رد کر کے اپنے ہاتھوں خسارہ خرید ا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔

☆☆☆

ذکیہ نے نور جہاں کی چوٹ پر ان کے کرایہ داروں سے میل جول بڑھایا۔ یہی نہیں ان کی اگلی پچھلی بھی مرچ مسالا لگا کر ان کے کانوں میں اتار دی جو بعد ازاں مہر اور ان کی شادی شدہ، غاصب بیٹی کی لے دے میں کام آئی۔

نور جہاں نے داماد میاں پر نظر پڑتے ہی بقایا جات کا مطالبہ کیا تو اس نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

''کون سے پیسے۔ کاہے کے پیسے۔ آپ کو کرایہ پورا ملا ہے کہ نہیں۔؟''

''یوں کہو کہ۔ کرایہ میں ساجھا کر کے تو ساس کے در پر پڑا ہے۔'' دیر سے سہی۔ مگر بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔

''یونہی سہی۔ آپ کے در پر تو نہیں پڑا ہوں۔ آپ اپنے کرائے سے مطلب رکھیے۔''

''ارے تیری زبان میں کیڑے پڑیں۔ پہلے تو نے بہانے سے سامان ڈالا۔ پھر خود آکے پڑ گیا۔

ڈبل فیملی کا خرچ میں بھگتوں؟ یہ پیسے تو تجھے دینے پڑیں گے تیرا باپ بھی دے گا۔'' اور واہ ری اس بدبخت کی دیدہ دلیری۔

''اچھا...... تو پھر آپ سے لیے جائیں تو لے کر دکھائیں۔'' دھمکی آمیز انداز نور جہاں کا ہاتھ اٹھا تھا اور اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ مانو ایک ہاہا کار مچ گئی۔ جو مہر کے کانوں تک جا پہنچی۔ اس نے جو سنا تو اس کے تلوؤں سے لگی، سر پر بجھی۔ رات ان کی بٹی فیکٹری سے لوٹی اور وہ جھٹ آستینیں چڑھا میدان میں......

''تجھ پر اللہ کی مار پڑے۔ اپنے بے غیرت مرد کو لگام دے کے رکھ۔''

''اللہ کی مار تجھ پر...... تیرے ہوتوں سوتوں پر...... اس بڑھیا کی یہ مجال...... ہاتھ ٹوٹیں اس کے...... بالشت بھر کے ٹکڑے پر اترائی ہے...... ایسے دس مکان ہماری جوتی کی نوک پر......''

''اری چل چل۔ ایسی ساہوکار ہوتی تو کاہے کو دوسروں کے در پر پڑی مفت کی روٹیاں توڑتی نظر آتی۔ ہونہہ! اوقات دو ٹکے کی نہیں اور باتیں بڑی بڑی۔''

''اری تیری اوقات کیا ہے۔ جانے کتنے کیڑے تھے تجھ میں، جو تجھے پر چا پکڑا۔ جھنجھنا ہاتھ میں دے، لات ماری۔''

''مجھ میں کیڑے تھے تو تُو پارسا ہے تو پڑھا لے اس سے نکاح۔ تیرے اس دو ٹکے کے ٹٹ پونجیے سے تو اچھا رہے گا۔''

''مجھے تو دس اور بھی مل جائیں گے تو ہی ناٹھی نگوڑی ہے۔ اک بار اجڑی تو پھر کسی کتے نے بھی نہ سونگھا۔''

''اری جا...... آئینے میں اپنی شکل دیکھ۔ پھر بات کر۔ اس بے غیرت نے تیری کمائی کے لالچ میں تجھ اماں برابر سے نکاح پڑھا لیا تو اسی پر اچھل رہی ہے۔ ہم تو اپنی جان بھی چھڑا لیں گے۔ تیری تو قسمت میں لکھا گیا۔ عورت کے ٹکڑوں پر پلنے والا۔ بے غیرت آدمی......''

''اری میرے منہ نہ لگیو۔ کہیں تیری اگلی پچھلی کھول کے رکھ دوں۔''

''چل چل۔ پہلے اپنے گریبان میں جھانک۔ در در کے ٹکرے توڑنے والی فقیرنی۔ تجھ جیسی عقل کی اندھیوں کے بل بوتے پر اس جیسے بے غیرت عیش کرتے ہیں تجھے کمائی میں جھونک کر وہ تیری جڑ میں بیٹھا...... سالیوں سے عشق لڑاتا ہے' تجھے ہوا بھی نہیں۔''

''تیری زبان میں کیڑے پڑیں۔ منہ سنبھال کے بات کر۔'' بات سچ تھی۔ تب ہی اسے پتنگے لگ گئے۔

''کیوں...... لگیں نا مرچیں۔ اری اپنی آنکھیں کھول کے رکھ۔ ورنہ اجڑ کر پھر اسی در پر بیٹھی نظر آئے گی۔''

''اری چل چل۔ میری آنکھیں کھولنے چلی ہے۔ تجھ جیسیاں ہماری جوتی۔ ہم مالک مکان کو اتنا سر نہیں چڑھاتے۔'' وہ یوں بولی جیسے مالک مکان سے گھر کی جھاڑو دلوائی ہو فساد کی جڑ، داماد صاحب بھس میں چنگاری ڈال کونے میں بیٹھا تماشا دیکھتا رہا۔

''اری چل...... ہم برے ہیں تو برے سہی۔ جان چھوڑ ہماری۔ اپنا راستہ ناپ اور مکان خالی کر۔''

''آپ سے کرایا جائے تو کرالیں۔'' بہنوئی کی حامی سالی چہکی۔

''اری تیرے کلیجے میں کاہے کا درد اٹھ رہا ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے۔ سارا دن یہ عورت کے ٹکڑوں پر پلنے والا اسی سالی کے گھٹنے سے تو لگا بیٹھا رہتا ہے۔ اری میری بات لکھ کے رکھ لے۔ ایک روز یہ سالی کو لے اڑے گا۔ تو بیٹھی ناچتی نظر آئے گی۔''

اس بات پر مزید جوتم پیزار چلی۔ پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ یہ تو طے تھا کہ کرایہ داروں کی صورت اک ہڈی ان کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ اب یہ ہڈی نہ نگلنے بنتی تھی۔ نہ اگلتی نظر آتی تھی۔

☆☆☆

نور جہاں...... مہر اور چھوٹی کے ہمراہ قریبی پارک گئیں تو ان کا ٹاکرا سہیل صدیقی سے ہوگیا۔ مہر اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی چھوٹی کو جھولا جھلانے کے بہانے کھسک گئی کہ سہیل صدیقی اپنی کاٹ دار نظروں اور تلوار مارکہ مونچھوں سمیت اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ایک زمانے میں نور جہاں نے اس کی ماں، خالہ رشیدہ کو دوپٹا بدل کے بہن بنایا تھا۔ خالہ رشیدہ نے زندگی کے بڑے دکھ جھیلے۔ براوقت کاٹ کر۔ اولاد کو پروان چڑھایا، مگر ان کی زبان کے نشتر...... الامان...... ہواؤں سے لڑتی تھیں۔ کبھی بھی پڑوسی تک سے نہ بنی۔ تو بہوئیں تو پھر بہوئیں تھیں اور بہوئیں بھی ایسی پائیں کہ خدا کی پناہ...... نہلے پہ دہلا...... رشیدہ دنیا کو جوتی تلے دبا کے رکھنا چاہتیں اور دبا بھی لیتیں کہ خیر سے چار کڑیل جوان بیٹوں کی ماں تھیں۔ جو اثر رسوخ بھی رکھتے۔ کوئی فوج کوئی پولیس اور دیگر عسکری محکمات کے ملازم تھے۔ خود سہیل صدیقی کا گھر دوبارہ اجڑا تو ماں کی اسی فسادی مزاج کی بدولت۔ آخر کار اس نے ماں سے کنارہ کرلیا۔ اب تو خیر رشیدہ مرکھپ گئی تھیں مگر سہیل صدیقی کا گھر ہنوز نہ بس سکا تھا۔ تین بچوں کا ساتھ تھا اور اکلی کے لیے مہر پر نظریں تھیں۔ جواب شادی کے نام سے بھی کانوں کو ہاتھ لگاتی تھی۔ نور جہاں کو سہیل صدیقی سے ملاقات کسی غیبی امداد سے کم نہ لگی۔ مہر کے لوٹنے تک وہ تازہ ترین افتاد سہیل کے کانوں میں اتار چکی تھیں۔ ادھر سہیل کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔ اس کی فساد پسند طبیعت کو قرار ہی مار دھاڑ کے مظاہروں سے ملتا تھا۔

"واہ خالہ واہ۔ تم نے کاہے کی فکر پالی۔ بے فکر رہو۔ ایسا چنگھاڑ دار کیس بنے گا کہ دنیا دیکھے گی۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"ہائیں۔ کیس۔؟" نور جہاں سٹپٹائیں۔ وہ تو چاہ رہی تھیں کہ کسی طرح سہیل اپنے عہدے، اثر و رسوخ سے ذرا دھمکا کر ان پر کچھ ایسی دھونس جمائے کہ وہ دم دبا کر بھاگ نکلیں اور یہی خیال انہوں نے اس بدبخت کے سامنے پیش کیا۔

"اے بیٹا۔ سیدھی شرافت سے کام نکل جائے تو اچھا ہے۔ توپ سے چڑیا مارنے کی کوئی تک بنتی ہے کیا۔؟"

"اجی جہنم میں ڈالیے۔ یہ شرافت کا زمانہ ہے کیا۔ کمال ہے، کوئی آپ کو دھونس، دھاندلی دکھا رہا تھا اور آپ نے صرف ہاتھ اٹھایا' گھسیٹ کر گلی میں لاتیں۔ اپنا سر پھوڑتے صاف قاتلانہ حملے کا الزام دھر دیتیں۔ سیدھا جیل کی ہوا کھاتا۔ ساری زندگی چکی پیستے گزرتی۔"

اور وہ۔ وہ بھیانک نقشہ کشی کہ نور جہاں کا نازک دل دہل دہل گیا۔ مگر سہیل صدیقی کی کمک اور شہہ۔

"اجی آپ عورت ہیں عورت۔ اور عورت کی ہر جگہ سنی جاتی ہے پرچا کٹوائیے۔ رپورٹ میں لکھوائیے اس سے آپ کی جان و مال، عزت و آبرو کو خطرہ ہے۔ آپ کے گھر پر بری نظر رکھتا ہے اور کرایہ داروں پر غاصبانہ قبضہ کا الزام۔ کورٹ، کچہری کے دھکوں کی فکر نہ پالیے گا۔ میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ آپ کا خادم۔"

کورٹ۔ کچہری۔ عدالت۔ دنیا نور جہاں کی نظروں کے سامنے گول گول گھومنے لگی۔ وہ تو کنگال ہو جائیں گی۔ سنا ہے، عدالتی کارروائیاں سالہا سال چلتی ہیں۔ کرایہ الگ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ ایسے غاصبوں کا کیا بھروسا۔ دیا دیا۔ نہ دیا، نہ دیا۔

اف خدایا۔ وہ کس جنجال میں جان پھنسا بیٹھی تھیں۔ کس بری گھڑی میں یہ پوزیشن کرائے پر اٹھانے کا خیال دل میں لپکا۔ اور اب یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی۔ خلاصی کی کیا صورت ہو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ وہ گھر آکر بھی سوچتی رہیں۔ بالآخر انہیں ایک آئیڈیا سوجھ ہی گیا۔

☆☆☆

"لو بھئی مہر۔ کام بن گیا۔" نور جہاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ہانک لگائی تو سبزی بناتی مہر ہاتھ روک کر ان کے پاس آبیٹھی۔

"کون سا کام امی۔" نور جہاں نے اک چور نظر بہ ظاہر ہوم ورک میں مصروف چھوٹی پر ڈال کر کہا "بھئی یہی اپنا کرایہ داروں سے گھر خالی کرانے کا کام۔ ایسی خطرناک رپورٹ لکھوائی ہے کہ دن میں تارے نظر آجائیں گے پرائی املاک پر غاصبانہ قبضہ۔ توڑ پھوڑ، اور ہاں، اب تو عزت، جان و مال کے خطرے کے بغیر کوئی رپورٹ بنتی ہی نہیں ایسا چٹ پٹا کیس بنے گا کہ مزا آجائے گا۔"

"ہائیں۔ اماں۔ تم تھانے تک کیسے جا پہنچیں۔؟" مہر حیرت زدہ رہ گئی۔

"ارے بھئی وہ اپنی رشیدہ کا بیٹا ہے نا۔ جو اس روز پارک میں ملا تھا۔ سابق فوجی ہے۔ پولیس تھانوں میں بڑی چلتی ہے اس کی۔ اچھے اچھوں کو الٹا لٹکوا دیتا ہے۔ ارے جب ہماری اتنی اونچی...... وہ کیا کہتے ہیں اسے، پی آر ہے تو کام میں کیوں نہ لائیں۔ ذرا لکوں پر بھی دھاک بیٹھے گی۔ اور بھئی عورت کی تو ہر جگہ سنی جاتی ہے، تگنی کا ناچ نہ نچوادوں تو میرا بھی نام نہیں۔ ہاں۔" انہوں نے فراغت سے تخت پر پیر پسار کے پاندان اپنی جانب کھسکایا اور پان بنانے لگیں۔

☆☆☆

اس روز نور جہاں اور مہر کسی کام سے سدھاریں، تو کس منہ سے ذکیہ کے دروازے سے جھانک کر ہانک لگاتیں کہ انہیں دیر سویر ہو جائے تو چھوٹی کا خیال رکھنا۔ مگر چھوٹی اپنے نام کی ایک تھی۔ چکمہ دینا تو کوئی اس سے سیکھے۔ اسکول سے لوٹی تو میدان صاف پا کر ذکیہ کے گھر جھانکی ماری۔ ذکیہ نے تاڑ لیا اسے آواز ماری اور چھوٹی غڑاپ اندر۔ اسے کا کا یاد آتا تھا۔ پھر ذکیہ اسے ایک ٹافی دے کر ہزار کام کرواتی۔ چھوٹی اگلی پچھلی ساری اگلنے کی ماہر۔ کچھ ذکیہ کرید کرید کر نکلوا لیتی۔

اب بھی کھٹا کھٹ الف سے ی تک ساری اگل گئی۔

"اور ہاں۔ نانی نے کرامت والے بابا کا پانی ان کی چوکھٹ پر چھڑکا تھا۔ جو ان کا نواسا لمبا پڑا۔ اور نانی کہہ رہی تھیں کہ ان کی بیٹی اسپتال جائے گی تو وہ ایسی مٹی ان کے آنگن میں جھاڑیں گی کہ اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔"

"ہائیں۔ سچ بتا۔" ذکیہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"کاکا کی قسم۔ نانی نے ان سب کی رپورٹ تھانے میں لکھوادی ہے۔ ان سب کو الٹا لٹکوا کے چھوڑیں گی۔ بڑی پہنچ ہے ان کی۔" ذکیہ کے پیٹ میں ابال اٹھنے لگے۔ چھوٹی کے سدھارتے ہی اس نے اگلی چھلانگ کرایہ داروں کی جانب لگائی تھی۔

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا؟ اور وہ سب جو تنہا و بے بس عورتیں سمجھ کر چھاتی پر چڑھے آرہے تھے، اسی شام ہاتھ باندھے دروازے پر کھڑے تھے۔ نور جہاں دم بخود رہ گئیں۔

"کرایہ پر گھر لینا ہماری مجبوری تھی۔ ہمارے گھر میں بجلی، پانی، گیس نہیں ہے۔ مگر ہم گزارہ کرلیں گے۔ جنریٹر، گیس کے سلنڈر اور ہاں، پانی کے لیے ٹینکر، کم از کم کرایہ سے تو کم ہی پڑے گا، کم بھی آٹھ ہزار نکلنا ہمارے بس کا کہاں (یہی نکتہ سارے فساد کی جڑ تھا) کہا سنا معاف کرنا۔ ہم کل اپنا سامان اٹھالیں گے جو کرایہ بچتا ہے، اس سے اپنا خسارہ پورا کرلیتا"

اور اگلے روز واقعی وہ سدھار گئے۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ۔ ختم فسانہ ہوگیا۔

"امی۔ یہ دو دن میں کیا ماجرا ہوگیا؟" مہر ابھی تک دم بخود تھیں۔ اور نور جہاں مسکرادیں، اب یہ بھی کوئی بتانے والی بات تھی کہ اپنی گیدڑ بھبکیاں، کرایہ داروں کے کانوں تک پہنچانے کے لیے انہوں نے نواسی کی چغل خوری کا سہارا لیا تھا۔ اور تیر نشانے پر فٹ بیٹھا تھا۔

☆☆

مکمل ناول

سیم زدہ

سحر ساجد

وہاں روشنی تھی۔ زرد دھندلی سی روشنی کسی غبار کی مانند پھیلی ہوئی۔ دھند کی طرح لپٹی ہوئی۔ وہاں جو دوسری چیز موجود تھی وہ اانت خاموشی تھی۔ گہری، کسی قبر کی سی بانند خوشی۔۔۔ اور تیسرا وہ تھا۔ اس دھند نما پھیلی روشنی میں ڈوبا اک آبنوسی دروازہ تھا۔ جسے وہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ چند لمحے حیرانی سے اس حیرت کدہ کو تکتا رہا۔ یہ کون سی جگہ تھی اور وہ کیوں وہاں کھڑا تھا۔

”بخش۔ش۔ش۔۔۔“ اک آواز گونجی اور گونجتی چلی گئی۔ وہ چونکا۔ بری طرح سے چونکا اور آواز کا منبع تلاشنا چاہا مگر نہ ڈھونڈ سکا تھا۔۔۔“ بخش۔ش۔ش۔“ آواز پھر سے آئی۔

”آؤ نا بخش۔ آؤ۔۔۔“ آواز کسی گنبد میں تیرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور وہ حیران کھڑا تھا۔ یکلخت دھند چھٹنے لگی۔ زرد روشنی مدہم ہوئی گئی اور وہ آبنوسی دروازہ اس کے سامنے تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر موجود۔ وہ اب اسے واضح دیکھ سکتا تھا۔ اس کے پیروں نے بے اختیار سی حرکت کی۔ اور دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ چند لمحے اس دروازے کو دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ کر اس نے بڑی بے قراری سے اس پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ اور یکلخت دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ دروازے کے پٹ وا ہو چکے تھے اور چوکھٹ میں وہ ایستادہ تھا۔ اک تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ اس نے اس جھونکے کی باس کو اپنے نتھنوں میں داخل ہوتے محسوس کیا تھا۔ اور پھر وہاں کوئی خوشبو سی پھیلی تھی۔ دل فریب۔ دل کش سی خوشبو۔ اس نے قدم آگے بڑھایا۔ اور پھر حیرت زدہ سا رک گیا۔ وہ سرسبز وادی ساری کی ساری سوکھی پڑی تھی۔ زرد، نارنجی پتے اس کے پیروں تلے چرچراتے تھے۔ یہ ایسی وادی تو نہ تھی۔ یہاں تو بہار رقص کیا کرتی تھی تو اب؟۔ اب کیا ہوا۔ وہ حیران سا آگے بڑھا اور یکلخت پھر سے رک گیا تھا عجیب تماشا تھا۔ عجب تماشا ہوا تھا۔ اس کے پیر رکھنے کے ساتھ ہی سڑی، مرجھائی گھاس۔ سبز ہوتی چلی گئی۔ درختوں پر جوبن اترتا چلا گیا اور پھول۔ وہ زندہ ہو گئے مہکنے سے لگے۔ اس کے اردگرد گلوں کی پتیاں سی بکھرنے لگیں۔ اور وہ حیرت زدہ سا آگے بڑھتا گیا۔ یہ ماضی تھا۔ یہ اس کا ماضی تھا۔ اک دم اس پہ انکشاف ہوا اور وہ دوڑتے۔ تیز قدموں کے ساتھ بھاگتا ہوا وہیں آن کھڑا ہوا۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ۔۔۔

”وہ اک کسرتی بدن والا نوجوان تھا۔“

☆☆☆

وہ اپنے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے دونوں بازو فضا میں سیدھے بلند کیے اور یوں ہی۔ اسی حالت میں وہ دائیں۔ بائیں جھکا اور پھر اس نے رکوع میں جھکتے ہوئے اپنے پیروں کی انگلیوں کو ہاتھوں سے چھوا تھا۔ وہ وارم اپ کی تیاری میں تھا۔ ہاتھوں کو بند مٹھیوں کی صورت سینے کے سامنے رکھتے ہوئے وہ اب جمپنگ جیکس کر رہا تھا۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے تیز تیز جاگ کیا اور اب وہ دو میل بھاگنے کے واسطے کسی گھوڑے کی مانند تیار تھا۔ پہاڑی علاقہ اور سردیاں خوش آمدید کہنے کو بالکل تیار تھیں۔ وہ سیاہ آدھے بازوؤں کی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ وہ دوڑتا ہوا بیرونی سیڑھیاں

اترا اور اسی طرح سے دوڑتا ہوا اک فوجی ادارے کی رہائشی کالونی کو پار کیا تھا۔ وہاں کے عام رستے بھی بل کھاتے۔ اونچے نیچے پتھریلے سے تھے۔ وہ معمول کے مطابق اپنے ٹریک پہ بھاگ رہا تھا اور راستہ اوپر کو جا رہا تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے وہ روز بلاناغہ اسی ٹریک پر دوڑا کرتا تھا اور یہ قدرے سنسان سا رستہ تھا۔ وہاں شاذ ہی کوئی دکھائی دیا کرتا تھا۔

وہ اپنے دھیان میں۔ مگن سا۔ پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا کہ ایک دم وہ رک سا گیا تھا۔ اور ایسا پتھریلی سڑک کے کنارے پڑے اس بڑے سے پتھر پہ بیٹھے وجود کو دیکھ کر ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ سست پڑا تھا اور پھر سے اپنی رفتار پکڑی تھی۔ وہ حیران ہوا تھا اور وہ ٹھیک حیران ہوا تھا۔ ایک تو صبح کا وقت۔ دوسرا سنسان رستہ۔ تیسرا اس پتھر پہ بیٹھی



لڑکی۔ اس نے اچٹتی سی نظر اس پہ ڈالی تھی۔ وہ گھٹنوں پہ فولڈر رکھے۔ سر جھکائے گردن ذرا سی ترچھی کیے۔ بڑی روانی سے لکھ رہی تھی۔ اس کے پیروں کے پاس ایک پانی کی بوتل پڑی ہوئی تھی اور وہ ارد گرد سے بے نیاز لکھتی چلی جاتی تھی۔ گو کہ لڑکی کی موجودگی اس نے نوٹس کی تھی مگر لڑکی نے اس کا بھاگ کر پاس سے گزر جانا نوٹس نہ کیا تھا۔ وہ بڑا محو ہو کر لکھتی تھی اور اس چیز نے اسے دوسری بار حیران کیا تھا۔

''تو کیا کوئی لڑکی ایرو اسپیس انجینئر خدا بخش کو نظر انداز بھی کر سکتی تھی؟''

''تو کیا اس کو معلوم نہ ہوا تھا کہ انجینئر خدا بخش اس کے پاس سے کسی گھوڑے کی مانند بھاگتا ہوا گزر گیا تھا۔ اور گھوڑا بھی۔ میرا مطلب ہے، انجینئر بھی وہ جو کہ وجاہت کا لفظی مطلب تھا۔

تو کیا وہ اتنی ہی انجان تھی؟۔ اچھا تو کوئی اسٹوڈنٹ ہوگی۔ اسائمنٹ کے عذاب میں پھنسی ہوگی اور اسائمنٹ کا عذاب کب بھلا کسی طرف دیکھنے دیتا ہے۔ چلو کوئی بات نہیں! اک آدھ لڑکی وہ بھی تو ہوتی ہی ہے نا جو کہ انجینئر خدا بخش کو مڑ مڑ کر نہیں دیکھتی۔ اس نے اپنے نوٹس نہ کیے جانے کی حیرت کو بہلایا اور تیز رفتار سے بھاگتا ہوا آگے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

''میرے اللہ!'' وہ آج پھر ٹھٹکا کیونکہ وہ لڑکی آج بھی ادھر موجود تھی۔ اور وہ آج بھی اس کی حیرت کا سبب بنی تھی یوں کہ آج بھی انجینئر صاحب کو نوٹس نہ لیا گیا تھا۔ وہ اسی پوز میں۔ سر جھکائے۔ گردن ذرا سی ترچھی کیے۔ فولڈر گھٹنوں پہ رکھے لکھتی اور بس لکھتی چلی جاتی تھی۔

''یا میرے اللہ!'' یہ کیسی محویت تھی جو اسے انجینئر خدا بخش کو دیکھنے نہ دیتی تھی۔ تو کیا وہ ایک ''تھیٹا'' تھی؟۔۔۔ تھیٹا ٹائپ کے طالب علم ہی ہوتے ہیں جو دنیا کی رنگینیوں سے منہ موڑے قلم کی سیاہیوں میں غرق رہتے ہیں۔ انہیں کیا خبر۔ کیا معلوم کہ دنیا کتنی حسین ہے۔ کتنی رنگین ہے اور اگر دنیا خدا بخش ہو تو؟۔ تو۔ یہ کہ اس ''تو؟'' کو ادھورا ہی رہنے دیتے ہیں۔ یہ قصہ پھر سہی۔ ہاں! تو وہ ''تھیٹا'' انجینئر بخش کو نوٹس نہ کرتا تھا اور انجینئر بخش نے اس دوسرے دن اپنے نوٹس نہ کیے جانے کی بھڑاس اس طرح سے نکالی کہ کل اگر وہ لڑکی وہاں موجود ہوئی۔ تو وہ بھی۔ اسے نوٹس نہ کرے گا اور کسی اعلیٰ عربی نسل کے گھوڑے کی مانند دوڑتا ہوا۔ بلکہ خاک اڑاتا ہوا اس کے پاس سے گزر جائے گا۔ یوں ہے تو یوں ہی سہی وہ کوئی اتنا تھرڈ کلاس نہیں تھا کہ اک لڑکی کے نوٹس نہ کرنے کا نوٹس لے۔ ہونہہ۔ ایسے ہے تو ایسے ہی۔۔۔ اس نے ہونہہ کہہ کر غم کو غلط کیا اور اک دم سے وہ انجینئر بخش سے کوئی اعلیٰ نسل کا عربی گھوڑا ہو گیا تھا۔ چست اور تیز رفتار۔۔۔

☆☆☆

اس تیسرے روز بھی وہ۔ وہاں موجود تھی۔ تیسرے روز کیا۔ وہ اگلے کئی روز وہاں موجود رہی تھی۔ اور انجینئر بخش جس نے اسے نوٹس نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ وہ قسم توڑ بیٹھا۔ وہ یوں کہ اس کے لکھنے کی رفتار اور محویت اسے حیران کرتی تھی اور کسی شیطان کے بہکاوے کی طرح قسم توڑنے پہ اکساتی تھی۔

''یا میرے اللہ۔'' وہ تھکتی نہ تھی۔ ایک ہی پوز۔ ایک ہی انداز۔ اور بے نیازی کا وہ ہی عالم۔ کوئی مر ہی نہ جائے اس انداز پہ۔ بخش کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ اک مجسمہ تھی مگر یہ کہ وہ ایک لکھنے والی مجسمہ تھا جسے کاغذ اور قلم تھما دیا گیا اور حکم یہ تھا کہ چلو اب تا ابد لکھتے رہو یا پھر وہ ربوٹ تھی۔ ہاں! ربوٹ کا لفظ زیادہ موزوں تھا۔ تو ہاں۔ وہ ایک لکھنے والی، نی میل ربوٹ تھی جس کے اندر بس یہ لکھنے کا پروگرام فیڈ کر دیا گیا تھا اور بس وہ لکھتی رہتی۔ لکھتی رہتی۔ لکھتی ہی رہتی۔ اتنی مگن ہو کر کہ اس کی محویت بخش کو چڑاتی تھی۔ کوئی تو سورج چڑھے گا نا کہ جس دن یہ منحوس محویت ٹوٹے گی۔ وہ لکھنا بند کرے گی اور بخش کو نوٹس...... ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ''۔ اور اس سوچ کے بعد بخش نے بدک کر لاحول پڑھی تھی۔ ہاں! ٹھیک ہے وہ لڑکیوں کے نوٹس کیے جانے کا عادی تھا۔ سو اس نی میل لکھنے والی ربوٹ کا نوٹس نہ کرنا ذرا محسوس ہوا تھا مگر اس کا مطلب یہ تھوڑی تھا کہ وہ بالکل ہی کمینہ ہو گیا تھا۔ اک دم چول انسان۔ نا۔ وہ انجینئر خدا بخش تھا کوئی مذاق تھوڑی تھا؟۔ وہ تو بس اسے اس نی میل لکھنے والی ربوٹ کی محویت حیران کرتی تھی اور لاشعوری طور پر وہ اس دن کے انتظار میں تھا کہ کب یہ محویت ٹوٹتی ہے۔ اور بخش نہیں جانتا تھا کہ وہ دن آج کا دن ہی ہوگا۔ آج مطلع ابر آلود تھا اور فلیٹ سے نکلتے وقت اس کے اسمارٹ فون نے بارش کی اطلاع دی تھی۔ سو اس نے اسپورٹس جیکٹ پہننا مناسب سمجھا تھا۔ ابھی جب وہ ایک میل بھاگ کر واپس آ رہا تھا کہ گھر واپسی کا چکر اس کے دو میل پورے کر دیتا تھا۔ پانی کے اکا دکا قطرے تیزی سے زمین کی طرف لپکے تھے۔ اس نے بھاگتے ہوئے آسمان کی طرف منہ کر کے اندازہ لگانا چاہا کہ بارش اسے بنا بھیگے گھر واپس جانے دے گی یا نہیں؟ اور پھر جب بادلوں نے اسے یہ پیغام پہنچایا کہ نا!۔ آج تو وہ اسے بھگو بھگو کر مارنے والے تھے تو اس نے منہ سیدھا کرتے ہوئے رفتار تیز کرنی چاہی تو یک دم ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

''لو جی! ٹوٹ گئی اس نی میل لکھنے والی ربوٹ کی محویت اور بند ہو گیا اس کا لکھنا۔''

وہ بڑے گھبرائے سے انداز میں کھڑی۔ کسی متاع کی طرح کاغذوں کو سنبھالنے کی کوشش میں تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس نے محض ایک چند فٹ لمبے اسٹالر کو گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور وہ جو کاغذوں کا پلندا تھا' وہ غرق ہوتا دکھائی دے رہا تھا' بارش کے ہاتھوں۔ انجینئر بخش اک لمحے کے لیے ٹھٹکا تھا اور پھر سے وہ اک گھوڑا بن گیا۔ وہ اپنی پوری رفتار سے اس کے پاس سے بھاگ کر گزرا مگر۔

''ایکسکیوز می!۔۔'' اور وہ جھٹکا کھا کر رکا۔ اسے وہم محسوس ہوا مگر۔۔۔ دوبارہ آنے والی ''ایکسکیوز می!۔۔'' کی آواز نے ثابت کیا کہ وہ وہم نہ تھا۔ حقیقت تھی۔ آ۔ ہا۔ تو ربوٹ محض لکھتا ہی نہ تھا۔ بولتا بھی تھا۔

وہ اپنی ایڑیوں پہ گھوما اور انگلی کا اشارہ اپنی طرف کرتے ہوئے اشارے سے ہی پوچھا۔ کہ آیا اسے ہی پکارا گیا۔ اور جواباً وہ تیز تیز چلتی ہوئی اس کی طرف آئی تھی وہ اس کے یوں تیز رفتاری سے خود کی طرف بڑھنے پہ احتیاطاً دو قدم پیچھے کو ہوا۔

''یہ صفحات آپ اپنے پاس رکھ لیں۔'' وہ کاغذات کو بڑی احتیاط سے اور پچکار کر تہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

''میری پاکٹ میں نہیں آئیں گے یہ کاغذات!'' بے تکلف لہجے نے بخش کو حیران کیا۔

''مجھے بھی معلوم ہے پاکٹ میں نہیں آئیں گے۔'' وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتی ہوئی فکر مندی سے بولی تھی۔

''تو پھر۔۔؟'' اور بخش کے ''تو پھر'' کہنے پر اس نے اک ناراض گھوری اس پر ڈالی تھی۔

''جیکٹ کی زپ کھول کر اندر رکھ لیں پلیز۔ میں نے بہت ہی محنت سے لکھا ہے۔'' وہ ایک دم منجھی ہوئی ہاں! کہتی تو ٹھیک ہی تھی۔ ''بہت محنت'' کا وہ چشم دید گواہ تھا، مگر اس کے آئیڈیے نے بخش کو حیران کیا اسے آج معلوم ہوا تھا اسپورٹس جیکٹ کاغذات چھپانے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہے۔

''جلدی کریں نا! اب کیا میری محنت پر آپ بج کا پانی بہائیں گے؟'' وہ جھنجلائی اور اس کی بے تکلفی بخش کے گلے سے نیچے نہ اتری تھی۔

''اوہ۔ تھینکس۔ تھینک یو سو مچ۔''

اسے کاغذ پکڑتے دیکھ کر وہ دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر کہتے ہوئے تشکر کے بے پناہ جذبات کے ساتھ ادھ موئی ہی ہو گئی تھی۔

''اٹس او کے۔ او کے!'' اس نے فوراً کہا تھا مبادا وہ۔ خیر۔ ان دونوں کے سروں کے اوپر موجود

بادلوں نے گڑگڑا کر ہنکارا ابھرا اور انہیں احساس دلایا کہ ''وہ بھی تو چڑھے ہیں آسمانوں پر''

بادلوں کی گڑگڑاہٹ پر ان دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں کے چہرے کے تاثرات کہتے تھے۔ ''بھاگو۔۔۔!'' سو وہ بھاگ لیے، مگر اس بھاگ دوڑ کے باوجود بارش انہیں بھگو بھگو جاتی تھی۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟'' پانی کی بوچھاڑ سے بچتے ہوئے بخش نے پوچھا۔ وہ سینے پہ دونوں ہاتھ باندھے جیکٹ کے اندر موجود کاغذات کو سنبھالے ہوئے تھا۔

''یہ سامنے والی کالونی میں۔'' وہ مشکل سے کہہ سکی تھی کہ پانی کے قطرے یخ بستہ تھے۔ بخش اس کے سامنے والی کالونی کہنے پر حیران ہوا۔ وہ وہی رہائشی کالونی تھی جس میں وہ بھی رہائش پذیر تھا۔

''آپ میرے ''پیپرز'' کو گھر تک چھوڑ جائیں گے؟'' وہ لفظ ''پیپرز'' کی بجائے لفظ ''مجھے'' کی توقع کر رہا تھا، مگر وہ پیپرز شاید جان سے زیادہ عزیز تھے اسے۔

''شیورا!'' اس نے کہا اور وہ دونوں بارش سے بچتے ہوئے کبھی تیز تیز چلتے۔ کبھی بھاگتے ہوئے کالونی کے اندر داخل ہوئے تھے۔ اس کے فلیٹ کے پاس پہنچ کر شیڈ کے نیچے کھڑے ہو کر سکون کا سانس لیا تھا ان دونوں نے۔ بخش نے پہلے ایک ہاتھ جیکٹ کے ساتھ رگڑ کر صاف کیا اور پھر دوسرا۔ پھر اس کے بعد بڑی ہی احتیاط سے اس نے کاغذات کا پلندا نکالا تھا۔ کافی بچت ہو گئی تھی ورنہ بارش ضرور اس کی محنت برباد کرتی۔

''بہت بہت شکریہ آپ کا۔۔۔'' وہ آنکھیں میچ کر پرزور انداز میں بولی تھی اور جب اس نے آنکھیں میچیں تو اس کی پلکوں سے پانی کے چند قطرے ٹوٹ کر گرے تھے۔ بخش ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔

''آپ آئیں نا اندر آئیں۔۔۔ ایک کافی کے کپ کے حق دار تو ہیں ہی آپ۔'' وہ اب مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

''نو تھینکس! میں اب چلوں گا۔ آفس بھی جانا ہے مجھے۔'' اور اس نے محض کندھے اچکائے۔ جیسے کہتی ہو آپ کی مرضی۔

''ایک دفعہ پھر سے شکریہ۔ آپ نے میری محنت بچالی۔''

''اتنا شکریہ ادا نہ کریں۔ حق حلال کی محنت تھی۔ سو بچ گئی ویسے کافی لمبی تھی آپ کی اسائنمنٹ۔'' ایک ہاتھ ٹراؤزر کی جیب میں ڈالے دوسرے ہاتھ سے وہ سر سے پانی جھٹکتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''اسائنمنٹ؟'' اس حیران آواز پر اس کے ہاتھ کی حرکت اک دم رک سی گئی اور بخش نے اس کی حیرت کو سوالیہ انداز سے دیکھا اور کہا۔

''جی۔ اسائنمنٹ۔''

''یہ اسائنمنٹ نہیں ہے۔''

تو؟ تو کیا ہے؟''

''یہ۔ ناول۔ ہے۔'' اس نے کاغذات کے پلندے پر انگلی سے ٹھونگ بجا کر کہا تھا۔

''واٹ؟ ناول۔'' جھٹکا لگنا چاہیے تھا اور وہ لگا بھی تھا۔

''جی۔ ناول۔''

''آئی ایم آ رائٹر۔'' اس نے فخر سے گردن تان کر چمکتی آنکھوں کے ساتھ فخریہ لہجے میں ہی کہا تھا اور وہ حیران اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک خیرہ کن تھی۔ اس چمک کے ہاتھوں بخش جکڑا گیا تھا۔ پکڑا گیا تھا اور وہ منظر جیسے اسٹل ہو گیا تھا۔

ٹھہر گیا تھا پھر آہستہ آہستہ اس منظر کے رنگ کھونے لگے مدہم پڑنے لگے۔ کسی کی آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ اور وہ منظر کسی پانی میں ٹپکنے والے سیاہی کے قطرے کی طرح تحلیل ہوتا چلا گیا اور اب وہاں اندھیرا تھا۔ سیاہ گھور اندھیرا خاموشی اک بار پھر سے راج کرنے چلی آئی تھی۔ وہ بھی پوری شان اور کروفر سے۔

☆☆☆

اس نے دیکھا کہ وہ اک آبنوسی دروازہ تھا۔ دیوہیکل۔ بڑے بھاری پٹوں والا دروازہ؟ مدہم غبار کی مانند پھیلی ہوئی زرد روشنیوں میں ڈوبا ہوا آبنوسی دروازہ۔ وہ روز بلاناغہ ہر دن اس در تک آیا کرتی تھی۔ وہ آج بھی آئی تھی کہ اس کے سوا چارہ کوئی اور نہ تھا' وہ سیم زدہ تھی۔ وہ بے بس تھی۔ لاچار تھی اور اسی فریب کے ہاتھوں مگر ہر روز جیتی تھی تو مرتی بھی تھی وہاں خاموشی بکل مار کر سوئی پڑی تھی۔ اس کے پیروں کے چاپ نے خاموشی کو جگا ڈالا۔ خاموشی نے اک نظر اس وجود پر ڈالی' اک آہ جیسی سانس ابھری اور پھر کافور کی مانند فضا میں تحلیل ہوتی گئی کہ وہاں اب اس کے پیروں کی چاپ واضح طور پر ابھرنے لگی تھی۔ وہ اس آبنوسی، دیوہیکل دروازے کے سامنے آکر رک سی گئی اور اسے دیکھتے ہی دروازہ کھلتا چلا گیا یوں جیسے اس کا وجود اسم تھا۔ جو پڑھ کر پھونکا گیا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ دروازہ کے پار اک منظر جوان تھا۔ اس نے تکلیف سے اس منظر کو دیکھنا اور چاہا کہ پلٹ جائے مگر...... گر پلٹنا اتنا ہی آسان ہوتا تو یہ کب کا ہو چکا تھا اس نے تکلیف کو دباتے ہوئے چوکھٹ پار قدم رکھا اور اس نے دیکھا کہ......

''وہ اک بارش میں بھیگتی لڑکی تھی۔''

☆☆☆

اس بارش میں بھیگتی لڑکی نے سامنے کھڑے شخص کی حیران آنکھوں میں جھانکا اور مسکرا کر بولی۔

''یس آئی ایم آ رائٹر۔'' یوں جیسے اسے باور کرایا گیا تھا کہ وہ غلط نہ کہتی تھی۔ بخش نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ کچھ کہنا چاہا اور پھر سمجھ میں نہ آنے پر اس نے حیرانی سے سر جھٹکا تھا۔

''رائٹر۔'' وہ ابھی تک بے یقین تھا۔

اور اس نے کندھے اچکائے ''جیسے کہتی ہو۔ ماننا ہے تو مانو نہیں تو نہ سہی۔

اور پھر اک مسکراہٹ اچھال کر پلٹ گئی تھی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ہی مسکراہٹ رائٹر صاحبہ کے ہونٹوں سے جدا نہ ہوتی تھی لکھاری جانتی تھی کہ روزانہ صبح کے وقت۔ وہ اس کے پاس سے کسی گھوڑے کی مانند دوڑتا ہوا گزر جایا کرتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ پہلی دفعہ وہاں دیکھ کر اس کے قدم کیسے سست پڑے تھے اور یہ بھی اسے معلوم تھا کہ وہ دوسرے دن بھی اسے وہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ جہاں کوئی بھی کسی بھی لڑکی کو دیکھ کر حیران ہی ہو سکتا تھا۔ اسے۔ یعنی رائٹر صاحبہ یعنی کہ زہرا امتیاز کو اس کی باقاعدگی حیران کرتی تھی۔ ٹھیک سات بج کر پندرہ منٹس پر روزانہ وہ اس کے پاس سے دوڑتے ہوئے گزرتا تھا اور اس کے گزر جانے کے بعد وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے ہر روز ہی خود کو حیران ہونے سے باز نہ رکھ پاتی تھی۔ یا میرے خدا۔۔۔ ایسی باقاعدگی۔۔۔ ایسا توازن۔ وہ انسان تھا کہ ربوٹ۔۔۔ دوڑنے والا ربوٹ جو بکنٹ کسی اعلیٰ عربی نسل کے گھوڑے کی مانند دوڑتا تھا۔ نہ اک سکینڈ زیادہ۔ نہ ایک سیکنڈ کم۔ روز سوا سات پر۔

''اف۔۔۔'' اسے جھرجھری آئی ان دنوں اک ناول کی کہانی نے اسے اتنا تنگ کر رکھا تھا کہ لکھے بنا چارہ ہی نہ تھا۔ کہانی خود منہ بول کر اسے کہتی تھی مجھے لکھو۔ مجھے لکھو اور لکھنے کے لیے وہ موزوں ترین جگہ تھی۔

سینری بھی تھی اور خاموشی بھی۔ ارتکاز ٹوٹنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی سو وہ لکھنے گئی۔ موڈ اچھا تھا تو لکھنے میں روانی بھی آ گئی تھی، لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا ارتکاز روز صبح سوا سات پر ٹوٹ جایا کرے گا۔ اس کا قلم رک جایا کرے گا اور وہ حیرانی سے سر اٹھا کر اس دروازے والے ربوٹ کی پشت کو تکا کرے گی تو ربوٹ بولتا بھی تھا اور مدد بھی کرتا ہے۔ فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ مسکراہٹ اب بھی لبوں سے چپکی پڑی تھی۔

''آئیے آئیے۔۔۔ آئیے محترمہ زہرا امتیاز۔ دی رائٹر صاحبہ۔ آئیے تشریف لائیے۔ تو یاد آ گیا

آپ کو کہ آپ کا ایک گھر بھی ہے اور گھر میں ایک عدد بھائی بھی ہے اور اس الو کے پٹھے نے ناشتا بھی کرنا ہوتا ہے اور ناشتا کر کے آفس جانا مرنا بھی ہوتا ہے۔" اس استقبال پر اس کے پھیلے ہونٹ یک دم سکڑے۔ دو بھنوؤں کے درمیان بل فوراً ہی نمودار ہوئے۔ آنکھوں میں چمک کی جگہ غصے سے شعلے دکھائی دینے لگے اور اس نے شعلہ بار نگاہوں سے ہی بھائی کو گھورا تھا۔

"نوکرانی نہیں ہوں میں تمہاری۔۔۔ میں جب یہاں نہیں ہوتی تب بھی تو تم ناشتا بناتے ہونا۔ ابھی بھی بنالوگے تو ہاتھ نہیں ٹوٹنے گے تمہارے۔۔۔" وہ کون سا کم تھی تڑخ کر جواب دیا گیا تھا۔

"ابھی۔۔۔ ابھی کال کرتا ہوں اماں کو۔ اس نکمی پھوہڑ اولاد کو چھوڑا ہوا ہے میرے پاس کہ بھائی کا خیال رکھے گی۔ یہ خیال رکھ رہی ہے میرا۔۔۔ ابھی بتاتا ہوں۔" وہ سیل فون نکالتے ہوئے بولا تھا اور وہ کان سے مکھی اڑانے والے انداز میں اندر چلی گئی تھی۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی کہ بدر کبھی بھی اماں کو کال نہیں کرے گا اور اتنا تو بدر کو بھی معلوم تھا کہ زہرا ہر حال میں ناشتا بنا کر دے گی اور اب آپ سوچتے ہوں گے تو پھر یہ لڑائی لڑائی تو لازم و ملزوم تھی ان دونوں کے بیچ کہ اوپر تلے کی اولادیں تھیں۔ پیار جتنا تھا اس سے کہیں زیادہ لڑائی تھی۔ اس کے بنا ان کا کھانا ہضم ہوتا نہ دن گزرتا تھا۔

بدر حساس فوجی ادارے کا ملازم تھا۔ زہرا اکثر ویک اینڈز اور چھٹیوں میں اسلام آباد سے اس کے پاس آجایا کرتی تھی کہ اماں کا آرڈر تھا اکلوتے بھائی کا خیال رکھنا ہے۔ اس کے لیے کھانا بنا کر فریز کر آؤ۔ اس کے کپڑے پریس کر کے رکھ آؤ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ وہ الگ بات وہ خیال تو جو رکھتی سو رکھتی۔ لڑائی زیادہ ہوا کرتی تھی ابھی بھی وہ چیخ کر کے باہر نکلی اور تیز تیز ہاتھ چلاتے ہوئے اس کے لیے ناشتا بنانے لگی تھی۔ بدر کو واقعی ہی میں دیر ہو گئی تھی آج۔

☆☆☆

بارش میں بھیگنے کا نتیجہ فلو کی صورت میں نکلا تھا۔ سو وہ اگلے کئی دن چاہ کر بھی اپنی مخصوص جگہ پر جا نہیں پائی تھی اور نہ ہی ناول مکمل کر سکی تھی۔ ایک تو سردیاں خوش آمدید کہنے کے بعد گلے ہی آن لپٹی تھیں اور دوسرا اس کی بہتی ناک۔ ان دونوں چیزوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ گھر میں ہی قید رہے اور گھر میں رہنے کا مطلب تھا کہ بدر سے لڑائی۔ نا۔ ناول لکھنے کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اسلام آباد کی اک یونیورسٹی میں ایم۔ فل کی طالبہ تھی اور بدر نے حال ہی میں گریجویٹ کیا تھا۔ "اوپن ہاؤس" میں اپروچ کرنے والی اک کمپنی کے ذریعہ اس کی جاب لگ چکی تھی، مگر یہ کہ جاب ریموٹ ایریا میں تھی سو اماں کو اکلوتے لاڈلے بیٹے کی بے حد پرواہ رہتی تھی تو وہ زہرا کو اس کے پاس بھیج دیا کرتی تھیں۔ اکثر پوری فیملی ہی وہاں آکر رہا کرتی تھی زہرا کے ابو کی جاب کی وجہ سے وہ مستقل وہاں شفٹ نہ ہو سکتے تھے اور دوسری وجہ زہرا کی تعلیم بھی تھی سو زہرا کو یہ قربانی دینی پڑتی تھی۔

طبیعت کچھ بحال ہو چکی تھی اور سورج نے بھی اتنے روز بعد اپنا منہ دکھلا دیا تھا تو وہ اپنا مسودہ لے کر پھر سے اس مخصوص جگہ پر آن بیٹھی تھی اور جیسے ہی سوا سات ہوئے تو اس نے قلم روک کر اس سمت دیکھنا شروع کر دیا جس سمت سے وہ دوڑنے والا روبوٹ آیا کرتا تھا۔ پندرہ سیکنڈ سے سوئی ذرا سی آگے ہوئی اور وہ حاضر تھا۔

"مائے گاڈ۔۔۔" زہرا آج بھی حیران ہوئی تھی۔ وہ اسے سامنے دیکھ کر یک دم رک گیا تھا۔ وہ اس کے رکنے پر مسکرائی۔ بخش چند لمحے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے سر جھکائے گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور پھر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اس تک آیا تھا۔ زہرا کے لبوں پر بڑی خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔

"میں سمجھا آپ کوئی چڑیل تھیں یا پھر شاید کوئی پری شری۔ جو اس دن مجھے ملی اور پھر غائب ہو گئی۔"

وہ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے مسکرا کر بولا تھا اس نے گردن کو پیچھے گرا کر کھل کر قہقہہ لگایا تھا اور پھر سانس بحال کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ہاں! میں اک عدد پری ہوں۔ چڑیل ہوں گے آپ خود اور ہاں میں غائب ہو گئی تھی۔ آج پھر حاضری لگانے آئی ہوں۔" بڑا ہی شرارت بھرا انداز تھا۔ بخش جی بھر کر محظوظ ہوا تھا۔

"تو پھر اس پاورلیس (کمزور) پری کو آج بھی مدد چاہیے کیا؟ کہ جس میں اتنی بھی پاور نہیں کہ وہ اپنے ناول کو بارش سے ہی بچا لیتی۔ کوئی جادو منتر پڑھ کر۔"

"آ۔ آہم۔" زہرا نے گلا کھنکارا اور قمیص کے دامن کو برابر کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"وہ کیا ہے کہ میری ساری طاقت جن نے قبضے میں کر رکھی ہیں اگر آپ اس سلسلے میں کوئی مدد کرنا چاہیں تو "یو آر ویل کم" اور اب کی بار بخش نے کھل کر قہقہہ لگایا تھا اور پھر دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"ایروا سپیس انجینئر خدا بخش۔"

"خواتین اور شعاع کی لکھاری زہرا امتیاز۔" گردن اکڑا کہا گیا اوہ۔ میرے خدا۔۔۔ بخش اک بار پھر سے ہنسا تھا اس کے تعارف سے زیادہ اس کے گردن اکڑانے پر۔

"اولڈ فیشن نیم" (قدیم نام) زہرا نے ناک چڑھا کر اس کے نام پر تبصرہ کیا۔

"بٹ آئی لو اٹ" (لیکن مجھے اس سے پیار ہے) بخش کے کہنے پر اس نے "اوہ" کے انداز میں اسے دیکھا۔

"نام کا بہت خوب صورت ہے اور یہ مجھے بے حد فیسی نیٹ (مسحور) کرتا ہے۔ خدا بخش۔"

"یس۔ خدا بخش" زہرا نے اس کے کہنے پر تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔

"ویل مسٹر بخش! میں نے آپ کے پورے دس منٹس لے لیے۔ سو۔۔۔" اور اس سو کے بعد اس نے ہاتھ پھیلا کر بخش کے دوڑنے والے ٹریک کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ مسکرایا اور پھر اسی ٹریک کی جانب دوڑ گیا تھا۔ زہرا گردن اٹھا کر اسے جاتا دیکھتی رہی وہاں تک کہ جب تک وہ نظر آتا رہا۔ اس کے دوڑنے سے ہلکی سی مٹی اڑتی تھی اور وہ اڑتی خاک یہ بتلاتی تھی کہ ابھی ابھی یہاں سے کوئی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑتا ہوا گزرا ہے۔

اور پھر۔۔۔ یک دم۔۔۔ اچانک۔۔۔ خاک بڑھتی گئی۔ بڑھتی ہی چلی گئی غبار پھیلتا چلا گیا اتنا کہ کوئی بھی شے دکھائی نہ دیتی تھی۔ سو جھائی نہ دیتی تھی وہاں اب کچھ نہ تھا۔ نہ دوڑتا ہوا انجینئر خدا بخش اور نہ منہ اٹھا کر اس کی پشت کو تکتی لکھاری زہرا امتیاز۔ وہاں بس مٹی تھی ہر سو۔ ہر جانب۔ ہر طرف غبار کی مانند پھیلی ہوئی مٹی اور پھر ٹھک سے زوردار آواز سے دروازہ بند ہوا تھا۔ پٹوں کے بند ہونے کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی اور پھر معدوم ہو گئی۔ وہاں اب اندھیرا تھا۔ سیاہ گھور اندھیرا اور دوسری جو چیز وہاں موجود تھی وہ خاموشی تھی بڑی شان سے کسی ملکہ کے سے پرغرور انداز میں اپنے سنگھاسن پر بیٹھی خموشی۔

☆☆☆

اک اور رات۔ ہجر کے موسم۔ فراق کے رات کی ایک اور رات۔ اک اور رات کا سفر۔ اسی پر فریب و دل کش وادی میں کہ جس کا نام "ماضی" تھا۔ ماضی کہ جسے وقت اپنی تہوں کے نیچے لا کر مٹا دینا چاہتا تھا اور وہ۔۔۔ وہ ایسا ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ کیسے کیسے۔۔۔ ایسا ہونے دیتا کہ وہ "سیم زدہ" تھا محبت اسے سیم زدہ کر چکی تھی۔ تو ماضی اسے پکارتا اور اس کی پکار اسے کوڑے مارتی تھی۔ ضربیں لگاتی تھی اور وہ خود کو مجبور پاتا کہ وقت کی رفتار کے الٹ چلے اور وہاں پہنچ جائے کہ جہاں "خوش نما رنگ" تھے۔ سہانا موسم تھا اور دل کش عروج حاصل تھا۔ تو اس نے دیکھا کہ اک نوجوان ڈھلوانی سے رستے پر بھاگتا ہوا واپس آرہا ہے۔

☆☆☆

وہ جب واپس آیا تو وہ وہاں موجود نہ تھی۔ وہ

اس کے واپس آنے سے پہلے وہاں سے جاچکی تھی۔ بخش کو تھوڑی مایوسی ہوئی اور وہ اپنے اس طرح مایوس ہونے سے ابھی انجان تھا اور پھر جیسے یہ اک معمول بن گیا۔ وہ سوا سات پر دوڑتا ہوا وہاں پہنچتا۔ وہ قلم روک کر، سر اٹھا کر اسے دیکھتی۔ اک جان دار سی مسکراہٹ اس کے نام کرتی۔ ہاتھ ہلا کر ہیلو کہتی اور پھر سے سر گرا کر لکھنے کا شغل جاری رکھتی۔ وہ اس کی مسکراہٹ کا جواب جان دار سی مسکراہٹ کے ساتھ دیتا۔ اس کے ہیلو کو سر کے خم کے ساتھ قبول کرتا اور پھر دوڑتا ہوا اس کے پاس سے گزر جاتا اور پھر روز واپسی پہ اس کا دل چاہتا وہ اسی پتھر پر، اسی طرح سے بیٹھی ہو۔ وہیں موجود ہو اور اسی طرح سے لکھ رہی ہو۔ اسے دیکھے تو سر اٹھائے جو سر اٹھائے تو پھر مسکرائے اور گر مسکرائے تو اور پھر وہ سر جھٹک دیتا۔ خواہ مخواہ میں ہی۔ ایویں ہی دل عجب عجب سی تمنائیں کرتا تھا اور انجینئر بخش نہیں جانتا تھا کہ دل ایسی تمنائیں کیوں کرتا تھا یا پھر کیوں کرتا ہے؟ وہ خوب صورت تو نہ تھی، چلیں یوں کہہ لیں وہ اتنی خوب صورت نہ تھی۔ عام سی شکل کہ جیسی بہت سی شکلیں ہوا کرتی ہیں۔ مناسب سا قد۔ مناسب سی رنگت اور مناسب سا ہی چہرہ تو پھر کیا چیز تھی جو بخش کو کھینچتی تھی اور اسے معلوم بھی نہ پڑتا تھا کہ وہ اک عام سی شکل کی جانب کھنچتا ہے اور پھر کھنچتا ہی چلا جاتا ہے۔

وہ روز گھر سے نکلنے سے پہلے یہ تصور کرکے مسکراتا ہے کہ آج لکھاری زہرا ممتاز اسے دیکھے گی اور مسکرا کر ہاتھ ہلا کر ہیلو کہے گی۔ وہ گدھا تو یہ بھی نہیں جانتا کہ روز مسکرانے کی وجہ یہ نہیں کہ لکھاری زہرا ممتاز اسے دیکھے گی۔ روز مسکرانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ لکھاری زہرا ممتاز کو دیکھے گا اور اندر تک خوشی سے بھر جائے گا "چغد نہ ہو تو۔۔۔" خیر۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور شاید اک ماہ تک چلتا رہا اور بالآخر لکھاری زہرا ممتاز کا ناول ختم ہوا۔ اس نے بخش کے آنے سے پہلے اس نے اختتامی لکیر کھینچی تھی اور پھر افسردہ سے انداز میں ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہوئی تھی۔

آج اس نے جب بخش کو دیکھا تو اک اداسی بھری۔ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ آج جب ہیلو بولا تو اس کا ہاتھ ڈھیلا سا تھا اور انداز مرا ہوا۔ بخش کو اک دم یہ اداسی محسوس ہوئی تھی محسوس کیا ہوئی۔ چبھی تھی۔ وہ آگے نہ بڑھ سکا اور اس تک آیا۔

"کیا ہوا؟"

"ٹھنگ!" (کچھ نہیں)

"نہیں! کچھ تو ہے۔" اور اس نے سر اٹھا کر بخش کو دیکھا اور دیکھتی رہی اور پھر بولی

"کچھ نہیں۔۔۔ بہت کچھ ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" بخش نے کندھے اچکا کر پوچھا۔

"ناول کا اینڈ ٹریجک (اختتام افسوس ناک) ہے۔"

"ہیں۔۔۔" بخش کا منہ کھل گیا۔

"تو اس میں اداس ہونے والی کیا بات ہے۔"

وہ اسی کھلے منہ کے ساتھ پوچھتا تھا۔

"ہے نا! آپ نہیں سمجھیں گے۔"

"آپ سمجھائیں تو سہی۔۔۔" بخش مصر ہوا اور غلط مصر ہوا۔

"سیریس" اس نے شک بھری نظروں سے انجینئر بخش کو دیکھا۔

"ڈیم سیریس۔" بخش کے کہنے کی دیر تھی۔ بس۔ وہ اپنا مسودہ فولڈر میں سیٹ کرتے ہوئے اٹھی۔ پین کو اوپر کی جیب میں ڈالا۔ فولڈر کو سینے سے لگایا اور بخش کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہوا یہ تھا کہ۔۔۔ اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں" بالکل اسی کے مصداق۔ زہرا ممتاز کیا چاہے۔ سامع ...... جسے وہ اپنی کہانی سنا سکے اور پھر اس کی رائے لے سکے اور رائے لینے کے بعد دو تین "متبادل" اختتام اس کے سامنے رکھ سکے اور پھر یہ پوچھ سکے کہ کون سا اختتام فٹ رہے گا اور بس اسی پہ بس نہ کرے بار بار پوچھ کر اگلے کو ہلکان کردے کہ آئیڈیا اچھا ہے نا؟ پلاٹ مضبوط ہے نا؟ کہانی جان دار ہے نا اور مزید یہ کہ ہیرو خواتین کو پھڑکا سکتا ہے نا؟

اور اگلے بندے کی لاکھ تسلیوں کے باوجود زہرا ممتاز کو تسلی آکے نہ دے۔ وہ "سامع" کی تعریف سے غیر مطمئن دکھائی دے اور تنقید پہ خواہ مخواہ کے جواز گھڑ گھڑ رائے اور اس کا سامع اکثر "ارسلان" ہوا کرتا تھا۔ اس کا دوست جمع کزن۔ تو بخش جب مصر ہوا تو غلط مصر ہوا اور یہ کس قدر غلط ہوا اس کا اندازہ اسے تب ہوا تھا جب وہ اس روز گھر کسی گھوڑے کی مانند بھاگتا ہوا واپس نہ آیا تھا وہ لکھاری زہرا ممتاز کا پورے ایک سو پچاس صفحات کا ناول سنتے ہوئے واپس آیا تھا اور بس اسی پر بس نہ ہوا۔ زہرا نے بخش سے اس کا نمبر بھی لے لیا تھا اور کالونی کے پارک میں شام کو ملنے کا وعدہ بھی۔ نہ۔ نہ۔ ایسی ویسی ملاقات کے لیے نہیں۔۔۔ اسے باقی ماندہ رہ جانے والا ناول بھی بخش کو سنانا تھا اور پھر اس کی رائے بھی جاننی تھی۔ تو بخش جب مصر ہوا تو بے حد غلط مصر ہوا تھا۔

☆☆☆

صبح اس "ناول" کو سننے کی بے زاری کے باوجود اسے سارا دن "شام" کا انتظار رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ آج کی "شام" کا انتظار کیوں کرتا تھا اور بے صبری کے ساتھ کرتا تھا تو جب افق نے سورج غروب ہونے کی اطلاع پہنچائی اور جب شفق نے پھوٹ کر اس اطلاع پر مہر ثبت کی تو وہ گھر سے نکل پڑا جب پارک پہنچا تو تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھی تو ثابت ہوا کہ وہ زیادہ "بے صبری" تھی لیکن بخش نہ جانتا تھا کہ اسے "بے صبری" کس بات کی تھی بالکل اسی طرح سے کہ جس طرح سے وہ یہ نہ جانتا تھا کہ "اسے پارک آنے کی جلدی کیوں تھی"

"ہائے۔"

"ہیلو۔"

"تو شروع کریں؟"

"آ۔۔۔" بخش کا منہ کھل سا گیا تھا۔ وہ چہرے پر معصومیت سجائے، بڑے ہی جوشیلے انداز میں پوچھتی تھی اور بخش کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے؟ آیا وہ پھر سے وہ ہی بورنگ۔ کہانی سنے جس کے سر کی سمجھ آئی تھی نہ پیر کی یا پھر وہ منہ بھر کر "نا" کہہ دے اور زہرا کے معصومیت بھرے جوش پر ٹھنڈا، یخ پانی ڈال دے۔

"میں سناؤں بخش؟" بے تابی ذرا اور بڑھی۔ بخش نے ہلکے سے گلے کو کھنکارا۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا۔ اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر اس کے ہاتھوں میں موجود صفحات کو اور ایک بار پھر سے اس نے اپنی سمجھ کو ختم پایا۔ ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے وہ بھی تب کہ جب سامنے اک لڑکی ہو اور معصومیت بھری نظروں سے آپ کو تکتی ہو۔ اس نے بڑی ہی مسکینیت بھری مسکراہٹ سے زہرا کو دیکھا اور اس سے بھی زیادہ مسکینیت سے اس کے ہاتھوں میں موجود صفحات کو دیکھا تھا۔

"برے پھنسے" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"کیا۔ کہا؟" زہرا انجان سی پوچھتی تھی۔

"وہ۔ میں۔ یہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے آرام بڑے پیار سے نرمی سی۔ شگفتگی سے زہرا کے ہاتھ سے صفحات نکالے تھے۔

"میں انہیں ساتھ لے جاتا ہوں۔ پڑھ کر تمہیں بتادوں گا۔" تو اک عدد حل۔ اس کی عقل کل نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر۔ ذہن کے نہاں خانوں سے کھرچ کر نکال ہی لیا تھا۔

"آ۔۔۔" زہرا اک دم چونکی۔ یوں جیسے یہ غیر متوقع تھا۔

"چلو۔ ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے ذرا ٹھنڈے سے انداز میں کہا تھا اور بخش نے بے اختیار شکر کا کلمہ پڑھا اور بار بار پڑھا۔ ورنہ کون سنتا وہ الف لیلیٰ کی داستان۔

"لیٹس واک" بخش نے کہا تھا اور وہ بخش کے کہنے پر مسکرائی اور اس کے قدموں کے ساتھ قدم رکھتے ہوئے سبزہ زار پر چلنے لگی۔ نرم نرم گھاس ان کے پیروں کے بوجھ سے دبتی چلی جاتی تھی فضا ان کے قہقہوں کی گواہ تھی اور سرد موسم میں ہی بہار کا اعلان کردیا گیا کیونکہ گل وہ کھل رہا تھا کہ جس کا نام ہے

محبت رات انجانی سی، دل فریب، بے حد بھلی سی خوشبو تھی جو فضا میں گھلتی چلی جارہی تھی زہرا امتاز اور خدا بخش نہیں جانتے تھے کہ وہ "مشک" تھی۔ "مشک خاص" وہاں خوشبو اپنا بہترین رقص پیش کرتی تھی اور اس نے چاہا کہ وہ آج بھی اسی خوشبو کو محسوس کر سکے۔ اس کی تازگی کو اپنے اندر اتار سکے۔ اپنے روم روم کو مہکا سکے۔ مگر یہ کہ وہ ناکام رہا تھا۔ وہ بالکل ہی ناکام رہا تھا۔ یہ آج تھا کہ جہاں کوئی زہرا امتاز تھی اور نہ ہی کوئی خوشبو اور بھلا خوشبو کا "سیم زدہ" وجودوں میں کیا کام۔

☆☆☆

معلوم نہیں پیر تھکتے کیوں نہ تھے۔ دل اکتاتا کیوں نہ تھا۔ جی بھر کیوں نہ جاتا تھا۔ ہر رات کا اک بے معنی سا سفر۔ لاحاصل سفر کہ جسے اب لاحاصل ہی رہنا تھا تو پھر یہ اذیت کیوں؟ وہ خود سے سوال کرتی، لڑتی خود کو باز رکھنے کی نصیحتیں گھول گھول کر پلاتی اپنے ہی منہ پر صبر کے طمانچے مارتی، مگر یہ کہ...... یہ برداشت سے زیادہ تھا گرافراق، قسمت تھا ہجر نصیب تھا تو کیا فریب کی دنیا سے چند ساعتیں چند خوش گوار ساعتیں بھی چرائی نہ جاسکتی تھیں۔ نہیں وہ خود پر یہ پابندی نہیں لگاسکتی تھی اور ہاں وہ خود کو باز نہ رکھ سکتی اور ہاں کہ صبر کے طمانچے کھانے سے اس کا چہرہ انکاری تھا۔ وہ آبنوی دروازہ، ہر رات اسے پکارتا تھا اور کہتا تھا زہرا امتاز آؤ اور مجھے کھولو اور دیکھو کہ وقت کے تہ تلے گرد کے انبار میں۔ ماضی کے دھندلکوں میں تمہارے لیے میں نے کیا چھپا رکھا ہے۔ اے غم کی تفسیر دکھنے والی آ اور دیکھو میں نے تمہارے لیے کیا بچا رکھا ہے۔ کیا؟ تو اس نے دیکھا کہ وہ دو وجود ایک اپارٹمنٹ کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے سامنے کھڑے تھے۔

☆☆☆

بخش اسے اپارٹمنٹ تک چھوڑنے آیا تھا
"تو کب تک پڑھ کر واپس کردو گے؟"
"آ ہم۔۔۔" بخش نے اس کے پوچھنے پر گلا کھنکارا اور کھسیانے سے انداز میں سر کھجایا تھا۔ اس کے چہرے پر اک مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ زہرا کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔

"زہرا...... دیکھو۔" اتنا کہہ کر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور زہرا کو دیکھا۔ "دیکھو میں اسے پڑھنے والا نہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے مسودہ اس کے آگے کرتے ہوئے بولا تھا۔

"واٹ؟" وہ لاؤڈ ہوئی تھی اور اب آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے کچا کھا جائے گی۔

"اتنا لحاظ کافی نہیں تھا کہ صبح — پورا ایک میل۔ میں یہ سنتا آیا تھا وہ بھی ماتھے پر بنا کوئی شکن ہے۔ تمہیں ٹوکے بغیر۔" بخش نے مدافعتی انداز اپنایا زہرا نے تندی سے اس کے ہاتھ سے صفحات کھینچے تھے۔

"مگر یہ نہیں سننا تھا تو پھر پارک آنے کا وعدہ کیوں کیا تھا۔" سرخ سرخ ہوتے ہوئے پوچھا گیا۔
"کیا ہم دوست نہیں ہیں؟"
"نہیں۔" وہ منہ پھاڑ کر بولی تھی۔
"واٹ۔" اور اب لاؤڈ ہونے کی باری بخش کی تھی۔

"میں تمہارے کاغذات جیکٹ میں چھپا کر بارش سے بچا کر لایا تھا۔" آواز میں صدماتی تیزی تھی۔
"سو واٹ! وہ کوئی بھی ہوتا' کرتا جس سے میں مدد مانگتی۔" وہاں بے نیازی تھی اور حد سے گزری تھی۔
"میں روز اپنے پورے دو سیکنڈ ضائع کر کے تمہارے ہیلو کا جواب دیتا ہوں۔"
"تو میں بھی تو روز پورے ڈیڑھ سیکنڈ قلم روک کر آپ کے ہیلو کہنے کا انتظار کرتی ہوں۔"
"تو ایسا کس ریلیشن میں ہوا ہے مادام زہرا ممتاز؟" وہ اب کے دانت چبا چبا کر بولا تھا۔
"آف کورس۔" اس نے دانت نکال کر بخش کو دیکھا اور پھر کہا۔
"شناسائی میں۔" اور بتیسی اور باہر نکال لی تھی۔

"تو آپ شناسائی۔ شناسائی میں آدھا پونا ناول سنا دیا کرتی ہیں کیا؟" اسے اور تپ چڑھی تھی۔
"نہیں۔ میں تو پارک میں اک آدھ گھنٹہ واک بھی کرلیا کرتی ہوں۔" وہ دل جلا دینے والے لہجے میں بولی تھی۔

"یو۔۔۔" وہ دانت پیس کر۔ انگلی اٹھا کر یوں بولا جیسے دانتوں کے ساتھ اسے بھی پیس دے گا اور۔۔۔ وہ کھل کر ہنس پڑی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی تھی۔ کیسی بے نیاز لاپرواجان داری ہنسی تھی نا۔ بخش ٹھٹک کر رک سا گیا تھا۔ اس نے ہنستے ہنستے کاغذات بخش کے بازو پر مارے اور سر جھٹکا۔ جیسے کہتی ہو۔ تمہارا ابھی جواب نہیں اور وہ پلک جھپکتے بنا دیکھتا رہا۔
"فرینڈز؟" اس کو لڑتے دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا تھا۔

"آف کورس" اور ذرا سا توقف کیا شرارت بھری، مسکراہٹ بھری آنکھوں کے ساتھ ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ اب کھڑی ہوئی تھی جیسے اب ابھی بھی وہ اسے ستانا چاہتی ہو۔ کہنا چاہتی ہو۔ نہیں شناسائی۔
"فرینڈز" اور پھر اس نے مسکرا کر کہہ ہی دیا تھا۔ اور بخش دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے۔ مسکراتے لبوں کے ساتھ اسے سیڑھیاں چڑھتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

صبح کے سوا سات پہ آ کر رکی اور پھر ذرا سا آگے کو سرکی سیکنڈ کی سوئی اور وہ حاضر تھا۔ وہ اس کے قدموں کی آواز سن سکتی تھی۔ اس نے زانوں پہ دھری کتاب میں نشانی کے طور پہ انگلی رکھی اور سر اٹھا کر اس طرف دیکھنے لگی کہ جس طرف سے اس کو آنا تھا۔ اور جیسے ہی وہ نمودار ہوا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر ہیلو کہا اور وہ سر کے خم سے جواب دیتا دیتا رک گیا۔ آج اس کے ہاتھ میں صفحات نہ تھے۔
"یہ کون سا کتاب پڑھنے کا وقت ہے" وہ وہیں کھڑا اتنی تیز jog (جاگ) کرتے ہوئے بولا تھا۔
"کتاب پڑھنے کا وقت نہیں۔ "موڈ" ہوتا ہے۔" اور اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔
"سارے جہان سے نرالی ہو تم۔ بندہ پوچھے اتنی صبح، سردی میں اٹھ کر تم یہاں کتاب پڑھنے آئی ہو۔"

"نہیں...... نرالی صرف میں ہی تو نہیں۔ آپ بھی تو ہیں آپ بھی تو اتنی صبح، سردی میں اٹھ کر یہاں دوڑ لگانے آئے ہیں۔"
"میں تو خود کو فٹ رکھنے کے لیے نکلتا ہوں۔"
"اپنی اپنی ترجیحات کی بات ہے بخش؟" وہ یوں مسکرا کر بولی جیسے بچے کی بات پہ مسکرایا جاتا ہے۔ بخش ایک لمحے کے لیے رک گیا۔
"ہاں! اپنی اپنی ترجیحات کی بات ہے' آئی گوٹ اٹ" وہ سر ہلاتا ہوا بولا اور ہاتھ ہلا کر آگے کو بڑھ گیا۔ اور وہ زہرا امتاز اس کی پشت کو تب تک دیکھتی رہی کہ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوا تھا۔ اور پھر ایک گہرا سانس بھر کر اس نے پھر سے کتاب کھول لی تھی

☆☆☆

اس نے بڑی نفاست سے ٹرے سیٹ کی۔ گلا کھنکارا اور بدر پہ ایک ترچھی سی نظر ڈالی تھی۔ وہ گود میں چپس سے بھرا باؤل رکھے۔ فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا۔ اور میچ میں قریب قریب غرق تھا۔
"ستیاناس......" زہرا منہ ہی منہ بڑبڑائی تھی "بدر اور اس وقت اٹھ جائے اور اٹھ کر وہ کام کردے جو کہ زہرا اس سے کروانا چاہتی ہے تو یہ اس صدی کا معجزہ نہ ہو جائے۔ زہرا چند لمحے ہونٹ چباتے اسے دیکھتی رہی، نہ صرف دیکھتی رہی بلکہ سوچتی بھی رہی اور پھر ایک عزم سے اس نے ٹرے اٹھائی تھی۔ وہ بدر کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو پھلانگتے ہوئے (دراصل بدر کو دکھلاتے ہوئے) بیرونی دروازے کی جانب بڑھی تھی۔
"اے...... اے تم اس وقت کہاں جارہی ہو؟" بدر چونکا' حیران ہوا۔ پھر حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔
"دیکھ نہیں رہے۔ یہ فرائنڈ رائس دینے جارہی

ہوں۔''ادھر سے کمال بے نیازی سے جواب آیا تھا۔وہ بھی آنکھیں پٹپٹا کر یوں جیسے بدر ایک دم ''گدھا'' تھا۔

''فرائڈ رائس دینے جارہی ہو۔مگر کسے؟......''

''ہے میرا ایک دوست......''اس نے رک رک کر کہا۔

''میرا......دوست؟''بدراور حیران ہوا۔نہ......نہ حیرانی کی وجہ''میرا''نہ تھا۔لفظ''دوست''تھا۔

''یہاں تمہارے کون سے دوست بننے لگے۔آخر تمہیں یہاں گھاس کون ڈالتا ہے؟''منٹ میں بدر کے تاثرات بلکہ لہجہ بھی تمسخرانہ ہوگیا تھا۔زہرا کا منہ تو سرخ ہوا مگر یہ کہ اس وقت بگاڑی نہیں جاسکتی تھی۔

''تو آکر دیکھ لو...... یہاں کون مجھے گھاس ڈالتا ہے۔''وہ سرخ منہ لیے۔تیزی سے بولی تھی اور جھٹ باہر نکل گئی۔''کمینہ......کھوتا......چول انسان......''منہ ہی منہ میں اکلوتے بھائی کو القاب بخشتی وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ جب ہی اپنے پیچھے اسے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔مڑے بنا۔دیکھے بنا وہ جانتی تھی کہ وہ بدر تھا۔بے ساختہ مسکراہٹ چہرے پہ اُمڈ کر آئی تھی اور اس نے دل میں بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''میرا شہزادہ بھائی۔''دراصل اس وقت اسے بخش کے فلیٹ میں جانا عجیب محسوس ہورہا تھا۔گو کہ وہ ایک نسبتاً آزاد خیال خاندان سے تعلق رکھتی تھی مگر پھر بھی اسے اکیلے جانا اچھا نہیں لگا تھا۔

''یہ مت سمجھنا تمہارے خیال سے آیا ہوں۔میں تو بس اس پاگل کو دیکھنے آیا ہوں۔جو تمہیں گھاس ڈالتا ہے۔''وہ شرٹ کے بٹن بند کرتا بولتا ہوا اس کے برابر آیا تھا۔

''لاؤ دو ٹرے......''اور پھر اس کے ہاتھ سے ٹرے لی تھی۔زہرا نے رک کر ٹرے اسے پکڑائی اور پھر ایڑھیاں اٹھا کر بدر کا منہ چوما تھا۔

''جیتے رہو میرے بھائی۔''کیا لاڈ تھا جو کہ اُمڈ اُمڈ کر آرہا تھا۔

''اوں۔ہوں۔کیا کرتی ہو۔''بدر نے ذرا سا جھک کر کندھے سے رگڑ کہ منہ وہاں سے صاف کیا کہ جہاں زہرا نے چوما تھا۔اور جواباً۔

''اخ......''زہرا نے رگڑ کر اپنے ہونٹ صاف کیے تھے۔

''کبھی شکل بھی دھولیا کرو۔گندے۔''وہ ابھی تک پلو سے ہونٹ رگڑ رہی تھی۔

''کبھی شکل بھی دھولیا کرو گندے۔''بدر نے منہ چڑھا کر اس کی نقل اتاری۔''اپنا نہیں پتا کیا۔معلوم نہیں برش بھی کرتی ہو یا نہیں اب دیکھنا یہ گندے گندے دانے نکلیں گے میرے چہرے پہ......''

''کمینے......''زہرا نے تپ کر اس کے کندھے پر ایک دھپ لگائی تھی۔یا کہ ان دونوں کا کچھ نہ کیا جاسکتا تھا۔

''یہ بہن بھائی کا جھگڑا تھا۔ لامحدود۔

☆☆☆

اس نے پہلے وقت دیکھا اور پھر دروازے کو جہاں پر دستک ہورہی تھی سات بج رہے تھے اور اس وقت یہاں اس کا کون تھا جو کہ آتا۔وہ حیران ہوا اور ٹھیک حیران ہوا۔اس کے دروازے پر شاذ ہی دستک ہوا کرتی تھی۔اس کے اٹھنے تک دستک ایک بار پھر ہوئی۔

''آرہا ہوں۔''وہیں سے آواز لگاتا وہ اٹھا تھا۔

''تم......!''اور دروازہ کھولتے ہی زہرا کی شکل دیکھ کر وہ بے یقینی جمع حیرت جمع ذرا سے شاک سے بولا تھا۔اس کا اگلا سوال یقیناً یہ ہی ہوتا تھا۔''تم اس وقت یہاں کیا کرنے آئی ہو۔''مگر یہ کہ بدر نے اپنی شکل اسے دکھادی تھی بمعہ بتیسی کے جو کہ ابھی تک ''32'' کے ہندسے کو چھو نہ سکی تھی۔

''بھائی کا انداز بتلاتا ہے یہ تمہیں کھڑے کھڑے ابھی کہ ابھی پہچاننے سے انکار کردے گا۔''بدر نے جھک کر زہرا کے کان میں دل جلا کر رکھ دینے والی سرگوشی کی۔

''چپ کرو۔''زہرا نے ڈپٹا اور بخش کی طرف دیکھا۔

''میرا بھائی ہے۔بدر۔''اس نے ٹرے بدر کے ہاتھ سے تقریباً چھینی اور بخش کو پکڑاتے ہوئے بولی تھی۔''میں نے فرائڈ رائس بنائے تھے۔آپ کے لیے بھی لائی ہوں۔''

''کھا کر بتایئے گا کہ ضرور یہ رائس تھے بھی یا نہیں۔''بدر نے لقمہ دیا۔زہرا نے اب کہ عملی کارروائی کی اور رکھ کر چھانپڑ اس کے بازو پر مارا تھا اور بخش۔وہ مسکین ذات کبھی حیرت سے ٹرے کو،کبھی بدر کو اور کبھی لکھاری زہرا امتیاز کو دیکھتا تھا۔

''تھینک یو تو بول دیں۔''زہرا اس کے بت بننے پر جھنجلائی۔

''اوہ۔ہاں۔تھینک یو۔تھینک یو۔''وہ ہوش میں آیا۔''آؤ نا۔تم لوگ اندر تو آؤ۔''بدر تو خراماں خراماں چلتا ہوا آگے کو بڑھا تھا،مگر یہ کیا۔اسے یک دم پیچھے کو جھٹکا لگا تھا۔زہرا نے اس کو کالر سے پکڑ کر کھینچا جو تھا۔

''نہیں۔پھر کبھی سہی۔یہ میچ دیکھ رہا تھا۔بے چارہ میرے ساتھ اٹھ کر آگیا۔اب تک تو پرتگال ہار چکا ہوگا۔''اس نے تعزیت کے سے انداز میں کہا۔

''شٹ اپ۔پرتگال نہیں ہار سکتا۔''بدر نے تلملا کر شاؤٹ کیا تھا اور بخش ایک دفعہ پھر سے ہکا بکا۔

''یا میرے خدا......!ان تو یہ ہی رکھا کہ لکھاری لوگ ادیب یار بے حد سنجیدہ بلکہ کچھ حد تک رنجیدہ ٹائپ ہوتے ہیں۔ریزروڈ ہوتے ہیں۔مسکراتے کم اور سوچتے زیادہ ہیں۔نفیس طبع ہوتے ہیں،مگر یہ کیا تھا جو اس کے سامنے کھڑا بلکہ کھڑی تھی۔کیا وہ اک''تماشا''نہ تھا چلو تماشا نہ سہی۔''پٹاخہ''تو ضرور تھا اور کہتی وہ خود کو''لکھاری''تھی وہ بھی گردن اکڑا کر وہ اسی حیرت میں غوطے کھا رہا تھا کہ بدر خوں خاں کرتے ہوئے واپس مڑا تھا۔

''اوئے۔اوئے یار۔کدھر جاتا ہے۔ٹی وی ادھر بھی ہے۔آجا مل کر میچ دیکھتے ہیں۔''بخش نے آگے بڑھ کر اس کو بازو پکڑ کے روکا تھا۔

''نہیں۔وہ ہم چلتے ہیں۔''زہرا کے یوں کہنے پر بدر نے بخش کو دیکھا جو کہ ابھی تک اس کا بازو پکڑے۔اسے روکے کھڑا تھا۔

''اس کو جانا ہے تو جائے۔ہم دونوں میچ دیکھتے ہیں اور یہ فرائڈ رائس کھاتے ہیں۔''بخش نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔لو بدر کو اور کیا چاہیے تھا۔اس نے پھر سے بتیسی نکالی جو کہ ابھی''32''کے ہندسے کو چھو نہ سکی تھی اور زہرا کو منہ چڑھایا۔

''دیکھا نہیں ڈالی نا گھاس۔''

''شٹ اپ۔''اور زہرا تلملا کر تلملا کر جل بھن کر پیر پٹخ کر حلق پھاڑ کر بولی تھی اور بخش نے اک بار پھر سے حیرت سے اسے دیکھا تو کیا وہ اک لکھاری تھی۔

☆☆☆

سیکنڈ کی سوئی صبح 7:15 پر آکر رکی اور ذرا سا آگے بڑھی ہی تھی کہ معمول کی طرح قدموں کے دوڑنے کی آواز آئی تھی۔اس نے کتاب میں انگلی رکھی نہ سر اٹھا کر اس سمت دیکھا بلکہ ردعمل کے طور پر اس نے کتاب اٹھا کر چہرے کے سامنے کرلی تھی بخش لاشعور طور پر اس کے ہیلو کا منتظر تھا اور جب ''ہیلو'' نہ آیا۔وہ رکا۔غور سے اس کتاب کو دیکھا الجھا۔اس رویے کو سمجھنا چاہا مگر......آہ......عورت کو سمجھنا اتنا ہی آسان ہوتا تو دنیا کے آدھے مسئلے حل نہ ہوگئے ہوتے۔

''ہائے۔''وہ قریب آیا اس نے کتاب اور اوپر چڑھالی۔

''زہرا؟''بے نیازی ہنوز قائم تھی۔

''واٹ ہیپنڈ''(کیا ہوا)۔وہ اب بے بس سا پوچھ رہا تھا،مگر وہاں تغافل کا وہ عالم تھا کہ کیا کسی شاعر کی محبوبہ کا ہوگا۔بخش نے اب کے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا اور پھر اک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے کتاب کھینچی تھی۔

''واٹ نان سینس''(کیا بے ہودگی ہے)وہ چونکی اور پھر کمال درجہ نزاکت بھرے غصے سے کندھے

اچکا کر بولی تھی۔ یوں جیسے اسے پہچانتی نہ ہو۔
''واٹ رببش زہرا۔ تمہیں ہوا کیا ہے؟'' اور بخش بے چارہ حیرت بھرے غصے سے پوچھتا تھا۔
''غصہ آرہا ہے نا۔ میرے انجان بننے پر۔'' وہ تیر کی طرح اٹھی اور اٹھ کر کمروں پر ہاتھ رکھے لڑنے مرنے والے انداز میں تڑخ کر بولی تھی۔ بخش حفاظتی اقدام کے طور پر دو قدم پیچھے کو ہٹا۔ کچھ کچھ سمجھ تو آرہا تھا کہ زہرا امتیاز کو ہوا کیا تھا۔
''میں نے کیا کیا ہے؟ جو تم یوں سیخ پا ہو رہی ہو۔''
''میں مر نہ جاؤں اس مسکینیت پر۔'' وہ دو قدم اور آگے بڑھتے ہوئے تندی سے بولی تھی۔
''اس کو جانا ہے تو جائے۔ ہم دونوں میچ دیکھتے ہیں اور یہ فرائڈ رائس کھاتے ہیں۔'' وہ اسے کچا چبا جانا چاہتی تھی۔ یا خدا۔ کچا چبا جانا چاہتی۔
''اوہ۔'' بخش کے ہونٹ ''اوہ'' کے انداز میں سکڑ کر رہ گئے تھے۔ بے اختیار اس نے سر کھجایا تھا۔ کیا کرتا۔ یا میرے خدا۔ اسے تو الفاظ تک ازبر تھے۔
''مذاق تھا۔''
''مذاق؟'' وہ حیرت سے چیخی تھی۔
''یو انسلٹڈ ی'' (تم نے میری توہین کی تھی)
''کم آن زہرا!۔ انسلٹ۔'' اور وہ مسکین حیرت سے تلملایا تھا۔
''شغل تھا این تھنگ ایلس'' (اور ایسا کچھ نہیں) منانے کے سے انداز میں وہ بولا تھا۔
''بدر کے سامنے شغل نہیں۔ انسلٹ ہوتی ہے۔''
''اب مجھے کیا معلوم؟ بدر کے سامنے کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔'' یہ دفاعی جملہ کارگر ثابت ہوتا نظر آرہا تھا۔ ''چلو تم اسے انسلٹ سمجھتی ہو تو ایسی ہی انسلٹ بدر کی میں تمہارے سامنے کردوں گا۔'' بخش نے اسے پچکارا۔
''ریئلی۔'' وہ چہک کر کہا گیا اور اس نے یوں پینترا بدلا تھا کہ کیا گرگٹ رنگ بدلتا ہوگا۔ بخش مسکرائے بنا رہ نہ سکا تھا اور پھر اثبات میں سر ہلایا تھا۔
''پرامس؟'' ناراضی کا فور۔ غصہ جھٹ سے اڑا اور اب وہ۔ وہی تھی بخش کی دوست۔ زہرا امتیاز۔
''کمال چیز ہو تم بھی؟'' ہنس کر اس نے کتاب زہرا کے ہاتھوں میں مارنے والے انداز میں پکڑائی تھی اور پھر وہ اپنی روز دوڑنے کے واسطے آگے کو بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

''آپ ملک سے باہر جاسکتے ہیں کیا؟''
''نہیں۔ مجھے ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ کم از کم پانچ سال۔''
''کیوں؟''
''جاب ہی ایسی ہے بلکہ ادارہ ایسا ہے کہ سیکورٹی ریزن کی بنا پر میں ملک سے باہر نہیں جاسکتا۔''
''صحیح اور جہاں آپ کام کرتے ہیں وہاں بھی سیکورٹی ہائی الرٹ ہوتی ہوگی۔''
''ظاہر ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے۔''
''کوئی ہنکی پھنکی نہیں ہوسکتی۔''
''تمہیں ہو کیا گیا ہے اور تم کیوں اس طرح کے سوالات کررہی ہو؟'' اور اس آنے والے پیغام پہ اس نے دانتوں تلے زبان دبائی تھی۔ اب اسے کیا بتاتی۔
''کیوں پوچھ رہی ہو تم یہ سب؟'' سیل نے بلنک کیا اور اگلا پیغام حاضر تھا۔
''ایویں ہی۔ بس جنرل نالج۔'' اور ساتھ میں سارے دانت نکالے ایموٹیکون۔
''پاگل۔ جنرل نالج کی باتیں نہیں ہیں جو میں تمہیں بتارہا ہوں۔'' اور ساتھ میں ناراض سی شکل تھی۔
''اوکے۔ میں کون سا دشمن ملک کو بتانے جارہی ہوں۔''
''کیا پتا تم کوئی جاسوس ''ایجنٹ ہو؟'' وہ مشکوک ہوا۔
''ہاں! میں اک ایجنٹ اور جاسوس ہوں اور میرا کور ایک رائٹر کا ہے۔ خوش؟'' اور اس پیغام کے بعد اس نے سرخ منہ والی شکل بھیجی تھی۔
''سیریسلی؟'' اس نے آنکھیں پھاڑنے والی

شکل بھیجی۔
''اوہ! مائی گاڈ کال 911''
''سم بڈی پلیز کال 911'' بخش کا اگلا پیغام آیا تھا۔
''911'' پاکستان میں نہیں ہوتی۔ انگلش فلمز دیکھنا بند کردیں اور اپنے ملک کی ایمرجنسی سروس کا نمبر معلوم کریں۔'' زہرا نے پھولا ہوا منہ بھیجا تھا۔
''تو آپ بتادیں ایمرجنسی سروس کا نمبر؟'' وہ ہنس رہا تھا اب۔
''115'' منہ ذرا اور پھول گیا۔
''لو۔ اب تو پکا ہوگیا تم اک جاسوس ہو۔ کیونکہ جاسوس کو سب پتا ہوتا ہے۔'' وہ ابھی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ اگلا پیغام بھی آگیا تھا۔
''تمہیں 6 کے 6 کلمے بھی آتے ہیں نا؟۔ ہے نا؟'' زہرا اس سے کام کی بات کرنا چاہتی تھی اور وہ تھا کہ آئیں بائیں شائیں۔ ادھر ادھر کی ہانک رہا تھا۔
''آپ یوں کریں ابھی کے ابھی انٹیلی جنس کو میرا بائیو ڈیٹا بھیج دیں اور ذرا جلدی کریں کہیں میں فرار نہ ہوجاؤں۔ میں انتظار کررہی ہوں۔ انٹیلی جنس والوں کا۔'' اور اک اور سرخ منہ والا ایموٹیکون بھیجا گیا تھا۔ اس نے ڈھیر سارے ہنسنے والے چہرے بھیجے تھے۔ نتیجتاً زہرا اک آؤٹ کرچکی تھی۔
بخش کے پیغامات آتے رہے، مگر وہ تو غصے میں تھی کیوں جواب دیتی بھلا۔ ''جب تم پیدا ہوئی ہوگی نا۔ تو تب پاکستان میں کریلے کی ساری کی ساری فصل تباہ ہوئی ہوگی۔'' بخش کا آخری پیغام آیا تھا اور وہ اس مثال پر زور سے ہنس دی تھی۔

☆☆☆

''کیا آپ مجھے فیکٹری کا وہ حصہ دکھا سکتے ہیں کہ جہاں کام ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے جہاں جو کچھ بھی آپ ڈیزائن کرتے ہیں۔ وہ تیار ہوتا ہے۔''
''واٹ؟'' بخش چلتے چلتے جھٹکا کھا کر رک گیا تھا۔
''اور میں تمہیں کس ریفرنس سے وہاں لے کر جاؤں گا؟'' وہ اب خاصی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
''کوئی دو نمبری نہیں ہوسکتی کیا؟'' وہ رک رک کر بولی تھی۔
''زہرا امتیاز۔ اب آپ واقعی ہی میں مشکوک ہوتی جارہی ہیں۔'' وہ مشکوک نظروں سے ہی اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔
''بخش پلیز۔ مجھے بس معلومات چاہیے۔''
''کیوں؟'' اور وہ رک سی گئی۔ ٹھہر سی گئی کیونکہ اس ''کیوں'' کے جواب سے وہ اس پر ہنسنے والا تھا۔
''بولو نا اب؟'' اور زہرا نے بے اختیار گلا کھنکار کر صاف کیا تھا۔
''وہ۔ میں ایک نیا ناول لکھنا چاہ رہی تھی تو اس کے لیے معلومات درکار تھیں۔'' وہ اب بخش کو یہ نہیں بتاسکتی تھی کہ دراصل نئے ناول کا ہیرو ''وہ'' تھا اور اسی کی طرح فوجی ادارے میں کام کرتا تھا۔ بخش چند لمحے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتا رہا یوں جیسے یقین کرنا چاہتا ہوں۔ جو کوئی بھی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کیا وہ عقل رکھتا تھا یا نہیں۔
''اچھا تو تم تو تم فیکٹری اس لیے وزٹ کرنا چاہتی ہو کہ تم معلومات حاصل کرسکو اور پھر ان معلومات کو اپنے ناول میں لکھ سکو اور اس طرح تم ان حساس معلومات کو پبلک کردو اور آخر میں کرتے کراتے سرا پکڑتے پکڑاتے قدموں کے نشانات میرے تک آ پہنچیں اور میں دھر لیا جاؤں ان حساس معلومات کو لیک آؤٹ کرنے کے جرم میں۔ تمہیں میں کھوتا نظر آتا ہوں کیا؟'' آخر والا جملہ ذرا تپ کر کہا گیا اور زہرا منہ بنا کر رہ گئی تھی۔
''میں کوئی حساس معلومات تھوڑی حاصل کرنا چاہ رہی ہوں۔ بس میں فیکٹری اینٹرس، ورکنگ پلیس، آفسز اور عملے کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔'' وہ بے حد برا مان کر بولی تھی۔
''تو گوگل کردنا۔''
''اوہ! پلیز۔۔۔ آئی ڈونٹ بلیو آن گوگل۔ آئی جسٹ۔۔۔'' (اوہ! میں گوگل پر یقین نہیں

رکھتی۔ میں صرف۔۔۔)

''اسٹاپ اٹ زہرا۔ بس کردو۔ میرے دماغ کی دہی نہ بناؤ۔'' بخش نے بے زار ہوتے ہوئے اس کی بات کاٹی تھی اور زہرا ممتاز نے بے بس ہوکر پاؤں پٹخا تھا۔

''یہ دنیا والے۔ کبھی بھی اک قلم کار کو نہیں سمجھ سکتے۔ نو۔ نیور۔

کیوں؟ کبھی بھی نہیں...... آخر یہ لوگ فن کو پنپنے کیوں نہیں دیتے تھے۔'' وہ اب دکھی ہوکر سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دھڑکن اتنی تیز کے کانوں میں سنائی دیتی تھی۔ سردی کے باوجود ہر مسام سے پسینہ پھوٹا پڑا تھا۔ شام کے چھ بجے تھے اور وہ علاقہ اندھیرے کی زد میں تھا۔ وہ دور سے ہی گارڈز کو دیکھ سکتی تھی اور وہ جانتی تھی کہ وہاں چاروں طرف گارڈز موجود ہوں گے۔ یہ ایک بے حد خطرے کا کام تھا، مگر۔۔۔ وہ جادو ہی کیا جو سر چڑھ کر نہ بولے۔ اسے بس اندر کا راستہ تلاش کرنا تھا۔ کوئی سیکورٹی لیپس کہیں سے کوئی ٹوٹی دیوار۔ کچھ تو۔ کچھ تو ہوگا ہی۔ نہ۔ نہ۔ وہ اتنی اونچی دیوار پر چڑھنے کا حوصلہ رکھتی نہ مہارت وہ تو بس قسمت آزمانے آئی تھی۔ سیاہ جینز کے اوپر سیاہ ہی ''بدر'' کا اپر پہنے ہوئے تھی تاکہ وہ لڑکا دکھ سکے بال سارے لپیٹ کر اونی ٹوپی کے نیچے کر رکھے تھے اور اس کے اوپر ہڈ گرایا ہوا تھا۔ اگر اس وقت اس کی اپر کی جیبوں کو چیک کیا جاتا تو اس میں سے ایک ٹارچ۔ ایک نوٹ بک۔ پین۔ چیونگم اور ایک عام چھوٹا سا چاقو ملتا۔

زہرا دھیرے دھیرے فیکٹری کی پچھلی جانب سے آگے بڑھ رہی تھی۔ دل بدتمیز دھڑکنے کے سارے ریکارڈ توڑنے پر آیا ہوا تھا۔ اسے سامنے اک بڑا سا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ جس کے اوپر روشنیاں چمک رہی تھیں۔ ایک ہی گارڈ کھڑا نظر آ رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!''

''وہ۔ میں تا رستہ بھول گئی ہوں تو......''

''بی بی تم کو اس وقت نہیں نکلنا چاہیے تھا۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے ہرگز ہرگز اس وقت نہیں نکلنا چاہیے تھا۔'' وہ خود پر غصہ ہوتی نظر آئی۔

''آپ یہاں جاب کرتے ہیں۔'' پھر یک دم خوش مزاجی عروج پر پہنچی۔

''نہیں۔ اتنی سردی میں یہاں جھک مارنے کھڑا ہے۔''

''آ۔۔۔'' زہرا کا منہ کھل گیا تھا۔

''اچھا اچھا۔ کیا آپ جانتے ہیں یہاں کیا بنتا ہے؟'' اور اب کے پٹھان کا منہ کھلا۔

''یہاں کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟ کتنے سیکشنز ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں؟۔''

''بی بی۔ تم ہم کو مشکوک لگتا ہے۔'' پٹھان بندوق پر گرفت سخت کرتے ہوئے انتہائی کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا اور زہرا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس کہیں نیچے ہی گم ہوگیا تھا۔

''نہیں۔ میں تو بس۔۔۔ راستہ۔۔۔ آپ۔ غلط سمجھ۔۔۔ اوہ۔ ہیلو۔۔۔ میری بات تو سنیں۔'' وہ خان کو انٹر کام کی طرف بڑھتا دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھولے تھے اور عین اس ہی وقت گیٹ کھلا تھا۔ وہ دونوں ہی بیک وقت اس طرف متوجہ ہوئے۔ انسانی فطرت۔ ایک جیپ کی ہیڈ لائٹس نے زہرا کی آنکھوں کو اندھا کیا تھا۔ اس نے بے اختیار ہاتھوں کا چھجا بنا کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی شخص ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، مگر کون تھا۔ وہ نہیں جان سکی تھی۔ پٹھان گارڈ فوراً جیپ کی طرف لپکا اور اب نہ جانے کیا کیا اس آفیسر کے کان میں گھول رہا تھا۔ نتیجتاً جیپ کی ہیڈ لائٹس بند ہوئیں۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ جیپ سے اترا اور دھم دھم کرتا اس کے سر پہ آن

پہنچا تھا اور زہرا مارے حیرت کے اور پھر مارے خوف کے اس کے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ بری پھنسی تھی وہ منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

معلوم نہیں میں اکتا کیوں نہیں جاتا۔ دل بھر کیوں نہیں جاتا میرا۔ آخر ماضی میں رکھا ہی کیا ہے جو میں بار بار وہیں جانے پر مجبور ہوتا ہوں۔ تو کیا ماضی ایک آسیب ہے جو مجھ کو آن چمٹا ہے اور کسی طرح سے نہیں جاتا۔ تو کیا میں اس قابل بھی نہیں رہا کہ حال کا سامنا کرسکوں تو کیا میں اس قدر ''سیم زدہ'' ہوچکا ہوں کہ میرے لیے ''ماضی'' ''سانس'' بن چکا ہے۔ جس کے بنا جینے کا زندہ رہنے کا تصور بھی محال ہے۔ وہ آبنوسی دروازہ۔ زرد ملگجی روشنیوں میں ڈوبا آبنوسی دروازہ۔ وہ ہر روز مجھے پکارتا ہے ہر روز بلاتا ہے اور میں سحر زدہ سا چل پڑتا ہوں۔ میں خود کو روک نہیں پاتا۔ میرے قدم بے اختیار ہوجاتے ہیں کہ زندگی میں اگر کچھ بچا ہے۔ کچھ قیمتی ہے تو بس وہی چند ساعتیں۔ چند لمحے۔ وہ خوش گوار سے دن جو ماضی نے میرے لیے اپنی راکھ کی تہہ تلے دبا رکھے ہیں۔ وہ سنہرے سے، تتلیوں سے رنگین لمحے۔ وہ خوشبو سی ساعتیں اور اک صدا میں دیتا در۔

''آؤ خدا بخش۔۔۔ آؤ اور دیکھو کہ یہاں کیا کیا ہے جو تمہارے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ آؤ نا بخش۔۔۔ دیکھو تو سہی۔''

''اور اس نے دیکھا کہ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔''

☆☆☆

تم!۔'' اس نے غصے جمع حیرت سے پوچھا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو اور وہ بھی اس وقت؟''

لفظوں کو چبا کر۔ انگارے اگلتا۔ وہ دو قدم اس کے اور نزدیک ہوکر بولا تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر وہ دو قدم پیچھے کو ہٹی۔

''وہ۔ میں۔ وہ۔'' اور لکھاری زہرا ممتاز کے سارے بہانے' سارے حیلے اور سارے لفظ بھی انجینئر بخش کے اس انداز کے سامنے بھک سے اڑ چکے تھے۔ ''یہ کہاں سے آ گیا؟'' وہ ہاتھ ملتی ٹوٹی سانس جوڑتی۔ دل کی دھکم پیل کو سنبھالتی سوچتی تھی۔

''کیا وہ؟۔۔۔ ہیں؟ کیا وہ؟۔۔۔'' انجینئر کا بس نہ چلتا ورنہ وہ اسے ایک لگاتا تو ضرور۔ غضب خدا کا۔ رات کا وقت سنسان سا علاقہ اور اک اکیلی لڑکی۔ اس کا بھائی کیا افیم کھا کر سویا ہوا تھا۔

''رستہ بھول گئی تھی۔'' وہ منمنائی۔

''یہ بی بی جھوٹ بولتا ہے صیب! یہ ہم سے ابھی الٹی الٹی۔ غلط غلط سی باتیں پوچھ رہا تھا۔''

''غلط غلط؟'' باوجود اس تشویش ناک صورت حال کے۔ ان الفاظ پر زہرا نے آنکھیں پھاڑ کر کہا تھا۔

''شٹ اپ!۔'' اور بخش طیش سے غرایا۔ زہرا نے اب کے سچ مچ خوف زدہ ہوئی تھی اور اس کے بعد۔ بخش نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور لاکر جیپ میں پٹخا تھا۔

''بخش میری بات تو سنو۔ اف۔ آؤچ۔'' مگر اس نے ایک بھی آواز نہ سنی تھی اور پھر سارے راستے وہ دبکی جیپ اور تقریباً خوف زدہ بیٹھی رہی جبکہ بخش سنجیدہ۔ غصے سے ناک تک بھرا ہوا اور بے حد ریش ڈرائیونگ کرتا رہا اور جب اس نے جیپ زہرا ممتاز کے فلیٹ کے سامنے روکی تو تب لکھاری زہرا ممتاز کو ٹھیک ٹھیک سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب ہونے کیا جا رہا ہے۔ وہ جو ادھر فیکٹری کے گیٹ پر ہوا وہ تو ٹریلر تھا ابھی تو پارٹی شروع ہوئی تھی۔

''میرے خدا۔۔۔'' بخش کو دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر اس نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھا اور وہ وہیں پہ فوت ہوگئی تھی، مگر نا۔ فوت ہونے سے کام نہیں چلتا تھا۔ کچھ کرنے کا وقت تھا۔ یوں ٹھٹھر کر فریز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ چھلانگ مار کر جیپ سے اتری اور چیتا رفتاری سے بخش کا پیچھا کیا اور عین اس کے سامنے جا کر اس کا رستہ روکا تھا۔ یوں رستہ روکے جانے پر بخش نے بے حد بری طرح سے اسے

گھورا تھا اور وہ ایسی سخت گھوری تھی کہ جان کھینچتی تھی۔ وہ اک لمحے کے لیے سن سی ہوئی تھی، مگر بخش کو حرکت میں آتے دیکھ کر۔ وہ بھی حرکت میں آئی تھی۔

''بخش۔ بخش پلیز۔ پلیز میری بات تو سنو۔''

وہ ایک بار پھر سے اس کے پیچھے بھاگی۔ بخش نے اب کہ اک لمحے کے لیے رک کر ان ہی جان کھینچتی نظروں سے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا تھا اور پھر بخش نے دروازے پر دستک کرنے کا بھی تکلف نہ کیا تھا بوٹ کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔ زہرا کو لاؤنج کے صوفے پر پٹخا اور۔

''بدر......'' وہ غرا کر بولا تھا۔

''بدر......'' اس دوسری پر طیش آواز پر بدر ہکا بکا باہر آیا تھا۔

''کیا ہوا بخش بھائی۔'' وہ غالباً سوتا اٹھ کر آیا تھا۔

''تمہیں معلوم بھی ہے کہ تمہاری بہن کہاں تھی اور کیا کر رہی تھی؟''

''بخش۔'' غصے سے کہہ تو دیا تھا مگر زہرا کے بخش کہنے پر اندازہ ہوا کہ کیا کہہ دیا تھا اور بدر وہ اتنی بے یقینی سے زہرا کو دیکھ رہا تھا کہ زہرا کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ کہیں دفن ہونا زیادہ پسند کرتی۔ وہ دکھ سے بخش کو دیکھتی تھی اور بدر اسے۔

''کہاں تھیں یہ؟'' بدر حیرت بھرے دکھ سے پوچھتا تھا۔

''فیکٹری ایریا میں۔ جاسوسی کر رہی تھیں محترمہ!''

''واٹ؟'' بدر کچھ اور سمجھا تھا مگر یہ جان کاری بھی کچھ کم نہ تھی۔

''زہرا۔ زہرا۔'' بدر نے صوفے سے کشن اٹھا کر طیش میں زمین پر پٹخا تھا یوں کہ جیسے وہ ''زہرا'' تھا۔

''فار گاڈ سیک۔ فار گاڈ سیک زہرا آخر تمہارے اندر کا یہ ''سڈنی شیلڈن'' مر کیوں نہیں جاتا۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اور زہرا دہل کر منہ ہی منہ میں بدبدائی تھی۔

''یا پھر یہ ہمیں مروا کر چھوڑے گا۔''

''میں رستہ بھو۔۔۔۔۔''

''شٹ اپ۔'' بدر نے بری طرح شاؤٹ کرتے ہوئے اس کی بات کاٹی تھی۔

''یو نو (تمہیں معلوم ہے) اگر تم پکڑی جاتیں تو ہوتا کیا؟''

''ایم سوری۔'' اور زہرا نے سر جھکا کر اعتراف کیا تھا۔

''واٹ سوری؟ کیا ہاں۔ ہم دونوں نوکری سے جاتے اور جو انکوائری بھگتنی پڑتی وہ الگ تھی، مگر آپ جناب کو کب احساس ہوا؟ آپ کو تو بس فیلڈ میں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شوق ہوتا ہے باقی سب جائیں بھاڑ میں۔ آپ کیوں کسی کی فکر کریں۔ آخر کو آپ عزت مآب لکھاری صاحبہ جو ہیں۔'' وہ اتنے غصے، اتنی بدلحاظی سے بول رہا تھا کہ اب زہرا کو حقیقت میں بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔

''بدر!۔'' بخش نے اس کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے ٹھنڈا کرنا چاہا مگر۔۔۔

''آپ نہیں جانتے بخش بھائی! آپ نہیں جانتے اس کی کھوپڑی ہی الٹی ہے۔ کبھی مجھ سے سوال پوچھ پوچھ کر مجھے ناک تک عاجز کر دے گی۔ اور اب۔ اب۔'' وہ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے بے بس نظر آیا تھا۔ ''انس انف زہرہ۔۔۔ انف۔۔۔'' (بس بہت ہو گیا زہرہ۔۔۔ بہت۔'' بدر اب کے اپنی پاکٹ سے سیل نکالتے ہوئے بولا تھا اور زہرا۔۔۔ اس نے شاک سے بدر کو دیکھا اور پھر بخش کو۔۔۔

☆☆☆

''سنا ہے اس دفعہ بدر نے تمہاری بہت بے عزتی کروائی ہے ممتاز خالو سے؟'' وہ ارسلان تھا۔

''شٹ۔ اپ۔'' اس نے گھور کر کہا تھا۔

''جب ہی میں کہوں۔ کہ محترمہ کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے اتنے دنوں سے''

''ارسلان۔ پلیز۔'' وہ رک کر۔ انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتے ہوئے بولی تھی۔

''اوکے۔'' اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر۔ ہنس کر بولا تھا۔

''تمہیں افسوس ہوا؟''

''ہاں۔''

''لیکن بدر پر نہیں۔ بخش پر۔''

''بخش؟''

''انجینئر۔''

''او۔ ہاں۔ وہ۔ بخش۔ اچھا تو بخش پر کیوں افسوس ہے۔''

''آئی مین (میرا مطلب ہے) بدر تو بھائی ہے۔ سڑا ہوا ہے یو نو اسے میری ہر بات الٹی لگتی ہے، مگر بخش۔ اسے تو سمجھنا چاہیے تھا۔ ہی سپوزڈ ٹو بی مائی فرینڈ......''

''ہر دوست میرے جیسا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ جو کہ تمہاری کرتوتوں پر پردہ ڈالتا پھرے۔'' ارسلان نے خوامخواہ میں کالرز کھڑے کیے تھے۔

''شاید۔'' اور وہ سخت دل گرفتہ نظر آئی تھی۔

''اوہ۔ ہیلو۔ تم اتنی سیریس کیوں ہو رہی ہے۔ وہ بھی بخش کو لے کر۔''

''شٹ اپ ارسلان! مجھے کسی کے بارے میں سیریس ہونا ہوتا تو وہ سب سے پہلے تم ہوتے۔'' وہ ڈھیلے سے انداز میں بولی تھی۔

''تو پھر منہ شریف کیوں لٹکایا ہے؟''

''اتنے دن ہو گئے مجھے آئے ہوئے، مگر اس کا ایک ٹیکسٹ تک نہیں آیا۔ بندہ یہ ہی پوچھ لیتا ہے کہ اتنی بے عزتی کے بعد زندہ بھی ہو کہ نہیں۔'' زہرا نے منہ لٹکا کر کہنے پر ارسلان کھل کر ہنسا تھا۔

''تو تم نے بھی غلط کیا تھا نا زہرا۔ یہ ''سیریس'' تھا۔ ان دونوں کی نوکری اور کیریئر دونوں خطرے میں پڑ سکتا ہے تمہارے اک ذرا سی ان فو (معلومات) کے لیے ایڈمٹ اٹ (تسلیم کرو)''

اور وہ یوں منہ بنا کر خاموش ہوئی تھی کہ جیسے کوئی کڑوا گھونٹ بھرا ہو۔

''اوہ میرے خدا! پونے چار۔ اٹھو نکلے۔ باتونی شخص۔ پوائنٹ چھوٹ جائے گا میرا اور پھر گھر جانا اک سیاپا بن جائے گا۔'' اس کی نظر یک دم ہی رسٹ واچ پر پڑی تھی اور وہ ارسلان کے کندھے پر دھپ مارتے ہوئے بولی تھی۔ (یونیورسٹی اوپن ہو چکی تھی)

''خیر ہے۔ میرے ساتھ چلی جانا۔'' مجال ہے جو ارسلان کے کانوں پر جوں تک رینگی ہو۔

''میرے ساتھ چلی جانا۔'' زہرا نے اس کی نقل اتاری۔ ''کورنگی ٹاؤن سے اٹھ کر 8-1 خالہ کے گھر کون لینے آئے گا مجھے؟ اب یہ مت کہنا میں چھوڑ آؤں گا۔ تمہارے فریبوں میں نہیں آنے والی میں۔'' اسے بولنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر وہ تپ کر بولی تھی۔

''اچھا۔ چلو مرو۔'' وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر آگے کو دھکا دے کر بولا تھا اور جب وہ تیزی سے تقریباً بھاگتے ہوئے اسٹاپ تک آئی تو یک دم۔ بے اختیار۔ بے ساختہ اک جھٹکا کھا کر رک گئی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل سی گئی تھیں اور وہ یک ٹک سامنے کو دیکھتی تھی بنا پلک جھپکے۔

☆☆☆

نیلی جینز۔ سیاہ شرٹ۔ آستینیں کہنیوں تک فولڈ کی ہوئیں۔ سیاہ چشمہ اور وہ ٹانگوں کا کراس بنائے اپنی وٹز کے ساتھ کھڑا تھا۔ اسے یوں حیرت سے بت بنا دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرایا اور پھر سر جھکا کر جھٹکا۔ ذرا سے وقفے کے بعد وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

''بخش۔'' اور اسے اپنے عین سامنے کھڑا دیکھ کر زہرا کے ہونٹوں نے بے آواز سرگوشی کی۔ ارسلان کبھی اسے اور کبھی بخش کو دیکھتا تھا۔

''ایکسکیوزمی؟۔'' ارسلان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ بخش نے اسے دیکھا اور پھر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

''بخش۔ خدا بخش۔''

"اوہ۔۔۔ تو آپ ہیں بخش۔" ارسلان کا "اوہ" معنی خیز تھا۔ زہرا کی گھوری اس سے بھی زیادہ معنی خیز تھی اور جیسے ہی وہ ارسلان کو گھور کر پلٹی۔

"میرا پوائنٹ۔" وہ ایک دم چیخی تھی۔ بخش اور ارسلان نے بیک وقت مڑ کر پوائنٹ کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو اور پھر بے اختیار دونوں نے ہی مسکراہٹ ضبط کی۔ زہرا ابھی تک شاک کے عالم میں پوائنٹ کو جاتا دیکھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے میں چلتا ہوں۔" ارسلان سر کھجا کر بولا تھا۔ بخش نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور زہرا ہکا بکا کبھی اسے دیکھتی۔ کبھی بخش کو۔

"تو میرا۔ میرا کیا ہوگا؟ مجھے کون گھر چھوڑے گا۔" وہ حیران حیران سی پوچھ رہی تھی۔

"میں۔" بخش نے کہا اور ارسلان زہرا کو آنکھ مارتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ زہرا نے بخش کو دیکھا۔ اور نظر ہٹا نہ سکی۔ وہ آج معمول سے زیادہ اچھا دکھ رہا تھا۔

"یاد آگئی میری؟" غصہ اگر کسی ناک پر سجتا تھا تو وہ ناک زہرا امتاز کی تھی۔

"بھولی کب تھی؟"

"اوہ۔ جب ہی میں کہوں کہ میرا ان باکس ہر وقت تمہارے میسجز سے بھرا کیوں رہتا ہے۔ گاڈ۔ اتنے میسجز۔" وہ حیران ہو کر بولی تھی کہ بخش نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔ گاڑی سبک رفتاری سے اس کے گھر کی جانب رواں دواں تھی۔

"تو تمہیں گلہ ہے کہ میں نے تمہیں ایک ٹیکسٹ بھی نہیں کیا؟"

"نہیں۔ میں کون ہوتی ہوں، آپ جناب سے گلے شکوے کرنے والی۔" مزاج ابھی تک برہم تھے۔ وہ پھر سے مسکرایا۔

"میں نے جان بوجھ کر تم سے کانٹیکٹ نہیں کیا زہرا۔"

"واٹ؟۔"

"اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں اس کے پیچھے بھی اک وجہ ہے۔"

"اور ہائی داوے وہ وجہ کیا ہے؟" اب کے وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھتی، اس کی طرف چہرہ کیے طنز سے بولی تھی۔ "آئی وانٹ ٹو فگر آؤٹ سم تھنگ" وہ احتیاط سے اک موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

"بخش یو ساؤنڈ ویئرڈ" اس نے بس اک پل کو زہرا کی طرف دیکھا اور مسکرایا جیسے اس کی حیرت سے حظ اٹھایا ہو۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں کیا...... فگر آؤٹ" کرنا چاہتا تھا۔"

"مجھے تو یہ ساری بات ہی فضول لگ رہی ہے۔ تم نے مجھ سے رابطہ نہ کیا کیونکہ تم کچھ "فگر آؤٹ" کرنا چاہتے تھے۔" زہرا نے ہاتھ کے اشارے سے ہنہ کرتے ہوئے بات کو اڑایا تھا۔

"سو یو ڈونٹ بلیو" وہ اب بھی اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

"تم اب میرا دماغ خراب کر رہے ہو۔" اب کے وہ ناراضی سے بولتے ہوئے رخ موڑے شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ گاڑی سگنل پر آ کر رکی۔

"میں یہ فگر آؤٹ کرنا چاہتا تھا زہرا امتاز کہ اک تمہارے میری زندگی میں نہ ہونے سے یا تم سے ڈی ٹیک (الگ) رہنے سے مجھ پر، میری زندگی پر آخر کیا فرق پڑتا ہے۔" اور زہرا نے "ہا" کے سے انداز میں منہ کھول کر اسے دیکھا، مگر وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے، سیدھا دیکھ رہا تھا۔ زہرا چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ "اور تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کیا فگر آؤٹ کیا؟" بخش نے چہرہ موڑا۔ وہ اب سیدھا زہرا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"اٹ دل بی آ میس...... آ ٹوٹل لاس سم کائنڈ آف ڈیزاسٹر ود آؤٹ یو" (گڈمڈ ہو جائے گا۔ یکسر خسارہ کسی قسم کا حادثہ تمہارے بغیر)

"بخش۔" اس کے ہونٹوں نے مدھم سا، مگر حیرت سے پر اس کا نام ادا کیا تھا۔ بخش نے نظریں جھکائیں۔ اک گہرا سانس لیا اور پھر سے اسے دیکھا۔

"میں تمہارے بنا زندگی نہیں گزارنا چاہتا

زہرا۔ کبھی بھی نہیں بلکہ میں اس زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جس میں تم میرے ساتھ نہ ہو۔" اور اس نے رک کر زہرا کا فق ہوتا چہرہ دیکھا۔ شٹ یار! کیا لڑکی ہے سرخ ہونے کے بجائے پیلی ہو رہی ہے۔ بخش نے بے اختیار سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

اور وہ ابھی تک آنکھیں پھاڑے، حیرت سے ساکت بس اس کو تکے جا رہی تھی۔ "آر یو میریس" (کیا تم سنجیدہ ہو؟) رک رک کر۔ ٹھہر ٹھہر کر۔ بے حد الجھن بھرے انداز میں وہ پوچھتی تھی۔ اتنے میں سگنل اوپن ہو گیا تو بخش کو چند لمحے لگے گاڑی وہاں سے نکالنے میں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے زہرا ممتاز۔ ایسی باتیں مذاق میں ہوتی ہیں کیا؟" وہ سبھاؤ سے بولا اور زہرا نے اپنے مزید کھل جانے والے منہ پر ہاتھ رکھا اور بے ساختہ رخ بدل کر سر جھکایا تھا اور پھر گاڑی میں خاموشی پھیلتی چلی گئی۔

بخش سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا اور اب وہ سانس روکے۔ بے جان جسم کے ساتھ بیٹھی یہ فگر آؤٹ کر رہی تھی کہ ایسا اس کے ساتھ ہوا؟ اس کے ساتھ؟۔ کوئی اس سے اظہار محبت کر رہا تھا۔ چلو اظہار ذرا سڑا ہوا ہی سہی۔ پر کہہ تو وہ اسے آئی لو یو ہی رہا تھا نا۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے اور دل کی بدتمیزیاں الگ۔

"وچ وے" (کون سے راستہ) بخش نے عام سے انداز میں کہا۔ اور وہ بری طرح سے چونکی۔

"اگلا ٹرن لے کر لیفٹ۔" اور اس پر ہولناک انکشاف ہوا کہ اب وہ بخش کو دیکھ کر بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی جسے بخش نے اچھی طرح سے محسوس کیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو زہرا؟" بخش نے بے اختیار گاڑی روکی تھی اور اس نے زور و شور سے سر ہلایا۔

"زہرا ادھر دیکھو اور مجھے بتاؤ۔ تم ٹھیک ہو؟"

"یس! آئی ایم فائن۔" (ہاں میں ٹھیک ہوں) پر زور لہجے میں جواب دیا، مگر زہرا نے اس کی طرف دیکھا نہ تھا۔

"اوکے۔" بخش نے ذرا سا الجھ کر گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ اسے ایسا کیا ہوا تھا؟ وہ سمجھ نہ پایا تھا اور بالآخر گاڑی زہرا کے گھر کے باہر جا رکی تھی۔ اک لمحے کو وہ دونوں ہی عجیب سی کیفیت کا شکار ہوئے تھے یوں جیسے سمجھ نہ پا رہے ہو کہ اب کیا کہنا چاہیے۔

"اندر نہیں آؤ گے؟" زہرا نے جھکی نظروں جھکے سر کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"جب تم مجھے جواب دو گی۔ میرے سوال کا تو تب دیکھوں گا کہ مجھے یہاں آنا ہے یا نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا تھا اور زہرا اک لمحے کے لیے ساکت ہوئی اور پھر تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اسے محسوس ہوا سب لفظ کھوکھلے۔ جملے بے معنی اور سب اظہار ہیچ۔۔۔ یا میرے خدا! جب یہ اصل میں ہوتا ہے۔ حقیقت میں سامنے آ جاتا ہے تو جو محسوس ہوتا ہے وہ کسی لفظ، کسی جملے میں سما نہیں سکتا۔ وہ ایویں ہی میں آج تک صفحے کالے کرتی رہی۔ یہ جو احساس ہوتا ہے نا۔ "چاہے جانے کا احساس"۔۔۔ "کسی کی زندگی کا جزوِ کل بن جانے کا احساس" کسی کی آنکھ، کسی کے دل میں اتر جانے کا احساس"۔۔۔ باخدا۔۔۔ باخدا یہ دنیا کا خوب صورت ترین "احساس" ہے اور جب یہ ہوتا ہے اپنی پوری معنویت کے ساتھ تو بس اسے الفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اسے بس محسوس کیا جا سکتا ہے اور وہ کر رہی تھی پوری طرح سے پوری شدت سے۔ وہ کیا لکھتی رہی۔۔۔ ہاں۔ کیا؟ وہ ابھی تک بے یقین تھی۔ ایک حیرت کے عالم میں تھی یا اس کے ہاتھوں کی لرزش جاتی نہ تھی اور پلک جھپکتی نہ تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ اس کے ساتھ ہوا؟ اس کے ساتھ۔۔۔؟" اور وہ بے اختیار اٹھ کر آئینے کے

سامنے جا کھڑی ہوئی۔ یہ دیکھنے کہ کیا تھا اس میں ایسا خاص جو بخش جیسا انسان اس کے بنا زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے نقوش پر ہاتھ پھیرا۔ آنکھیں، ناک، ہونٹ، چہرہ سب نارمل تھے۔ عام تھے تو پھر کیا تھا جس نے بخش کو باندھا؟ یکایک اسے ایک خیال آیا۔ کھینچ کر اس نے بالوں کو ربڑ بینڈ سے آزاد کیا اور بال کھول کر کندھے کے ایک طرف گرائے۔ پھر دوسری طرف اور پھر سارے کے سارے بال سیدھی مانگ نکالتے ہوئے پیچھے کو گرائے۔ ابھی بھی وہ کوئی قلوپطرہ نہیں نظر آرہی تھی تو پھر۔۔۔ پھر کیا دیکھا بخش نے۔ وہ حیران تھی اور سچ حیران تھی۔ بخش نے اس کے چہرے پر نہیں۔ اس پہ مرا تھا۔

☆☆☆

اس نے سیل فون نکالا۔ رابطوں کی فہرست میں سے بخش کا نمبر نکالا۔ وہ چند لمحے اس کے نام کو دیکھتی رہی۔ مسکراتے لبوں اور چمکتی آنکھوں سے۔ اس نے انگلی سے اسے پچ کیا۔ کانٹیکٹ کھل گیا تھا، مگر وہ الجھن میں پڑ چکی تھی۔ کال کرے؟ آہ۔۔۔ کرے تو آخر کرے کیسے۔۔۔؟ یہ مشکل تھا۔ اس نے دانتوں تلے ہونٹ دبایا۔ سوچا اور پھر پیغامات کھول لیے۔ بخش کے نام وہ اک پیغام تحریر کرنے لگی تھی۔ سنہری حروف سے لکھا پیغام۔ لفظوں کی کھلاڑی تھی آخر وہ۔

''یو نو بخش! یہ اعزاز ہوتا ہے۔ بہت بڑا اعزاز۔ یوں جیسے وہ تاج جو کسی ملکہ کے سر پر رکھا جاتا ہو۔ اس دنیا میں کوئی اک شخص ہے جو کہ آپ کے بنا زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ میرے خدا!۔۔۔ اور بخش کوئی اس اعزاز کو کیسے قبول نہ کرے۔۔۔ کیسے۔۔۔؟ تمہاری زندگی میں ہونا، تمہارے ساتھ زندگی گزارنا۔۔۔ اس سے بڑھ کر خوب صورت اور کچھ بھی نہیں۔ باخدا کچھ بھی نہیں۔'' سنہری سنہری حروف سے پیغام لکھا گیا۔ وہ چند لمحے چمکتی سنہری آنکھوں سے ہی اس پیغام کو دیکھتی رہی۔ وہ پیغام نہیں تھا۔ وہ خواب تھا۔ سنہری خواب ہی جو بخش نے اسے بخشا تھا۔ اس نے سیل فون کی اسکرین پر انگلی پھیری اور پھر سینڈ کا بٹن دبا دیا تھا اور ادھر فون کے دوسری طرف۔۔۔ بخش کے سیل نے بلنک کیا۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ سوئپ کیا اور ''اقرار'' حاضر تھا۔ سنہری حروف میں لپٹا اقرار۔۔۔ وہ کھل کر مسکرایا۔۔۔ پھر ہنس دیا اور یک ٹک اس سنہری پیغام کو دیکھتا رہا۔ زہرا اپنے بھیجے ہوئے پیغام کو دیکھتی تھی اور بخش موصول ہوئے پیغام کو۔ دونوں کی سیل اسکرین روشن تھیں۔ ان کی آنکھیں بھی روشن تھیں۔ اسی سنہرے دیکھے جانے والے خواب کی بدولت نہ صرف خواب کی بدولت بلکہ اس سنہرے جذبے کی بھی بدولت کے جسے حرف عام میں ''محبت'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

وہاں روشنی تھی۔ سنہری سی روشنی اور پھر یک دم۔ روشنی ماند پڑتی گئی۔ جلنے بجھنے سی لگی اور پھر۔۔۔ پھر وہاں اندھیرا چھاتا چلا گیا۔ گھور اندھیرا۔ سیاہ گھور اندھیرا جو کہ سب نگل گیا تھا۔ سنہری خواب اور جذبہ۔۔۔ دونوں۔

☆☆☆

''کیوں اپنی زندگی برباد کرتی ہو زہرا؟''

''امی! میں اپنی زندگی برباد نہیں کر رہی ہے۔''

''تو پھر یہ اور کیا ہے۔۔۔؟ اور وہ اگلے کئی لمحوں تک چپ رہی۔ ایسے چپ۔ اتنی خاموش کہ جیسے دوبارہ کبھی نہ بولے گی۔ ماں چند لمحے تک اس کا چہرہ دیکھتی رہیں اور پھر انہوں نے اچانک اس کا چہرہ اپنا دونوں ہاتھوں میں لیا تھا۔

''ایسے مت کرو بیٹا۔۔۔ ایسے مت کرو۔۔۔ لیٹ اٹ گو۔۔۔ لیٹ اٹ گو (جانے دو اس سب کو)۔

''میرا یقین کریں امی۔ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ ''آئی ایم ان ایبل۔۔۔ آئی ایم ان ایبل'' میں سہم زدہ ہو چکی ہوں وہ ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر، بھرائی۔ دکھ بھرے لہجے میں بولی تھی اور اس کے ہر انداز۔ ہر ادا سے بے بسی ولاچاری ٹپکتی تھی اور وہ ٹپکنے والی بے بسی ولاچاری۔ چیخ چیخ کر اس کی حالت زار بیان کرتی تھی۔

☆☆☆

''زہرا!''

''ہوں۔''

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اک سکتے کی سی کیفیت میں آئی۔۔۔ اور۔۔۔

''شٹ اپ ارسلان۔۔۔'' اس نے اسی صدماتی سی کیفیت میں کہا تھا۔ ''مجھ سے ہمدردی کر رہے ہو۔ مجھ سے؟ ارسلان۔۔۔'' اور پھر یک دم اس نے ہونٹ بھینچے تھے۔

''نہیں میں ہمدردی نہیں کر رہا۔ بالکل بھی نہیں۔''

''تو؟'' اور وہ سرخ بھری آنکھوں کے ساتھ تڑپ کر پوچھتی تھی۔

''میں صرف تمہیں اس فیز...... اس سے باہر نکالنا چاہتا ہوں۔'' ارسلان نے بے حد خلوص سے کہا اور وہ اس کے خلوص پر حیران رہ گئی۔ وہ چند لمحے اس مہربان، پرخلوص شخص کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''نہیں۔۔۔'' اس کی آواز اتنی آہستہ، اتنی مدہم تھی کہ محض لب جنبش کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اور اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور وقت کے دھند سکون میں کھو گیا۔

☆☆☆

''زہرا! تم بدر کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں۔'' ممتاز صاحب کے کہنے پر اس نے شاک سے باپ کو دیکھا۔

''تمہارے بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں زہرا۔ تم چلی جاؤ۔ یہ اچھا رہے گا تمہارے لیے۔'' اور وہ ماں کی تائید پر انہیں بھی دیکھ کر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں ایسے کیسے بول سکتے تھے۔۔۔ کیسے؟۔

''نہیں! مجھے نہیں جانا وہاں اور پلیز۔۔۔ پلیز آج کے بعد کوئی بھی مجھے کم از کم وہاں جانے کے لیے نہیں کہے گا۔ پلیز۔'' آنسوؤں کو پیتی۔ خود کو کنٹرول کرتی۔ وہ بڑے جتنوں سے بول رہی تھی۔

''زہرا؟''

''پلیز امی۔'' جواب دے کر وہ رکی نہ تھی۔ اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی اور ماں باپ اسے افسردہ نظروں سے دیکھتے رہ گئے اور پھر وقت جیسے کلینڈر بن گیا۔ یوں جیسے دھڑا دھڑ اکوئی ورق پہ ورق پلٹتا چلا جا رہا ہو۔ یوں جیسے تاریخ دنوں کے حساب سے نہیں۔ گھنٹوں کے حساب سے بدلتی تھی۔ تیزی سے۔۔۔ برق رفتاری کے ساتھ، لیکن۔۔۔ وہ۔۔۔ وہیں کھڑی تھی اسی ایک مقام پر کہ جہاں بخش نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ سنایا تھا اسی اک مقام پر کہ جہاں اس کے اندر پہلی سیم پھوٹی تھی۔

☆☆☆

2 سال بعد

''تمہاری خالہ پھر آئی تھیں زہرا!'' اور زہرا نے بے بسی سے سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔

''آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔۔۔ کیوں؟'' وہ رونا نہیں چاہتی تھی کم از کم ابھی تو ہرگز بھی رونا نہیں چاہتی، مگر رو رہی تھی۔

''زہرا۔۔۔ جانی دو سال۔۔۔ دو سال بہت ہوتے ہیں کسی فیز...... کسی برے وقت سے باہر آنے کے لیے۔ اب بس کرو۔۔۔ بس کر دو بیٹا۔''

''آپ لوگ میرا یقین۔۔۔ یقین۔۔۔ کریں۔'' آنسوؤں کی وجہ سے آواز حلق میں پھنستی تھی۔

''میرا یقین کریں۔ مجھے۔ مجھے سب سے زیادہ خواہش ہے کہ میں اس فیز سے باہر آجاؤں، مگر۔۔۔ میں۔۔۔ امی۔۔۔ میں بے بس ہوں۔۔۔''

''ٹھیک ہے۔ کر لیتے ہیں تمہارا یقین، لیکن زہرا! مجھے یہ بتاؤ کہ ڈس ایبل بچوں کے اسکول میں

چند ہزار کی نوکری پر زندگی گزرتی ہے۔ گزاری جاسکتی ہے؟ تعلیم تم نے ادھوری چھوڑ دی۔ لکھنا چھوڑ دیا۔ کیریئر کوئی تمہارا نہیں ایسے کیسے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیں۔" اور وہ ہونٹ بھینچے، رخ موڑے بہتی آنکھوں کے ساتھ سنتی رہی اور جب عالیہ خاموش ہوئیں تو اس کے پاس بھی کچھ نہ تھا کہنے کو۔

"امی! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بالکل بھی اچھا نہیں لگتا میں آپ لوگوں کو ہرٹ کروں، لیکن یہ کہ شادی میں تب کروں گی جب میں خود کو اس کی اہل پاؤں گی۔ آپ بدر کے بارے میں سوچیں۔" کافی دیر بعد وہ کہہ سکی اور آواز اب کے ہموار تھی۔

"ایسے کیسے بدر کے بارے میں سوچیں؟" عالیہ بے بس نظر آئیں۔

"آپ اس کا ٹائم ویسٹ کررہی ہیں امی! میرے پیچھے لگ کے اس کا وقت کیوں برباد کرلی ہیں۔ دس ماہ ہی تو چھوٹا ہے مجھ سے۔"

"اپنے علاوہ۔۔۔ سارے جہاں کا خیال ہے۔" امی غصے بڑبڑاتی وہاں سے اٹھ کر آگئی تھیں اور وہ طنز سے خود پر ہنس دی۔

اپنا۔۔۔ اپنا خیال کیسے کروں؟۔ مجھے حیرت ہے کہ میں کھل کیوں نہیں جاتی۔۔۔ آخر کیوں نہیں؟ وجود سلامت ہے تو آخر کیسے؟۔ اور اس نے بڑی عجیب نظروں سے اپنے دونوں ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تھا یوں جیسے ان کی کاملیت پر حیرت سی ہو۔

☆☆☆

ڈیڑھ سال بعد

وہ چند لمحے دروازے کے آگے کھڑی رہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سارا کا سارا اضطراب اس کے دائیں ہاتھ میں آن سمایا ہے۔ وہ بار بار مٹھی بند اور کھول رہی تھی اور پھر اس نے آنکھیں میچ کر گہرا سانس خارج کیا تھا۔ ٹھک ٹھک کی آواز گونجی اور بالآخر اس نے دستک دے ہی دی تھی۔

"آجائیں!" اندر سے آواز آئی تھی۔ اس نے اک لمحہ لیا تھا دروازہ کھولنے میں، پھر ناب گھمایا اور آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔

"زہرا؟" وہ حیران ہوا۔ کین آئی ہیو آ ورڈ ود یو (کیا میں تم سے بات کرسکتی ہوں؟) وہ ہونٹ چباتی، کنفیوزڈ نظر آتی تھی۔

"شور" اس نے یک دم اپنی جگہ چھوڑی تھی۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا تھا کہ وہ اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے۔ یہ اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا۔

"فکر نہ کرنا۔۔۔ تمہارے شوہر کے کان بھرنے نہیں جارہی۔" اس نے بدر کی بیوی سے کہا تھا جو کہ کمفرٹر اوڑھے، ٹی وی دیکھنے کے ساتھ چپس کھانے میں بھی مگن تھی۔ ہو کیئرز منال نے کندھے اچکائے۔

"وہ پہلے ہی میری مٹھی میں ہے۔" پھر ہاتھ مارتے ہوئے شرارت سے کہا اور زہرا نے ہنستے ہوئے دروازہ بند کیا تھا۔ بدر پہلے ہی اس کا منتظر، دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر آئے تھے۔ چھت پر آتے ہی بدر اچانک کر منڈیر پر بیٹھا تھا اور وہ منڈیر پر دونوں بازو لٹکائے چمکتے چاند کو دیکھنے لگی تھی۔ شانوں کے گرد لپٹی شال، ادھ کھلے سیاہ بال اور نم ہوتی آنکھیں۔ وہ افسردگی کی تفسیر لگتی تھی۔

"زہرا؟۔" اور اس نے بے اختیار ہونٹ بھینچ کر چہرہ جھکایا تھا۔

"بدر مجھے معلوم ہے جو میں کہنے جارہی ہوں۔ وہ تمہیں حیران کردے گا، لیکن پلیز۔۔۔ پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرنا اور اس سے بڑھ کر میری مدد کرنے کی کوشش کرنا۔" وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر نمناک لہجے میں بولی تھی۔

"کہو تو سہی زہرا۔" اس نے پیار سے اس کی الجھی لٹوں کو کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنا ٹرانسفر کہیں اور کروالو پلیز۔۔۔ پلیز۔ کیا یہ ممکن ہے؟" اور بدر۔۔۔ وہ واقعی ہی میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ وہ زہرا تو نہیں تھی جسے وہ جانتا تھا اس کی زہرا اتنی کمزور کیسے ہوسکتی تھی۔ کیسے؟۔

"زہرا؟۔" اس نے شاک سے کہا۔

"بدر پلیز۔" اور اک قطرہ سا اس کی چھلکتی آنکھوں سے ٹپکا تھا بدر چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور اک پل کو اس نے چاہا کہ وہ۔ وہی کرے جو زہرا کہتی تھی کہ یہ اتنا بھی ناممکن نہ تھا مگر۔۔۔

"نہیں زہرا۔ ہرگز بھی نہیں۔ یہ اگر ممکن بھی ہے تو میں نہیں کروں گا۔ "یو ہیو ٹو بی اسٹرونگ" (تمہیں مضبوط ہونا ہوگا) اس نے مضبوط لہجے میں کہا پھر چھلانگ مار کر منڈیر سے اترا اور اس کی جانب دیکھے بنا وہ نیچے چلا گیا تھا۔ زہرا چند لمحے بدترین صدمے کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہی اور پھر دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑے کو وہ منڈیر کے ساتھ گھسٹتی، نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ بدر کو گھر الاٹ ہوچکا تھا۔ ممتاز صاحب کی ریٹائرمنٹ ہوچکی تھی اور وہ سب وہیں شفٹ ہورہے تھے اور زہرا کے بس میں ہوتا تو وہ دنیا کی آخری جگہ ہوتی جہاں جانے کا وہ تصور بھی کرتی۔

☆☆☆

وہ چند لمحے کھڑکی کے سامنے کھڑی اس سبز خوب صورت وادی کو دیکھتی رہی اور پھر یک دم اس نے پردے کھینچ کر برابر کردیے تاکہ نہ اسے کھڑکی سے باہر نظر آتا منظر نظر آئے اور نہ ہی۔ نہ ہی اسے تکلیف محسوس ہو، مگر پھر اس نے جانا کہ "تکلیف" کو ہونے کے لیے اس منظر کی ضرورت نہ تھی اس جگہ کا حوالہ ہی کافی تھا۔ یہ جیسے تناسب راست والا معاملہ تھا۔ وہ ہی حساب تھا۔ وہ اندھیرے کمرے میں سر دونوں گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھی اور خود کو اس قابل نہ پاتی تھی کہ دھوئیں کی مانند بکھرنے والی یادوں کو روک سکے۔

"کیا آپ یہ صفحات رکھ لیں گے؟" اور اس کی آنکھوں کے سامنے بخش کا حیرت زدہ چہرہ نمایاں ہوا۔ ذرا سی دیر کو ٹھہرا اور پھر نقش بگڑے اور پھر دھوئیں کی مانند بکھرتے گئے اور تکلیف نے کہا زہرا ممتاز تم جاتی کہاں ہو؟ آخر بچ کر جاتی کہاں ہو اور زہرا ممتاز چاروں شانے چت تھی۔ اس تکلیف کے آگے اس تکلیف کے سامنے۔ وہ ہار چکی تھی۔

"تو اس میں اداس ہونے والی کیا بات ہے؟"

"ہے نا!۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔"

"آپ سمجھائیں تو سہی۔۔۔"

"سیریس"

"ڈیم سیریس" آوازیں تھیں۔ اس کا چہرہ تھا اور ٹھنڈی یخ ہوا کے جھونکوں کی مانند یادیں جو اس کے آس پاس۔ دائیں بائیں سے گزرتی اسے ٹھٹھرا کر رکھ دینے کا باعث بن رہی تھیں۔

"بخش۔۔۔" اس کے ہونٹوں نے بے آواز حرکت کی۔

یہ نام کانٹا تھا۔ مارتا تھا اور کسی قابل نہ چھوڑتا تھا۔ وہ یک دم اٹھی۔ اس نے پردے کھینچ کر ہٹائے اور اس کے سامنے وہ ہی سبزہ زار تھے۔ کیا ہوا اگر میں وہاں۔ اس اونچے نیچے رستے پر جاؤں۔۔۔ اس پتھر پر بیٹھوں اور وہ دوڑتا ہوا آئے اور اک ہیلو کہہ کر گزر جائے۔ کیا ہوتا اگر یہ ساڑھے تین سال درمیان میں آئے ہی نہ ہوتے۔ سب ویسا ہی ہوجائے جیسے اور پھر اسے معلوم نہیں کیا ہوا۔ وہ مڑی اور تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس کے گال تر تھے۔ بال بے ترتیب، دوپٹا گلے میں لٹک رہا تھا اور وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ اسی راستے کی جانب چلتی تھی۔ یوں کہ جیسے وہاں انجینئر خدا بخش اس کا منتظر تھا کہ لکھاری زہرا ممتاز اسے ڈھونڈنے آئے گی۔ وہیں پر کہ جہاں وہ پہلی بار ملے تھے۔ پہلی بار۔۔۔

وہ روتی ہوئی۔ نم گالوں چڑھے سانسوں کے ساتھ اس رستے پر اوپر ہی اوپر چڑھتی جارہی تھی اور یادیں اسے ٹھٹھرانے کا موجب بنتی تھیں۔ اس کے دل میں تیر کی طرح آکر پیوست ہوتی تھیں اور درد وہ تھا کہ جس کا کوئی انت۔ کوئی مرہم نہ تھا اور پھر جیسے ہی وہ ڈھلوانی سطح کو عبور کرکے اوپر آئی تو۔۔۔ تو اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔

وہ ساکت۔۔۔سکتہ کی سی کیفیت میں دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

"بدر؟"

"جی ای!"

"بیٹا! وہ۔۔۔" عالیہ کہنے میں ذرا متامل تھیں۔

"وہ میں نے تم سے پوچھنا تھا کہ تم نے پتا کروایا؟" بدر کو منتظر پا کر انہوں نے بات مکمل کی تھی۔

"جی ای!" بدر نے ذرا سے توقف کے بعد جواب دیا۔

"پھر؟" وہ بے تاب ہو کر آگے بڑھیں۔ اور بدر نے مایوسی سے سر جھکا کر نفی میں ہلایا تھا اور عالیہ کا دل ڈوب کر رہ گیا تھا۔ کیا بنے گا زہرا کا آخر؟

☆☆☆

وہ سکتہ کی سی کیفیت میں اس جگہ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ پتھر اب وہاں نہ تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑے کھڑے زمین پر گری تھی۔ پتھر وہاں نہ تھا۔ بخش وہاں نہ تھا۔۔سب کچھ بدل چکا تھا۔۔۔سب کچھ۔۔۔زہرا نے کرب سے آنکھیں بند کی تھیں اور پھر وہ اچانک ٹھہری گئی۔ اس نے سانس روک لی اور کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ کیا وہاں دوڑتے قدموں کی آواز تھی؟۔۔۔تھی کیا؟۔۔۔ کتنے ہی لمحے۔۔۔وہ دھک دھک کرتے دل اور بند آنکھوں کے ساتھ منتظر رہی، مگر۔۔۔ جو نہ ہونا ہو۔ وہ نہیں ہوتا۔ وہ کبھی بھی نہیں ہوتا۔

"بخش۔۔۔" وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے، تکلیف سے دہری ہو کر چیخی تھی۔

☆☆☆

پہلے وہ تکلیف سے بچتی تھی اور اب وہ ہر وہ چیز ڈھونڈتی تھی جو اسے اندر تک اک گہرا گھاؤ لگا سکے۔ وہ بدر کے پرانے فلیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ خاموش۔ خالی نظروں سے اوپر جاتی سڑھیوں کو دیکھتی تھی۔ کیا ابھی بارش نہیں ہو سکتی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا کہ وہاں بڑی اچھی سی دھوپ نے پر پھیلا رکھے تھے۔ وہ ہر رات ماضی کا سفر کرتی تھی اور اب۔۔۔ اب جاگتی آنکھوں سے۔ کھلی آنکھوں کے ساتھ وہ یہ شدید خواہش رکھتی کہ "ماضی" زندہ ہو کر حال میں آن کھڑا ہو۔ بالکل ابھی کے ابھی۔ وہ چند لمحے آسمان کو منتظر نگاہوں کے ساتھ دیکھتی رہی، مگر بادل گڑگڑائے۔ نہ ہی بارش کا اک قطرہ بھی ٹپکا تھا۔

اس کی نگاہیں اب سڑھیوں پر پھسل رہی تھیں۔ یوں وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ اس نے کیسی جان نکالتی نظروں سے تکا تھا نا۔ کیسے طیش سے دروازے کو اپنے بوٹ سے ضرب لگائی۔ یہاں۔ ہاں بالکل یہاں۔۔۔ جیپ کھڑی تھی۔ وہ اب وہ جگہ تلاشتی تھی کہ جہاں لا کر بخش نے جیپ روکی تھی۔ گھاؤ لگا۔ خدا قسم گھاؤ لگا تھا۔۔۔بہت اندر تک۔ تکلیف بہت تیز تھی۔ اذیت سے پر تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور وہ سرعت سے مڑی۔ اس کا رخ اب بخش کے اپارٹمنٹ کی جانب تھا۔ تیز تیز سیڑھیاں چڑھتے ہوئے۔ لرزتے ہونٹ اور کپکپاتا سا وجود۔۔۔ وہ اسی دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ ابھی وہ ناک کرے گی اور بخش کہے گا۔ "آ رہا ہوں۔" اور پھر زہرا کو سامنے پا کر وہ کتنی حیرت سے اسے تکے گا اور کہے گا۔ "تم۔۔۔؟" وہ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتی۔ خشک ہونٹوں کے ساتھ اس دروازے کے سامنے کھڑی رہی اور پھر۔۔۔ اس نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا تھا۔ کسی کے قدموں کے چاپ ابھری۔ زہرا کا سانس تک رک گیا اور۔۔۔

"جی؟" ایک لڑکی پوچھتی تھی۔

"بخش؟" اور کیسی ماتم کرتی آواز تھی۔۔۔

لڑکی نے حیرت سے اسے تکا۔ اوپر سے نیچے تک اور پھر بولی۔

"کون بخش؟" زہرا نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں اور ان آنکھوں سے وہ آنسو تو نہ تھے جو پگھل کر گرے تھے۔ یقین کر دو وہ زہرا ممتاز تھی۔ جو قطرہ قطرہ ٹوٹ کر گرتی تھی۔ اس لڑکی نے زہرا کے

منہ پر دروازہ زور سے بند کیا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں نہیں لگتا کہ یہاں آ کر زہرا کی حالت بدتر ہو گئی ہے؟ کم از کم وہاں اس نے خود کو مصروف تو کر رکھا تھا۔" اس سوال پر بدر نے اک نظر منال کو دیکھا تھا۔

"ہاں۔ ہو چکی ہے اور ایک بار ایسا ہونا ہی تھا۔ اس کے بعد وہ سنبھل جائے گی۔ اسے سنبھلنا ہوگا۔ تسلیم کرنا پڑے گا کہ زندگی کسی کے بغیر بھی گزر سکتی ہے۔ گزاری جا سکتی ہے۔ گو کہ وقت ابھی تک اس کے لیے کارگر ثابت نہیں ہو سکا۔ مرہم نہیں بن سکا، مگر یہ ہو گا۔ ضرور ہو گا۔ وقت اپنے اندر شفا کی سی تاثیر رکھتا ہے۔" منال نے بے ساختہ اک گہرا سانس بھرا تھا یوں جیسے وہ بدر کی بات سے متفق نہ ہو۔ لگتا تو نہیں تھا کہ وقت بھی زہرا ممتاز کے لیے "مرہم" بن کر آئے گا۔

☆☆☆

"اوہ کم آن زہرا۔۔۔ پارک چلتے ہیں نا۔ ذرا سی واک ہی ہو جائے گی۔" اس نے منہ اٹھا کر منال کو دیکھا جو اس کے سر پر کھڑی۔ بضد نظر آتی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ یہ بلا کسی طور، کسی طریقے سے ٹلنے والی نہ تھی۔ یادوں کے گھڑ سوار اس کے بدن پر چڑھائی کرنے آئے تھے، لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ وہ جب اس راہ پر نہیں ملا تھا۔ اس فلیٹ میں نہیں تھا۔ تو بھلا پارک میں کیسے ہوتا؟ کیسے۔۔۔؟

"گوئی سم منٹ" پھر اس نے خود کو کہتے سنا۔

"لیں" منال نے اس کے اٹھ کر مڑتے ہی پرجوش انداز میں کہا تھا اور پھر وہ تینوں واک کرنے نکل گئے تھے۔ ہوا اب کے بھی سرد تھی۔ درختوں کے پیلے نارنجی پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔ فضاؤں کی خنکی کپکپانے پر مجبور کرتی تھی اور اک گہری چپ کی مانند بکھری۔ وہ اداس شام تھی۔ بدر اور منال نان اسٹاپ بولتے بھی تھے اور چلتے بھی جا رہے تھے جب کہ وہ اپنی توانائی ختم پاتی تھی کہ کسی ایک کام میں وہ ان دونوں کا ساتھ دے سکے۔ وہ مین سڑک پر چل رہے تھے۔ دائیں بائیں اندر کو جاتیں۔ لینز تھیں ایسے ہی اک لین کے سامنے گزرتے ہوئے بدر کو اک گاڑی اک بونٹ کھلا نظر آیا وہاں اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں اور صاف دکھتا تھا کہ گاڑی چلتے چلتے بند ہوئی۔ جس پوزیشن میں وہ راہ میں کھڑی تھی۔ وہ یہی بتاتی تھی۔

"ایک منٹ لیڈیز۔۔۔" بدر کہتا ہوا اس طرف مڑا تھا یہ ہی چار، پانچ فٹ کا فاصلہ ہو گا۔

"آپ کو مدد چاہیے کیا؟" دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے وہ گاڑی کے قریب جاتے ہوئے بولا تھا۔ ڈگی میں ٹول کٹ رکھتا ہوا شخص چونکا اور پھر اس نے ترچھا ہو کر اس آدمی کو دیکھا کہ میں نے مدد کی آفر کی تھی اور۔۔۔ اور بدر کے قدم وہیں پہ ساکت ہوئے۔ اس جانب متوجہ زہرا پر بھی بجلی ٹوٹ کر گری تھی اور شام کچھ اور سیاہ ہو گئی تھی۔ وہ خدا بخش تھا۔

☆☆☆

"تم۔ تم بزدل انسان۔" اور بدر کا دوسرا احساس۔ شدید غصے کا تھا۔ اس نے طیش سے لپک کر بخش کا گریبان پکڑا تھا۔ منال نے بے ساختہ اک چیخ ماری تھی اور زہرا۔ وہ کسی ٹرانس میں تھی۔ باخدا کسی ٹرانس میں تھی اور اسی ٹرانس کے زیر اثر وہ ان دونوں کی جانب بڑھتی گئی تھی۔ منال بھی بھاگی تھی۔

"بدر۔۔۔بدر۔۔۔" منال نے چھڑوانے کی کوشش کی۔ بخش جبڑے بھینچے سر جھکائے کھڑا تھا۔

"بتاتے کیوں نہیں ہو۔ آخر کیا بگاڑا تھا زہرا نے تمہارا۔" بدر نے اک اور جھٹکا اس کے گریبان کو دیا۔

"بدر۔۔۔" اب کے منال نے زور سے بولتے ہوئے۔ اسے پیچھے کو کھینچا اور بدر کو جیسے ہوش آیا تھا۔ اس نے بخش کا گریبان چھوڑ دیا، مگر غصہ اب بھی کم نہ ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ایک مکا مار کر اس کا جبڑا توڑ دیتا اور اس سب سے بے نیاز۔۔۔ زہرا۔۔۔ بخش سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی۔ بے یقینی، حیرانی اور اک عجب سے نامعلوم سے

احساس کے تحت اسے دیکھتی تھی۔ منال نے بدر کے بازو کو اک جھٹکا دیا کہ اب چلو یہاں سے۔ وہ مڑا اور زہرا کو دیکھ کر اک بار پھر ٹھہر سا گیا تھا۔

"زہرا؟" اس نے نرمی سے پکارا۔

"آؤ چلیں۔" اس نے زہرا کا بازو پکڑ کر اسے موڑنا چاہا مگر۔۔۔ مگر زہرا نے بازو چھڑوا لیا۔ وہ ان ہی تین جذبوں کے ساتھ بخش کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔ بدر نے بے بس ہو کر منال کو دیکھا اور منال۔۔۔ اس کی آنکھیں کہتی تھیں کہ ان دونوں کو بات کرنے دی جائے۔ بدر انکاری تھا، مگر۔۔۔ منال۔۔۔

"ہم باہر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اوکے؟" زہرا کا گال تھپتھپا کر کہتے ہوئے اس نے مڑ کر بخش کو اک نظر دیکھا اور پھر بدر کا بازو پکڑ کر، اسے زبردستی باہر لے آئی تھی۔ بخش نے ان دونوں کے جاتے ہی اک گہرا سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا، ہونٹ بھینچ کر، آنکھیں میچ کر حلق سے کچھ نیچے اتارا اور زہرا کی طرف دیکھا۔ وہ اسے پلک جھپکے بنا دیکھتی تھی یوں جیسے پلک جھپکے گی تا تو سب کچھ غائب ہو جائے گا۔ سب کچھ۔ پھر وہاں نہ کوئی زہرا ہو گی اور نہ بخس۔۔۔ بخش کے دیکھنے پر اک آنسو ٹوٹ کر اس کی گال پر سے گزرا تھا اور مانو کہ وہ زہرا کے گال پر نہ گرا تھا۔ خدا قسم وہ بخش کے دل پر گرا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھا نرمی سے اس کا بازو تھاما اور اسی نرمی کے ساتھ اسے گاڑی میں بٹھایا، دروازہ بند کیا پھر بونٹ بند کیا اور خود دوسری طرف ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھا تھا۔ وہ چند لمحے اسٹیرنگ کو تھامے، سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے ہونٹ ابھی تک بھینچے ہوئے تھے اور پھر۔۔۔ یک دم اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور زن سے بدر اور منال کے پاس سے لے گزرا تھا۔

"اوئے۔۔۔ اوئے۔۔۔" بدر اس کے پیچھے لپکا، مگر منال۔ اس نے آگے بڑھ کر بدر کا رستہ روکا تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"وہ میری۔۔۔"

"کہیں نہیں لے کر جائے گا۔ اب یہاں لین میں کھڑے ہو کر بات کرتا کیا وہ؟" منال نے تپ کر اس کی بات کاٹی تھی۔

"ڈیم اٹ" بدر نے پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے پتھر اڑایا تھا۔ بدر کی مدد کی آفر سے پہلے ہی بخش گاڑی کا فالٹ دور کر چکا تھا۔

☆☆☆

بخش نے گاڑی کالونی سے باہر لا کر اک سڑک کے کنارے روکی تھی اور زہرا اس کی اس حرکت پر بت بن کر رہ گئی تھی اور اب وہ نیم زدہ سے وجود تھے۔ سڑک کے اک نسبتاً اندھیرے سے حصے میں کھڑی گاڑی کے اندر۔۔۔ خاموش اور ساکت۔ وقفے وقفے سے ٹریفک کے گزرنے کی زوں کی سی آواز گونجتی اور پھر دور تک خاموشی چھا جاتی۔ دور سامنے اک کھوکھا سا نظر آ رہا تھا۔ جس کی بتیاں روشن تھیں جہاں سے کسی علاقائی گیت کی مدہم سی آواز ان تک پہنچتی تھی۔ آسمان پر تارے واضح ہونے لگے تھے۔ ہوا درختوں کے پتے توڑ توڑ لاتی تھی اور وہ دونوں تھے۔ خاموش۔ وہ اپنے گود میں رکھے ہاتھوں پر نظریں جمائے۔ ٹپ۔ ٹپ آنسو بہاتی اور وہ اسٹیرنگ کو تھامے۔ سامنے دیکھتا ہوا اور پھر کافی دیر بعد گاڑی میں اک ٹھنڈی سی آہ ابھری تھی۔

"میں جانتا تھا کہ مجھ پر یہ وقت ضرور آئے گا۔ ضرور مجھے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تمہارا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن۔ اس سب کے باوجود میں نے اس "جواب دہی" سے بچنا چاہا۔۔۔ بچتا رہا، مگر کب تک۔ کب تک ایسا ہونا تھا۔" اور وہ ٹھنڈی، یخ سی آہ بخش کی تھی۔ تکلیف نے اک بھرپور انگڑائی لی اور وہ زہرا امتیاز کے رگ رگ میں جا اتری تھی۔ "میں نے تم سے محبت کی۔"

"شٹ اپ۔۔۔" اور زہرا پوری قوت سے چیخی تھی۔ یک دم۔ اچانک اس کی طرف رخ کرتے ہوئے۔ غصے اور دکھ سے اس کی رنگت سرخ تھی اور آنکھوں سے شفاف سے قطرے پھسل پھسل جاتے۔ "شٹ اپ بخش۔ شٹ اپ۔" اب کے آواز دھیمی، مگر درد سے پر تھی اور بخش نے بے اختیار اپنا ماتھا اسٹیرنگ پر ٹکایا تھا۔ اک بار پھر سے خموشی وہاں پھیلتی چلی گئی تھی۔ کافی دیر بعد اس خاموشی کو اک ہلکی سی آواز نے توڑا تھا۔ زہرا نے گاڑی کا دروازہ کھولنا چاہا تھا۔ وہ یقیناً وہاں سے جانا چاہ رہی تھی، مگر۔۔۔ بخش نے فوراً آٹومیٹک لاک کا بٹن پریس کیا تھا۔ گاڑی کے چاروں دروازے لاک ہو چکے تھے۔ زہرا نے مڑ کر حیرت سے بخش کو دیکھا۔

"تم اب میری بات سنے بنا نہیں جا سکتیں۔" انداز میں دھونس۔

"تم۔۔۔ تم۔ اتنی ہمت ہے تم میں ابھی کہ تم مجھے روک سکو؟" اور وہ انتہائی حیرت سے پوچھتی تھی۔ بخش چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

"ہاں!۔۔۔" زہرا نے غصے جمع حیرت سے منہ پھیرا تھا اور بخش اک بار وقت کو پھر سے وہیں لے گیا کہ جہاں زہرا اپنے بھیجے ہوئے سنہری سے پیغام کو تکتی تھی اور وہ موصول ہوئے پیغام کو۔

☆☆☆

بخش کتنی ہی دیر اس موصول ہونے پیغام کو تکتا رہا۔ اس نے ہاتھ سے ان لفظوں کو چھوا اور پور پور میں اک انجانی سی خوشی اترتی گئی تھی۔ اس نے بھی جواباً اک پیغام بھیجنا چاہا، مگر ٹھہر گیا۔ اس نے کال ملائی تھی اور فون کے دوسری طرف کال آنے پر وہ اس بری طرح سے ہڑبڑائی کہ سیل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔

"ہا۔۔۔" وہ کھلے منہ اور پھیلے ہوئے ہاتھوں سے نیچے گرے سیل فون کو ہلنک کرتے دیکھتی رہی اور پھر کال آنا بند ہو گئی۔ زہرا بلاوجہ ہنسی تھی اب کہ پیغام آنے کی ٹون بجی۔ اس نے شرارت سے ہونٹ دانت تلے دبایا اور فون اٹھایا پیغام کھولا۔

"کال کیوں نہیں پک کر رہیں؟" سوال آیا۔

"آپ کال کر کیوں رہے ہیں؟" جواب گیا

"تمہیں اپنی خوشی بتانا چاہتا ہوں۔"

"میسج پر بتا دیں نا۔"

"تو میسج پر کہاں خوشی محسوس ہو گی؟" وہ ناراض سا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دوبارہ کال آنے لگی تھی اور اس نے پھر سے موصول نہیں کی۔

"تم۔۔۔!" اس نے سرخ منہ والی شکل بھیجی۔ اور زہرا نے دانت نکالتی۔

"ویٹ آ منٹ۔" سوچا ہوا ایکو لیکون۔

"تم شرما رہی ہو؟" "ہا" اور اس پیغام پر سیل فون ایک بار پھر سے زہرا کے ہاتھ سے چھوٹا اور بستر پر جا گرا۔

"یا میرے خدا! اس نے کیسے بوجھ لیا تھا؟۔ کیسے؟۔"

"زہرا تم شرما رہی ہو؟" اب کے وہ حیران نظر آتا تھا۔

"میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔" زہرا نے لال لال گالوں والی شکل کے ساتھ پیغام بھیجا اور جواباً بخش کا زوردار قہقہہ آیا تھا اور زہرا مسکراتی نظروں سے اس پیغام کو دیکھتی رہی اور کوئی اس وقت زہرا امتیاز کو ذرا دیکھتا۔ کیسے ہزار جگنو تھے جو اس کی آنکھوں بیک وقت چمکتے تھے۔

☆☆☆

بخش کے کہنے پر اس نے امی سے بات کی تھی۔ اس کا خاندان نسبتاً آزاد خیال تھا اور یہ وہ جانتی اسے کسی بھی قسم کی مشکل پیش نہیں آنے والی تھی۔ بخش نے ہی اسے یہ بتایا تھا کہ اس کی ماں زہرا کو لفٹ ٹائم دے سکتی ہیں کیونکہ انہیں اپنے انجینئر بیٹے کے لیے چاند سی بہو درکار تھی جو کہ زہرا۔۔۔ ظاہر ہے کہ نہیں تھی۔ زہرا نے اس بات کو ذرا جو سنجیدگی سے لیا ہو وہ جس طرح کے ماحول میں پلی بڑھی تھی وہاں خوب صورتی ثانوی چیز سمجھی جاتی تھی۔ اگر بخش کی ماں اسے پسند نہ بھی کرتیں تو بھی اسے فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ وہ بخش تھا کہ جس کے ساتھ اسے گزارنی تھی اور وہ اسے پسند کرتا تھا۔ یہ کافی تھا لکھاری زہرا امتیاز کے

لیے۔ وہ اس کی ماں اور بہنوں سے بالکل نارمل سے انداز میں ملی تھی۔ وہ گھٹنوں تک آتی قمیص کے ساتھ سگریٹ پینٹ پہنے ہوئے تھی۔ لمبا سا تین گز کا دوپٹہ شانوں پر پھیلا رکھا تھا۔ کانوں میں پرل کے ٹاپس، گلے میں ہلکی سی چین، بال ادھ کھلے اور پنک لپ اسٹک۔ وہ چائے لے کر آئی تھی اور نہ ہی لوازمات انہیں بڑھ چڑھ کر پیش کرتی رہی برعکس اس کے وہ بخش کے بابا کے ساتھ عراق وار پر بحث کرتی رہی تھی۔ اس کی بہنوں کے ساتھ فیشن پر بات کرتی نظر آئی تھی۔ وہ گھبرائی، شرماتی نہ تھی اور نہ ہی یہ اس کی ٹائپ تھی اور یہیں پہ زہرا امتیاز نے مار کھائی تھی۔ اگر وہ خوب صورت ہوتی تو شاید مارجن دے دیا جاتا، مگر وہ تو خوب صورت بھی نہ تھی۔ تو لکھاری زہرا امتیاز اتنی ساری خوبیوں کے ہونے کے باوجود اپنی شکل کے ہاتھوں مار کھا گئی تھی اس کو بخش کے بعد میں دوسرے جس شخص نے بخش کے لیے پسند کیا تھا وہ بخش کے بابا تھے اور بس۔

☆☆☆

''ماں جی پلیز۔۔۔ جب مجھے اس کی شکل سے فرق نہیں پڑتا تو آپ کو کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ شادی تو میں نے ہی کرنی ہے نا اس کے ساتھ۔ میں نے ہی چلنا ہے اس کے ساتھ تو پھر آپ کو وہ میرے ساتھ چلتی کیوں بری لگے گی؟ وہ کوئی آپ کے ساتھ تھوڑی چلے گی۔'' بخش سخت زچ نظر آتا۔

''لو! دنیا کیا کہے گی ایک ہی بیٹا تھا اور اس کے لیے سردار بیگم چن کر لائی بھی تو لائی کیا؟'' اور زہرا کی اتنی توہین پر بخش کا منہ سرخ ہوا تھا۔

''ماں جی پلیز۔۔۔'' وہ ماتھے پر بل لیے بولا تھا۔

''تمہارے سارے اعتراضات فضول ہیں سردار بیگم! جب بخش کو پسند ہے وہ لڑکی تو پھر کا ہے کے اعتراضات۔'' بابا اس کے واحد حمایتی تھے اور اس بات پر سردار بیگم نے تیز نظروں سے ان دونوں باپ بیٹا کو دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے اگر آپ دونوں باپ بیٹے کو اتنی ہی پسند آ گئی ہے وہ لڑکی تو آپ بارات لے جایئے گا اور یہ بیاہ لائے گا اور تو کوئی نہیں جائے گا اس گھر اور خاندان سے بھی اس کو بیاہنے۔'' وہ غالباً کوئی انتہائی غلط لفظ بولتے بولتے رہ گئی تھیں اور بخش منہ کھول کر انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ ایسا تو اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ماں یوں اور ایسی مخالفت کرے گی۔

اور بعد میں تمام تر کوششوں اور سفارشوں کے بعد بھی سردار بیگم اپنی بات سے ٹلی تک نہ تھیں اور بخش نے آنے والی زندگی کا اک لمحے کے لیے تصور کیا۔ وہ گر زہرا کو بیاہ بھی لایا تو اس گھر میں اس کی زندگی کیا ہوگی؟ تو اس نے تصور کیا۔ وہ اس کو ایک دم اپنے ساتھ نہیں لے جاسکے گا اور پیچھے سے ماں جی اور اس کی جتنی بنی تھی وہ اچھی طرح جان چکا تھا۔ طعنے، طنز کو سنے، لڑائی جھگڑے۔ ہر وقت چخ چخ۔ بے سکونی ماں کے دکھڑے الگ اور بیوی کے رونے الگ۔ دونوں اسے ہی سزاوار ٹھہراتیں اور پھر اک مقام پر آ کر وہ یہ سوچتا' یہ چاہنے لگتا یہ کہنے لگتا کہ ''کاش! میں نے یہ شادی ہی نہ کی ہوتی یا پھر کاش! میں نے ''تم'' سے شادی ہی نہ کی ہوتی۔'' تو اس سب سے بہتر نہ تھا کہ وہ ابھی سے پیچھے ہٹ جائے۔ زہرا کو کوئی اور اچھا شخص مل جائے گا جو اسے ایک پرسکون، عزت والی، مکمل زندگی دے سکے گا۔ وہ گر زہرا کو کچھ دے سکتا تھا تو وہ ''دکھ'' ہی ہونے تھے۔ جو اسے نظر آ رہا تھا۔

وہ یہ ہی بتاتا تھا سو خدا بخش پیچھے ہٹ گیا۔ خاموشی سے زہرا کو کچھ بھی کہے بنا۔ وہ اسے یہ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس کی ماں نے اسے رد کر دیا تھا اور یہ کہ وہ اسے بیاہنے نہیں آئیں گی۔ وہ گر زہرا کو ''سکھ'' نہیں دے سکتا تھا تو ''دکھ'' تو کبھی نہ دیتا نا۔ وہ کیوں وہ وجہ بنتا جو اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کا باعث ہو۔

اس نے رابطے کا ہر ذریعہ ختم کر دیا، ہر تعلق مٹا دیا یہاں تک کہ وہاں سے ٹرانسفر بھی کروا لیا تھا اور یہ کام بھی بے حد خاموشی سے کیا گیا تھا اتنی خاموشی سے کہ جب بدر کو خبر ہوئی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بدر کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ ٹرانسفر ہو کر گیا کہاں

تھا کیونکہ دونوں کے ڈسپلنز الگ تھے اور پھر بخش ساڑھے تین سال تک اپنے سیم زدہ وجود کو سینکتا رہا۔

☆☆☆

''میں جانتا تھا کہ تم ڈسٹربڈ رہو گی۔ کچھ عرصہ کے لیے۔ پھر کوئی نہ کوئی تمہیں مل جائے گا اور تم موو آن کر (آگے بڑھ) جاؤ گی۔ میں بھی آرام میں نہیں رہا میں سیم زدہ ہو چکا ہوں۔ ظاہر ہے تکلیف تو ہونی ہی تھی، لیکن اک وقت ہوتا ہے۔ ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ سو ایک دن ہم دونوں ہی ہیلڈ ہو کر زندگی کے ساتھ دوڑنے کے قابل ہو جائیں گے۔ میں نے تمہیں زندگی میں ضرور شامل کرنا چاہا تھا زہرا! مگر تمہارے لیے ایک بے ترتیب زندگی تو کبھی بھی نہیں چاہی تھی۔ کبھی بھی نہیں۔ سو۔ اسی لیے۔'' اور وہ بے بسی سے محض شانے اچکا کر رہ گیا تھا وہ کہہ رہا تھا اور اس نے ہر ہر لفظ کے ساتھ ایک ایک بھالا زہرا کے دل میں پیوست ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اک عجب سے احساس کے ساتھ اس شخص کا چہرہ دیکھتی تھی۔ ہوا ابھی بھی درختوں کے پتے توڑ توڑ کر لا رہی تھی اور دور اس کھوکھے کی بستیاں ابھی تک روشن تھیں اور فضا میں گیت کی مدہم آواز ابھی تک موجود تھی۔ ''یو نو زہرا اکلوتے بیٹوں پر فرماں برداری کا بڑا بوجھ ہوتا ہے اور میں یہ بوجھ تمہارے کندھوں پر نہیں لادنا چاہتا تھا۔''

اور اک اور بھالا سب سے زیادہ تیز دھار والا بھالا۔ زہرا امتیاز کے دل میں کھبا تھا۔ اس نے تکلیف سے بخش کو دیکھا اور اس طرف دیکھے بنا بخش جانتا تھا کہ زہرا کن نظروں سے اسے دیکھتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے گال تر تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ اور نم تھیں، لیکن پھر بھی دو جبڑے بھینچے۔ اسٹیرنگ کو مضبوطی سے تھامے سامنے دیکھتا رہا۔ زہرا چند لمحے تیز نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''واؤ! جسٹ واؤ ڈیٹس گریٹ۔۔۔ گریٹ (واہ!۔۔۔ بہت خوب۔ خوب) وہ کافی دیر بعد اچانک بولی تھی اور بخش نے یوں زہرا کو دیکھا کہ جیسے وہ پاگل ہو گئی تھی۔ یہ ری ایکشن۔۔۔؟

''تو پھر تم ایک اچھے مرد کے بجائے ایک فرماں بردار بیٹے بن گئے ہے نا بخش۔۔۔ اینڈ دس از دا اینڈ۔۔۔ ایک اچھا فرماں بردار بیٹا۔ جس نے محبوبہ کی زندگی بھی بچائی اور اپنی بھی۔ ماں کی پسند سے شادی کی اور اب اپنے غم بھول کر ایک کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔ واہ۔۔۔ بہت خوب۔ آئی مین۔۔۔ ویٹس امیزنگ (میرا مطلب ہے... یہ حیرت انگیز ہے) اور بخش کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑی تھی۔ معلوم نہیں کیوں؟ وہ شاک سے زہرا کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور زہرا اس نے اذیت سے چہرہ موڑ کر کچھ آنسو اور بہائے۔ پھر رگڑ کر گال صاف کیے اور اس شاکڈ بیٹھے شخص کو دیکھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اس۔۔۔ اس ساری رام کہانی کو سن کر میں تمہارا کندھا تھپتھپاؤں؟ یا تالیاں پیٹوں؟ تم نے مجھے۔۔۔ مجھے بچا لیا بخش؟ اوہ سیریسلی؟'' اور اس کی آواز حلق میں پھنس پھنس جاتی تھی۔ وہ چند لمحے اور زہر بھری نظروں سے اسے تکتی رہی۔ ''تم ایک فرمانبردار بیٹے تھے۔۔۔ یہ تمہیں مجھ سے اظہار کرنے سے پہلے یاد کیوں نہ آیا؟ تم مردوں کی فرماں برداری کیا اس عورت کو ہرٹ کر کے ہی پوری ہوتی ہے جو کہ بیوی یا پھر محبوبہ ہوتی ہے؟'' وہ زور زور سے بول کر پوچھ رہی تھی۔

''تمہاری ماں ہیں نا وہ۔۔۔ ہیں ناں؟۔۔۔ تو پھر تم ان کی عادات و خواہشات سے انجان کیسے رہ سکتے ہو کیسے؟۔۔۔ کیسے۔۔۔'' اب کی بار اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اپنے زانوں پر گرائے تھے۔

''یہ جس میس (بے ترتیبی) کے بارے میں تم نے بعد میں سوچا نا بخش۔ اس میس کے بارے میں تمہیں سب سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ سب سے پہلے اور اگر تم اس میس کو ہینڈل کرنے لائق ہوتے تو تب تم مجھے انوالو کرتے۔ مجھ سے آ کر کہتے۔۔۔ پر نہیں۔۔۔ تم مردوں کو عورتوں کی زندگی کو اک جہنم بنا کر رکھ دینے کا شوق ہوتا ہے اور پھر بعد میں تمہیں خیال آتا ہے کہ او۔ ہو۔ ہو یہ تو نہیں ہو سکتا۔ ایسے تو

زندگی عذاب ہو جائے گی۔ ماں روٹھ جائے گی۔ یہ ہو جائے گا۔ وہ ہو جائے گا۔ اک عورت کو اس سب میں انوالو کرنے کے بعد تمہیں ماں یاد آ جاتی ہے۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔'' اور بخش ایسے تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ بلاؤ تو بدن میں جان نہیں۔ وہ یک ٹک پلک جھپکے بنا زہرا کو دیکھ رہا تھا کہ جس کا زہر آلود، طنزیہ لہجہ چہرے پہ تھپڑ مارتا تھا۔

''عورت کو خواب دکھلاتے ہو۔ سنہرے، حسین خواب اور پھر اسے دوزخ میں دھکیل کر خود غائب ہو جاتے ہو۔ اس معاشرے کا طاقت ور ہونے کے باوجود تم مردوں کو آج تک ''محبت'' جیسے مسئلے کا حل نہیں سوجھا۔ ہر دفعہ۔ ہر بار یہ ہی حل ہوتا ہے ''فرماں برداری'' بجالو۔۔۔ محبت جھونک دو!۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیوں بخش؟'' اور اس کے سوال۔۔۔ یا میرے خدا۔۔۔ اس کے سوال؟۔۔۔ بخش کے لیے سانس لینا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

''زہرا۔۔۔ زہرا میں اور کیا کرتا؟''

''کم از کم مجھ سے اظہار محبت نہ کرتے۔'' وہ بل کھا کر، تڑخ کر بولی تھی اور بخش کا منہ کھل گیا۔ تب ہی یک دم بخش پر انکشاف بھی ہوا تھا کہ وہ صحیح کہتی تھی۔

''تم انجینئر بن گئے، اک اچھی خاصی نوجی کمپنی میں ملازمت حاصل کر لی۔ تم نے یہ فلر آؤٹ کر لیا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے، مگر تم یہ فلر آؤٹ نہ کر سکے کہ تمہارے مرضی، تمہاری فرماں برداری سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولی تھی۔ ''یو نو واٹ بخش۔۔۔ ہمارے معاشرے کا مرد کبھی یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتا۔

نہیں کبھی نہیں۔۔۔ اس کی فرماں برداری ایک عورت کو ہرٹ کر کے ہی پوری ہوتی ہے۔ قدموں کے تلے کی جنت تب ہی اسے مل سکتی ہے اس کے علاوہ تو کوئی دوسرا رستہ ہے ہی نہیں۔'' وہ اب تھک چکی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ان میں سے اب پانی نہیں بہتا تھا۔ چہرہ تپ رہا تھا اور گلا بیٹھ چکا تھا۔

''دروازہ کھولو مجھے جانے دو۔'' ذرا سے توقف کے بعد وہ سنجیدہ سے لہجے میں بولی تھی۔ بخش نے میکانکی انداز میں دروازہ کھولا تھا۔ زہرا گاڑی سے اتری اور لحہ بہ لحہ اس کی گاڑی سے دور ہوتی چلی گئی اور وہ وہیں اسٹیئرنگ پہ ہاتھ جمائے ساکت شاکڈ بیٹھا رہا کہ اچانک شیشے پر دستک ہوئی۔ وہ بری طرح سے چونکا۔

''زہرا؟'' اس کے ہونٹوں نے بلا آواز جنبش کی۔ وہ اسے شیشہ نیچے کرنے کا کہہ رہی تھی۔ بخش نے فوراً شیشہ نیچے کیا تھا۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر شیشے پر جھکی تھی۔

''تم میری زندگی کے پہلے مرد تھے اور تم سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں چاہا، لیکن آج کے بعد یہ یاد رکھنا خدا بخش کہ تم سے بڑھ کر میں نے کسی سے بھی نفرت نہیں کی۔۔۔ کسی سے بھی نہیں۔۔۔'' ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا۔ ساتھ میں مشت بھر خاک بھی اٹھا لایا اور وہ ساری کی ساری خاک خدا بخش کے چہرے پر ڈال گیا تھا۔ تو زہرا چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''کمال ہے تم لوگ اسے۔ اس کے ساتھ چھوڑ آئے۔ حد ہوتی ہے اور دیکھو وہ ابھی تک نہیں آئی؟''

''آنٹی فکر نہ کریں۔ نہ وہ بچی ہے اور نہ بخش۔ آ جاتی ہے۔'' منال عالیہ کا بازو سہلاتے ہوئے بولی تھی، مگر ان کی پریشانی تھی کہ کم نہ ہوئی تھی۔ بدر لاؤنج میں چکر پر چکر کاٹ رہا تھا اور ممتاز صاحب سنجیدہ نظر آئے، کھڑکی میں کھڑے تھے۔

''ممتاز۔ پلیز جائیں، اس کا پتا۔۔۔'' اور اچانک وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

''زہرا؟'' عالیہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھی تھیں بدر بھی رک سا گیا، منال اور ممتاز صاحب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''امی!۔۔۔ آپ خالہ کو ہاں کہہ دیں۔'' عالیہ کے بڑھتے قدم ساکت ہوئے اور باقیوں کے

دل۔۔۔ کہہ کر اندر جا چکی تھی اور وہ سب حیرت سے اک دوسرے کا چہرہ تکتے رہ گئے تھے۔

''یہ ہوا کیا تھا؟۔ آخر کیا؟''

☆☆☆

وہ کہتی ہے میں مرد ہوں۔ حقیقت طاقت رکھتا ہوں، مگر فلر آؤٹ کیسے کروں؟ کیسے؟۔۔۔

''مرضی پوری ہوتی ہے تو ماں ناراض ہوتی ہے۔ ماں خوش ہوتی ہے تو مرضی (زہرا) ناراض۔'' کروں تو کروں کیا؟ کیسے ایکوئیشن (مساوات) حل ہو کیسے؟ وہ اس بری طرح سے اس سوال میں جکڑ گیا تھا کہ صبح دوڑنے جاتا تو گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ہانپنے لگتا اور ''حل'' کے لیے دماغ لڑاتا رہتا۔ کھانا کھاتے اگلا نوالہ لینا بھول جاتا اور وہ ''کیسے'' کے گرداب میں الجھا پڑا رہتا۔ آفس میں نامکمل فائلز کا ڈھیر بڑھتا جا رہا تھا اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے فلر آؤٹ کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتا رہتا۔ اس نے ایک دفعہ زہرا کو کھو دیا تھا۔ اب نہیں۔ اب نہیں۔ نو۔ نیور۔ ''ناٹ ایٹ اینی پرائس'' (کسی قیمت پر نہیں)

اس نے تو محبت کی کہانی کا روایتی سا اینڈ کر دیا تھا۔۔۔ کر چکا تھا، مگر یہ لکھاری زہرا ممتاز۔۔۔ میرے خدا۔ اس نے بخش کے منہ پر طعنوں کے تھپڑ مار مار کر اس کا منہ لال کر چھوڑا تھا۔ اندر خانہ وہ اسے کہہ کے گئی تھی کہ تم مرد ہو تو کیسے مرد ہو جو اس مسئلے کا حل نہ تلاش سکے۔ تف ہے تم پر۔ ہاں تو ٹھیک تھا نا۔ یہ معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے اور تو پھر توازن قائم رکھنا بھی اسی کا کام ہے۔ ہاں عورت مدد کر سکتی ہے، مگر یہ معاشرہ جب مرد کو فوقیت دیتا ہے، تسلط اسی کا ہے۔ محبت وہ کرتا ہے تو عورت کو اس کا جائز مقام بھی اسی کو دلانا ہو گا۔

یہ مساوات اسی کو حل کرنی ہو گی اور اسی کو حالت توازن میں لانا ہو گا۔ کیونکہ یہ مقام، یہ عہدہ اسے خدا نے دیا ہے اور جب خدا نے دیا ہے تو وہ اس کا اہل بھی ہے۔ سارا مسئلہ یہ ہے کہ اسے بس اس چیز کو ''فلر آؤٹ'' کرنا ہے۔ اور پھر اک مرد کہ جس کا نام خدا بخش تھا۔ اس نے یہ فلر آؤٹ کر ہی لیا تھا اور جس دن اس نے فلر آؤٹ کیا تھا اسی رات کی گاڑی پکڑ کر وہ گاؤں روانہ ہو گیا تھا۔ اب کی بار اسے پہلے سارا میس صاف کرنا تھا اور پھر زہرا سے بات، مگر زہرا تو۔۔۔

☆☆☆

''تم کب آئے؟'' صبح ناشتے کی میز پر بخش کو موجود پا کر سردار بیگم حیران ہوئی تھیں۔

''رات کو؟''

''خیریت؟''

''جی! خیریت ہی ہے۔'' سردار بیگم چند لمحے اس کا چہرہ کھوجتی رہیں اور وہ مطمئن سا پراٹھے سے انصاف کرتا رہا۔ پھر اک سانس خارج کر کے وہ کرسی پر بیٹھی تھیں۔

''کتنے دنوں کے لیے آئے ہو؟''

''کل کا آف لیا ہے۔ پرسوں اتوار ہے۔ سو اتوار کی شام کو جاؤں گا۔''

''خیر! اب آئے ہی گئے ہو تو ماں کو جواب دے کر جانا۔''

''اگلا جملہ بولیں ماں جی۔ اگلا جملہ۔۔۔'' وہ دل ہی دل میں بے تاب ہو کر بولا۔

''اس لڑکی کی تو اب تک شادی ہو چکی ہوگی بخش ورنہ میں تمہارے لیے چلی ہی جاتی۔ مان جاؤ اب بچے۔''

''نہیں ماں جی! اس لڑکی کی شادی نہیں ہوئی۔ ابھی تک نہیں ہوئی تو پھر؟'' وہ ترنت بولا تھا۔ یہ تھا وہ اگلا جملہ جس کا بخش کو انتظار تھا جو پچھلے کچھ عرصے سے ماں جی اس سے کہتی چلی آ رہی تھیں، لیکن اب کی بار ''حل'' اور ''جواب'' دونوں سوچ کر آیا تھا۔ اب آپ پھنسیں گی ماں جی! آرام سے دھماکا کر کے، اس نے سکون سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سوچا تھا۔ سردار بیگم اتنی شاکڈ ہوئیں کہ نوالہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے پلیٹ میں جا گرا تھا۔

''وہ تو اک کیا؟'' بھی نہ کہہ سکیں اور حیرت

سے اسے تکتی رہ گئیں۔ پل میں ان کا منہ سرخ ہوا تھا۔ بخش کے بابا اور اس کی چھوٹی بہن نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ماں جی کو اور پھر بخش کو۔ ساڑھے تین سال بعد پھر سے۔ وہ کئی لمحے تو کچھ بول ہی نہ سکیں۔

''تو تم دونوں کی یہ پلاننگ تھی؟'' وہ تپ کر بولیں۔

''نہیں۔۔۔ قسمت کی۔'' بخش کے اطمینان میں اب بھی فرق نہ آیا، مگر اب کے جو اچانک خیال دماغ میں آیا تھا اس نے سکون و اطمینان دونوں غارت کردیے تھے۔ ''کہیں واقعی ہی میں زہرا کی شادی ہوگئی ہوئی تو؟'' اس کا بلڈ پریشر اک دم لو ہوا تھا، مگر ماں جی کے سامنے اس نے پیروں تلے کی مٹی نہ چھوڑی تھی۔

''جو لڑکی تمہیں ابھی سے۔۔۔''

''ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ ماں جی......!'' بخش نے بے حد ادب سے ان کی بات کاٹی تھی۔

''بابا؟''

''جی بیٹے۔''

''اگر ماں جی میری بارات لے کر نہیں جاتیں تو کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟'' اور ماں جی تو ماں جی۔۔۔ بابا کا منہ بھی کھل گیا تھا۔

''بابا۔ پلیز جواب دیں۔'' (منہ نہ کھولیں) اگلا جملہ پھر سے دل میں کہا گیا۔ بابا نے اک پل کو شریک حیات کو دیکھا۔ پھر اولاد کو۔۔۔ اور تیسرا کام پیشانی مسلنے کا کیا تھا۔ وہاں پر ان تینوں کے دل دھڑک رہے تھے اور بابا خاموش تھے کیونکہ ان کا اپنا دل بھی دھڑک رہا تھا۔

''سردار بیگم! مجھے افسوس تو ہمیشہ رہے گا کہ میں نے تمہارا ساتھ نہ دیا، لیکن میں اپنے بچے کا دل اور زندگی۔ دونوں برباد نہیں کرنا چاہتا اور میں تمہارا ساتھ دیتا۔ ضرور دیتا گر یہ بات جائز ہوتی۔ یہ بخش کا حق ہے۔ تمہیں ماننا چاہیے۔'' اور بخش کے دل میں تشکر کا وہ احساس ابھرا تھا کہ جس نے اس کی آنکھ کو نم کردیا تھا۔ وہ چند لمحے سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر سر اٹھا کر باپ کو مسکرا کر دیکھا۔ اور وہ اک مسکراہٹ کیا کچھ نہ کہتی تھی۔

''چھوٹی تم؟۔۔۔'' بخش کے یک دم بولنے پر مینا ہڑبڑائی اور ہڑبڑا کر ماں کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ بخش کو حیرت نما دکھ ہوا وہ اس کی لاڈلی تھی اور بھائی بھائی کرتے زبان تھکتی نہ تھی اور اب۔۔۔ وہ مایوس ہوا تھا کہ اچانک مینا کا پیر بخش کے پیر سے ٹکرایا تھا۔ وہ ساتھ ہی تو بیٹھی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا وہ ''تھمبس اپ'' کا اشارہ کررہی تھی اور بخش۔ اسے بڑے زور کی ہنسی آئی تھی جسے وہ پی گیا تھا۔ ماں سامنے تھی وہ کیسے منہ بھر کر کہہ دیتا اسے ٹوٹ کر مینا پہ پیار آیا۔

''ٹھیک ہے مینا۔ جیسے تمہاری مرضی۔'' بظاہر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اور پھر ایک ایک کرکے سب وہاں سے اٹھتے گئے۔ وہاں اب سردار بیگم اور بخش تھے۔ سردار بیگم ڈھے سی گئی تھیں۔ وہ اٹھا ان کے قدموں میں جا بیٹھا۔ ان کے دونوں ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھ میں لیے۔ وہ چند لمحے انہیں سہلاتا رہا۔

''ماں جی! میری مرضی میرا حق ہے اور یہ حق کسی اور نے نہیں میرے اللہ نے مجھے دیا ہے۔ آپ مجھ سے یہ حق نہیں لے سکتیں۔ باوجود اس کے کہ آپ میری ماں ہیں اور میری جان پر سب سے زیادہ حق آپ کا ہی ہے۔ مجھے کوئی آپ سے دور نہیں کرسکتا۔ کوئی بھی نہیں اور میری فرماں برداری تب بھی سلامت ہی رہے گی۔ آپ دیکھیے گا۔'' اس نے یہ کہہ کر ماں کے دونوں ہاتھ عقیدت سے چومے۔ انہیں آنکھوں سے لگایا اور اٹھ کر چلا گیا تھا۔

''یہ میری زندگی ہے ماں جی۔ اسے آپ کیسے جی سکتیں ہیں۔۔۔ کیسے؟۔۔۔'' اور یہ جملہ وہ ان سے کہہ نہیں سکا تھا۔

☆☆☆

''بدر۔ زہرا انگیجڈ ہے کہیں؟''

''تم؟۔ بے غیرت انسان ابھی بھی تم میں۔۔۔''

''گالیاں جتنی دل سے دے لینا، مگر بعد میں۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔'' اس نے بات کاٹی تھی۔ فون کے دوسری طرف وہ جتنا بے تاب تھا وہ بدر اچھی طرح محسوس کرسکتا تھا۔

''ہاں۔!'' بدر تپ کر بولا تھا اور پھر بدر نے محسوس کیا تھا محض اپنی حس سماعت کے بل پر۔ اس نے محسوس کیا کہ فون کے دوسری طرف کوئی مرگیا تھا۔

''کیوں پوچھ رہے ہو؟۔۔۔'' مگر بخش جواب دیتا تو کیسے دیتا۔۔۔ وہ تو مرگیا تھا۔ اک پل، اک لمحے ہی میں۔

''خبیث آدمی انگیجڈ تو وہ نہیں تھی۔۔۔ تم پتا نہیں کیا پڑھ کر پھونک گئے تھے اس پر۔۔۔ کہ وہ راضی ہی نہیں ہوئی تھی مگر اب ہے۔ اب راضی ہے۔۔۔ اور جلد انگیجڈ بھی ہوجائے گی۔۔۔'' اپنے تئیں بدر نے اسے کچھ اور مارنا چاہا مگر۔۔۔ نہیں جانتا تھا کہ اس کے لفظوں نے کسی کو زندہ کردیا تھا۔

''یا میرے خدا۔۔۔ یا میرے خدا۔۔۔'' بخش نے کرسی کا سہارا لے کر اس پہ ڈھے سا گیا تھا۔ یہ سننے کے بعد۔ بدر۔ میری بات سنو۔

''پلیز آئی نیڈ یو ٹو لسن می'' (مجھے تمہاری ضرورت ہے مہربانی کرکے میری بات سنو) اور پھر وہ آہستہ آہستہ ساری بات اسے سمجھاتا گیا تھا۔

☆☆☆

''ابو!''

''ہوں؟'' اور ابو نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بنا جواب دیا۔ بدر نے ایک لمحے کے لیے انہیں دیکھا اور پھر کتاب ان کے ہاتھ سے لے کر سائڈ پہ رکھی تھی۔ وہ خالی پھیلے ہاتھوں کے ساتھ اسے حیرت سے تکتے رہے۔

''بات ذرا سنجیدہ ہے۔''

''اوہ۔ کم آن۔ منال سے لڑائی ہوئی ہوگی۔۔۔'' وہ دوبارہ کتاب اٹھانے لگے۔۔۔ بدر نے اچانک کتاب پر ہاتھ رکھ کر انہیں کتاب

اٹھانے سے روکا۔

''بخش کے والد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔۔۔'' اور پھر فوراً کہا گیا تھا۔ ممتاز صاحب نے شاکڈ ہو کر اسے دیکھا۔

''کیوں؟۔''

''کیونکہ وہ شادی شدہ نہیں ہے۔ زہرا کو غلط فہمی ہوئی تھی۔''

''اوہ۔ گاڈ۔ تو تمہاری ماں نے صحیح گیس کیا تھا۔''

''جی!۔۔۔ امی صحیح تھیں۔'' انہوں نے اسی لیے خالہ کو بھی نہیں کہا تھا کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ زہرا کا یہ فیصلہ، ضد اور جذباتی پن کا نتیجہ ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔۔۔'' ممتاز صاحب نے دونوں ہاتھ چہرے پہ پھیرے تھے۔ ''کب ملنا ہے؟''

''ابھی چلے چلیں۔۔۔ وہ بخش کے ساتھ، اس کے فلیٹ پہ موجود ہیں۔'' بدر نے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

☆☆☆

عنایت بخش کے والد نے یہاں آنے سے پہلے خاندان کے چیدہ چیدہ افراد کو اکٹھا کیا تھا جن میں ان کے چھوٹے بھائی اور ان کی دو بڑی بیٹیوں کے خاوند اور ان کے والد شامل تھے۔ انہوں نے سارا مسئلہ کھول کر ان کے سامنے رکھا لیکن ان لوگوں کو سردار بیگم کو پریشرائز کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ چھپ کر بیٹے کا نکاح نہ کرنے چاہتے تھے۔ جو مسئلہ تھا انہوں نے خاندان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نکاح سادگی سے ہو۔ ولیمہ جب ماں راضی ہو جائے تب ہوگا۔ ابھی اسی مسئلے پہ بات کرنے کے لیے وہ ممتاز صاحب سے ملنا چاہتے تھے۔ اور ممتاز صاحب کو تو اعتراض نہ تھا مگر عالیہ متامل تھیں۔ تو ان کے خیال میں، اب زہرا یہ رشتہ قبول کرنے والی نہیں تھی۔ سب کا خیال تھا بشمول بخش کے کہ اسے انجان رکھا جائے۔ سب کے کہنے پہ عالیہ مان تو گئیں مگر دل میں اک دھڑکا موجود تھا۔ وہ ان کی بیٹی تھی اور وہ اسے اچھی طرح سے جانتی تھیں۔

انہوں نے تو یہاں آ کر بھی بخش کا پتا کروایا تھا مگر انہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ بدر کو اس کے دوبارہ وہاں آنے کا بھی علم نہ ہو سکا تھا کیونکہ اس نے پتا کروایا تھا، تب تک بخش نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

اس نے گھڑی کو دیکھا اور پھر امی ابو کو۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔

''آپ؟۔'' وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔ عالیہ اور ممتاز نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور ان دونوں کے دل ایک بار، ایک ساتھ دھڑکے تھے۔ نہ صرف ان کے کمرے کے باہر موجود بدر اور منال کے بھی۔ اور اپنے فلیٹ پہ موجود۔ خدا بخش اور مینا کے بھی۔ مینا تو دوپٹا سر پر لیے آلتی پالتی مارے۔ صوفے پہ بیٹھی مسلسل زیر لب ورد کر رہی تھی اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھی۔

''یا اللہ! بھابھی کوئی فساد نہ کرے۔ یا اللہ! بھابھی مان جائے۔۔۔'' اور بخش کے پیروں میں سکون نہ تھا۔ پیروں میں کیا اس کے تو دل میں بھی سکون نہ تھا۔ لکھاری زہرا ممتاز کچھ بھی کر سکتی تھی کچھ بھی۔۔۔ اور یہ وہ کچھ بھی، کر دینے کا ڈر ہی تو تھا جو عالیہ اسے بتانے چلی آئی تھیں تاکہ اسے جتنا فساد، جتنا کھڑاگ کھڑا کرنا تھا وہ پہلے ہی کر دے۔ عین موقع پہ بدک گئی تو؟۔۔

عالیہ اس کے ساتھ بیڈ کے ایک طرف بیٹھ گئیں اور ممتاز صاحب دوسری طرف۔ اور وہ ہکا بکا کبھی ماں کو دیکھتی اور کبھی باپ کو۔۔۔ ''بیٹے!'' عالیہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ''ہم نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔'' اور زہرا کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ عالیہ نے اس کی رنگت فق ہوتے ہوئے محسوس کی تھی۔

''اگلے جمعہ کو تمہارا نکاح ہے۔'' اور اس نے ماں کے ہاتھ کو یک دم مضبوطی سے جکڑا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرمی۔ سرد پڑ رہی تھی۔

''بخش کے ساتھ۔۔۔'' ممتاز صاحب نے کہا۔ اور وہ ایک جھٹکے سے اس نے پلٹ کر باپ کو

دیکھا اور حیرت جمع بے یقینی جمع شاک سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

''وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ تو۔۔۔'' اس کی زبان لکنت زدہ ہو گئی تھی مگر جو وہ کہنا چاہتی تھی عالیہ سمجھ گئی تھیں۔

''تم نے ہی اس سے محبت نہیں کی زہرا ممتاز۔۔۔ اس نے بھی تم سے کی ہے۔ سو وہ کیسے کسی اور کو زندگی میں لے آتا۔'' عالیہ نے مسکرا کر، اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا تھا اور وہ۔ ایک پل کو نا سمجھی کی سی کیفیت میں بیٹھی رہی اور پھر دوسرے ہی لمحے ماں کے سینے سے منہ چھپا کر رو دی تھی۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔۔۔'' عالیہ اسے خود میں بھینچتے ہوئے، منہ اٹھا کر شکر ادا کیا تھا کہ لکھاری زہرا ممتاز نے کوئی فساد، کوئی کھڑاگ نہیں مچایا تھا نہ صرف انہوں نے بلکہ دروازے کے باہر کھڑے منال اور بدر نے بھی۔ ٹھیک اسی پل بخش کے سیل پہ پیغام آنے کی ٹون بجی تھی۔ مینا نے سانس روک کر بخش کو دیکھا اور بخش نے پیغام کو۔۔۔ اور وہاں ایک ہنستا ہوا چہرہ تھا جو بدر نے بھیجا تھا اور بخش نے منہ آسمان کی طرف کر کے اک تشکر بھرا سانس لیا تھا۔

''یا ہو۔۔۔ بھابھی مان گئی۔۔۔'' مینا نے صوفے سے چھلانگ لگائی اور بخش کے گلے جا لگی تھی۔ بخش نے ہنس کر اس کا سر چوما تھا۔

☆☆☆

''ماں جی!۔۔۔'' اور وہ کچھ نہ بولیں۔ وہ بھی ٹھہر سا گیا۔

''ماں جی۔ میں آخری دستخط کرنے تک آپ کا منتظر رہوں گا۔'' اور یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کا لہجہ روتا سا تھا۔ ماں کے دل نے محسوس تو کیا مگر انا۔ ماں کے دل سے بڑی ہو گئی تھی۔

''سردار بیگم۔ اب بھی وقت ہے۔ چلو۔ میرے ساتھ چلو۔۔۔'' مگر سردار بیگم نے منہ موڑ لیا۔ دل اتنا دکھی تھا کہ بس۔۔۔ اور وہ شوہر سے بھی خفا تھیں۔ اور شوہر۔ وہ بے حد مایوس اور دل گرفتہ سے ہو کر پلٹ گئے تھے۔ باہر گاڑی تیار کھڑی تھی۔ جس میں ان کی بیٹیوں کے سسر، وہ اور ان کے بھائی جا رہے تھے بخش کے نکاح میں شمولیت کرنے۔ مینا اور بخش پہلے ہی وہاں موجود تھے۔

گھر میں سردار بیگم کے کمرے سے باہر بہنیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آئی ایک ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشیوں میں کیسے شامل نہیں ہو سکتی کیسے؟۔۔۔'' وہ بخش کی دوسرے نمبر والی بہن تھی۔ دونوں بڑی بہنیں محض ماں کی دل آزاری کی خاطر اکلوتے بھائی کے نکاح میں شامل نہیں ہوئی تھیں۔ بابا انہیں گھر پہ ہی چھوڑ گئے تھے کہ ان کی ماں کو دکھ ہوگا۔ چلو کوئی تو ان کے ساتھ ہو۔ بڑی والی تو خاموش تھی مگر وہ۔

''ہم سے تو مینا اچھی رہی۔۔۔ بھائی کی خوشی میں تو شریک ہے۔۔۔''

''کوثر!۔۔۔'' بڑی نے آنکھیں دکھائیں۔۔۔ مگر کوثر بری طرح سے دکھی تھی۔

''خوب صورت نہیں تھی تو کیا تھا ماں جی!۔ بخش کو پسند تھی کیا اتنا کافی نہیں تھا۔ یا پھر آپ سے یہ ہی بات ہضم نہیں ہوئی کہ آپ کے لاڈلے فرماں بردار بیٹے نے اپنی مرضی کی ہے۔'' وہ روتی جاتی تھی اور بولتی جاتی تھی۔ بڑی بہن کے اشاروں کو بالکل بھی سمجھتی نہ تھی اور سردار بیگم۔ وہ چپ۔ خاموش۔ اپنے کمرے میں موجود ان آوازوں کو سنتی تھیں۔

☆☆☆

زہرا کے نکاح کی تقریب گھر میں ہی ارینج کی گئی تھی۔ ممتاز صاحب نے بھی خاندان کے چیدہ چیدہ افراد کو ہی بلایا تھا۔ گو کہ رخصتی ابھی ہونی تھی مگر ولیمہ تب ہی ہونا تھا کہ جب سردار بیگم راضی ہوتیں۔ دونوں خاندان اس بات پر متفق تھے کہ ولیمے کا فنکشن گرینڈ ہوگا اور اس میں دونوں طرف سے خاندان بھر کے لوگوں کو بلایا جائے گا اور خدا بخش۔۔۔ خدا قسم وہ اتنی دور ہونے کے باوجود آخری دستخط تک۔۔۔ واللہ

آخری دستخط تک ماں کا منتظر رہا تھا لیکن ہر چیز ایک قیمت رکھتی ہے اور وہ قیمت چکانی بھی پڑتی ہے۔" بڑے بھاری دل کے ساتھ بخش نے آخری دستخط کیے تھے۔ پھر زہرا کو رخصت کروا کر گھر پہنچے۔

سردار بیگم زہرا کو ریسو کرنے بھی نہیں آئی تھیں بلکہ انہوں نے اپنے ردعمل کے طور پر کمرے کا دروازہ زور سے بند کیا تھا۔

"پریشان نہیں ہونا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس ردعمل پہ عنایت صاحب نے اس کا سر تھپتھپا کر کہا تھا اور اس نے سر ہلا دیا۔ ایسے ہی استقبال کی توقع تھی مگر۔۔۔ بخش کی بہنیں۔۔۔ انہوں نے کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ تھیں نا اس کا پرتپاک استقبال کرنے کے واسطے اور ہاں! اس کی توقع بھی زہرا کو نہ تھی۔ اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اور لکھاری زہرا امتاز روایتی دلہنوں کی طرح سر جھکا کر بیٹھی نہ رہ سکی تھی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا معلوم نہیں کیوں؟۔ وہ اٹھی اور کمرے کی کھڑکی کھول دی اور جیسے ہی کھول کر پلٹی۔ انجینئر خدا بخش اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہی اک دوسرے کو دیکھ کر ساکت ہوئے تھے۔ پھر بخش نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ زہرا کے دل میں زور کا ابال اٹھا۔ اس کی آنکھیں نم ہوئیں مگر۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کشن اٹھا کر پوری قوت سے بخش کی طرف پھینکا تھا۔

"او۔ او۔ آؤچ۔" اور بخش کشن کو کیچ کر کے رک سا گیا تھا۔ یوں جیسے حیران ہو۔ یہ حملہ اس پہ ہوا تھا اور وہ بھی محض چند گھنٹوں کی دلہن کی جانب سے۔۔۔ ہیں؟۔۔۔ ابھی حیرت رفع بھی نہیں ہو سکی تھی کہ۔۔۔۔

"آؤچ۔۔۔" اب کہ وہ گھٹنا پکڑ کر دوہرا ہوا تھا۔ یہ ہیئر برش تھا۔ اور اب وہ روتے ہوئے کسی تیسری چیز کی تلاش میں تھی۔

ڈیپ ریڈ کلر کا زرتار۔ عروس لباس۔ سرخ، نم آنکھیں۔ بھیگے سے گال اور اس سب کے ساتھ ایسا استقبال۔۔

"اف۔۔۔" بخش نے بھلا کب ایسا تصور کیا تھا۔ اس نے رونے والے انداز میں آنکھیں بند کیں اور جیب کھولیں۔۔۔ تو وہ ہاتھ میں اک گلدان لیے کھڑی تھی۔ بخش کی آنکھیں پھیل گئیں۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ اور وہ شعلہ جوالہ بنی کھڑی۔ کھا جانے والی بلکہ ہڑپ کر جانے والی نظروں سے اسے دیکھتی تھی۔ "زہرا۔ نو۔ نو۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھائے، اس کی جانب نپے تلے قدموں سے بڑھ رہا تھا۔

"نو۔ یہ۔ یہ نہیں۔"

"تم یہ سارا میس (گند) پہلے صاف نہیں کر سکتے کیا؟۔۔۔" انداز جارحانہ۔

"زہرا اسے۔ رکھ دو۔۔۔" وہ کب سنتا تھا اس کی بات۔ اس کی نظریں تو گلدان پہ جمی تھیں۔

"زہرا۔ ڈارلنگ۔ سویٹی۔ اسے رکھ دو۔" اس نے پچکارا زہرا کو رونا کچھ اور آیا۔ ساڑھے تین سال کی اذیت پھر سے یاد آئی تھی اور۔۔۔ "آ۔۔۔" آواز اتنی گونج دار تھی کہ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ زہرا نے بے ساختہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے۔ یہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ وہ دونوں چند لمحے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پہ دستک کے منتظر رہے، مگر لگتا کہ سب تھکن کے باعث گھوڑے گدھے بیچ کر سو چکے تھے۔ بے اختیار ان دونوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ بخش گل دان سے بچا اور گل دان ٹھا کر کے جا کر دروازے کو لگا تھا۔ بخش نے مڑ کر اک نظر گلدان کو دیکھا اور پھر اسے۔ وہ اب دونوں ہاتھ مسلتی سر جھکائے کھڑی تھی۔ وقفے وقفے سے بہنے والی آنسو کی لکیریں گالوں کو کچھ اور نم کر رہی تھیں۔ وہ دھیرج سے آگے بڑھا۔

"زہرا؟" اس نے نرمی سے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھا اور جتنی نرمی سے رکھا تھا، اتنے ہی برے طریقے سے جھٹک دیا گیا تھا۔ وہ اب کے رخ موڑے کھڑی ہو گئی تھی۔ رونا ہی اتنا آ رہا تھا۔ کیا کرتی؟۔ "زہرا۔۔۔" اب کے بے حد پیار سے کہتے ہوئے بخش نے شانوں سے پکڑ کر اس کا رخ موڑا تھا اور بس۔۔۔ بس جی! دلہن صاحبہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر دھواں دھار رونا شروع کر دیا تھا۔ بخش جانتا تھا کہ یہ رونا کیسا تھا۔ کیوں تھا؟۔ کس لیے تھا۔ اس نے نرمی سے اسے گلے سے لگایا۔ "بس۔ بس زہرا۔ شش۔ بس۔" وہ نرمی سے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے کہہ رہا تھا مگر وہ کہاں سنتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے، اس کی شرٹ کو مٹھیوں میں بھینچے روئی چلی جا رہی تھی۔ یہ ساڑھے تین سال کی اذیت تھی۔ ساڑھے تین سال سے جمع تھا۔ آسانی سے تو ختم نہ ہوتا۔ بخش نے اسے خود سے الگ کیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کیا اور پھر مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تم مجھے کہتے۔۔۔ مجھے بتاتے تو سہی بخش۔ کچھ کہتے تو سہی۔۔۔ خدا قسم میں ہر طرح کے حالات قبول کر لیتی۔ کیا کرنا تھا۔ آخر کیا کرنا تھا میں نے ایسی زندگی کا جس میں تم نہ ہوتے۔۔۔" وہ منہ اٹھائے، اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اور وہ یہ تو نہ کہہ رہی تھی۔ وہ ساڑھے تین سال کی اذیت بیان کر رہی تھی۔ بخش کے دل پہ چوٹ پڑی۔

"آئم سوری میں نے فگر آؤٹ کرنے میں بہت دیر کر دی۔" وہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔

"اوہ! شکر خدایا کہ تم نے کر تو لیا۔۔۔" وہ اب کے آنکھیں بند کر کے سکون سے بولی تھی۔ زہرا جانتی تھی کہ زندگی اتنی آسان نہ تھی۔ مگر یہ اتنی مشکل نہ تھی کہ جتنی بخش کے بنا ہوتی۔ بخش بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ مشکلات تھیں۔ اور وہ کون سی زندگی ہوتی ہے جس میں مشکلات نہیں ہوتیں وہ تھی ناں۔ اس کی بیٹر ہاف۔۔۔ اس کی مشکلات اور آسانیوں کی ساتھی تو پھر سب سہا جا سکتا تھا۔ سب وقت سدا اک سا نہیں رہتا۔ وہ بدلے گا اور ضرور بدلے گا۔ وہ اپنی کوشش سے بدلے گا۔ وہ ماں کا وہ ہی فرماں بردار بیٹا ہے۔ وہ یہ ثابت کرے گا مگر یہ ثابت کرنے میں وہ زہرہ کو ہرٹ کرے گا نہ ہی اس پہ کوئی بوجھ لادے گا۔

☆☆☆

بچوں کی پسند کی شادی۔ چاہے بیٹا ہو یا بیٹی۔ یہ حق انہیں اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) دیتے ہیں۔ تو پھر ہم اور آپ کون ہوتے ہیں یہ حق ان سے چھیننے والے۔ ماں باپ کے حقوق اور بچوں کی ذاتی زندگی ان دونوں میں ایک بڑی واضح لائن ہے۔ خدارا اس کو گڈمڈ مت کریں۔ ہٹ دھرمی بچوں کی طرف سے ہو یا ان کے ماں باپ کی طرف سے۔ ہمیشہ معاملات کو انتہا پہ لے جاتی ہے اور انتہا، ہمیشہ بربادی لاتی ہے۔ چاہے گھر سے بھاگنے کی شکل میں ہو یا پھر کل کو ماں باپ کو گھر سے نکال دینے کی شکل میں۔ تھوڑی سی برداشت۔ ذرا سا حوصلہ۔ اور وہ رہ گئی محبت تو۔ یہ جو محبت ہوتی ہے نا۔ یہ جب نہیں ملتی تو وجود میں کسی سیم کی طرح پھیل جاتی ہے۔ ناکارہ کر کے چھوڑتی ہے اور بندہ کسی کام جوگا نہیں رہتا۔ نہ ملے تو سمجھوتے کے نام پہ زندگی تو گزاری جاتی ہے مگر دل۔ یہ بنجر اور بے آباد رہتا ہے۔ کسی سیم زدہ علاقہ کی مانند۔ سو جب دو دل ملائے جا سکتے ہوں اور یہ ایسی مشکل بات بھی نہ ہو تو پھر آخر دل بنجر اور وجود سیم زدہ کیے ہی کیوں جائیں۔ ذرا سوچیے!

☆☆

ناولٹ

نفیسہ سعید

کلثوم زمانی بیگم

"یہ کیا ہے؟" اس نے اپنے سامنے رکھے سلور کے ٹیڑھے میڑھے کٹورے میں موجود ملغوبہ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے حیرت بھرے انداز میں فیضو کو تکتے ہوئے سوال کیا، جو اس کی بات سنتے ہی گڑبڑا گیا تھا۔

"وہ بی بی جی یہ...... کھچڑی ہے، مالکن ہم غریب لوگ ایسا کھانا کھا کر بھی اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں۔"

اسی دم اس کی مدد کے لیے اندرونی کمرے سے چندا برآمد ہوئی، جسے دیکھ کر جہاں فیضو نے ایک سکھ بھرا سانس لیا وہیں کلثوم کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ یہ سب طنزیہ سنا رہی ہو۔ چندا فیضو کے مقابلے میں خاصی ہوشیار اور شاطر عورت تھی، جس کا اندازہ کلثوم کو کافی پہلے سے تھا، جس کی تصدیق بھی اگلے ہی پل ہوگئی۔

"مگر میں نے تمہیں اپنے کھانے کے لیے الگ سے رقم فراہم کی تھی، پھر یہ سب!"

"ضرور دیے تھے بی بی جی، مگر پندرہ دن قبل......" چندا نے تیزی سے کلثوم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کے دیے ہوئے روپے کوئی ربڑ تو تھے نہیں کہ جنہیں کھینچ کھینچ کر اتنا بڑا کر لیتے کہ ایک سال باآسانی نکل جاتا۔" کلثوم سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ اب اس سے مزید بحث کرنا بے کار ہے۔ لہٰذا خاموشی سے چارپائی سے اٹھتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا، ابھی بھی اس کے پرس میں کافی رقم موجود تھی کہ وہ بازار جا کر ایک ماہ کا راشن خرید لاتی۔ اس طرح کم از کم وہ مزید کچھ دن اس گھر میں رہ سکتی تھی، یہ ہی سوچ کر اس نے تکیے کے نیچے دبا اپنا پرس نکالا۔ پاؤں میں چپل پہن کر وہ جیسے ہی دروازے کی جانب بڑھی، پیچھے سے آتی چندا کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیے۔

"معذرت چاہتی ہوں مالکان، ہمارے گھر میں یہ ہی واحد کمرہ ہے، جہاں آپ کی موجودگی ہم دونوں میاں، بیوی کے لیے خاصی مشکلات پیدا کر رہی ہے

اور پھر چند ہی دنوں بعد برسات کا موسم بھی شروع ہونے والا ہے، تو ایسے میں سوچیں، بھلا ہم کہاں جائیں گے۔ باہر چھوٹا سا صحن تو ویسے ہی چھت سے محروم ہے۔" فیضو کے آنکھیں دکھانے کے باوجود چندا بولتی چلی گئی اور کلثوم اس کی ہر بات سمجھ گئی۔

"بری بات ہے چندا، اس وقت یہ مالکن نہیں ہماری مہمان ہیں اور جب تک چاہیں یہاں رہ سکتی ہیں۔" فیضو نے آگے بڑھ کر اپنی بیوی کو روکنا چاہا۔

"چھوڑ دو فیضو، چندا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، میرا خیال ہے کہ اب مجھے مزید یہاں نہیں رہنا چاہیے۔"

"یہ تو پاگل ہے بی بی جی! آپ اس کی باتوں کا برا نہ منائیں۔" بیس سال تک کھایا گیا اس کے گھر کا نمک شاید ابھی بھی فیضو کی رگوں میں کہیں موجود اسے نمک حلالی کا درس دے رہا تھا، اس لیے وہ شرمندگی سے گردن جھکاتے ہوئے بولا۔ جب کہ چندا منہ بنائی اندر چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں گھس گئی۔

"میں اب کسی کی بات کا برا نہیں مناتی، گردش حالات نے مجھے خاصا سمجھ دار کر دیا ہے۔ تم خواہ مخواہ شرمندہ مت ہو۔" وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے

بولی۔ "بس میرا ایک کام اور کر دو، میرے ساتھ میرپور خاص تک چلو، وہاں امی کے ایک کزن رہتے ہیں، جو خاصے اثر و رسوخ والے زمین دار ہیں، ہوسکتا ہے وہ میرے کسی کام آجائیں، پھر وہاں نزدیک ہی میری ایک خالہ بھی رہتی ہیں، جن سے امی اپنی زندگی میں بہت ہی کم ملیں، کیوں کہ ڈیڈی کو ان کا اپنے غریب رشتہ داروں سے ملنا سخت ناپسند تھا، لیکن ہوسکتا ہے اس مشکل کی گھڑی میں شاید وہ ہی میری کچھ مدد کرسکیں۔"

"ٹھیک ہے بی بی! آپ جہاں کہیں گی، میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں، لیکن یہ بتا دیں، کیا آپ اتنے سالوں بعد ان کا گھر تلاش کر لیں گی۔"

"میرا خیال ہے کہ ہاں، کیوں کہ انکل مقصود شیخ اپنے علاقے میں خاصے مشہور ہیں، اس سال وہ



الیکشن میں بھی کھڑے ہوئے تھے اور جب میں ان تک پہنچ جاؤں گی تو خالہ سکینہ کا گھر بھی مل جائے گا، جن کے شوہر، انکل مقصود کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔"

کسی زمانے میں امی سے سنی گئی یہ معلومات آج اس کے اس قدر کام آئیں گی، یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا، ورنہ امی جب اسے اپنے کسی رشتہ دار کے متعلق کچھ بتاتی تھیں، وہ کبھی دلچسپی نہ لیتی تھی۔ خالہ سے چونکہ وہ ایک دو بار مل چکی تھی، اس لیے ان کا شفقت بھرا رویہ اسے ابھی بھی یاد تھا۔

"بی بی جی! جب آپ حکم کریں، میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر تم اپنی ضروری تیاری کرلو، ہم آج شام ہی میر پور کے لیے نکل جائیں گے۔"

وہ راشن خریدنے کا اپنا ارادہ قطعی طور پر ملتوی کرچکی تھی، کیوں کہ جب اسے مزید یہاں رہنا ہی نہ تھا تو بلاوجہ پیسے ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ صد شکر کہ چندا نے اس کے اس سارے پروگرام میں کوئی مداخلت نہ کی، ورنہ تو شاید اس کے لیے اکیلے میر پور تک جانا خاصا مشکل ہوجاتا اور پھر میر پور جاتے ہوئے بس میں سفر کے دوران سیٹ سے ٹیک لگائے وہ ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی۔

☆☆☆

سفید خوب صورت رتھ اس کے قریب آن کھڑی ہوئی، جس میں سوار خوب صورت شہزادہ مسکراتے ہوئے اس کی جانب تک رہا تھا۔ "آجاؤ، میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔"

کلثوم کے متوجہ ہوتے ہی شہزادے نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس سے قبل کہ کلثوم وہ ہاتھ تھام کر رتھ میں سوار ہوتی، دور کہیں گرتے شیشوں کی چھن چھنا چھن کی آواز اس کے کانوں سے ٹکراتے ہی وہ بوکھلا اٹھی اور رتھ کی جانب بڑھنے والا اس کا پاؤں جانے کس چیز سے ٹکرایا کہ شدت تکلیف سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ "اوہ خدایا! یہ میں خواب دیکھ رہی تھی۔" اپنے اتنے حسین خواب کے اس طرح ٹوٹ جانے پر اس کا سارا موڈ آف ہوگیا، جب اسی پل تیز چھنا چھن کی آواز ایک بار پھر سے گونج اٹھی۔ یقیناً آواز اس کے فون کے الارم کی تھی، جلدی سے تکیہ اٹھا کر اس نے فون باہر نکالا، سات بج چکے تھے۔

ساڑھے سات تک کریم چاچا گاڑی باہر نکال لیتے، کیوں کہ وہ پہلے سوہا اور زوہا کو اسکول چھوڑتے تھے، جو اس کے چھوٹے چچا کی جڑواں بیٹیاں تھیں اور کلثوم کے ساتھ والے گھر میں ہی رہتی تھیں۔ کلثوم بھی ان دونوں کے ساتھ ہی کالج کے لیے نکل جاتی، مگر آج اس کا کالج جانے کا بالکل بھی موڈ نہ ہورہا تھا، کمرے میں پھیلی اے سی کی خنکی نے اسے ایک بار پھر سے سوجانے پر مجبور کردیا، لیکن ابھی اسے آنکھیں بند کیے بمشکل دو منٹ ہی گزرے تھے کہ کسی نے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی، ساتھ ہی لاک میں چابی گھومنے کی ہلکی سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی، اس نے کمفرٹ کو مزید اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر آنکھیں موندلیں، جب اسے اپنے کان کے قریب چندا کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"چھوٹی بی بی، ساڑھے سات ہونے والے ہیں، بوا کہہ رہی ہیں جلدی آجائیں، سوہا اور زوہا آپ کے انتظار میں کھڑی ہیں، ان کو اسکول کے لیے دیر ہوجائے گی۔"

"میں آج کالج نہیں جارہی اور باہر جاتے ہوئے میرے روم کا دروازہ پھر سے لاک کرجانا۔"

"اچھا جی......" وہ الٹے پاؤں واپس پلٹ گئی، کیوں کہ اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ مالکن سے کیا، کیوں اور کیسے جیسے سوال کرتی، اس لیے خاموشی سے نیچے آکر اس نے کچن میں مصروف بوا تک کلثوم کا جواب پہنچادیا۔

"آج کلثوم بی بی نے کالج نہیں جانا۔"

"ارے کیوں......" تازہ پھلوں کا رس نکالتی بوا کا ہاتھ اپنی جگہ رک گیا۔ "میں تو اس کے لیے جوس بھی تیار کرچکی، چلو خیر، تم پی لو، وہ اٹھے گی تو اسے دوبارہ

بنادوں گی، وہ تو فریزر میں رکھا باسی جوس پینا بالکل پسند نہیں کرتی، ہر چیز تازہ اور فریش چاہیے۔"

"تم پی لو، بوا میرا دل نہیں چاہ رہا۔" آہستہ سے کہتی چندا سلیپ پر رکھی پلیٹ کی جانب بڑھ گئی، جس میں اس کا ناشتا تیار رکھا تھا۔

"تم نے اچھی طرح پوچھا تھا، ایسا نہ ہو سورج نکلتے ہی بٹیا کو اپنا کوئی ضروری ٹیسٹ یاد آجائے اور پھر صاحب ہم پر چڑھ دوڑیں۔" بوا کو ابھی بھی شاید کچھ شک تھا، ویسے بھی وہ پچھلے پچیس سالوں سے اس گھر میں کام کررہی تھیں۔ اس لیے ہر شخص کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں۔

"میں تو اچھی طرح پوچھ آئی ہوں بوا، اب اگر تمہیں شک ہے تو ایک دفعہ خود جاکر تصدیق کرلو، کیوں کہ میں دوبارہ اس کمرے میں نہیں جانے والی۔"

دوٹوک انداز میں جواب دیتی چندا وہیں فرش پر نیچے بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی، جب کہ بوا نے کچھ دیر کھڑے ہوکر سوچا اور پھر کچن کے دروازے سے باہر نکل گئی، تاکہ کریم چاچا کو اطلاع دے سکے کہ بٹیا نے آج کالج نہیں جانا، وہ سوہا اور زوہا کو چھوڑ آئیں۔

☆☆☆

"آپ کا نام۔" کلاس میں آج اس کا پہلا دن تھا، اس لیے سرفاضل باری باری تمام طلبہ سے ان کا تعارف حاصل کرتے ہوئے اس تک آن پہنچے۔

"کلثوم زمانی بیگم۔" اس کے جواب دینے سے قبل ہی کسی کی مدھم سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور ساتھ ہی دبی دبی ہنسی کی آواز کلاس میں ہر طرف پھیل گئی۔

"واٹ۔" سرفاضل نے اپنے چشمہ کی اوٹ سے کلثوم کے پیچھے موجود شخص کو گھورا، جو سب کو نظر انداز کیے اپنے سامنے کتاب کھولے ایسے بیٹھا تھا جیسے اسے کچھ علم ہی نہ ہو کہ کچھ دیر قبل کلاس میں سنائی دینے والی آواز کس کی تھی۔ اس کی بے نیازی دیکھتے ہوئے سر دوبارہ کلثوم کی جانب متوجہ ہوئے جو چہرے پر ایک ناگواری سجائے بیٹھی تھی۔

"واٹ از یور نیم؟"

"کلثوم زمان احمد۔" اپنے بالوں کو اک ادا سے جھٹکتی وہ آہستہ آواز میں بولی۔

"اوہ......" سر نے بے اختیار ہی اپنے ہونٹ سکوڑے، کچھ دیر قبل کسی جانے والی آواز کا مطلب اب ان کی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ بے اختیار ہی مسکرا دیے اور اپنا سر ہلاتے جیسے ہی آگے کی جانب بڑھے کلثوم نے پلٹ کر اپنے قریب بیٹھی شبینا کو دیکھا۔

"یہ کلثوم زمانی بیگم کون تھی؟" وہ جب سے اس کلاس میں آئی تھی، کئی بار یہ نام سن چکی تھی۔

"بہادر شاہ ظفر کی بیٹی یا شاید پوتی، مجھے بھی صحیح طرح علم نہیں، کیوں کہ مجھے تاریخ سے کبھی کوئی خاص دل چسپی نہیں رہی۔ لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ برصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد دیگر لوگوں کی طرح شہزادی کلثوم پر بھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے اور یہ سب میں نے اپنے کورس کی کسی کتاب میں پڑھا تھا۔"

کلثوم کا تعلق کیمبرج نظام تعلیم سے تھا۔ اس لیے شاید اس نے کلثوم زمانی بیگم کے متعلق کچھ نہ پڑھا ہو یا پھر اب اسے یہ نام یاد نہ رہا تھا۔ جو بھی تھا خود پر کسی جانے والی آوازوں کا مطلب اسے اب سمجھ آیا تھا اور ساتھ ہی یہ احساس کہ کلاس میں وہ ایک شہزادی کی حیثیت سے جانی جاتی ہے، اس کے غرور میں مزید اضافہ کرگیا۔

☆☆☆

"کلثوم بیٹا آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" وہ ابھی سوکر ہی اٹھی تھی، جب آہستہ سے دروازہ کھولتی مما اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کیوں مما، کیا ہمیں آج کہیں جانا تھا؟" ذہن پر زور دینے کے باوجود جب اسے کچھ یاد نہ آیا تو ثمرین کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

"ہاں بیٹا، میں نے کل تو بتایا تھا، آج تمہارے پاپا کا سالانہ ڈنر ہے، جس میں تمہاری شرکت بہت

ضروری ہے۔ ورنہ وہ ناراض ہوجائیں گے۔" ماں تھیں کلثوم کی شکل دیکھ کر اندازہ لگا چکی تھیں کہ وہ جانے کے موڈ میں نہیں ہے، اس لیے مکمل وضاحت دیتے ہوئے سمجھایا۔

"سوری مما، میرا بالکل موڈ نہیں ہے اور ویسے بھی کل میرا ٹیسٹ ہے۔"

"موڈ نہیں ہے تو بنالو اور ٹیسٹ کی ٹینشن مت لو، ایک ٹیسٹ میں تمہارے اچھے نمبر نہ آنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا اور ویسے بھی تمہارا داخلہ لندن کی لاء یونی ورسٹی میں ہوگیا ہے، میرا خیال ہے کہ اگلے ماہ تک تمہیں یہ یونی ورسٹی چھوڑنا ہوگی، پھر کیا پریشانی؟"

"وہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر......"

"بس اب کوئی بہانا نہیں، میں چندا کو بھیج رہی ہوں، جو ڈریس پسند ہو وہ تمہیں نکال دے گی، تم تیار ہوجاؤ۔" جواب دیتی مما دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی کلثوم کو ایک بڑے فائیو اسٹار ہوٹل کے بینکویٹ میں دیا جانے والا یہ ڈنر اٹینڈ کرنا پڑا۔

☆☆☆

"چھوٹی بی بی...... چھوٹی بی بی۔" وہ شاید سوگئی تھی، اس لیے فیضو کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"میرپور آنے والا ہے بی بی جی۔" کلثوم کو خود کی جانب تکتا پاکر فیضو جلدی سے بول اٹھا۔

"اوہ اچھا......" ایک دم ہی اسے یاد آگیا کہ وہ اس وقت بس میں سفر کررہی ہے، جلدی سے اپنا دوپٹا ٹھیک کرکے اس نے قریب رکھا پرس اٹھالیا، جب اس لمحے تیز رفتاری سے چلتی بس آہستہ آہستہ ہوتے ہوئے رک گئی، چنے بیچنے والا ایک چھوٹا سا بچہ بس میں چڑھ آیا۔

"مسالے والے چنے ہیں جی...... چنے لے لو چنے۔" کلثوم کو یاد آیا وہ صبح سے بھوکی تھی، یہ ہی سب تھا جو بچے کی آواز کے ساتھ ہی بھوک کا احساس بھی اس کے دل میں انگڑائیاں لے کر بے دار ہوگیا۔ اسی وقت کولڈ ڈرنک اٹھائے ایک مرد بھی بس میں داخل ہوگیا۔

"آپ نے کچھ کھانا ہے، تو میں لے آؤں؟" فیضو شاید اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سمجھ چکا تھا کہ اسے بھوک لگ رہی ہے، اس لیے سامنے والی سیٹ سے اٹھ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"نہیں، رہنے دو، میں یہ چنے کھاؤں گی۔" جواب دے کر اس نے جلدی سے اپنا پرس کھولا، اتنی دیر میں فیضو اس لڑکے کو آواز دے کر بلا چکا تھا جو چنے بیچ رہا تھا۔

"ایک بار اچھی طرح سوچ لیں، چھوٹی بی بی، کہیں ایسا نہ ہو یہ چنے آپ کو بیمار کردیں۔"

"اللہ مالک ہے۔" آہستہ سے جواب دے کر اس نے پرس سے سو کا نوٹ نکالا اور اس بچے کے حوالے کردیا، اس کے اس جملے پر فیضو نے چونک کر دیکھا، کیوں کہ یہ لفظ کلثوم کی زبان سے ادا ہوتے اسے خاصے عجیب لگ رہے تھے۔

"لے جاؤ بقایا واپس نہیں چاہیے۔" اپنی جیب سے پیسے نکال کر گنتا، لڑکا اس کی بات سن کر حیران رہ گیا اور پھر جیسے ہی کلثوم کی بات اس کی سمجھ میں آئی، مسکرا کر بولا۔ "شکریہ باجی۔"

اتنی دیر میں بس چل چکی تھی، اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، شام کے پھیلتے سائے میں دور، دور نظر آتے اکا دکا درخت اور اڑتی ہوئی، ریت، مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے جہاں مزدور نما مرد وعورت دکھائی دے رہے تھے، جن کے ماتھوں پر غربت کندہ تھی۔ کچے پکے گھر، ایک ایسی زندگی جس کا تصور شاید کبھی کلثوم نے خواب میں بھی نہ کیا تھا۔ آج اسے حقیقت میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ یہ لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں، آج سے ایک سال قبل اگر وہ یہ سب دیکھتی تو زمین پر چلنے والے اللہ کے یہ بندے اسے بڑے حقیر دکھائی دیتے جنہیں دیکھ کر وہ نفرت سے اپنی ناک سکوڑ لیتی۔

مگر اب وقت بدل گیا تھا اور اس بدلتے وقت نے اس کے دل و دماغ کو بھی بدل دیا تھا اور آج بس میں بیٹھی کلثوم اس کلثوم سے بالکل مختلف تھی جو زمان ملک کی بیٹی تھی، وہ زمان ملک جو ایک بڑے سرکاری محکمہ کا ڈائریکٹر تھے، جن کے رعب و دبدبہ سے ان کے محکمہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی گھبراتے تھے، جنہیں اپنے سامنے کھڑے معمولی انسان کسی چیونٹی سے کم دکھائی نہ دیتے تھے، جن کی گفتگو کے ایک ایک لفظ میں غرور جھلکتا تھا۔ جنہیں شاید اپنی پچپن سالہ زندگی میں کبھی خدا یاد نہ آیا تھا، مگر وقت جو کبھی کسی کا دوست نہیں ہوتا، اس وقت کے بدلتے تیز تیوروں نے زمان ملک کے ساتھ ساتھ ان کے سارے خاندان کو بھی خدا کی یاد دلادی تھی اور یہ سبب تھا، جس نے صرف ایک سال کے مختصر عرصہ میں کلثوم کے اندر کنڈلی مارے بیٹھی بائیس سالہ پرانی رعونت اور شہنشاہیت کو نکال باہر کیا تھا اور آج اسی کلثوم کو بس کی ایک سیٹ پر عام مسافروں کی طرح کاغذ کی تھیلی میں چنے کھاتے دیکھ کر فیضو کو خدا کی خدائی پر ایسا رشک آیا کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور بے اختیار ہی دل کلثوم کے لیے دعا گو ہوگیا، جب کہ کلثوم بس کی سیٹ سے ٹیک لگائے ایک بار پھر سے ماضی کی گہرائیوں میں کھوگئی تھی۔

☆☆☆

"ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا، تم ہر ماہ گاؤں کیا کرنے جاتی ہو۔" ثمرین نے اپنے سامنے کھڑی بوا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"ہر ماہ کہاں جاتی ہوں بی بی جی، ابھی دیکھ لیں، پورے تین ماہ بعد تین دن کی چھٹی مانگ رہی ہوں۔" منت بھرے انداز میں جواب دیتی بوا انہیں آس و نراس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"پھر تمہیں ایڈوانس رقم بھی چاہیے ہوگی۔"

"جی بی بی!" نظریں جھکاتی بوا دھیرے سے بولی۔

"سیف اللہ......" ثمرین نے بوا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کچھ دور کھڑے سیف اللہ کو پکارا۔

"جی بیگم صاحبہ۔" وہ ان کی پکار سنتے ہی دوڑا چلا آیا۔

"بوا کو ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس دے دینا اور ہاں اپنے پاس لکھ بھی لینا، تاکہ مجھے یاد رہے۔" سیف اللہ کو ہدایت دیتی ثمرین ٹھک ٹھک سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئیں۔

"کتنے پیسے چاہئیں بوا۔" ثمرین کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ بوا کی جانب پلٹا۔

"پانچ ہزار روپے دے دو، باقی میں مہینہ ختم ہونے پر لے لوں گی۔" اور پھر بوا کو رقم دیتے ہوئے سیف اللہ نے رجسٹر میں کسی قسم کا کوئی اندراج نہیں کیا، کیوں کہ جانتا تھا ثمرین کے نزدیک ان پانچ ہزار کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ انہیں تو یہ بھی یاد نہ رہے گا کہ بوا کو کچھ رقم ایڈوانس دی گئی، جب کہ بوا کے نزدیک پانچ ہزار خاصی بڑی رقم تھی، تو پھر کیا ضرورت تھی پیسوں کا اندراج کرنے کی، اس طرح کم از کم بوا کو اگلے ماہ تنخواہ تو پوری مل سکتی تھی، یہ ہی سوچ کر سیف اللہ نے ایک بار پھر حساب کتاب میں ڈنڈی ماری، جو وہ اکثر ایسے موقع پر مارلیا کرتا تھا۔

☆☆☆

کلثوم نے دیکھا، کیفے کی پارکنگ میں بالکل جگہ نہ تھی، جب کہ اندر موجود حاذل اسے کئی فون اور میسج کرچکا تھا۔ اس نے سامنے کھڑے کانسٹیبل پر ایک نظر ڈالی اور اسے صرف ایک سیکنڈ لگا سوچنے میں، گاڑی بیچ روڈ پر چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی، کانسٹیبل تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ "میڈم آپ......"

"میری گاڑی پارک کرکے چابی اندر دے جانا۔" کانسٹیبل کی بات کاٹتے ہوئے اس نے تیزی سے اپنا جملہ مکمل کیا۔

"لیکن میڈم......" اب کانسٹیبل نے اپنی بات خود ہی درمیان میں چھوڑ دی۔ غالباً وہ کلثوم کی گاڑی پر لگی ہوئی نمبر پلیٹ دیکھ چکا تھا۔

"یہ میرے بابا کا کارڈ ہے۔ گاڑی پارک کرکے چابی مجھے دے جانا۔"

”او کے میڈم...... السلام علیکم۔“ کارڈ پر نظر پڑتے ہی کانسٹیبل نے بوکھلا کر کلثوم کو سلام جھاڑ دیا اور وہ سر ہلاتی اندر داخل ہوگئی۔ ویسے بھی یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اکثر ایسے موقعوں پر جب وہ ٹریفک میں پھنس جاتی اس کے بابا کا جادوئی کارڈ اور ہری نمبر پلیٹ اسے کسی جن کی طرح ہر مشکل سے نکال لیتی۔ وہ بھرے روڈ پر گاڑی کسی بھی پولیس والے کے حوالے کرتی، جو اسے ٹریفک سے باآسانی نکال لیتا، یہ ہی وہ وجہ تھی کہ وہ اپنی گاڑی میں سارا کراچی بنا کسی خوف و خدشہ کے تنہا گھوم لیا کرتی۔ حالانکہ زمان صاحب نے کئی بار کہا کہ وہ اپنے ساتھ ڈرائیور رکھا کرے، مگر کلثوم کو اپنی آزادانہ زندگی میں کسی بے جان سورتی کا بھی ساتھ منظور نہ تھا۔ اسی لیے وہ ڈرائیور یا گارڈز کے چکروں میں نہ پڑتی تھی، ورنہ زمان صاحب کے ساتھ تو ہر لمحہ گارڈز کی ایک پلٹن موجود ہوتی۔

ابھی اس نے ڈائننگ ہال میں داخل ہوکر حاذل کو تلاش بھی نہ کیا تھا کہ کانسٹیبل گاڑی پارک کرکے چابی اسے دے بھی گیا۔ انعام کے طور پر کلثوم نے اسے کچھ رقم بھی دی، کچھ دور بیٹھا حاذل یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جس کا اندازہ کلثوم کو اس سے ملتے ہی ہوگیا۔

”جب گاڑی پارک نہیں کرسکتی ہو تو اپنے ساتھ ڈرائیور کیوں نہیں رکھتیں۔“ حاذل اسے دیکھتے ہی بولا۔

”پارک کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہیں جو میں نہیں کرسکتی۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اصل مسئلہ پارکنگ کی جگہ کا نہ ہونا ہے۔“

”ایک ہی بات ہے یار، تم ہمیشہ جہاں بھی جاتی ہو، وہاں یہ ہی مسئلہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور پھر بلاوجہ اپنا رعب ان غریب لوگوں پر ڈالتی ہوں۔“ غالباً حاذل کا اشارہ پولیس کانسٹیبل کی جانب تھا۔

”تم ان کی ٹینشن مت لو اور لنچ آرڈر کرو، سچ میں مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ حاذل کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے مینیو کارڈ اپنی جانب کھسکایا۔ حاذل نے بھی مینیو کارڈ اٹھالیا، جانتا تھا کہ اب مزید کچھ کہنا بے کار ہے، کیوں کہ کلثوم ہمیشہ اپنی من مانی کرنے والی لڑکی تھی۔

☆☆☆

”سامنے رکھی میری جوتی اچھی طرح صاف کردو، تب تک میں فریش ہوکر آرہی ہوں۔“ چندا نے جیسے ہی کپڑے استری کرکے ہینگر میں لٹکائے، کلثوم کی جانب سے ایک نیا آرڈر موصول ہوگیا۔

”جی اچھا۔“ انکار کی مجال نہ تھی، اس لیے خاموشی سے سامنے رکھی جوتی اٹھائی اور آہستہ آہستہ صاف کرنے لگی۔ ویسے بھی کچن کی گرمی میں جاکر روسٹ ہونے سے اچھا تھا یہاں بیٹھ کر کلثوم کے بتائے ہوئے کام کرتی رہے۔ اس لیے وہ سست روی سے کام کررہی تھی، جب کلثوم دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور چندا پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے اپنی ناک سکوڑی۔

”تم ابھی تک یہاں ہی بیٹھی ہو، ایک جوتی صاف کرنے میں پندرہ منٹ لگادیے۔“

”جی، بس جارہی ہوں۔“ کلثوم کی بات سنتے ہی وہ یک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک منٹ رکو، یہ تم نے جوتی کون سی صاف کی ہے، تمہارا دماغ خراب وراب ہے کیا، بلیو ڈریس کے ساتھ میں ریڈ شوز پہنوں گی؟ ذرا سینس نہیں ہے تمہارے اندر، بے وقوف لڑکی۔“ سامنے رکھی جوتی پر نظر پڑتے ہی کلثوم زور سے دھاڑی، تو چندا مزید گھبرا گئی، مارے خوف کے آواز اس کے حلق میں کہیں پھنس گئی اور پاؤں جیسے زمین میں جم گئے۔

سامنے رکھے بلیو شوز اٹھاؤ میرے اور اچھی طرح صاف کرو۔“ ایک بار پھر سے آرڈر دے کر کلثوم کپڑے اٹھا کر واپس باتھ روم میں گھس گئی، جب کہ چندا آنکھوں میں آنسو لیے، بلیو شوز صاف کرنے وہیں زمین دوبارہ بیٹھ گئی۔

بس کے جھٹکے سے رکنے کے باعث وہ ایک بار

پھر اپنی سوچوں سے باہر نکل آئی۔ کلثوم نے دیکھا سامنے لگے بڑے سے بورڈ پر میرپور لکھا تھا، فیضو بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب رکھا چھوٹا سا بیگ اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ اس کے پیچھے چلتی کلثوم بس سے نیچے اتر آئی، زمین پر پاؤں رکھتے ہی گرمی کی شدید لہر نے اس کا استقبال کچھ اس طرح کیا کہ کلثوم کے قدموں نے مزید آگے بڑھنے سے ہی انکار کردیا۔ اے سی لینڈ کروزر میں میرپور تک کا سفر کرنے والی کلثوم زمین پر اس لمحہ اس قدر بے بس کھڑی تھی کہ اسے کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کرے، جب فیضو نے آواز دے کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”تھوڑا سا آگے ہوا میں آجاتیں چھوٹی بی بی میں تانگا کرلیتا ہوں۔“ فیضو کی بات سن کر کلثوم نے یہاں وہاں دیکھا۔ بلب کی پیلی روشنی میں ادھر ادھر بکھرے لوگ، اپنے حال میں مست، جنہیں اس گرمی اور حبس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا، جن کی ضرورت صرف روٹی اور تن ڈھانپنے کا کپڑا تھا اور بس، اس سے زیادہ تک تو شاید ان کی سوچ کی بھی رسائی نہ تھی، کلثوم تھکے تھکے انداز میں ایک طرف ہوکر کھڑی ہوگئی، جب فیضو تانگا لے آیا۔ کوچوان مقصود انکل کو جانتا تھا۔ اس لیے نام سن کر بنا کچھ پوچھے تانگا کو اپنی منزل کی جانب ڈال دیا اور کلثوم ایک بار پھر اپنی سوچوں میں گم ہوگئی۔

☆☆☆

”صفدر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ رحیم نے ملک صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”صفدر صاحب —— کی کوئی فائل ہے شاید آپ کے پاس، اس سلسلے میں انہیں بات کرنی ہے۔“

”اوہ......“ انہیں یک دم ہی یاد آگیا۔ ”صفدر انٹرپرائزز کے صفدر خان۔“

”جی...... جی...... وہ ہی۔“

”کہہ دو میں سیٹ پر نہیں ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی ملک زمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”سفیان سے کہو وہ ان سے بات کرلے گا، میں آج بہت بزی ہوں۔ وقت نہیں دے سکوں گا۔“

”جی سر! میں کہہ دیتا ہوں۔“

ملک صاحب کی بات سنتے ہی رحیم تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ملک صاحب نے کچھ دیر وہیں کھڑے ہوکر سوچا اور پھر سامنے رکھے فون سے ایکسٹینشن ڈائل کیا، جس کے دوسری طرف سفیان تھا، جو ان کا دست راز ہونے کا شرف رکھتا تھا اور پھر ملک صاحب نے اسے ساری بات سمجھا کر فون بند کردیا، اب وہ خاصے مطمئن تھے، جانتے تھے سفیان ہر معاملے کو سنبھال لے گا۔

☆☆☆

”رات تم میری برتھ ڈے پارٹی پر کیوں نہیں آئے۔“ صبح حاذل کا فون اٹھاتے ہی کلثوم شکوہ کر بیٹھی۔

”پاپا نے نہیں آنے دیا یار! وہ سخت غصہ میں تھے اور یو نو تم اچھی طرح جانتی ہو جب بابا غصہ میں ہوں تو ان سے کوئی بات منوانا خاصا مشکل ہوجاتا ہے، بہرحال یہ بتاؤ میرے بنا تمہاری پارٹی کیسی ہوئی۔“

”تمہیں انکل نے میری برتھ ڈے پارٹی پر نہیں آنے دیا۔ وجہ پوچھ سکتی ہوں۔“ کلثوم نے شاید حاذل کی پوری بات سنی ہی نہیں۔ کیوں کہ اس کا دماغ ایک ہی جملے میں پھنس گیا تھا، جس کی وہ وضاحت چاہ رہی تھی۔

”پتا نہیں شاید ان کی تمہارے ڈیڈی سے کوئی بات ہوئی ہے۔ خیر جانے دو یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ بڑوں کا پرابلم ہے، خود ہی حل کرلیں گے، تم یہ بتاؤ مجھے ٹریٹ کب دے رہی ہو؟“

”جب تم کہو۔“

”ٹھیک ہے، پھر آج شام ہی ملتے ہیں۔“ حاذل نے پروگرام طے کرکے فون بند کردیا، مگر کلثوم کا دماغ الجھ گیا، اس کے پاپا اور انکل رحمان کے کئی

سال پرانے تعلقات تھے۔ پھر ایسی کیا وجہ ہوئی کہ انکل نے حاذل کو اس کی برتھ ڈے پارٹی پر نہیں آنے دیا۔ شام تک اس کا دماغ ان ہی سوچوں میں الجھا رہا، مگر حاذل سے ملاقات ہوتے ہی اس کی ہر الجھن سلجھ گئی۔

☆☆☆

تانگا جیسے ہی شیخ ہاؤس پہنچا کلثوم ماضی سے نکل کر حال میں آ گئی، جہاں کلثوم کی توقع کے برعکس مقصود انکل اسے اپنے گھر دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے کچھ پریشان سے ہو گئے۔

''تم آنے سے پہلے مجھے فون کر دیتیں، تو میں بس اسٹاپ تک گاڑی بھیج دیتا۔'' سپاٹ اور اجنبی لہجہ، مگر کلثوم اب ان لہجوں کی عادی ہو چکی تھی۔

''سوری انکل، میرے پاس آپ کا فون نمبر نہیں تھا۔'' انکل مقصود کے روکھے رویے نے اسے تھوڑا شرمندہ کر دیا، کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یہاں ایک سیکنڈ بھی نہ رکتی، مگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یہاں آتی ہی کیوں، اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی اس کے دل میں ابھرنے والا ہلکا سا غصہ بھی ختم ہو گیا۔

''بہر حال تم کھانا کھا کر آرام کرو، صبح مجھے ایک جلسہ میں شرکت کے لیے دادو جانا ہے۔ شام تک واپسی ہوگی، پھر تم سے ملاقات کروں گا۔'' کھڑے کھڑے اس سے کل کر وہ باہر نکل گئے، جب کہ آنٹی اور سورٹھ نے تو آ کر اس سے ملنے کی بھی زحمت نہ کی، اسے حیرت ہوئی۔

یہ وہ لوگ تھے جن کی مہمان نوازی کے قصے سن کر وہ بچپن سے جوان ہوئی، اتنی دوستی اور تعلقات کے باوجود آنٹی نے اس سے اس کے بدلتے حالات پر کوئی افسوس نہیں کیا، یہاں تک کہ اس کی ماں کے انتقال کی تعزیت بھی نہ کی، یہ بھی نہ پوچھا کہ زمان بھائی کن حالوں میں ہیں؟ یہ ہی باتیں سوچتے ہوئے اس کی ساری رات گزر گئی اور ساتھ ہی یہ پریشانی کہ اگر مقصود انکل نے اسے یہاں رہنے کی اجازت نہ دی تو وہ کہاں جائے گی اور اب اس سے آگے مزید سوچنے کی اس کی ہمت ختم ہو گئی۔

دن کے انتظار میں رات کا ایک ایک پل اس نے سلگتے ہوئے گزار دیا، ہاں اور نا کی سولی پر لٹکے جانے اسے کب نیند آ ئی کہ پتا بھی نہ چلا۔ سچ ہے نیند تو انسان کو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید کلثوم پچھلے دو ماہ جاگ کر ہی گزار دیتی۔

☆☆☆

یار تم اگر میرا یہ کام کر دو تو یقین جانو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے گا۔''

''لیکن میں نے آج تک کبھی ڈیڈی سے ایسی کوئی بات کی نہیں۔'' حاذل کی بات سن کر کلثوم الجھ سی گئی۔

''تو اب کر لو، ان سے کہو کہ صفدر انکل کی فائل سائن کر دیں، جس کے لیے اپنی ڈیمانڈ میں تھوڑی سی کمی کر لیں، کیوں کہ جو رقم وہ مانگ رہے ہیں، وہ خاصی بڑی ہے۔''

''اس سلسلے میں انکل رحمان خود بات کیوں نہیں کرتے۔''

''کی تھی بات میری جان' انہوں نے بھی کی تھی، مگر جانے انکل کو کیا ہوا ہے اپنی ڈیمانڈ سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹ رہے۔''

''اچھا......'' کلثوم نے ایک گہری سانس لی۔

''چلو، میں می سے بات کرتی ہوں، شاید وہ اس مسئلہ کا کوئی حل نکال سکیں۔'' بات ختم کرتے ہی وہ کرسی کھینچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی حاذل بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بل پر سائن کر کے وہ باہر نکل آئی۔

ان ہی سوچوں میں ابھی وہ اپنی گاڑی کی جانب بڑھی ہی تھی کہ جانے کہاں سے ایک گندہ میلا بچہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، جس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی کلثوم کو اتنی کراہت محسوس ہوئی کہ کچھ دیر قبل کھایا جانے والا لذیذ کھانا ایک دم ہی حلق میں آ گیا۔ شدید متلی کے احساس کے ساتھ ہی دل چاہا کہ ایک زوردار تھپڑ اس لڑکے کو دے مارے۔

''ہٹو میرے سامنے سے۔'' اپنے غصہ کو قابو کرتی وہ قدرے ہلکی آواز میں چلائی، مگر بچے نے شاید سنا ہی نہیں، کلثوم نے جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ جو بچے کے کندھے سے جا کر ٹکرایا اور وہ زمین پر جا گرا۔

''جاہل لوگ؟ گندے میلے بدبودار جانے ان لوگوں کو نیند کیسے آتی ہے۔'' تیزی سے گاڑی ریورس کرتی وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی، یہ دیکھے بنا کہ زمین پر گرا وہ بچہ کس تکلیف کی شدت سے رو رہا ہے، مگر اس سات سالہ معصوم بچے نے کلثوم کی طبیعت اس قدر مکدر کی کہ وہ ساری رات متلی سی محسوس کرتی رہی۔ وجہ اس کی طبیعت کی نفاست پرستی تھی۔ جو ذرا سا گندا اور بدبو برداشت نہ کر سکتی تھی، نہیں جانتی تھی کہ یہ نفاست اور صفائی پسندیدگی کا احساس وقت اور حالات کا محتاج ہے، ایسا نہ ہوتا تو جمعدار گٹر کی صفائی کر کے ہمارے پھیلائے گند کو نہ سمیٹتے اور یہ ہی نظام قدرت ہے کہ بدبو اور خوشبو پسند کرنے پر بھی اکثر لوگ بااختیار نہیں ہوتے۔

☆☆☆

''رحمان بھائی سے آپ کی بات نہیں ہوئی؟'' ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے ثمرین کو کلثوم سے کیا گیا وعدہ یاد آ گیا۔

''کس سلسلے میں؟'' ملک صاحب نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کرتے ہوئے سامنے بیٹھی ثمرین سے پوچھا۔

''صفدر صاحب کی فائل......''

''اچھا تو اس سلسلے میں وہ تم تک بھی پہنچ گئے۔'' ملک صاحب نے تیزی سے ثمرین کی بات کاٹی، ثمرین نے دیکھا غصہ کی ہلکی سی لہر ان کے چہرے پر آ کر جیسے گزر گئی۔

''دراصل حاذل نے کلثوم سے بات کی تھی اور کلثوم نے مجھ سے، آپ جانتے تو ہیں کہ حاذل اور کلثوم کی دوستی کتنی پرانی ہے۔''

''پرانی دوستی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس قسم کی باتیں بچوں سے کی جائیں۔'' آہستہ آہستہ ملک صاحب کا غصہ عروج کو پہنچ رہا تھا۔

''کول ڈاؤن ملک جی، پرانے تعلقات میں اکثر ایسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔'' اب وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ملک صاحب کے قریب آ گئیں اور آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھانا چاہا اور ویسے بھی رحمان بھائی سے بگاڑنا اچھی بات نہیں ہے، اس لیے آپ اس فائل پر سائن کر دیں۔ صفدر انٹرپرائزز والے جتنا دیتے ہیں وہ لے لیں۔''

''یہ تم لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے، سفیان سے ان کی بات چل رہی ہے، مگر مجھے سمجھ میں نہیں آتا اس سارے معاملے میں رحمان کیوں انوالو ہو رہا ہے۔ آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''میرا خیال ہے صفدر صاحب کے بیٹے سے مہرین کے رشتہ کی بات چل رہی ہے اور چونکہ اب معاملہ ان کی بیٹی کے سسرال کا ہے، اس لیے وہ انٹرسٹ لے رہے ہیں۔''

''جو بھی ہے ان کے اس فضول سے انٹرسٹ نے بلاوجہ ہی مجھے ضد چڑھا دی ہے۔ ورنہ تو شاید یہ کام میں کب کا کر دیتا۔''

ثمرین جانتی تھیں کہ ملک صاحب کافی ضدی آدمی ہیں، ایک بار جس بات پر اڑ جاتے، اسے پورا کر کے ہی چھوڑتے اور یہ ہی عادت کلثوم میں بھی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ انہوں نے مزید بحث کا ارادہ ترک کر دیا۔ سمجھ گئی تھیں کہ کوئی فائدہ نہیں ہے۔

☆☆☆

دو دن بعد کلثوم کو لندن کے لیے روانہ ہونا تھا، جہاں کی ایک بڑی لاء یونی ورسٹی میں اس کا ایڈمیشن ہو چکا تھا، لیکن بجائے خوش ہونے کے اس کا دل اداس تھا۔ وجہ شاید حاذل تھا جو پچھلے تین دنوں سے اس سے رابطہ میں نہ تھا۔ کلثوم نے کئی بار فون کیا، مگر وہ کال ریسیو ہی نہ کر رہا تھا۔ انکل رحمان کی ناراضی کے باعث وہ ان کے گھر بھی نہ جا سکتی تھی، ورنہ شاید اتنا مسئلہ نہ ہوتا، ابھی بھی جب وہ می کے ساتھ اپنی

شاپنگ مکمل کر کے گھر پہنچی تو بلاوجہ ہی چنیدا پر چڑھ دوڑی، جو اس کے غصہ سے ڈر کر کچن میں جا گھسی۔

اتنے شدید غصہ کی وجہ مہرین کا نکاح تھا جو آج رات کسی مقامی ہوٹل میں ہو رہا تھا اور انکل رحمان نے اتنے پرانے تعلقات اور دوستی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انہیں انوائٹ ہی نہ کیا تھا اور یہ خبر اسے ابھی کچھ دیر قبل ہی ممی کے ذریعے ملی تھی، جسے سن کر دل چاہا حاذل کو فون کر کے بے نقط کے سنائے، مگر کوئی فائدہ نہ تھا، کیوں کہ وہ فون ہی ریسیو نہ کر رہا تھا، تو کیا فائدہ مزید کال کر کے ذلیل ہونے کا، شاپنگ کا سامان وہیں کارپٹ پر پھینک کر وہ خود بھی صوفے پر ڈھے گئی، جب ممی کے فون کی بیل بجی اسے لگا شاید انکل رحمان یا آنٹی کا فون ہو، جنہیں عین ٹائم پر دعوت دینے کا خیال آ گیا ہو، یہ ہی سوچ کر وہ سیدھی ہو بیٹھی، ممی نے یس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگا لیا۔

"جی...... میں مسز زمان بات کر رہی ہوں۔" دوسری طرف شاید کوئی اجنبی تھا۔

"واٹ...... کیا بکواس ہے یہ......" کلثوم نے چونک کر دیکھا۔ ممی کے چہرے پر غصہ کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی چھا گئی تھی۔

"وہ اس وقت کہاں ہیں؟ ہیلو...... ہیلو......" مگر شاید دوسری طرف فون بند کر دیا گیا، جس کا اندازہ ممی کی حرکات و سکنات دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ وہ گھبرا کر ماں کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا ہے ممی......" مگر شاید ثمرین نے اس کی بات سنی ہی نہیں، وہ تیزی سے کوئی نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔ کئی بار نمبر ڈائل کرنے کے بعد انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اپنا قیمتی فون فرش پر دے مارا، رونے کے ساتھ ساتھ مغلظات کا ایک طوفان اس سے ان کی زبان پر جاری تھا۔ یقیناً وہ انکل رحمان کو گالیاں دے رہی تھیں۔

کلثوم کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ مارے گھبراہٹ اس نے فون سے ملک صاحب کا نمبر ملایا، جو بند جا رہا تھا، لائن کاٹ کر ان کے دوسرے نمبر پر فون کیا، وہ بھی بند تھا، جب کہ عام حالات میں وہ اپنا سیل کبھی آف نہ کرتے، کلثوم نے چاہا وہ دوبارہ ڈائل کرے، جب ثمرین کی روتی ہوئی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

"بند کر دو فون، کوئی فائدہ نہیں ہے تمہارے ڈیڈی کو اینٹی کرپشن والے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ان کے خلاف ادارے میں کرپشن کے حوالے سے کیس درج کیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں مجھے فون آیا تھا۔"

"مگر آپ تو انکل رحمان کو گالیاں دے رہی تھیں۔" وہ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور اسے اس طرح روتا دیکھ کر کچن کے دروازے پر کھڑی چنیدا کی بھیگی آنکھیں طنزیہ مسکرا دیں۔

"اس لیے کہ یہ سب اسی خبیث کا کیا دھرا ہے۔"

"اوہ......" ایک ہی پل میں کلثوم سارا معاملہ سمجھ گئیں۔ "پلیز ممی! آپ روئیں مت، ہمت کریں، وکیل انکل کو فون کریں یا سفیان کو، وہ ضرور کوئی راستہ نکال لیں گے۔"

مگر ساری رات گزرنے کے بعد کلثوم کو اندازہ ہوا کہ مصیبت کی اس گھڑی میں کوئی راستہ نہیں نکلنا۔ سفیان تو خود اس قدر خوف زدہ تھا کہ ان کے کیا کام آتا، جب کہ وکیل انکل کی کوئی بھی کوشش پیر تک کی محتاج تھی، کیوں کہ صبح اتوار ہونے کے باعث سب کچھ بند تھا اور پھر اگلا پورا دن ان ماں، بیٹی نے سولی پر لٹک کر گزارا، کسی رشتہ دار کو فون کر کے صورت حال بتانے سے زیادہ بہتر تھا کہ فی الحال خاموشی سے خود ہی کوشش کی جائے، یہ ہی سوچ کر ثمرین نے فیصلہ کیا کہ وہ رحمان کے گھر جا کر ان سے ملے گی۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والے کھٹکے کی آواز سنتے ہی کلثوم حال میں واپس آ گئی، ماں کو یاد کر کے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئی تھیں، جنہیں تیزی سے صاف کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی کھڑی تھی جو کلثوم کو دیکھتے ہی بول اٹھی۔

"بی بی جی! آپ کا ناشتا لے آؤں؟" ملازمہ کی جانب سے کیے جانے والے سوال نے کلثوم کو مزید شرمندہ کر دیا۔ وہ رات سے یہاں تھی اور گھر کا کوئی فرد ابھی تک اس سے ملنے نہ آیا تھا۔ ایسے میں اسے ڈائننگ ہال میں بلانے کے بجائے کمرے میں ہی ناشتا کا پوچھنا سوائے شرمندگی کے کچھ نہ تھا۔

"آنٹی کہاں ہیں؟" اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے وہ آہستہ آواز میں بولی۔

"وہ تو صبح سے سورٹھ بی بی کے ساتھ شہر گئی ہیں۔ شام تک آ جائیں گی۔ آپ آرام سے ناشتا کریں۔"

ملازمہ اسے صورت حال سے آگاہ کر کے واپس پلٹ گئی۔ جب کہ کلثوم اپنے پاؤں گھسیٹتی دوبارہ بیڈ پر آن بیٹھی، اس عالم تنہائی میں اس کے پاس سوائے ماضی کی یادوں کے کچھ نہ تھا۔ یہ یادیں ہی تو تھیں جن میں ڈوب کر اس کا وقت گزر جاتا تھا۔

☆☆☆

آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا، ان ماں، بیٹی کو یہاں وہاں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے، مگر بہتری کی کوئی صورت دکھائی نہ دی، کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ آگے کیا ہو گا۔ کوئی شخص اس صورت حال میں ان کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا، کیوں کہ سب کو اپنی پڑ گئی تھی۔ زمان صاحب ایک دفعہ عدالت میں پیش کیے جا چکے تھے۔ تمام اخباروں نے اس خبر کو مرچ مسالا لگا کر فرنٹ پیج پر لگایا، جس کے ساتھ ہی ان لوگوں کی عزت خاک میں مل گئی۔

ہر شخص مزے لینے کے لیے ہمدردی کی آڑ میں باتیں سنا رہا تھا، جب کہ حاذل نے تو اپنا نمبر ہی تبدیل کر لیا تھا، رحمان انکل دو دفعہ گھر جانے پر بھی انہیں نہ ملے تھے۔ عدالت کے حکم کے مطابق زمان صاحب کا اکاؤنٹ اور اثاثے انکوائری ہونے تک سیل کر دیے گئے تھے۔ اب صرف وہ رقم باقی بچی تھی جو ثمرین کے پاس تھی۔ گورنمنٹ کی گاڑیاں واپس جا چکی تھیں۔ ہر آسائش، منٹوں میں ان سے دور ہو گئی، پھر بھی ثمرین نے ہمت نہ ہاری، انہیں امید تھی کہ جلد ہی زمان صاحب باہر آ جائیں گے اور سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ہر پیشی کے بعد ایک نئی تاریخ، روپیہ جیسے پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور دن بہ دن ختم ہوتے پیسوں نے جہاں ثمرین کو بوکھلایا وہاں کلثوم بھی پریشان ہو گئی۔ لندن یونی ورسٹی نہ پہنچنے پر اس کا داخلہ کینسل ہو گیا تھا۔ جس کی فی الحال اسے کوئی ٹینشن نہ تھی۔ اصل ٹینشن زمان صاحب تھے جو جیل میں بیمار ہو گئے تھے، انہیں کسی سے ملنے نہ دیا جا رہا تھا۔

جن کی امید ہر پیشی پر ملنے والی نئی تاریخ آہستہ آہستہ ختم کر رہی تھی۔ انہیں اتنے منظم طریقہ سے پھنسایا گیا تھا کہ فی الحال اس جال سے نکلنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بھی جہاں تک ہو سکتا تھا ثمرین کی کوششیں جاری تھیں۔ ایسے وقت میں رشتہ دار کس طرح ساتھ چھوڑتے ہیں، یہ جان کر کلثوم کو بے حد دکھ ہوا، ساتھ ہی حاذل اور اس کی فیملی کے بدلتے رویہ نے بھی کلثوم کو توڑ دیا اور دنوں میں ہی کلثوم بدل گئی۔ سیانے سچ کہتے ہیں، وقت کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ آج آسمان پر دکھائی دینے والے تارے کب ٹوٹ کر اندھیرے کا حصہ بن جاتے ہیں، کوئی نہیں جانتا، وقت کے ہاتھوں کلثوم کی حقیقت بھی ٹوٹے تارے جیسی ہو گئی تھی۔ شاید وہ خود کو سنبھال بھی لیتی۔ اگر ان حالات میں ثمرین ہمت ہار کر اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیتیں۔

وہ منحوس دن جب زمان صاحب کی جائداد ضبط کرنے کا کورٹ نے حکم دیا۔ ثمرین کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا اور وہ کلثوم کو اس ظالم دنیا میں تنہا کر گئیں۔ ماں کا چھوڑا ہوا کچھ زیور جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا، جب کہ اس کے چاچا عبید بھی اس سارے جھنجٹ سے بچنے کے لیے سوہا اور زوہا کو ساتھ لے کر لندن چلے گئے تھے اور اب اس عالم میں کلثوم تنہا تھی، سوائے فیفو کے کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا اور

یہ فیضو ہی تھا جس کے سہارے وہ تنہا میر پور تک کا سفر طے کر کے انکل مقصود کے پاس آئی تھی، اس امید پر کہ شاید وہ اس کا ساتھ دیتے ہوئے زمان صاحب کی ضمانت کی کوشش کریں، مگر یہاں آ کر تو وہ اب بالکل ہی مایوس ہوگئی تھی اور اب چاروں طرف پھیلے اس اندھیرے میں دکھائی دینے والی ہلکی سی روشنی کی کرن امی کی کزن تھیں جن کے پاس شاید وہ کچھ دن جا کر رہ سکتی تھی۔

☆☆☆

سچ ہے چور راستہ سے آنے والی دولت چور راستہ سے ہی واپس چلی جاتی ہے اور پیچھے کچھ نہیں چھوڑتی، سوائے بدنامی کے اور اسی بدنامی کے بوجھ نے زمان ملک کو بیمار کر ڈالا تھا۔ اوپر سے ثمرین کی بے وقت موت نے ان سے جیسے جینے کی تمنا بھی چھین لی تھی، اس بے بسی کے عالم میں ان کے لیے باہر کی دنیا میں اگر امید کی کوئی کرن تھی تو وہ صرف کلثوم تھی جو جانے کہاں اور کن حالوں میں تھی کہ پچھلے پندرہ دنوں میں ایک بار بھی ان سے ملنے نہ آئی تھی، جس کا علم ان کے وکیل کو بھی نہ تھا۔ دیگر پریشانیوں کے ساتھ یہ ایک نئی پریشانی ملک صاحب کی بیماری میں اضافہ کا سبب بن رہی تھی، جس کی بنا پر انہیں جیل کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

''دیکھو بیٹا! کوئی اور حالات ہوتے تو میں ضرور تمہاری مدد کرتا، مگر چونکہ یہ گورنمنٹ کرپشن کا معاملہ ہے اور کیس نیب کے سپرد ہے تو سوری، میں اس سلسلے میں تمہاری بالکل بھی مدد نہ کرسکوں گا۔'' مقصود انکل کی بات ختم ہوتے ہی کلثوم نے ایک گہری سانس اپنے حلق سے خارج کرتے ہوئے ان کے سپاٹ چہرے پر ایک نظر ڈالی، جہاں ہمدردی کی ہلکی سی رمق بھی کہیں موجود نہ تھی۔

''ویسے بھی بابا نیب کے پھڈے میں ذرا سی ٹانگ اڑانے سے نیب والے اپنے ہی پیچھے لگ جاتے ہیں اور ان حالات میں جب یہ الیکشن لڑ رہے ہیں محکمہ نیب ہمارے لیے خاصا خطرناک ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے معاملے میں نہ گھسیٹو۔'' اب اسے باتیں سنانے کی باری آنٹی کی تھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ان کی باتیں سنے گئی، جس کے دوران دو دفعہ اس کا فون بجا، دوسری طرف وکیل انکل تھے، مگر اس نے کال ریسیو نہ کی۔

''اسی لیے کہتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں بچا کر کھاؤ، ایسا نہ ہو ایک دن دھر لیے جاؤ اور پھر ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاؤ۔''

''آپ غلط سوچ رہی ہیں آنٹی۔'' کلثوم نے تڑپ کر ان کی بات کاٹی۔ ''یہ معاملہ کرپشن سے زیادہ ذاتی دشمنی کا ہے۔ میں انکل مقصود کو ہر بات بتا چکی ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مگر کیا ضرورت تھی تمہارے باپ کو صفدر اور رحمان سے دشمنی مول لینے کی، جب کہ وہ رحمان کی طاقت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔'' اس بات کا جواب کلثوم کے پاس نہ تھا۔ اس لیے ایک سرد آہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''انکل آپ مجھے خالہ سکینہ کا پتا بتا دیں، بڑی مہربانی ہوگی۔''

''سکینہ......'' انہوں نے کچھ دیر سوچا۔ شکور کی گھر والی......

''جی شاید وہ ہی......'' چونکہ وہ خالہ سکینہ کے گھر کے کسی فرد کا نام نہ جانتی تھی، اس لیے اتنا ہی کہہ پائی۔

''بیٹھ جاؤ، اللہ ڈینو سے کہتا ہوں، تمہیں چھوڑ آئے گا۔'' اللہ ڈینو شاید ان کے ڈرائیور کا نام تھا۔

''شکریہ انکل! آپ رہنے دیں، میں فیضو کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اس کے بعد نہ انکل نے ضد کی اور نہ ہی اس نے کوشش کی کہ بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر آنٹی سکینہ کے گھر جائے اور جب وہ انکل، آنٹی سے مل کر حویلی کے بڑے سے گیٹ سے باہر آئی تو اسے دروازے تک چھوڑنے سوائے گھر کی ماسی کے کوئی نہ تھا، جب کہ فیضو تانگا لیے پہلے ہی اس کے

انتظار میں گیٹ کے عین سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے خالہ سکینہ کے گھر چھوڑ کر تم واپس چلے جاؤ، میں نہیں چاہتی کہ میرے ساتھ تم اس طرح در، در خوار ہو۔''

''میں آپ کو اس طرح تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' تانگے پر بیٹھتے ہوئے فیضو نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا اور کلثوم خاموش ہوگئی اور پھر سکینہ کے گھر پہنچنے تک اس نے کوئی بات نہ کی۔ مبادا اس کی کسی بات سے فیضو کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

☆☆☆

''آپ کی ملاقات آئی ہے سر!'' زمان صاحب مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ جب پولیس کانسٹیبل نے انہیں آ کر اطلاع دی۔

''میری ملاقات......'' وہ حیرت سے اٹھ کھڑے ہوئے، شاید کلثوم ہو، ویسے انہوں نے اسے منع کر رکھا تھا کہ وہ ملاقات کے لیے جیل نہ آیا کرے، اس کا جیل آنا زمان صاحب کو پسند نہ تھا۔ ان ہی خیالوں میں ڈوبے وہ شیشہ کی اس کھڑکی تک پہنچ گئے جو ملاقاتیوں کے لیے لگائی گئی تھی۔ دوسری طرف سفیان تھا جسے دیکھ کر وہ مزید حیران ہو گئے۔

''معاف کیجیے گا سر! دراصل خود کو بچانے کے لیے میں آپ سے رابطہ نہ کرسکا۔'' انٹر کام اٹھاتے ہی سفیان کی شرمندہ سی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی، بنا کہے بھی وہ اس کی مجبوری جانتے تھے۔ اس لیے کچھ نہ بولے۔

''تمہیں ابھی بھی نہیں آنا چاہیے تھا، ایسا نہ ہو کہ تمہارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔''

''نہیں سر، ان شاء اللہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ دوسری پارٹی آپ سے ایک ڈیل کرنا چاہتی ہے، جس کی تفصیلات میں نے آپ کے وکیل کو بتا دی ہیں، ساتھ ہی میری کوشش ہے آپ سے اگلی ملاقات کمرے میں ہو، جہاں ہم بیٹھ کر آرام سے ہر بات کرسکیں۔'' وہ کس ڈیل کی بات کر رہا تھا۔ زمان صاحب کی سمجھ میں نہ آیا۔

''ٹھیک ہے، تم وکیل صاحب سے ہر بات ڈسکس کرلو اور جو بہتر لگے وہ کرو، میرا مسئلہ صرف اس جیل سے باہر آنا ہے، کسی طرح مجھے یہاں سے باہر نکالو۔''

''بالکل میں یہ ہی چاہ رہا ہوں کہ آپ جلد از جلد باہر آ جائیں۔''

''ایک منٹ، تمہارے پاس کلثوم کا نمبر ہے؟'' سفیان کے انٹر کام رکھنے سے قبل ہی وہ بول اٹھے۔

''ہے تو سہی، مگر کچھ عرصہ سے ان کا فون بند ہے، البتہ وکیل صاحب سے ان کی بات ہوئی ہے، وہ شاید اپنے کسی رشتہ دار کے گھر ہیں۔''

''اچھا......'' جوان بیٹی جانے کہاں در بدر پھر رہی تھی، اس سوچ نے زمان صاحب کے منہ سے تمام الفاظ چھین لیے اور پھر وہ سفیان کو خدا حافظ کہہ کر تھکے تھکے قدموں سے اپنے بیرک کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

اس کی توقع کے برخلاف خالہ سکینہ نے اس کا استقبال بڑے پرتپاک انداز سے کیا اور کلثوم شرمندہ ہوگئی۔ ان حالات میں پہلی بار کسی نے اسے عزت کے قابل سمجھا تھا۔

''میرے بھاگ کھل گئے، آج ثمرین کی بچی نے اس غریب کو رونق بخشی۔''

وہ جتنا کلثوم کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں، کلثوم اتنا ہی مارے شرم سے زمین میں گڑتی جا رہی تھی۔ یہ وہ عورت تھی جسے ساری زندگی اس کے باپ نے اس قابل نہ سمجھا کہ کبھی اس کے سلام کا جواب ہی دے اور جہاں تک کلثوم کو یاد تھا اس نے تو کبھی انہیں سلام بھی نہ کیا تھا۔ اس لیے وہ انہیں روکتے ہوئے بولی۔ ''پلیز خالہ! آپ یہ سب نہ کہیں، مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔''

''لو بھلا اس میں شرم کی کیا بات ہے۔'' خالہ اس کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے بولیں۔ کلثوم نے دیکھا ساگ اور مکئی کی روٹی جو اس نے زندگی میں کبھی

نہ کھائی تھی، ایک دم ہی اس کی بھوک ختم ہوگئی، مگر وہ کچھ بولی نہیں اور اسی رات اس کے فون پر حاذل کی کال بھی آ گئی۔ اسکرین پر جگمگاتا حاذل کا نام دیکھ کر کلثوم جیسے سکتہ میں آ گئی۔ کپکپاتی انگلیوں سے یس کا بٹن دبا کر فون کان سے ضرور لگایا، مگر حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

''ہیلو کلثوم، میں حاذل بات کر رہا ہوں۔'' دل چاہا کہہ دے تمہیں، میں کیسے بھول سکتی ہوں، تم نام نہ بھی بتاؤ تو آواز سن کر ہی جان جاؤں کی کہ تم حاذل بات کر رہے ہو، مگر کہہ نہ سکی۔

''کلثوم تم میری آواز سن رہی ہونا۔'' وہ سمجھا شاید کلثوم نے فون بند کر دیا ہے۔ اس لیے جلدی سے بول اٹھا۔

''ہاں...... بولو، کوئی کام ہے مجھ سے۔'' دل میں ابھرتی تمام تر محبت کو ایک طرف رکھ کر جب وہ بولی تو لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' آج شاید سب کچھ خلاف توقع ہونے کا دن تھا۔ اس لیے حاذل کے منہ سے ادا ہونے والا یہ جملہ بھی خلاف توقع ہی تھا۔

''میں کراچی میں نہیں ہوں۔'' جواب دے کر اس نے نہ صرف فون بند کر دیا، بلکہ سم بھی نکال کر رکھ دی، اتنا سب کچھ ہونے کے بعد اس کا دل ہی نہ چاہا کہ وہ حاذل سے مزید بات کرے۔

☆☆☆

''میری کوشش ہے کہ اس پیشی پر آپ کی ضمانت ہو جائے۔'' وکیل کی بات سن کر زمان صاحب نے اپنا جھکا سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ملک صاحب۔''

وہ جانتے تھے کہ وکیل ٹھیک کہہ رہا ہے، کیوں کہ وہ مخالف پارٹی سے ڈیل کر چکے تھے۔ جس کے بدلے میں انہوں نے سب کچھ کھو دیا تھا، مگر سب سے اہم بات رہائی تھی جو شاید جلد ہی ان کا مقدر بننے والی تھی اور اتنے عرصہ جیل میں رہنے کے بعد اس رہائی کی وہ ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ ان کے پاس کچھ باقی نہ بچا تھا، لیکن بیٹی جیسی قیمتی دولت ابھی بھی موجود تھی، جسے وہ کسی حال میں کھونا نہ چاہتے تھے۔

☆☆☆

فیضو واپس چلا گیا۔ اسے چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ خالی برتن کی مانند یہاں وہاں لڑھکتے ہوئے، سکینہ خالہ کے گھر آ کر اس کی زندگی میں جیسے ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ وقت انسان کو کس قدر تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ سوچتی تو اکثر حیران رہ جاتی، عام حالات میں وہ جس گھر میں ایک رات نہ گزار سکتی تھی، اس گھر میں وہ پچھلے پورے ایک ہفتہ سے موجود تھی، کئی بار اس نے کوشش کی کہ سکینہ خالہ کی کچھ مدد کر سکے، تاکہ وہ اسے بوجھ محسوس نہ کریں، مگر ہر بار ناکام ہوئی، کیوں کہ اس مد میں سکینہ خالہ اس سے ایک روپیہ بھی لینے کو تیار نہ تھیں۔ حاذل کا دوبارہ فون نہ آیا تھا۔ البتہ رات سفیان سے اس کی بات ہوئی تھی، جس نے وکیل صاحب سے کلثوم کا نمبر لیا تھا۔ اس سے ہونے والی گفتگو نے کلثوم کو خاصا مطمئن کر دیا، یہ ہی وجہ تھی کہ صبح وہ ناشتا کے لیے کمرے سے باہر نکلی تو خاصی پرسکون تھی، لیکن اس کا یہ سکون اگلے چند لمحوں میں ہی رخصت ہو گیا۔ جب اوپر کی سیڑھیاں اتر کر ایک کرخت چہرے والا نوجوان برآمدے میں داخل ہوا اور کلثوم پر نظر پڑتے ہی اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔

''آ جا پتر، یہ کلثوم ہے کراچی والی ثمرین کی بیٹی۔'' جواباً نوجوان نے ایک نظر کلثوم کے چہرے پر ڈالی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کلثوم کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''ثمرین آپ کی وہ کزن جس کا امیر کبیر شوہر آج کل کرپشن کے الزام میں گرفتار ہے۔''

''میرے والد نے کوئی کرپشن نہیں کی۔'' کلثوم تڑپ کر بول اٹھی۔

''تو پھر کیا نیب والوں نے انہیں اپنا مہمان بنا کر رکھا ہے۔''

''نہ پتر، گھر آئے مہمانوں سے اس طرح بات نہیں کرتے۔'' سکینہ خالہ نے آگے بڑھ کر معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

''میری بھولی ماں ایسے مہمانوں کو گھر میں رکھنے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیے، ایسا نہ ہو کل کلاں اس کے پیچھے پولیس یہاں بھی آ جائے اور ہم غریب لوگ بلاوجہ ہی پھنس جائیں۔'' ان الفاظ نے کلثوم کو اتنا شرمندہ کیا کہ وہ چپ چاپ، بنا ناشتا کیے اپنے کمرے میں واپس آ گئی، اس کے آنے کے بعد ان ماں، بیٹا میں کیا گفتگو ہوئی۔ کلثوم کو اس سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن اسے یہ ضرور محسوس ہوا کہ شاید اب اس کا اس گھر میں مزید رہنا ممکن نہ تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں غرق تھی، جب سکینہ خالہ اس کا ناشتا لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''میرا پتر دل کا بہت اچھا ہے، اس کی کسی بات کا برا نہ ماننا۔'' سکینہ خالہ نے ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''میں اب کسی کی بات کا برا نہیں مانتی خالہ، آپ پریشان نہ ہوں۔''

''فوجی ہے نا اس لیے ہر بندے پر شک کرنا اس کی فطرت میں گھل گیا ہے۔ ویسے بھی میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں، اس لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کی انکوائری کرتا ہے، تاکہ کل کلاں ماں کسی وجہ سے پریشان نہ ہو۔''

''جی......'' ٹھنڈی آہ کے ساتھ کلثوم کے منہ سے یہ ہی لفظ نکل سکا۔

''تو پریشان نہ ہو، ایک ہفتہ یہاں ہے، پھر واپس چلا جائے گا اور یہاں ہم دونوں ماں، بیٹی ہی رہ جائیں گی۔'' سکینہ خالہ ہر ممکن طریقے سے اسے تسلی دے رہی تھیں۔

''اس کا اپنا گھر ہے، خالہ جب تک دل چاہے یہاں رہے۔'' ناشتے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔ جواباً سکینہ خالہ اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے بالکل خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے کل کی پیشی میں آپ کی ضمانت ہو جائے گی۔'' آج سفیان، زمان صاحب کی ضمانت کے حوالے سے خاصا مطمئن تھا۔

''تمہاری کلثوم سے بات ہوئی؟'' انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پیپرز سفیان کی جانب بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ کل وہ بھی کورٹ آ جائیں۔''

''منع کر دو، فی الحال اسے کورٹ آنے کی ضرورت نہیں ہے، جب میں باہر آ جاؤں گا تو خود اسے لے آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں یہاں سے باہر نکلتے ہی انہیں فون کر دیتا ہوں۔'' سفیان کا موبائل باہر گاڑی میں ہی رکھا تھا، کیوں کہ جیل میں اپنے ساتھ فون لانے کی اجازت نہ تھی۔

''اب میں چلتا ہوں، ان شاء اللہ کل آپ سے ملاقات ہوگی۔'' زمان صاحب سے مل کر سفیان کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''دعا کریں خالہ! کل ڈیڈی کی ضمانت ہو جائے۔'' سکینہ خالہ کو جاء نماز پر بیٹھا دیکھ کر وہ ان کے قریب ہی آن بیٹھی۔

''کیوں، تمہیں نماز پڑھنا نہیں آتی، جو دعاؤں کے لیے بھی دوسروں کی محتاج ہو۔'' شمائل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کا جملہ شاید سن لیا تھا۔ اس لیے فوراً بول اٹھا۔ کلثوم نے پلٹ کر دیکھا، سفید شلوار قمیص میں ملبوس وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہر شخص دعاؤں کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو دنیا سے نیکی کا تصور ہی ختم ہو جائے۔''

''بس کر جا پتر، نہ جھگڑا کر، یہ بے چاری تو پہلے ہی بہت پریشان ہے۔'' جلدی جلدی دعا ختم کر کے خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''آپ سے کس نے کہا میں جھگڑ رہا ہوں؟''
معصومیت سے سوال کرتا شمائل، کلثوم کو ہی دیکھ رہا تھا۔
''اس کی باتوں کا برا نہ ماننا پتر، یہ ایسا ہی ہے''
اسے بازو سے تھامتے ہوئے خالہ اپنے ساتھ کچن میں ہی لے آئیں اور وہ بھی خاموشی سے وہیں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا دل مسلسل ایک ہی دعا کر رہا تھا کہ کل زمان صاحب کی ضمانت ہو جائے، تاکہ وہ اپنے گھر واپس جا سکے، مگر ابھی شاید اور بھی امتحان باقی تھے۔ یہ ہی وجہ تھی جو اگلے دن وکلا کی ہڑتال کے سبب عدالت کے بند ہونے کے باعث زمان صاحب کی پیشی ہی نہ ہو سکی اور معاملہ مزید ایک ہفتہ آگے بڑھ گیا اور کلثوم جس کے لیے اب اس گھر میں شمائل کی موجودگی کے باعث ایک ایک دن کاٹنا مشکل تھا۔ مزید ایک ہفتہ تک انتظار کی سولی پر لٹک گئی۔

☆☆☆

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ چھت کی منڈیر سے نیچے جھانک رہی تھی، جب شمائل اوپر آ گیا اور قدرے مشکوک انداز میں اسے دیکھتا ہوا بولا۔
''نظر نہیں آ رہا، دھلے کپڑے تار سے اتارنے آئی ہوں۔''
''لیکن یہاں اس منڈیر پر تو کوئی کپڑا نہیں لٹک رہا جہاں تم کھڑی ہو۔'' بات کرتا کرتا وہ قدرے آگے آ کر نیچے جھانکنے لگا۔ کلثوم کو اس کی یہ حرکت خاصی بری لگی۔
''فی الحال اس گاؤں میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے تاڑنے کے لیے مجھے اس منڈیر سے نیچے جھانکنا پڑے۔'' شمائل کی حرکت کا مطلب سمجھتے ہوئے وہ خاصا تپ کر بولی۔ جواباً شمائل ایک قہقہہ مار کر ہنس دیا۔
''فی الحال......اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ اس گاؤں میں کوئی ایسا بندہ ہو سکتا ہے جسے تم یہاں کھڑی ہو کر تاڑو۔''
''میرے پاس آپ کی فضول باتوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے تار سے کپڑے اتارتے ہوئے بولی۔

''آہستہ بی بی، اپنا غصہ تار پر کیوں اتار رہی ہوں، ٹوٹ گئی تو کون جوڑے گا۔'' کلثوم نے دیکھا، ایک کرختگی سی اس کے چہرے پر دوبارہ چھا گئی تھی، لگ ہی نہ رہا تھا کہ کچھ دیر قبل لگایا جانے والا قہقہہ شمائل کا تھا۔
''فکر نہ کریں، میں خود ہی جوڑ لوں گی، کیوں کہ اب مجھے ٹوٹی چیزیں جوڑنا بخوبی آ گئی ہیں۔'' جواب دے کر وہ رکی نہیں اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔

☆☆☆

زمان صاحب کی ضمانت ہو گئی تھی۔ کچھ کاغذی کارروائی باقی تھی، جس کے بعد انہیں جیل سے باہر آ جانا تھا۔ اس تھکا دینے والے عمل کے دوران انہوں نے بہت کچھ کھو دیا تھا۔ عزت، دولت، بیوی، نوکری سب کچھ بظاہر سوائے کلثوم کے ان کے پاس کچھ باقی نہ بچا تھا۔ مگر پھر بھی در پردہ اتنا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی دوبارہ شروع کر سکتے تھے جو پہلے جیسی تو نہ ہوتی، مگر پھر بھی خاصی بہتر ہوتی۔
سفیان کے موبائل سے آج کتنے ماہ بعد ان کی کلثوم سے بات ہوئی تھی جو اپنے باپ کی آواز سن کر بہت خوش ہوئی تھی، اس کے لیے اب مزید دو دن نکالنا بھی شاید مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے چاہتی تھی کہ فوراً کراچی چلی آئے، لیکن چونکہ وہاں رہنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لیے مجبوراً اسے سکینہ کے گھر ہی رکنا تھا۔

☆☆☆

چار دناں دا پیار او ربا
لمبی جدائی، بڑی لمبی جدائی

وہ گانے کے بولوں میں بری طرح مست تھی، جب کسی نے آ کر ٹیپ ریکارڈر کا بٹن بند کر دیا، کلثوم نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دروزے کے بالکل قریب، اپنی روایتی کرختگی کے ساتھ شمائل موجود تھا۔
''پوچھ سکتا ہوں، کس کا سوگ منایا جا رہا ہے،

جب کہ اب تو آپ کے والد محترم کی بھی ضمانت منظور ہو گئی ہے۔'' سینے پر دونوں ہاتھ باندھے وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
''آپ کے گھر رہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں ہر بات کے لیے آپ کو جواب دہ ہوں۔'' آہستہ سے کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی، چاہا کہ کمرے سے باہر نکل جائے، مگر دروازے کے عین درمیان وہ کچھ اس طرح کھڑا تھا کہ کلثوم کا باہر نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔
''یہ تم ہر بات کا اتنا غلط مطلب کیوں لے لیتی ہو، میں نے تو ایک سیدھا سادا سوال کیا تھا، جس کا جواب بھی ویسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'' اپنی جگہ سختی سے جما، شمائل ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
جواباً اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ''شاید حالات نے مجھے کسی کی اچھی بات سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔''
''بہرحال تم کل جا رہی ہو، ایسے میں اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت۔'' اتنا کہہ کر شمائل رکا نہیں اور نہ ہی یہ سننے کی کوشش کی کہ کلثوم کا جواب کیا ہے، اپنی بات کہہ کر وہ واپس پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا، جب کہ پیچھے کھڑی کلثوم حیرت سے اسے تکتی رہ گئی۔

☆☆☆

آج خالہ سکینہ کے گھر اس کی آخری رات تھی اور جانے کیوں لاکھ کوشش کے باوجود اسے نیند نہ آ رہی تھی۔ اس لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر صحن میں نکل آئی، جہاں گھپ اندھیرے میں تاروں بھرا آسمان اس قدر حسین منظر پیش کر رہا تھا کہ وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں پر جا بیٹھی، کئی عرصہ کی ذلت و رسوائی کے بعد اس کی زندگی کو ایک سکون میسر آ گیا تھا۔
صبح زمان صاحب نے رہا ہو جانا تھا۔ سفیان ان کے لیے گھر کا بندوبست کر چکا تھا۔ جس کا ایڈریس کلثوم کے پاس تھا۔ چونکہ زمان صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے کلثوم نے انہیں میرپور آنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اکیلی ہی کراچی آ جائے گی۔ ویسے بھی زمانے کے سرد و گرم نے اسے بہت کچھ سمجھا اور سکھا دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں انسان کو جس قدر تیزی سے بدلتے دیکھا تھا۔ شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔
وقت نے اسے احساس دلایا تھا کہ کوئی بھی کسی کا اپنا نہیں ہوتا۔ سوائے دولت کے۔ عزت انسان کی نہیں، پیسے کی جاتی ہے، محبت رشتوں سے نہیں دولت سے کی جاتی ہے اور اگر یہ دولت، عزت اور رتبہ ہی انسان کے پاس نہ رہے تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا، لیکن نہیں سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے، کچھ کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی دولت انسانیت ہوتی ہے، جس کی بڑی مثال سکینہ خالہ تھیں، یہ سوچتے ہی اس کے ذہن میں شمائل کا تصور پھر اتر آیا۔ ساتھ ہی اس کے صبح کہے گئے الفاظ، جنہیں سوچ کر وہ اس بار حیران نہ ہوئی، آخر وہ سکینہ خالہ جیسی عورت کا بیٹا تھا تو، ظاہر ہے اپنی ماں کی کوئی خوبی تو اس میں ہونی چاہیے اور پھر بے اختیار ہی وہ شمائل کا موازنہ حاذل سے کر بیٹھی۔ وہ حاذل جس نے مصیبت کی اس گھڑی میں اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے باپ کا کیا دھرا ہے۔ حاذل کے خیال کے ساتھ ہی پچھلا وقت یاد کر کے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی، جب اسی پل اذان کی تیز آواز کلثوم کے کانوں سے ٹکرائی۔ اللہ اکبر......اللہ اکبر......
بے شک اللہ بہت بڑا ہے، دنیا کی ساری ذلت عزت اسی کی طرف سے ملتی ہے۔ وہ دنیا کی ہر شے پر قادر ہے، تو طے ہوا کلثوم کی جانب آنے والی عزت و ذلت اس کے رب کی جانب سے تھی جو یقیناً ایک آزمائش تھی، کیوں کہ وہ اپنے ہر پیارے بندوں کو آزماتا ہے اور کلثوم کا شمار بھی شاید اس کے پیارے بندوں میں ہو چکا تھا، جنہیں آزمائش کے لیے چنا گیا۔ وہ اپنی قمیص جھاڑتی سیڑھیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی، صحن میں موجود نلکے سے وضو کر کے جیسے

ہی واپس پلٹی پیچھے کھڑے شمائل کو دیکھ کر چونک اٹھی جو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا، سر پر پہنی ٹوپی اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ وہ بھی مسجد نماز پڑھنے ہی جا رہا تھا۔

اسے قطعاً نظر انداز کرتی وہ خاموشی سے برآمدے کی جانب بڑھ گئی جہاں سکینہ خالہ پہلے سے ہی موجود تھیں۔ وہ بھی چپ چاپ ہاتھ میں جاءنماز لیے ان کے پاس جا کھڑی ہوئی، جب کہ شمائل یقیناً مسجد جا چکا تھا۔ نماز کے بعد اس نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا ہی تھا کہ سکینہ خالہ اس کے پیچھے ہی کمرے میں آگئیں۔

بیٹا! باہر آکر ناشتا کر لو، شمائل شہر جا رہا ہے، وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔"

"ارے نہیں خالہ، پلیز آپ انہیں زحمت مت دیں، میں خود چلی جاؤں گی۔ آپ بس اسٹینڈ تک جانے کے لیے مجھے تانگا منگوا دیں۔" سکینہ خالہ کے پہلے ہی اس پر بہت احسانات تھے۔ اب وہ مزید ان کا کوئی احسان لینا نہ چاہتی تھی۔ اس لیے جلدی سے بول اٹھی۔

"زحمت کیسی، جب وہ شہر ہی جا رہا ہے، تمہیں بھی چھوڑ دے گا۔ نہ بھی جا رہا ہوتا تو بھی چھوڑ آتا۔ اس طرح تنہا بچی بسوں میں سفر کرتی اچھی نہیں لگتی۔" اپنائیت سے کہتی سکینہ خالہ کمرے سے باہر نکل گئیں، اب اس کے پاس انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ بچی تھی۔

☆☆☆

جیل سے باہر نکلتے ہی زمان صاحب نے ایک گہری سانس ناک سے باہر خارج کی اور سامنے کھڑے سفیان کو دیکھا جو وکیل سے کوئی بات کر رہا تھا۔ سفیان کے انتظار میں وہ وہیں اس کی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے، انہیں اس طرح کھڑا دیکھ کر سفیان تیزی سے ان کی جانب آیا اور ہاتھ میں پکڑی چابی سے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ "پلیز سر! آپ اندر بیٹھیں، میں ابھی آتا ہے۔"

بنا کوئی جواب دیے زمان صاحب دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھے، ان کی طبیعت میں عجیب سی سستی چھائی ہوئی تھی۔ وہ رعونت اور غرور جو ان کی طبیعت کا خاصا تھا ختم ہو گیا تھا یا شاید حالات کے باعث دب گیا تھا۔ اس وقت وہ خاصے نڈھال دکھائی دے رہے تھے اور چاہتے تھے کہ سفیان جلد اپنی بات ختم کر کے آئے اور وہ گھر جائیں، اس وقت ان کا دل صرف کلثوم سے ملنے اور اسے دیکھنے کو بے چین تھا، اپنی بے چینی کو دل میں چھپائے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے، جب ان کی نظر قریب سے گزرتی گاڑی پر پڑی۔

جس کی فرنٹ سیٹ پر رحمان بیٹھا تھا، وہ بھی شاید جیل سے ہی باہر نکلا تھا۔ زمان صاحب کو قطعی نظر انداز کرتا وہ ان کے قریب سے گزر گیا، زمان صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جیل کیوں آیا تھا؟ شاید زمان صاحب کے سلسلے میں ہی آیا ہوا، انہیں حیرت ہوئی کس طرح لوگ اپنی انا اور ضد میں سالوں پرانے تعلقات ختم کر دیتے ہیں اور اس وقت وہ بھول گئے کہ ان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

☆☆☆

پرانی سی جیپ کا دروازہ کھول کر کلثوم جیسے ہی اندر بیٹھی شمائل اسے دیکھ کر ہلکے سے طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔

"میری جیپ تمہارے باپ کی گاڑیوں جیسی عالی شان نہیں ہے، مگر پھر بھی تمہیں بحفاظت تمہاری منزل تک پہنچا دے گی۔"

کلثوم نے کوئی جواب نہ دیا، یہ ہی وجہ تھی کہ دوبارہ شمائل نے بھی کوئی بات نہ کی، کلثوم خاموشی سے کھڑکی کے باہر بھاگتے دوڑتے نظارے دیکھنے میں اس بری طرح مگن ہوئی کہ گاڑی کب شہر کی حدود میں داخل ہوئی، اسے پتا ہی نہ چلا۔ ایسے میں شمائل نے جیپ ایک جھٹکے سے روکی تو وہ چونک اٹھی۔

"کیا بات ہے کلثوم، تمہیں میری آواز سنائی نہیں دے رہی۔" ماتھے پر بل ڈالے وہ اسے گھور رہا تھا۔

"آپ کی آواز......" کلثوم قدرے شرمندگی سے بولی۔ "آپ کچھ کہہ رہے تھے؟"

"اپنے گھر کا ایڈریس بتاؤ۔" شمائل نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

کلثوم نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑا موبائل کا ان باکس چیک کیا اور سفیان کا وہ میسج نکال لیا، جس میں اس فلیٹ کا ایڈریس تھا جہاں رہائی کے بعد زمان صاحب شفٹ ہوئے تھے۔ خاموشی سے اسکرین آن کر کے اس نے فون شمائل کے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

"تمہارا گلا خراب ہے کیا؟" فون اٹھا کر دیکھتے ہوئے وہ ایک بار پھر کلثوم سے مخاطب ہوا۔

"نہیں......" مختصر جواب دے کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"خیریت ہے، تمہاری تیزی سے چلتی زبان کو آج خاصا بریک لگا ہوا ہے۔" چہرے پر ازل کی سختی لیے وہ ڈرائیونگ کرتا ہوا بولا۔

"کبھی کبھی انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ خاموش رہے، اتنا خاموش کہ سوائے اپنے اندر کی آواز کے اسے کچھ سنائی نہ دے۔"

"تمہارے اندر بھی کوئی رہتا ہے، یہ تو مجھے آج ہی علم ہوا۔" کلثوم نے دیکھا، گھنی مونچھوں تلے شمائل کے لب دھیرے سے مسکرائے۔

"ہر انسان کے اندر وہ خود رہتا ہے اور جب وہ تنہا ہوتا ہوتا ہے تو اپنے اندر بسنے والے "خود" سے دوستی کر لیتا ہے۔"

"سوری میڈم، میں اتنے مشکل الفاظ سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل قاصر ہوں۔" اس کے بعد ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد گاڑی سفیان کے بتائے ہوئے اپارٹمنٹ کے باہر جا کر رک گئی، وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلنے لگی۔ شمائل نے روک دیا۔

"یہ بہت بڑا پروجیکٹ ہے، اندر جا کر گم ہو جاؤ گی، اس لیے بہتر ہے سفیان صاحب کو کال کرو، وہ باہر آکر تمہیں لے جائیں یا پھر میں اندر جا کر چھوڑ آتا ہوں۔"

کلثوم جان چکی تھی کہ اپنی تمام تر کرختگی کے باوجود شمائل ایک خیال رکھنے والا نوجوان ہے، اسی لیے وہ اس سے اسے تنہا اندر نہ جانے دے گا۔ لہٰذا خاموشی سے فون اٹھا کر سفیان کا نمبر ملا لیا۔ دوسری ہی بیل پر سفیان نے کال ریسیو کر لی اور کلثوم کی آواز سنتے ہی بول اٹھا۔

"کلثوم بی بی! آپ اندر کاؤنٹر پر آجائیں۔ میں وہاں کہہ دیتا ہوں، کوئی ملازم آپ کو زمان صاحب کے پاس چھوڑ دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" فون بند کر کے وہ شمائل کی جانب پلٹی۔

"آپ جائیں، سفیان صاحب مجھے لینے آرہے ہیں۔"

"اوکے۔" اتنا کہہ کر اس نے ایک جھٹکے سے جیپ اسٹارٹ کی اور تیزی سے بھگا کر لے گیا، یہاں تک کہ اللہ حافظ کے الفاظ بھی کلثوم کی زبان میں ہی رہ گئے، جب کہ اس نے خود بھی خدا حافظ نہ کیا۔ وہ ایسا ہی تھا، ہر کام اپنی مرضی سے کرنے والا، دل چاہتا تو اتر کر کلثوم سے اچھی طرح مل کر جاتا، نہ دل کیا تو بنا خدا حافظ کہے ہی بھاگ گیا۔

☆☆☆

کلثوم کی زندگی میں برپا ہونے والا طوفان آہستہ آہستہ اپنے اختتام کو پہنچا اور یہ ختم ہوتا طوفان اس کی زندگی سے بہت کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ جن میں سب سے قیمتی سرمایہ اس کی ماں تھی جس کی یاد کلثوم کے دل کو بے چین کیے رکھتی اور ان بدلتے حالات نے کئی چہرے بھی اس کے سامنے نمایاں کر دیے تھے، جن میں سب سے بدنما چہرا حاذل اور انکل رحمان کا تھا۔

حاذل کا اس دن کے بعد دوبارہ فون نہ آیا اور نہ ہی کلثوم چاہتی تھی کہ وہ اسے فون کرے، لیکن اکثر

یہ ضرور سوچتی کہ اس نے کلثوم کو فون کیوں کیا تھا۔ اور اپنے اس سوال کا جواب اسے جلد ہی سفیان کے ذریعے مل گیا، جس نے بتایا کہ ”حازل پڑھنے کے لیے کینیڈا چلا گیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہ اس کا نکاح ہو گیا ہے اور شاید وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ کینیڈا ہی میں ہے۔“ یہ خبر سن کر کلثوم کو کوئی افسوس نہ ہوا، کیوں کہ اتنے عرصہ میں وہ جان چکی تھی کہ جو چیز نصیب میں نہیں ہوتی اس کا نہ ملنا ہی بہتر ہے۔ البتہ اپنی زندگی میں پیدا ہونے والے ٹھہراؤ نے اسے اداس کر دیا تھا۔

زمان صاحب چاہتے تھے کہ وہ اپنی ادھوری تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دے اور اس سلسلہ میں انہوں نے سفیان سے بھی کہہ دیا تھا جس نے کلثوم کو مقامی لاء کالج سے فارم بھی لا دیا تھا، جس کی آخری تاریخ دیکھے بنا کلثوم نے اسے دراز میں ڈالا اور بھول گئی، فی الحال اس کا ارادہ کہیں بھی داخلہ لینے کا نہ تھا، ان حالات میں اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ وہ گھر سے باہر نکلے اور کسی سے ملے۔

ابھی بھی وہ اداس اور تنہا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی، جب باہر سے آتی سکینہ خالہ کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔ وہ یک دم چونک اٹھی اور تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا، بالکل سامنے صوفہ پر سکینہ خالہ کسی نوجوان لڑکی کے ساتھ موجود تھیں جو یقیناً ان کی بیٹی عالیہ تھی، جس کا ذکر وہ اکثر ہی کلثوم سے کرتی تھیں، مگر چونکہ وہ شادی کے بعد سے ہی سعودیہ میں مقیم تھی، اس لیے کلثوم کی اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے پر کھڑی یہ ہی سوچ رہی تھی، جب خالہ کی آواز اس کے کان سے ٹکرا کر اسے شرمندہ کر گئی۔

”پتر دو دن میں، میں اتنی تو نہیں بدل گئی کہ تو پہچان ہی نہ سکے۔“

”السلام علیکم خالہ۔“ وہ آگے بڑھ کر ان کے گلے ملی، سچ یہ تھا کہ خالہ کی آمد نے اسے دل سے خوش کر دیا تھا اور پھر عالیہ کے ساتھ مل کر اس نے دوپہر کا کھانا تیار کیا، اسے خوش دیکھ کر زمان صاحب بھی خوش ہو گئے، کیوں کہ وہ جب سے گھر واپس آئے تھے انہیں کلثوم اداس ہی نظر آئی تھی، ایسے میں کلثوم کی خوشی انہیں بھی سرشار کر گئی۔

خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا، ابھی وہ چائے پی کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ شمائل اپنی ماں اور بہن کو لینے آ گیا، وہ اندر نہ آیا، بلکہ باہر سے عالیہ کو فون کر دیا۔ زمان صاحب نے چاہا کہ شمائل بھی اندر آ کر ان کے ساتھ بیٹھے، مگر خالہ نے بتایا کہ وہ جلدی میں ہے، کیوں کہ انہیں گاؤں چھوڑ کر اسے واپس شہر آنا تھا اور پھر خالہ، کلثوم سے مل کر واپس چلی گئیں اور کلثوم گھر کی تنہائی میں پھر سے اداس اور تنہا ہو گئی۔

☆☆☆

سکینہ خالہ کے جانے کے بعد رات زمان صاحب نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور ان کی بات سن کر کلثوم حیران رہ گئی۔

”ڈیڈی میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”بیٹے سکینہ تمہارے رشتہ کے لیے آئی تھی، شمائل تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اچھا، پڑھا لکھا برسر روزگار نوجوان ہے، مجھے امید ہے تمہیں خوش رکھے گا۔“

”مگر ڈیڈی میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔“ دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیوں کہ میرے اور اس کے مزاج میں بہت فرق ہے، وہ روکھا اور بہت بدلحاظ بندہ ہے اور میں ایسے لوگوں کو قطعی پسند نہیں کرتی۔“

کلثوم کی بات سن کر زمان صاحب خاموش ہو گئے۔ فی الحال وہ کلثوم سے کوئی بحث و مباحثہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے بہتر تھا کہ فیصلہ وقت کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جائے اور وقت جو فیصلہ کرتا ہے یقیناً وہ بہترین ہوتا ہے۔

☆☆☆

وہ لاء یونی ورسٹی فارم جمع کروا کر جیسے ہی باہر

نکلی، نظر سامنے کھڑی جیپ پر پڑی، جسے وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی کہ یہ گاڑی شمائل کی ہے، جب کہ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی نہ تھا۔ گاڑی کو قطعی نظر انداز کر کے اس نے یہاں وہاں دیکھا، دور، دور تک سفیان دکھائی نہ دیا، پتا نہیں اسے یہاں چھوڑ کر وہ کہاں چلا گیا تھا، یہ ہی سوچ کر کلثوم نے ہینڈ بیگ سے اپنا موبائل نکال کر ابھی سفیان کا نمبر ملایا ہی تھا کہ سامنے کھڑی جیپ آہستہ آہستہ چلتی اس کے قریب آن رکی۔ کچھ دیر قبل لگایا گیا اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شمائل براجمان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”سفیان نہیں آئے گا، اس کی بیوی کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی، اسے ہاسپٹل جانا پڑا، اس لیے انکل نے مجھے بھیج دیا۔“ کلثوم نے دیکھا، بات کرتے کرتے اس کا چہرا بالکل سپاٹ تھا، بنا کسی تاثر کے لب بھینچے، وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے بلاوجہ زحمت کی، میں رکشے میں چلی جاؤں گی۔“

”اب تو زحمت کر ہی لی، اس لیے رکشا میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ ایسا کرو رکشا والے کے جو پیسے بنیں وہ مجھے دے دینا۔“

اب مزید بحث کرنا بے کار تھی۔ کلثوم خاموشی سے دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی، جب اچانک ہی شمائل نے ہاتھ میں پکڑا خوب صورت لال گلاب اس کی جانب بڑھا دیا۔

”سوری کلثوم! اگر تمہیں میری کبھی بھی کوئی بات بری لگی ہو، دراصل میں ایک سیدھا سادا دیہاتی آدمی ہوں۔ شاید محبت کا اظہار کرنا نہیں جانتا اور نہ ہی کتابی فوجی ہیرو کی طرح کوئی لمبے لمبے ڈائیلاگ بول سکتا ہوں۔ اس لیے میرے کم کہے کو ہی زیادہ سمجھنا اور بس اتنا جان جاؤ کہ شاید مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“ کلثوم نے چونک کر دیکھا۔ شمائل اس کی جانب دیکھ رہا تھا شاید..... اس کا دماغ اس ایک لفظ میں الجھ گیا۔

”آپ کو یقین نہیں ہے اپنی محبت کا۔“

”نہیں بھئی، ناراض مت ہو جانا، مجھے پورا یقین ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی جواباً مجھے اپنی محبت کا شرف قبولیت بخش دو۔“ وہ اس کی جانب جھکتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”اور اگر میں انکار کر دوں تو......“

”تو وہ سامنے جو پل نظر آ رہا ہے نہ تو محترمہ جیپ وہاں سے نیچے پھینک دوں گا۔ زندگی نہ سہی، موت تو ہمیں ایک کر دے گی۔“

”تو میرا خیال ہے کہ اپنے اس نیک ارادے پر عمل کر ہی لیں تو بہتر ہو گا۔“ وہ اک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے بولی۔

”او خیر! مطلب یہ کہ تم میرے ساتھ مرنے کو تیار ہو۔“

”ہاں ساتھ مرنا اور ساتھ ہی جینا۔“ شانت ہوتی کلثوم نے اپنا نرم و نازک ہاتھ شمائل کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”تو یقین جانو ایسا ہی ہو گا، تمہاری محبت ہی میری زندگی، اور تمہاری محبت ہی میری موت۔“

کلثوم کے ہاتھ کو ہلکے سے دبا کر، شمائل نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور پرسکون سی کلثوم نے اپنا سر سیٹ پر ٹکا کر آنکھیں موند لیں، ایک لمبا اور تھکا دینے والا سفر جو شاید شمائل اور اس کے ساتھ کا وسیلہ بنا تھا۔ اپنی منزل تک پہنچ کر ختم ہو گیا، اسے یقین آ گیا کہ اللہ جو کرتا ہے وہ ہی بہتر ہوتا ہے اور بے شک میرے رب کے فیصلے ہی بہترین ہوتے ہیں۔

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... انمول اور فریحہ
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

آسیہ مرزا

من مورکھ کی بات سناو

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کر لیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے' مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکرمند رہتا ہے۔ جب کہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے' مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا' مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ ماں سے مل کے تمام شکوے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

حوریہ مومنہ کی بھتیجی ہے بے حد محبت کرتی ہے اور مومنہ بھی اسے بے تحاشا چاہتی ہے' حازم جب حوریہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حوریہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہی حال حوریہ کا بھی ہوتا ہے۔ عباد گیلانی حوریہ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ حوریہ میں اسے مومنہ کا عکس نظر آتا ہے اور حازم سے پوچھ کر اس کے نانا یاور علی سے دونوں کی شادی کی بات کرتا ہے۔

حوریہ اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے' فضا کی ایک امیرزادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے' وہ فضا کو بہت سمجھاتی ہے کہ اس راستے پر نہ چلے' مگر فضا نہ مانی اور آخر کار ایک دن محبت کے نام پر بربادی اپنی قسمت میں لکھوا لیتی ہے اور اس بات کا پتا اس کی سوتیلی ماں جہاں آرا کو چل جاتا ہے اور وہ اپنے بھانجے نصیر سے اس کی شادی کرنے کا پروگرام بنا لیتی ہے جبکہ فضا اس پر راضی نہیں ہوتی حوریہ کو جب پتا چلتا ہے تو وہ فضا کو سمجھاتی ہے اس امیرزادے کو کہے کہ وہ اس سے شادی کرے اور فضا اس کو مجبور کرتی ہے کہ یہ بات



وہ خود اس کو سمجھائے اور فضا کے مجبور کرنے پر جب وہ بابر سے ملتی ہے تو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوتا ہے بابر سے ہرگز نہیں ملنا چاہیے تھا اور اس بات پہ بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایک غلط لڑکی کو دوست بنایا۔۔۔ (اب آگے

تیئسویں قسط



بابر کے حواس پر چند لمحے سناٹا طاری رہا۔ ادھر حوریہ بھی شاید اپنے اس جذباتی فعل پر یک دم شرمسار اور چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے آنسو آنکھوں میں ٹھہر کر رہ گئے۔

''کیا ہوا۔'' بابر نے اپنے اعصاب کو سنبھالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میں گیلانی ہاؤس آنا چاہتی ہوں بابر۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''میں وہیں رہنا چاہتی ہوں۔''

بابر بے اختیار ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ ''کس رشتے اور تعلق سے رہنا چاہتی ہوں۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ یکسر بے کھنک تھا۔ یوں سرد سا جیسے بہت سی برف چبالی ہو۔ اسے اپنی کنپٹیوں پر موجود رگیں اکڑتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ کتنی مشکل سے اس نے خود کو جوڑا تھا۔ وہ اسے پھر سے بکھرنے اور ٹوٹنے چلی آئی تھی۔

صبر کے کتنے جام پیے تھے۔

کتنے کڑے لمحوں کا زہر پیا تھا اور کہیں جا کر سنبھلا تھا وہ نئی چوٹ لگانے چلی آئی تھی۔

''میں بہت اپ سیٹ ہوں بابر۔'' چند لمحے کشاکش کے گزرے تھے۔ وہ اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ از حد پریشان اور وحشت زدہ تھی اس کے لہجے سے بھی ظاہر تھا۔

بہت سے سوال بابر کے دماغ میں کلبلانے لگے تھے مگر اس نے کسی سوال کو لبوں تک آنے نہ دیا...... بس سپاٹ اور بے مہر لہجے میں بولا۔

''او کے...... میں گاڑی بھیج دوں گا صبح۔ تم آ جانا۔''

''پلیز بابر۔'' حوریہ جلدی سے بولی مبادا وہ لائن ڈس کنکٹ نہ کر دے۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم خود ہمیں لینے آ جاؤ۔ میں ڈرائیور کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔'' وہ اعتماد کے ساتھ بولی۔

بابر لمحہ بھر دم بخود رہ گیا۔

ادھر حوریہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ حوصلہ ہار دے گی۔ ہمت توڑ بیٹھے گی تو یقیناً کسی بڑے نقصان کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ کسی اجنبی ناآشنا کی ہو کر عمر بھر مثل پتنگا تڑپتی سسکتی رہے گی۔

''میرا نہیں خیال کہ تمہیں اس سے کوئی فرق پڑے گا۔ مقصد تمہارا گیلانی ہاؤس میں آنا ہے۔ کس طرح اور کس کے ہمراہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے ہلکے سے ہنسا تھا بڑی پھیکی ہنسی تھی۔

''فرق پڑتا ہے۔'' اس کا لہجہ پست تھا۔

''او کے میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

حوریہ نے موبائل کو دیکھا پھر اسے ایک طرف رکھ دیا۔ اور جیسے ہی پلٹی مومنہ کو دیکھا جو اس کے کمرے کے دروازے سے پلٹ رہی تھی۔

''پھپھو'' وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی مگر دوسرے پل اس کے قدم وہیں جم گئے۔ عجیب سی ندامت نے اس کی زبان پر قفل لگا دیے۔

اسے یقین تھا مومنہ اس کی بابر سے ہونے والی گفتگو سن چکی ہے۔

وہ خفیف سی دروازے کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھا پائی۔ مومنہ بے حد خاموشی سے حوریہ کے کمرے سے پلٹ آئی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کہ انہوں نے بہت پہلے بابر سے کہا تھا کہ ''محبت جبر سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ اپنے راستے خود بناتی ہے۔ اسے قید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو وہ احساس ہے جو دل کی زمین سے خود پھوٹتا ہے۔ کسی کے دل کی زمین سے یہ پودا اس وقت ہی پھوٹتا ہے جب بیج خالص ہوتا ہے۔

سچی اور خالص محبت کبھی نہیں ہارتی۔ یہ جیت بن کر کہیں نہ کہیں کسی بھی صورت میں مل ضرور جاتی ہے۔

مومنہ وہیں لابی میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اسے جانے کیوں حوریہ کا بابر کو پکارنا اچھا لگا تھا۔

☆☆☆

صبح حوریہ کے گیلانی ہاؤس جانے کے فیصلے کی خبر پاور ہاؤس میں ہوئی تو رقیہ بھابی اور عادل بھائی نے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔

''اب کس رشتے سے جاؤ گی وہاں۔ کس بنیاد پر رہو گی کیا تعلق ہے تمہارا ان لوگوں سے۔'' رقیہ بھابی نے اسے گھرکا۔

''تو پہلے کیا رشتہ تھا کیوں آپ لوگ اصرار کرتے رہے تھے۔''

''تب بات اور تھی۔ کوئی عمر بھر رہنے کو نہیں کہا تھا۔'' رقیہ بھابی برہمی سے بولیں۔

''پھپھو پلیز آپ سمجھائیے ناامی کو۔'' وہ مومنہ کے آگے گڑگڑانے لگی۔ ''میں علی شاہ پر کسی غیر اور اجنبی شخص کا سایہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی علی شاہ سے دست بردار ہوں گی۔''

''دیکھو حوریہ! گیلانی ہاؤس کے دروازے لاکھ تمہارے لیے کھلے ہیں مگر ہماری غیرت گوارا نہیں کرے گی کہ تم عمر بھر وہاں رہو۔ کسی تعلق اور حوالے کے بغیر۔'' عادل بھائی اپنا فیصلہ سنا کر کرسی دھکیل کر کھڑے ہو گئے۔ یاور علی پہلے ہی کھانا ادھورا چھوڑ کر کمرے میں چلے گئے تھے۔ کچھ کہے بغیر۔

''عادل تمہارا برا بھی نہیں سوچ سکتے حوریہ۔ وہ باپ ہے تمہارا تمہاری بھلائی چاہتے ہیں ہم سب۔ بات صرف ہماری غیرت کی نہیں تمہاری عزت کی بھی ہے۔'' مومنہ نے نرمی سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

''مگر میں گیلانی ہاؤس جانا چاہتی ہوں پھپھو۔ میں کچھ نہیں جانتی سوائے اس کے کہ وہ علی شاہ کی پناہ گاہ ہے۔ بابر، علی شاہ کے لیے ایک مضبوط سائبان ہے چھت ہے...... اس کے لیے۔ میں اسے کسی بھی غیر اجنبی کے حوالے نہیں کر سکتی۔'' وہ رونے لگی۔ رقیہ بھابی۔ کچن کے دروازے پر کھڑی بے بسی محسوس کر کے رہ گئیں۔

''وہ علی شاہ کے لیے چھت ضرور ہے۔ مگر تمہارے لیے...... تمہارے لیے کیا ہے۔ سوچا تم نے۔'' حوریہ نے تڑپ کر مومنہ کی طرف دیکھا۔

''نامحرم۔ ایک اجنبی غیر مرد جس سے تمہارا جو بھی تعلق اور رشتہ تھا حازم کے حوالے سے تھا۔ حازم نہیں رہا۔ وہ حوالہ وہ رشتہ بھی نہیں رہا حوریہ۔ تم یہ بات اچھی طرح سمجھتی ہو اور ہمیں بھی یہ بات ایک عرصے تک سمجھاتی رہی ہو پھر اب۔ اب کیا ہوا۔'' حوریہ دل گرفتہ سی ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

''آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں۔ شادی کر لوں ایک اجنبی انسان سے۔ ہاتھ تھام لوں اس کا جس کا ابو کہہ رہے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں اور لہجے میں شکوہ تھا۔ مومنہ دھیرے سے مسکرائی۔

''نہیں میں چاہتی ہوں تم شادی کر لو۔ مگر بابر سے۔''

مومنہ کی بات پر رقیہ بھابی نے سٹپٹا کر حوریہ کی طرف دیکھا تھا اس کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی مگر۔ حوریہ یکلخت سر جھکا گئی تھی۔

''ٹوٹنے سے بہتر ہے انسان جھک جائے۔''

مومنہ دھیرے سے کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ حوریہ نے تڑپ کر سر اٹھا کر ان کی پشت کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

بابر، یاور علی کے کمرے کی بیٹھک میں آیا بیٹھا تھا۔ وہ حوریہ کو لینے آیا تھا مگر عجیب مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ یاور

علی نے سنجیدگی سے یہ مسئلہ اس کے آگے رکھ دیا تھا۔ جانے انہیں کیوں ایک مدہوم سی امید تھی کہ بابر یہ سن کر حوریہ سے شادی کی پیشکش کرے گا۔ مگر انہیں مایوسی ہوئی۔ بابر کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں علی شاہ کو اپنی سرپرستی میں رکھنے کو تیار ہوں۔ آپ حوریہ کی شادی کسی بھی اچھے انسان سے کر دیں۔ اسے کہیے وہ علی شاہ کے لیے فکر مند نہ ہو۔ میں اسے باپ بن کر پالوں گا۔ یوں بھی یہ میرا ہی فرض ہے علی شاہ کی پرورش۔'' وہ یکسر بے کیف لہجے میں کہہ رہا تھا۔

حوریہ رنج سے شق دل لیے دروازے پر ہی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کا تو خیال تھا بابر یہ ساری صورت حال جان کر پریشان دکھائی دے گا۔ کوئی اضطراب اس کی روح کو چھو لے گا۔ وہ مضطرب دکھائی دے گا۔ مگر وہاں تو صحرا جیسا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

یاور علی اور بابر کی نظر اس پر پڑی۔ علی شاہ اس کی گود سے اتر کر بابر کی طرف لپکا تھا۔ بابر نے بھی اسے دیکھ کر جلدی سے اپنی بانہیں پھیلا دی تھیں۔

''آؤ حوریہ۔'' یاور علی اسے یونہی کھڑے دیکھ کر بولے۔ وہ ایک دل گرفتگی کے ساتھ اندر آ گئی۔ اور علی شاہ کی طرف دیکھنے لگی جو بابر کی گود میں آ کر بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا دل سلگنے لگا اور چہرہ کسی احساس سے تمتمانے لگا تھا۔

''مجھے بھی خوشی ہو گی اگر تم علی شاہ کو اپنے پاس رکھو گے۔'' وہ بابر سے مخاطب تھی۔

بابر نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹا دیں اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں یاور علی کے بیڈ کے اونچے سرہانے پر جمی تھیں۔

''میں شاید اس کا بوجھ نہیں اٹھا پاؤں گی۔ مجھے یقین ہے اسے تم سے زیادہ اور کوئی نہیں چاہ سکتا۔ تم سے زیادہ اسے کوئی محبت نہیں دے سکے گا۔ اس لیے میں اسے آج تمہیں سونپ رہی ہوں۔ تم اسے اپنے ہمراہ لے جا سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے میں رکی نہیں تھی۔ بابر کی اٹھنے والی نظروں کو دیکھنے، نہ یاور علی کی افسردہ چہرے کو دیکھنے کے لیے، پلٹ کر تقریباً بھاگتی چلی گئی تھی۔

کمرے میں یکلخت مضمحل سا سناٹا پھیل گیا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ ایک عجیب ویران سی خامشی میں چھپ گئے تھے۔ لمحے اذیت ناکی سے گزرتے محسوس ہو رہے تھے۔

بابر کے وجود سے لپٹا علی شاہ ہی واحد تھا جس کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں سکون اترا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے بابر کی گود میں آ کر اس کے بے قرار دل کو قرار آ گیا ہو۔

وہ کمرہ بند کر چکی تھی اور سب جانتے تھے کہ اب وہ دروازہ، لاکھ کوشش کر لو نہیں کھولے گی۔ کم از کم آج کی رات تو۔ بابر علی شاہ کو لے کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

عشق صبر و رضا کے رخ پر ہے
یہ سفر کربلا کے رخ پر ہے
ایک پل کی خبر نہیں یارو
ہر دیا یہاں ہوا کے رخ پر ہے

بابر کے اعصاب پر شدید دباؤ تھا۔ حوریہ کی نگاہیں جیسے دل پر نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ سوچتا اور الجھتا جا رہا تھا کہ ان نگاہوں میں کیا تھا۔ بے بسی، بے اختیاری کوئی شکوہ، کوئی التجا یا برہمی۔ عجیب سی گرہ تھی جو کھل نہ پا رہی تھی۔

اس نے کوئی چوتھی بار حوریہ کے سیل فون پر رابطہ کیا تھا حوریہ نے کال ریسیو کر لی تھی۔

''میں علی شاہ کو تم سے چھین کر نہیں لایا ہوں۔'' وہ اس کے رویے سے الجھتے ہوئے بولا۔

''ہاں میں نے کب بلیم کیا (الزام دیا) ہے تم کو۔'' وہ افسردگی سے ہنس دی۔

''دیکھو حوریہ...... تمہارے گھر والے تمہارے دشمن نہیں ہیں۔'' وہ رسان سے کہنے لگا۔

''ہاں جانتی ہوں۔ میں ہی شاید خود اپنی دشمن آپ ہوں۔'' ایک بھنچی بھنچی سانس کھینچ کر اس نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ بابر کی آواز سن کر ضبط کا خول ٹوٹنے سا لگا تھا۔

دبیز تاریکی میں ایک روشنی کا احساس سا جگانے لگا تھا جو دھوپ سر پر پڑی تھی اس میں سائے کا بھی ایک احساس لگ رہا تھا۔

رات رات بھر جاگ کر اور سوچتے رہنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے اپنے گھر والوں کے دباؤ سے بچنے اور اپنی بقا کے لیے یہ جنگ لڑنا پڑے گی۔ اگر وہ ہار گئی تو پھر...... عمر بھر پچھتاوا اس کی جھولی میں رہ جائے گا۔ مومنہ پھپھو ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ ٹوٹنے سے بہتر ہے وہ جھک جائے۔ اور اگر اپنی انا کو توڑ کر ذرا سا جھک جاتی ہے تو شاید وہ یہ جنگ جیت سکتی تھی۔

بس ذرا سے حوصلے کی ہی تو ضرورت تھی...... ایک چھوٹی سی شکست اسے کسی بڑی شکستگی، سے بچا سکتی تھی وہ اپنا حوصلہ سمیٹنے لگی اور خامشی کے اس وقفے کے بعد لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے بولی۔

''کیا تم مجھ سے شادی کرو گے بابر۔'' یہ الفاظ نہیں تھے ساکن جھیل پر پھینکے گئے پتھر تھے۔ بابر کو لگا اس کی پوری ہستی ڈول کر رہ گئی ہو وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا جیسے کوئی یخ بستہ پانی میں یک دم دھکیل دے کہ دھڑکنیں ہی رکتی محسوس ہوں۔ مگر یہ کیفیت چند لمحے ہی رہی۔ یا اس سے بھی کم۔

اسے اپنے اعصاب پر ایک تھکن سی محسوس ہونے لگی۔ موبائل پر اس کے ہاتھ کی گرفت غیر محسوس طور پر سخت ہونے لگی۔ ایسا لگا جیسے موبائل ابھی تڑخ کر ٹکڑوں کی صورت ہو جائے گا۔ اس کا دل چاہا۔ وہ حوریہ کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ رسید کرے کہ وہ الٹ کر دور جا گرے۔ اس نے زور سے لب بھینچ لیے۔

اس طرح کے جملے سننے کو اس نے کتنا انتظار کیا تھا۔ کتنا کڑا اور اذیت ناک سفر طے کیا تھا۔ مگر افسوس حوریہ تم نے یہ جملہ ادا کیا۔ تو مجھے ذہنی آزار ہی دے ڈالا۔ وہ حقیقتاً یوں تڑپ کر رہ گیا تھا گویا دل پر خنجر کی نوک آ لگی ہو۔

''میں شادی کرنا چاہتی ہوں تم سے بابر۔'' وہ اپنے جملے کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ بابر کا دل افسردگی سے ہنسنے لگا۔

وہ چاہتی تھی وہ اس سراب سے بہل جائے گا۔ اس فریب کو محبت سمجھ کر آنکھیں بند کر کے اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ اس کا بچہ اس سے کہیں چھین نہ لیا جائے۔ سو وہ بابر کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے ڈھال کے طور پر اپنانا چاہ رہی تھی۔

وہ کیونکر نہ تڑپتا۔ بابر کو لگا اس کے ذہن کی طنابیں چٹخ جائیں گی۔ ایک پل علی شاہ کا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔ مگر دوسرے پل غم و غصے کی لہریں دل سے اٹھنے لگیں۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی خود غرض اور بے رحم بھی ہو گی۔'' وہ بولا تو اس کا لہجہ آگ کی طرح سلگتا ہوا تھا۔

''محبت کو غرض میں لپیٹ دیا جائے تو اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ وہ مر جاتی ہے غرض اور ضرورت زندہ رہ جاتی ہے اور ضرورت تو کوئی بھی پوری کر سکتا ہے کسی کا بھی ہاتھ تھاما جا سکتا ہے۔ نہیں حوریہ میں نے تم سے محبت کی ہے اور میں اپنی محبت کو اتنی بدصورتی سے مرتا نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز حوریہ گاڈ سیک مجھے اور میری محبت کو استعمال مت

کرو۔ میرے جذبوں سے مت کھیلو۔ اسے محض نجات کا ذریعہ مت بناؤ۔ گاڈ سیک۔" اس نے موبائل پوری طاقت سے دیوار پر دے مارا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا وہ حوریہ کو بھی اسی طرح دیوار پر دے مارے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا دیکھے۔ کسی سفاکی کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ۔

کتنی خودغرض عورت ہو تم حوریہ۔ ذرا سا بھی احساس نہیں کیا تم نے میرے دل کا۔ میرے جذبوں کا اسے اتنا سستا سمجھ لیا۔

وہ صوفے پر ڈھیر سے بیٹھ گیا۔ اور فرش پر بکھرے موبائل کے ٹکڑوں کی خالی خالی نظروں سے تکنے لگا۔

اسے لگا یہ موبائل کے ٹکڑے نہ ہوں اس کے دل کے خون آلود ٹکڑے ہوں۔

☆☆☆

بابر کے الفاظ حوریہ کو گویا کھڑے کھڑے جھلسا کر رہ گئے تھے۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ بابر کی طرف سے اسی طرح کا جواب اسے سننے کو ملے گا۔

پہلی بار اسے بابر کے وجود سے تقویت کا احساس ہوا تھا۔ مگر یہ کیا اس کا سرد و سرد لہجہ اس کے دل میں شگاف ڈال گیا تھا۔ وہ تو خوش فہم تھی کہ وہ جب چاہے یہ فاصلے سمیٹ سکتی تھی۔ مگر خوش فہمی کی یہ دیوار گری تو اسے بابر بہت دور فاصلے پر کھڑا دکھائی دینے لگا۔

موبائل کو دیکھتے ہوئے وہ یکدم گھائل انداز میں ہنس پڑی۔ جھلستی سلگتی ہنسی۔

ہاں وہ غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔ اور وہ بارہا اسے جتا چکی تھی کہ وہ اس کی چاہ نہ کرے۔ وہ اس کی منزل نہیں تھی۔ اس کے دل کے ویرانے میں اس کا کوئی رویہ، کوئی انداز پھول نہیں کھلا سکے گا۔ اس کے دل کی بنجر اور بے آباد زمین کو سیراب نہیں کر پائے گا۔

قدم قدم پر اس کا دل توڑا تھا۔ ماضی کے حوالے سے اسے فقط طعنے دیتے تھے۔ وہ آج سرد مہری دکھا رہا تھا تو۔ یہ سرد مہری کا صحرا تو خود اس کا اپنا بخشا ہوا تھا وہ جیسے اپنی ہی نظروں میں گرتی جا رہی تھی۔ مزاحمت کے الفاظ سینے میں کہیں گھٹ کر رہ گئے تھے۔

"اف! ایسی ذلت کا تو تصور بھی پاس نہ تھا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اب جتنا روتی ماتم کرتی کم تھا۔

وہ تو پہلے ہی اس کے رویوں کی بے گانگی پر سلگتا رہا تھا۔ آج تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر اسے تذلیل کے احساس سے پاگل کر دیا تھا۔

☆☆☆

عاظمہ نے بے حد دل گرفتگی سے اس کے کمرے کی حالت زار کو دیکھا۔

وہ ایک ایک چیز توڑ چکا تھا۔ شوپیس۔ رسٹ واچ، موبائل، سب کچھ کارپٹ پر ٹکڑوں کی صورت میں بکھرا پڑا تھا۔ مگر اس سے کہیں زیادہ اس کا دل بکھرا ٹوٹا پڑا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ پوری دنیا کو تہس نہس کر دے۔ آگ لگا دے ہر شے کو۔

"وہ ایک بے رحم اور خودغرض لڑکی ہے ماما۔ آئی ہیٹ یو حوریہ۔ (مجھے تم سے نفرت ہے حوریہ) آئی ہیٹ یو۔" وہ سر پٹخنے لگا۔ پھر عاظمہ کے بازوؤں میں بچوں کی طرح سما کر رو دیا۔ عاظمہ تڑپنے لگیں۔

"وہ مجھے جسٹ استعمال کرنا چاہ رہی ہے۔ اس کے پاس اب کوئی راہ نہیں بچی۔ تو وہ میرا ہاتھ تھام کر خود کو اور علی شاہ کو بچانا چاہ رہی ہے ہاں ماما! اسے مجھ سے محبت نہیں ہے محض غرض ہے۔" وہ بیڈ کے تکیے اٹھا کر فرش پر پھینکنے لگا۔

"وہ میرے جذبوں سے کھیل رہی ہے آئی ول کل ہر (میں اسے مار ڈالوں گا)"

"بابر کمپوز کرو خود کو پاگل ہو گئے ہو تم۔" عاظمہ اسے سنبھالنے لگیں۔

بابر کی ذہنی حالت سخت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر اسے سہلانے لگیں۔ پانی کا گلاس اٹھا کر اسے زبردستی پلانے لگیں۔

"خود کو سنبھالو بابر...... وہ، وہ خودغرض نہیں ہے مجبور ہے۔"

"ہرگز نہیں...... وہ سیلفش (مطلبی) ہے ماما وہ۔ وہ ایک بے رحم لڑکی ہے۔" وہ زور سے چلایا۔ "وہ مجبور نہیں ہے ضدی اور خودغرض ہے اس کو میری نفرت، میری جارحیت اور میرا کردار ہمیشہ دکھائی دیا۔ مگر اسے میری چاہت محبت میرا کوئی بھی اچھا عمل نہیں دکھائی دیا۔ میں نے اس کی خاطر خود کو بدل ڈالا ماما۔ اس سے سچی محبت کی۔ اپنی محبت کو خون سے سینچا ہے ماما۔ وہ اسے دکھائی نہیں دی۔ اور آج جب ہر رستہ اسے بند دکھائی دے رہا ہے۔ سب اس کے خلاف ہیں تو وہ میری طرف آ رہی ہے۔ وہ اپنا بچہ بچانا چاہ رہی ہے وہ اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتی۔ وہ مجھے محض اپنے بچے کی پناہ گاہ سمجھ رہی ہے اینڈ نتھنگ ماما اینڈ نتھنگ (اور کچھ نہیں)۔" وہ ذلت اور اذیت سے سلگ رہا تھا...... کوئی آگ تھی جو دل کو جلا کر خاکستر کر رہی تھی۔

"ہوش کرو بابر، ہوش کرو۔ محبت کرتے ہو تو اپنی محبت کا ثبوت دو۔ اسے ثابت کرو۔ محبت تو قربانی مانگتی ہے۔" "تم جانتے ہو۔ میں قربانی نہیں دے پائی تو میں محبت بھی کبھی نہیں پا سکی۔ اور مومنہ نے قربانی دی اور محبت پالی۔ محبت لینے کا نہیں...... دینے کا نام ہے بابر۔" عاظمہ اسے تھام کر صوفے پر لے آئیں اور رسان سے سمجھانا چاہا۔ مگر اس پر جیسے خون سوار تھا۔

"بکواس...... سب بکواس میں نہیں مانتا کچھ بھی۔" اس نے ہاتھ مار کر صوفے کے سارے کشن ایک طرف اچھال دیے اور پھر خود بھی صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

عاظمہ نے اس کی طرف دکھ اور ملال سے دیکھا وہ لب دانتوں میں دبائے صوفے پر چت لیٹا تھا اپنے اندرونی خلفشار کو اب دبا رہا تھا۔

کمرے میں یکلخت مضمحل سی فضا طاری ہو گئی تھی۔ عاظمہ نے اسے اکیلا چھوڑ دینا مناسب خیال کیا اور کمرے سے باہر آ گئیں۔

"گیلانی ہاؤس" میں سناٹے کا راج تھا ملازم اپنے اپنے کوارٹرز میں تھے۔ ایک امیر علی غمگین سی لابی میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں اور چہرے پر حزن بکھرا ہوا تھا۔

عاظمہ کو بابر کی خواب گاہ سے باہر آتے دیکھ کر وہ جلدی سے فرش سے کھڑا ہوا۔

"کیا ہو گیا ہے چھوٹے صاحب کو۔ مجھ سے ان کا تڑپنا نہیں دیکھا جاتا۔" وہ عاظمہ کی طرف لپک کر آیا۔

عاظمہ نے ایک تھکی تھکی سی سانس بھری۔

"سنبھل جائے گا۔ وقتی غصہ ہے۔ کیا علی شاہ سو گیا ہے۔"

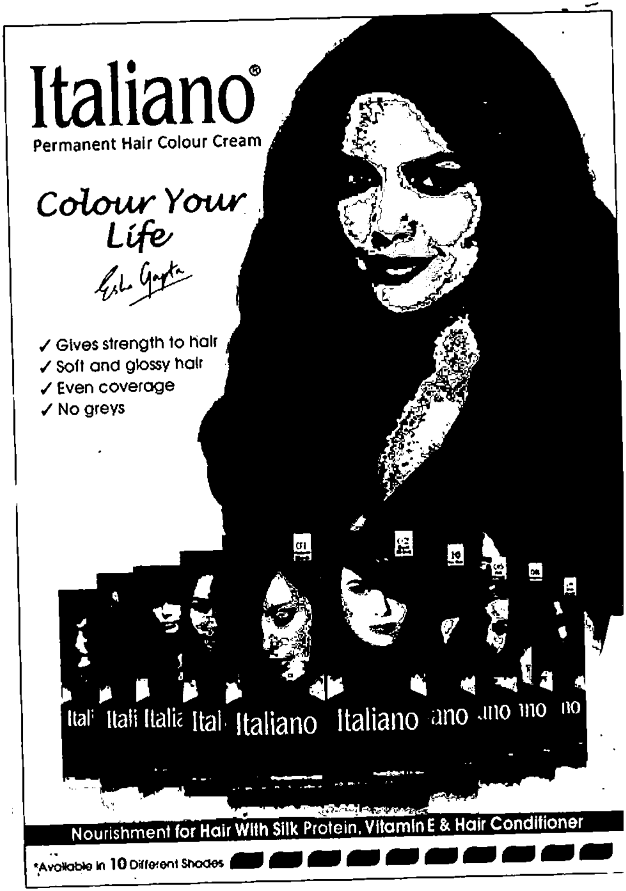
"جی۔ پر بڑی مشکل سے سویا ہے۔ ضد کر رہا تھا بابر صاحب کے پاس جانے کی۔"

"ٹھیک ہے تم بھی اب جاؤ اور سو جاؤ۔"

"دودھ دے دوں آپ کو۔"

"نہیں، دل نہیں ہے۔ اگر موڈ ہو گا تو خود ہی پی لوں گی جا کر۔ سو جاؤ تم جاؤ۔" عاظمہ اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھ گئیں۔

"بابر صاحب کو۔ ایک نظر دیکھ لوں۔" امیر علی ہچکچاتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ ملتجی تھا۔ عاظمہ رک گئیں اور



امیر علی کو دیکھا۔

''کیا کرو گے امیر علی۔ ابھی وہ ضدی سا ہو رہا ہے اس بچے کی طرح جس کا قیمتی پسندیدہ اور بے حد قیمتی کھلونا ٹوٹ گیا ہو اور اس کھلونے سے باندھا ہوا دل بھی ٹوٹ گیا ہو۔'' عاظمہ دل گرفتگی سے بولیں اور سر ہلا کر چلی گئیں وہاں سے۔

امیر علی باورچی خانے جا کر دودھ کا گلاس بھر کر بابر کی خواب گاہ میں چلا آیا۔ بابر آنکھوں پر بازو رکھے آنکھیں موندے پڑا تھا آہٹ پر ذرا سا بازو ہٹایا...... امیر علی کو دیکھا۔

''میں دودھ نہیں پیوں گا امیر علی۔ اسے واپس لے جاؤ۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''آپ بھی علی شاہ بابا کی طرح آج ضد پکڑ بیٹھے ہیں۔'' امیر علی نے یہ کہتے ہوئے گلاس سائیڈ کی تپائی پر رکھ دیا۔ علی شاہ کے نام پر بابر چونکا۔

''علی شاہ کہاں ہے امیر علی۔'' وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''وہ تو سو گیا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے سویا ہے۔ عادت نہیں ہے نا اسے میری۔ بس ضد کر رہا تھا آپ کے پاس آنے کی۔''

''کمال ہے تم اسے میرے پاس کیوں نہیں لائے۔ اسے کیوں سلا دیا۔ روتے ہوئے سویا ہوگا۔'' بابر کے لہجے میں فکرمندی جھلک رہی تھی۔ امیر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بچ مائی گاڈ تم بھی نا امیر علی ...... کتنی بار کہا ہے اسے رلا کر مت سلایا کرو۔ جاؤ لے آؤ اسے میرے پاس۔'' امیر علی سر ہلا کر حکم کی بجا آوری کے لیے کمرے سے نکل گیا۔

بابر سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لگانے لگا۔ اس کی ساری توجہ علی شاہ کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ وہ بے چینی سے علی شاہ کا منتظر تھا۔ چند لمحے بعد ہی امیر علی سوئے ہوئے علی شاہ کو کسی قیمتی متاع کی طرح گود میں اٹھائے اندر داخل ہوا تو بابر نے جلدی سے ادھ جلی سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی اور علی شاہ کو اس کی گود سے لے کر بے تابانہ اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔

اس حملے پر علی شاہ گڑبڑا گیا۔ اس کی نیند ٹوٹی تھی وہ رونے لگا مگر جیسے ہی اس کی نظر بابر پر پڑی تو چپ ہو گیا اور اپنی معصومانہ نگاہوں سے بابر کو تکنے لگا۔

بابر نے بے اختیار اس کی نرم و نازک گالوں پر اپنے سلگتے لب رکھ دیے۔

اس کا رواں رواں اس کی محبت سے جلنے لگا۔ اس نے علی شاہ کو یوں خود سے چمٹا لیا گویا اب کبھی جدا نہ کرے گا۔ امیر علی محبت بھری نظروں سے ان دونوں کو دیکھنے لگا پھر بے آواز کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسے معلوم تھا بابر، علی شاہ کو اپنے پہلو میں لٹائے گا۔ اس سے باتیں کرے گا۔ اس کے بال سہلاتے سہلاتے خود بھی سو جائے گا۔

☆☆☆

دوسروں کو نظروں سے گرانا ایک آسان سی بات لگتی ہے۔ مگر دوسروں کی نظروں سے گر جانا ایک بالکل الگ تجربہ ہے۔ اذیت ناک اور دل خراش تجربہ۔ انسان کی ساری خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں جب وہ خود کو اس رنگ میں دیکھتا ہے جس میں وہ کسی اور کو دیکھتا رہا ہوتا ہے۔ رد کیے جانے کے احساس سے وہ پہلی بار آشنا ہوئی تھی۔ اور جانا اس کی اذیت کیا ہوتی ہے۔ وہ صحن میں بے قرار روح کی مانند بھٹک رہی تھی۔ کسی پل قرار نہیں تھا۔ جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔

''حوریہ کب سے تمہارا موبائل بج رہا ہے۔ تم ادھر بیٹھی ہو۔'' رقیہ بھابھی اس کا موبائل لیے صحن میں چلی

آ گئیں۔ "لو پھر بج رہا ہے۔" انہوں نے موبائل حوریہ کی طرف بڑھا دیا۔ اور خود پلٹ گئیں۔

حوریہ کا دل یکبارگی دھڑکا تھا۔ کال بابر کی تھی۔ اس کا دل خوش فہمی میں گھر کر سوچنے لگا۔ "یقیناً بابر اپنے کہے پر نادم ہوگا۔"

"ہیلو۔" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"تم علی شاہ سے ملنا چاہو گی تو میں اسے بھجوا دیتا ہوں۔" دوسری طرف بے مہری کے ساتھ کہا گیا۔

"دراصل میں اسلام آباد جا رہا ہوں دو چار دنوں کے لیے۔ چاہ تو یہ رہا تھا کہ اسے بھی ہمراہ لے جاؤں مگر ماما منع کر رہی ہیں۔ اینی ویز تم چاہو تو اسے بھیج دوں تمہارے پاس۔"

"نہیں...... میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔ بس سونپ دیا ہے تو سونپ دیا ہے تمہیں۔" اس کی آواز اداسی میں ڈھل گئی۔ وہ گویا بجھ کر رہ گئی تھی۔ جواباً بابر ہلکے سے ہنسا تھا بڑی چبھتی ہنسی تھی۔

"لکھ کر دو گی یہ بات کہ سونپ دیا ہے۔"

"بابر۔" وہ گویا تڑپ کر رہ گئی۔

کسی ماں کا امتحان تو مت لو۔"

"امتحان تو تم خود ہمیشہ اپنا لیتی رہی ہو۔ خود کو آزمائش میں دھکیلتی رہی ہو۔" وہ تنک گیا۔

"تب ہی تو تمہیں پکارا ہے۔ کیا تم مجھے اس آزمائش سے نہیں نکالو گے۔" بے اختیاری کی لپیٹ میں آ کر وہ بولی۔ بابر لحہ بھر چپ سا رہ گیا۔ تاہم ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی تھی۔

"اس آزمائش سے نکالنے والے بہت مل جائیں گے حوریہ۔ کسی کا بھی ہاتھ تھام سکتی ہو۔ زندگی گزارنی ہی تو ہے کوئی بھی ہو۔ کیا فرق پڑے گا تمہیں۔"

"ہاں فقط جذبات کی تسکین اور تن کی آسودگی کی بات ہے اگر تو، کسی کا بھی ہاتھ تھاما جا سکتا ہے۔" وہ افسردگی سے بولی۔ "مگر روح کی تھکن سمیٹنے والا کون ہوگا بابر!"

وہ بڑے تحمل سے اس کے جملوں کی تلخی کو پیتے ہوئے بولی۔

"دل میں آنا تو دور کی بات۔ دل کے نزدیک آنے کے لیے اتنا سفر کون طے کرے گا جتنا تم نے کیا بابر۔"

"ہاں سفر لا حاصل۔" وہ اتنا تلخ ہو گیا کہ حوریہ کو لگا زہر سے بھرا کوئی جام الٹ گیا ہو۔ اتنی کڑواہٹ۔ وہ باوجود چاہنے کے کچھ نہ بول سکی۔

"میں علی شاہ کو بھجوا رہا ہوں تمہارے پاس۔" چند لمحے کی خاموشی کے بعد بابر نے کہا۔

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"واٹ آ نان سینس وہ تمہیں مس (یاد) کر رہا ہے۔ تم ماں ہو اس کی۔"

"بہل جائے گا۔ اسے عادت ہو جائے گی مجھ سے دور رہنے کی۔"

"بہل جائے گا۔ کیسی بات کر رہی ہو۔" بابر کے لہجے میں خفگی تھی۔

"ہاں...... بچہ ہی تو ہے بہل جائے گا۔ یوں بھی وقت تو بڑے بڑے غم بانٹ لیتا ہے۔ گہرے زخموں پر کھرنڈ لے آتا ہے۔"

"اوہ ویری اسٹرینج...... تم نے فطرت کے اس قانون کو مان لیا کہ زخم بھر جاتے ہیں۔ وقت غم بانٹ لیتا ہے۔" وہ یکدم ہنسا۔ حوریہ کو یہ ہنسی برچھی کی طرح اپنے دل میں اترتی محسوس ہوئی۔ اس کی روح پر جما ملول کچھ اور بڑھ سا گیا۔

"بابر گیلانی عورت ایک جسم ہی نہیں رکھتی۔ روح بھی رکھتی ہے اور دل بھی۔ حالات کی آندھی میں گھر کر بکھر بھی سکتی ہے۔ اسے بھی سمیٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔" وہ بلاآخر چیخ گئی تھی۔ بابر نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"تم جانتی ہو میں نے فضا سے شادی کیوں نہیں کی۔" وہ بولا تو اس کے لہجے میں بے مہری تھی۔

"اس لیے کہ اس نے مجھ سے نہیں میری دولت، میرے اسٹیٹس سے محبت کی تھی۔ اس نے میری دولت کی چاہ کی تھی میری نہیں۔ اس کے پیش نظر فقط وہ اعلا سہولیات تھیں۔ میں یا میری جگہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ تم نے، تم نے بھی تو حازم سے محبت کی۔ اس کی دولت اثر رسوخ اس کے اسٹیٹس سے نہیں اس کی ذات سے محبت کی اور میں نے ایسی ہی محبت تم سے کی ہے حوریہ...... میں کسی کی ضرورت نہیں بننا چاہتا۔ میں منزل بننا چاہتا ہوں فقط سیڑھی نہیں۔"

اس نے لائن منقطع کر دی اور موبائل بے دلی سے بیڈ پر پھینک دیا۔ اور خود جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا اپنا ماضی، حال، سب کچھ۔

یک دم علی شاہ کا خیال آیا تو امیر علی کو پکارنے لگا۔

"امیر علی...... امیر علی۔" اس کی آواز خاصی اونچی تھی امیر علی گھبرایا ہوا اس کے کمرے تک بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"علی شاہ کو تیار کر دو امیر علی۔ اس کی تمام چیزیں پیک کر دو اور اسے ڈرائیور کے ہمراہ یاور ہاؤس پہنچا دو۔" وہ امیر علی کو دیکھتے ہی بولا اور پیروں سے جوتے اتار کر موزے کھینچ کر اتارنے لگا۔

"مگر صاحب......"

"میں نے جو کہا ہے بس اتنا کرو امیر علی کتنی بار کہا ہے بحث مت کیا کرو۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جی بہتر۔" امیر علی پلٹ گیا۔

"میرا بیگ پیک کر دیا ہے۔ مجھے رات نکلنا ہے اسلام آباد کے لیے۔"

"جی ابھی کر دیتا ہوں۔ علی شاہ کو پہلے بھجوا دوں۔" امیر علی سر ہلاتا پلٹ گیا۔

☆☆☆

آتے جمعے کو عادل بھائی کے دوست کی فیملی سے چند خواتین حوریہ کو انگوٹھی پہنانے کے لیے آ رہی تھیں۔

حوریہ نے کوئی احتجاج بلند نہیں کیا تھا بس چپ سادھ لی تھی۔ اس کے ہونے والے سسرال سے اس کے لیے جوڑا۔ مٹھائیوں کے ٹوکرے۔ چوڑیوں کے بکس، میک اپ، چپلیں، جیولری اور جانے کیا کچھ آیا رکھا تھا، یہ ساری چیزیں رقیہ بھابھی اس کے کمرے میں سجا گئی تھیں تاکہ وہ دیکھ لے۔ مگر اس نے دیکھنا تو کیا ان پر ایک نظر تک نہ ڈالی۔ اسے ان چیزوں سے دلچسپی نہ تھی۔ مگر بس سمجھوتہ کر لیا تھا، خاموش، بے رحم سمجھوتہ۔

فیضان احمد کون تھا کیا تھا؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی نہ جاننا چاہتی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ فیضان احمد ہے یا ایکس وائی زیڈ۔ بس وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا دل خالی ہے۔ اس کے پاس اس شخص کے لیے کوئی جذبہ کوئی احساس نہیں۔ جس کا احساس بڑھنے لگا تو وہ کمرے سے ملحقہ ٹیرس میں نکل آئی۔ اس کے موبائل پر بابر کا میسج آیا تھا کہ۔

"وہ علی شاہ کو اسلام آباد سے واپس آ کر لے جائے گا آج وہ اسلام آباد کے لیے جا رہا ہے۔"

اب جانے وہ کب لوٹے گا۔ اسے لگا اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر پکڑ لیا ہو۔ نبضیں تھمتی محسوس ہو رہی ہوں۔ وہ ٹیرس پر رکھی کرسی پر ڈھے سی گئی اور کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ ایسا لگنے لگا گردن کی شریانیں کسی بھی لمحے پھٹ جائیں گی۔

آؤ کہ مرگ سوز محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسن ماہ سے دل کو جلائیں ہم

خوش ہوں فراق قامت و رخسار یار سے
سرو، گل، سمن سے نظر کو ستائیں ہم
ویرانیٔ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم
پھر اوٹ لے کے دامن ابر بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستان عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

☆☆☆

یہ رات مومنہ کے لیے بے حد بھاری تھی۔ یوں تو پہلے بھی اسے بستر پر پڑتے ہی نیند نہ آتی تھی مگر آج تو لگ رہا تھا آنکھوں میں ڈھیر ساری ریت بکھری پڑی ہو۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے بابر سے ضرور بات کرنی چاہیے۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کھویا تھا اور پایا تھا تو صرف ناآسودگیاں، تنہائیاں، پچھتاوے، نارسائی۔

اور ان سب کے ساتھ جو زندگی گھٹ گھٹ کر اس نے جی تھی۔ اب اس کا تصور کر کے ہی خوف زدہ ہو جاتی تھی۔

ایسی ہی زندگی جیتے وہ حوریہ اور بابر کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی اسے بابر بھی حازم کی طرح عزیز ہو گیا تھا اور حوریہ تو تھی ہی ان کے جگر کا ٹکڑا۔ وہ کیسے اسے تڑپتا دیکھتی۔

فیضان احمد کے نام کی انگوٹھی نہیں تھی وہ طوق تھا جو وہ بحالت مجبوری پہننے جا رہی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر کچھ دیر بے چینی سے کمرے میں ٹہلتی رہی پھر موبائل اٹھا کر بابر کے نمبر پش کرنے لگی۔

☆☆☆

من مورکھ کی ایک نہ مانو
اس کے موہ کو جھوٹا جانو
اس کا کام ہے دھوکا کھانا
بنجاروں سے دل نہ لگانا

بابر اپنے بیگ پر ایک نظر ڈال رہا تھا پھر اپنی ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بیگ میں ڈال کر بند کر رہا تھا جب اس کا سیل فون بج اٹھا۔

''ہیلو، السلام وعلیکم۔'' وہ اتنی رات مومنہ کی کال دیکھ کر ذرا حیران ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' مومنہ نے بھی نرمی سے جواب دیا۔

''تو تم جا رہے ہو۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ہاں۔ مگر ہمیشہ کے لیے نہیں چند دنوں کے لیے۔'' اس نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

''دلوں میں فاصلے آ جائیں تو زمینی فاصلے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ تو بظاہر نظر آنے والی دوریاں ہیں۔'' مومنہ کا لہجہ دل گرفتہ سا تھا۔

بابر ایک ہلکی سانس بھر کر رہ گیا۔

''بابر تم جانتے ہو تم حوریہ کو اپنے ہاتھوں سے کھونے جا رہے ہو۔''

''میں نے اسے پایا ہی کب ہے کہ کھونے کا سوال پیدا ہو۔'' وہ ہلکے سے ہنسا۔ خود آزاری ہنسی جیسے خود پر

ہنستی معلوم ہو۔

''تم بھی عباد کی طرح محبت کو شاید کبھی سمجھ نہ پاؤ گے۔'' مومنہ متاسف تھی۔

''محبت یا غرض!'' نا چاہتے ہوئے بھی وہ استہزائیہ لہجہ اپنانے پر مجبور ہو گیا۔

''بے غرض محبت کا دعوا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا بابر۔'' وہ بغیر برا منائے بولی۔

''انسان سے انسان کی محبت تو غرض ہی ہے۔ کبھی غرض دکھائی دے جاتی ہے کبھی نہیں۔ بے غرض محبت تو صرف رب العالمین کی شان ہے۔ وہ کرتا ہے اپنی مخلوق سے بلا تفریق محبت۔ بے غرض اور بے مثال محبت......انسان تو خطا کے پتلے اور غرض کے بندے ہیں۔'' بابر کا دل ایک عجیب سی اتھاہ میں ڈوبا۔ تاہم وہ خاموش رہا اور مومنہ کے تسلسل کو توڑا نہیں۔

''عورت کو خدا نے ہی کمزور بنایا ہے اور ایک کمزور ہستی ہے وہ لاشعوری طور پر اپنے لیے ایک مضبوط سائبان کی تلاش میں ہوتی ہے جو اسے سہارا دے۔ اسے عزت دے اس کا وجود اس کے لیے راحت اور تسکین کا باعث ہو۔ یہ قدرت نے رکھا ہے یہ خود غرضی نہیں ہے بابر۔ یہ فطری تقاضا ہے۔''

''تو یہ تقاضا تو کسی کا ہاتھ تھام کر بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔'' وہ بول اٹھا۔

''نہیں ہر کسی کا ہاتھ تھام کر پورا نہیں کیا جا سکتا۔'' مومنہ اس کی بات رد کرتے ہوئے بولی۔ ''جس پر بھروسا ہو۔ جس پر اعتبار ہو اس کی جانب ہاتھ بڑھتا ہے۔''

بابر نے یکبارگی لب بھینچ لیے۔ اس کا دل اندر ہی اندر بکھرنے لگا۔ جیسے بجھتے شعلوں کو پھر سے ہوا دے دی ہو یوں رگ رگ میں جلن ہونے لگی۔

''محبت......جواب محبت پر نہ قائم ہو سکتی ہے نہ پھلتی پھولتی ہے۔ جواب محبت کے سائے میں پلنے والی محبت اس پودے کی مانند ہوتی ہے جو بہار کی اولین بارش میں اگ تو جاتا ہے مگر اس کی جڑیں گہرائی تک نہیں جا سکتیں۔ وہ موسم بدلتے ہی سوکھ جاتا ہے۔ سایہ دار درخت نہیں ہو پاتا۔ تم خوش نصیب ہو بابر کہ کوئی تمہاری پناہ تلاش کر رہا ہے۔ تمہاری پناہ میں اپنے لیے تحفظ اور آسودگی محسوس کر رہا ہے۔ کیا یہ تمہاری محبت کی سچائی کی دلیل نہیں ہے کہ تم پر وہ ٹرسٹ کر کے خود تمہیں پکار رہی ہے۔'' بابر یک دم چپ سا رہ گیا۔ اس کے وجود پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ وہ کسی بھی ردعمل سے باز رہا۔

''عورت جتنی مشکل نظر آتی ہے اس سے کہیں زیادہ آسان ہے اسے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے اسے صرف عزت دینے کی ضرورت ہے، عزت اس کے دل میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔'' شدید ترین احساس بے بسی نے بابر پر حملہ کر دیا تھا وہ مضمحل دکھائی دینے لگا۔ بیگ ایک طرف رکھ کر بالوں پر ہاتھ پھیرتا بیڈ پر بیٹھ گیا۔

مومنہ کے الفاظ اسے دماغ پر ٹھوکر مارتے محسوس ہو رہے تھے وہ یکدم بیڈ سے اٹھا اور بیگ کو اٹھا کر نیچے رکھا۔

اسے لگا اگر وہ مزید یہیں رہا تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کے چہرے کے نازک حصوں میں سرخی اتنی گہری ہونے لگی کہ یوں لگا ابھی خون چھلک آئے گا۔ اس نے ایک بھنچی بھنچی سانس بھر کر خود کو سنبھالنے کی شعوری کوشش کی۔

''سوری میں تمہارا ٹائم ویسٹ (وقت ضائع) کر رہی ہوں۔ تمہاری فلائٹ بھی ہے۔'' مومنہ یک دم چونکتے ہوئے بولی۔

''ہوں بس ابھی نکل رہا ہوں۔'' وہ ہلکے سے ہنکارا بھر کر بولا۔ اس کا لہجہ بے حد دھیما تھا۔ گہری سوچ میں کھویا ہوا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ ان باتوں کا کیا جواب دوں آپ کو۔''

''کچھ بھی نہیں میں نے تم سے جواب کب مانگے ہیں۔'' مومنہ محبت آمیز نرمی سے بولی۔ پھر قدرے

سنجیدگی سے بولی۔
"جاؤ تمہیں دیر نہ ہو جائے۔ فی امان اللہ۔"
بابر نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اس کے سامنے بیٹھی ہوں۔ "میرے پاس ٹائم نہیں ہے ورنہ میں ضرور آپ سے مل کر جاتا اور یاور صاحب سے بھی ملنے آتا۔ بس کچھ ایمرجنسی میں جانا پڑ رہا ہے۔ واپسی پر ضرور ملاقات کروں گا۔ علی شاہ کو بہت پیار کیجیے گا میری طرف سے۔" وہ بیگ اٹھائے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ پھر حوریہ کا خیال آیا تو دل بہت تیزی سے دھڑکا۔
"حوریہ..... کیسی ہے۔" اس کا لہجہ ذرا سا لڑکھڑایا۔ "اسے بھی پوچھ لیجیے گا میری طرف سے..... شاید میں نے اسے بہت ہرٹ کیا ہے۔"
"ہاں وہ ٹھیک ہے۔" مومنہ نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا دل چاہا وہ اسے کہے کہ بابر آتے جمعہ کو اس کی منگنی ہے اور اسے کھونے کے بجائے پالو۔ مگر ایک مبہم سی چپ اس کے لبوں پر جم گئی تھی۔ شاید وہ خوف زدہ تھی کہ شعوری طور پر چونکہ وہ سفر پر جا رہا تھا اور وہ اسے اپ سیٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔
بہت ساری دعائیں دے کر اس نے لائن منقطع کر دی۔

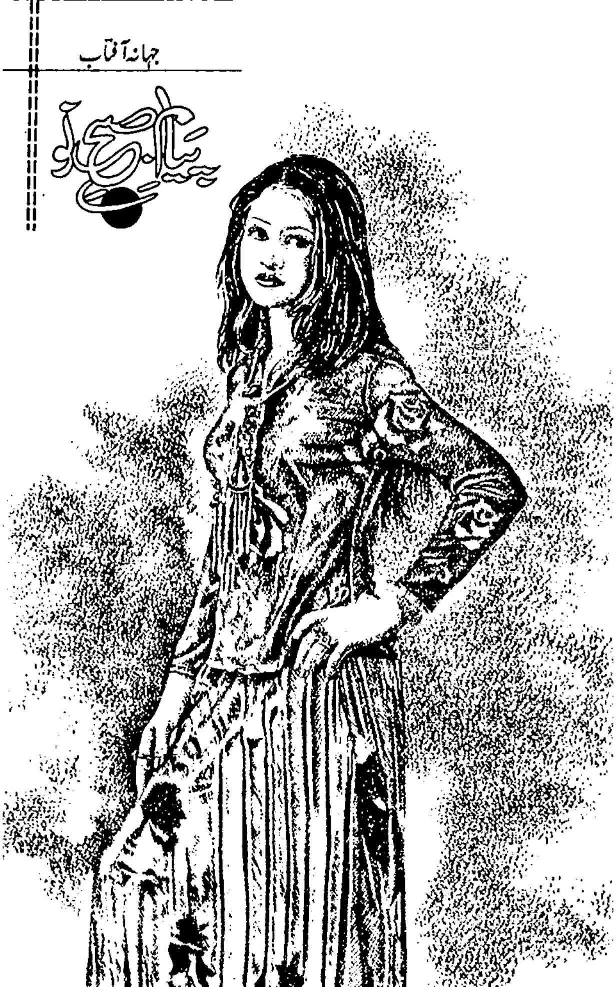
☆☆☆

بابر کمرے سے باہر آ گیا۔ امیر علی اس کا بیگ تھامے اس کے ہمراہ چلنے لگا۔
ڈرائیور نے اس کا بیگ ڈگی میں رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنی چاہی تو بابر نے اسے روک دیا۔
"اوہ ہوں۔ ڈرائیونگ میں کروں گا۔"
"مگر صاحب......" وہ ہچکچایا۔
"تمہیں پتا ہے نا فیروز۔ جب میں بہت خوش ہوتا ہوں یا بہت ڈپریسڈ، خوب ڈرائیونگ کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
فیروز خان بے چارا۔ اس کے چہرے کی کھوج میں لگ گیا آیا وہ خوش ہے یا ڈپریسڈ۔

☆☆☆

فضا کا دل صبح سے ہی عجیب سی یاسیت اور ایک وحشت کا شکار تھا۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کئی بار اس سے چیزیں گری تھیں۔ گلاس ٹوٹا تھا۔ چائے کا مگ ٹوٹا تھا ایان کی فیڈر کا کیپ کھل کر سارا دودھ بیڈ پر گر گیا تھا اور ایسی کسلمندی بھی نہیں تھی مگر دل کو کسی طور پر سکون بھی نہیں تھا۔
"کیا ہو گیا ہے فضا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ رات صحن میں بیٹھی تھی کہ نصیر روم سے نکل کر اس کے پاس چلا آیا۔
"نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ یہاں آ کر کیوں بیٹھ گئی ہو۔" وہ اس کے ہمراہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔
"پتا نہیں، دل گھبرا رہا ہے عجیب بے چینی سی ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔
"تم نے خود کو بالکل گھر کے اندر ہی قید کر لیا ہے اب تو نکلنا چھوڑ دیا ہے۔"
"نہیں ایسا نہیں ہے مجھے گھر میں سکون ملتا ہے اور آپ کے ہمراہ ہر ویک اینڈ جاتی تو ہوں۔" وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔ "ایسی بے چینی تو ہوتی نہیں ہے آج پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔"
"حوریہ سے ملنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میں نے تمہیں اس سے ملنے کو بس اس لیے روکا تھا کہ تم اپ سیٹ ہو جایا کرتی تھیں صرف تمہاری خوشی کے لیے۔ تم چاہو تو اس سے ملو۔" نصیر اپنے طور پر اخذ کرتے ہوئے بولا۔
"نہیں مجھے ایسی کوئی بات پریشان نہیں کر رہی ہے۔ میں نے کہا ناں۔"

"تو پھر؟"
"پتا نہیں۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچی۔ اور نصیر کے چہرے کی طرف دیکھا پھر مسکرا دی۔
"آپ کو بلاوجہ پریشان کر دیا۔ ابھی تہجد پڑھ لوں گی تو سکون آ جائے گا۔ جب سے آپ نے تہجد پڑھنے کی میری عادت ڈال دی ہے مجھے بہت سکون مل گیا ہے۔ آج عشا کی نماز خطا ہو گئی ہے شاید اس لیے بے چینی ہو رہی ہے۔"
"ہوں یہ تو ہے۔ مجھ سے بھی کبھی نماز خطا ہو جاتی ہے تو ایسی ہی بے چینی ہوتی ہے، ایسا لگتا ہے کہیں کچھ کمی سی ہے۔ بہت سکون ملتا ہے نماز سے۔ تم بھی پہلے عشاء پڑھ لو پھر تہجد کے نوافل پڑھنا۔ فرض کی اہمیت ہر حال میں نوافل سے زیادہ ہے۔" نصیر صحن میں پھیلی ٹھنڈی ہوا کو جیسے پھیپھڑوں میں بھر کر چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ پھر اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے خود سے نزدیک کرتے ہوئے بولا۔
"دنیا کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تو کب زندگی پگھل کر رہ جاتی ہے رات کی تنہائی میں سجدے میں جاتے ہیں تو لگتا ہے دنیا سمٹ کر ایک ہو گئی ہے۔ اور دن بھر کر تھکن کہیں گم ہو گئی ہے جسم میں نئی روح گھستی محسوس ہوتی ہے۔ ہے ناں۔ پتا نہیں تمہیں بھی ایسا ہی کچھ لگتا ہے۔ یا نہیں۔ ہمارے امام صاحب بہت پیاری باتیں کرتے ہیں مجھے تو کرنا بھی نہیں آتیں۔ مگر جب ان کی باتیں سنتا ہوں تو لگتا ہے۔ ہاں بالکل ایسا ہی تو میں بھی سوچ رہا تھا۔ میری فیلنگز بھی تو بالکل وہی ہوتی ہیں۔ وہ علم والے ہیں شاید اس لیے اپنے جذبات اور احساس کو لفظ پہنا سکتے ہیں۔" نصیر اسے امام صاحب کی باتیں سنانے لگا۔ فضا کو اچھا لگ رہا تھا اس کی باتیں سننا۔ وہ اسے ایسے وقت ایک بہت معصوم سادہ دل آدمی دکھائی دیتا۔
"امام صاحب بہت اچھے اچھے واقعات سناتے رہتے ہیں۔ آج انہوں نے ایک تمثیل سنائی۔ سناؤں۔"
"بالکل۔" وہ ہمہ تن گوش تھی۔
"ایک شخص کو بھوت قابو کرنے کا شوق ہوا وہ جنگل میں رہنے والے ایک مہاتما کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ مجھے کوئی تدبیر بتاؤ کہ بھوت میرے قبضے میں آ جائے اور میرا کام دھندا سب کر دیا کرے۔" مہاتما عقل مند انسان تھا کہا "بھوت بہت برے ہوتے ہیں۔ تم اس کو کام کاج نہ بتا سکو گے تو آخر میں تم کو چٹ کر جائے گا۔" اس نے جواباً کہا "میرے پاس بہت کام کاج ہے اسے فرصت ہی نہ ملے گی۔" وہ بضد رہا تو مہاتما نے اسے آخر وہ منتر بتا دیا۔ وہ گھر آ کر منتر پڑھنے لگا۔ جب منتر سدھ ہو گیا تو بھوت ظاہر ہو کر کہنے لگا، "بتاؤ کیا کروں۔" اس نے کہا۔
"ایک شان دار عمارت بنا دو......ایک پل میں شان دار عمارت تیار ہو گئی اس نے کہا" کھیت جوت آؤ۔" کھیت جوت آیا تو کہا بہت سارا روپیہ پیسہ لاؤ۔" خزانہ بھی حاضر ہو گیا۔ غرض کہ ہر کام فٹافٹ ہو جاتا۔ اب کوئی کام نہ رہا تو بھوت نے کہا۔ "کام بتاؤ ورنہ میں تم کو کھا جاؤں گا۔" وہ ڈر کر مہاتما کے پاس آیا اور اسے سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ "اب میں کیا کروں۔ میرے پاس کوئی کام نہیں ہے کیا بتاؤں اسے ورنہ وہ مجھے کھا جائے گا۔" اتنے میں وہ بھوت بھی "کھاؤں کھاؤں" کرتا چلا آیا۔ مہاتما کے پاس ایک کتا بیٹھا ہوا تھا اس نے آدمی کے ہاتھ میں خنجر دیا اور کہا اس کی دم کاٹ کر بھوت کو دے دو کہ وہ سیدھی کر کے دے...... "بھوت نے کتے کی دم ہاتھ میں تھام لی ایک مرتبہ سیدھی کر دی پھر چھوڑا تو وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ تب وہ بہت گھبرایا اور کہنے لگا۔ "بھائی میرے اب چھٹی دے دو۔ آدمی فوراً راضی ہو گیا۔ بھوت اپنے ٹھکانے پر چلا گیا۔" نصیر یہ سنا کر چپ ہوا تو فضا ہنس رہی تھی۔
"یہ تمثیل، جانتی ہو کیا ہے اس کا مقصد۔" فضا نے نفی میں سر ہلایا۔
"امام صاحب کا یہ تمثیل سنانے کا مقصد یہ واضح کیا کہ دنیا بھی کتے کے دم کی طرح ہے کتنی کوشش کر لو۔ سیدھی نہ ہوگی انسان ہزار تدبیر کر لے۔ تو میں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ نہ ہم دنیا کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ اسے اچھا بنا



سکتے ہیں بس انسان تغیرات اور زمانے سے عبرت اور نصیحت حاصل کرتا ہے اور اپنی زندگی کو سدھارنے کی کوشش میں رہے اسے سیدھا کرنے کی تدبیر کرتا ہے۔ زمانے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر نصیر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فضا کے چہرے پر بھی سنجیدگی تھی۔

''خیر تمہارا وقت نکل رہا ہے تم نماز پڑھ کر کمرے میں آجاؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ پیار سے اس کے بال سہلا کر چارپائی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جبکہ فضا وضو کر کے صحن میں ہی جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو یکدم بابر نظروں تلے آگیا۔ وہ گھبرا گئی۔ جائے نماز پر بیٹھ کر ایک غیر مرد کیونکر آگیا۔

''نہیں نہیں اس کا دل بہت صاف ہے وہاں اب بابر کا بالکل گزر نہیں ہے، پھر عجیب بات تھی بابر کا چہرہ بار بار اس کی نگاہوں تلے آرہا تھا۔ اس نے خیال جھٹکنے کی کوشش کی اور اپنی پوری توجہ۔ اپنے بچوں اور نصیر کی طرف کر کے خوب دعائیں مانگنے لگی۔

اچانک اسے محسوس ہوا اس کی آنکھوں سے بہت سا پانی بہہ رہا ہے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ رو کسی کے لیے رہی ہے۔ یہ پانی اتنا کیوں بہہ رہا ہے۔

☆☆☆

حوریہ کی آنکھ کچھ دیر پہلے ہی لگی تھی یک دم ہڑبڑا کر وہ اٹھ گئی۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بڑے دنوں بعد اسے حازم خواب میں دکھائی دیا تھا۔ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا شاید اسے کچھ دے بھی رہا تھا اور اس نے لیا یا نہیں۔

وہ بیٹھ کر خواب کو پھر سے یاد کرنے لگی۔ مگر کچھ پہلو جیسے اندھیرے میں گم تھے باوجود کوشش کے کچھ یاد نہ آرہا تھا۔ بس حازم کا چمکتا مسکراتا چہرہ اس کے ذہن پر نقش تھا اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر سائڈ ٹیبل سے پانی کا بھرا گلاس اٹھا کر دو چار گھونٹ پیے اور گلاس رکھ کر سیدھی ہوئی کہ سرہانے پڑا موبائل بجنے لگا۔ اتنی رات موبائل بجنے پر وہ ذرا حیران ہوئی۔ نمبر گیلانی ہاؤس کا آرہا تھا۔

اس کے دل پر ایک عجیب سا دباؤ محسوس ہوا۔ بابر تو اسلام آباد جا رہا تھا پھر کوٹھی سے یہ کال اس کا ذہن عاظمہ کی جانب دوڑا۔ خدا خیر کرے اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف امیر علی تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ حوریہ کی آواز سنتے ہی وہ ایک بار پھر رونے لگا۔

''حوریہ بی بی...... وہ بابر صاحب کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے بہت بڑا ایکسیڈنٹ۔''

امیر علی نے اس کے اعصاب پر بغیر حیل وحجت دھماکا کر دیا تھا وہ صدمے سے تھرا اٹھی اور یک دم جھٹکے سے بیڈ سے کھڑی ہوئی مگر لڑکھڑا گئی۔

''کیا...... یہ کیا کہہ رہے ہو امیر علی۔''

''بہت بڑا ٹرک تھا جی۔ وہ پورا چڑھ گیا بابر صاحب کی گاڑی پر۔'' امیر علی روئے جا رہا تھا حوریہ کے آگے پوری کائنات ڈول گئی تھی۔

☆☆

(آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

آگ اگلتے سورج کی گرمی سوا نیزے پر تھی جب اچانک سرمئی بادلوں نے جلتے سورج کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

سورج کو خود میں سموئے بادلوں کا دل بھر آیا اور وہ بے اختیار برسنے لگے۔ بارش کی ٹھنڈی بوندیں آگ برساتی گرمی کی لہروں کو اپنے ساتھ بہالے گئیں۔

''ماما دیکھیں موسم کتنا پیارا ہو رہا ہے۔'' کچن کی کھڑکی سے لان میں پڑتی بارش پر نظریں مرکوز کیے ہوئے ماما سے مخاطب تھی جو چاول صاف کرنے میں منہمک تھیں۔

''اللہ کا کرم ہے اس نے ہم گناہ گاروں پر اپنا کرم کر دیا۔'' عینک درست کرتے گویا تھیں۔

''ویسے موسم میں کہیں گھومنے جانے کا دل چاہتا ہے نا؟'' وہ خوشی میں کہہ گئی۔

''شادی کے بعد گھومنا۔'' ماما کی بات پر اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے حسرت سے اپنی بائیں ہاتھ کی چوتھی انگلی کو دیکھا جہاں ڈائمنڈ کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ جانے کیوں اس انگوٹھی کی چمک کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اداسی کا رنگ گہرا ہو جایا کرتا تھا۔ دل یک دم ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ اپنے کم مائیگی کا احساس ہوتے ہی موسم کی دلکشی یاسیت میں بدل گئی۔ جل تھل بارش کی شوریدہ بوندیں جس طرح زمین کو بھگو رہی تھیں اسی طرح خاموش آنسوؤں نے آنکھوں کی زمین کو بھی نم کر دیا۔ آنسوؤں کی آبیاری نے خوابوں کو نمو بخشا تھا دل میں دبی خواہشوں نے جڑ پکڑنا شروع کر دیا۔

''ہانڈی دیکھ لو کہیں جل نہ جائے۔'' ماما کی آواز پر وہ چونک گئی۔ ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں کو رگڑتے اس نے ڈھکن ہٹایا۔ ہانڈی کو چولہے پر رکھنے کے بعد اگر اس کا دھیان نہ رکھا جائے تو ہماری ذرا سی بے توجہی سے ہانڈی جل سکتی ہے پھر وہ تو اک نازک جذبات رکھنے والی لڑکی تھی۔ شعائر حسن کی بیگانگی اسے جلا رہی تھی اس کی بے دھیانی اسے جلا کر راکھ کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ سخت بور ہو رہی تھی اس لیے چاچو کے پورشن میں آ گئی تھی۔ حرا شیشے کے آگے کھڑی تیاری میں مصروف تھی۔

''سمجھ جاؤ۔'' ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک لگاتے اس نے شوخی سے کہا تھا۔

''اوہ!'' بلو جینز، ریڈ ٹاپ میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا، ہاتھوں میں ریڈ نازک موتیوں کی بریسلٹ اس کی دودھیا کلائی میں سج رہی تھی۔ شولڈر سے نیچے آتے آئرن کیے بالوں کو اس نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔

مسکارا اور لائنر نے آنکھوں کو مزید دلکش بنا دیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' وہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی، جب اونچی سینڈل کی ٹک ٹک کرتی وہ اس تک آئی اور بیڈ سے ریڈ کلچ اٹھانے کو جھکی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' اس نے بے اختیار تعریف کی۔

''ہاں مجھے پتا ہے، ابھی ولید کو بھی پکچر بھیجیں، وہ بھی یہ ہی کہہ رہا تھا۔'' اٹھلاتے ہوئے گویا تھی، منگیتر کے ذکر پر چہرا چمک اٹھا۔

''بہت لکی ہو تم۔'' وہ رشک سے دیکھتے گویا تھی۔ ''ولید بھائی بہت چاہتے ہیں تمہیں؟'' سوال میں اشتیاق تھا۔

''چاہتا نہیں، وہ تو پاگل ہے، میرے لیے۔'' قہقہہ لگاتے گویا تھی۔

''اللہ بری نظر سے بچائے۔'' وہ دل سے دعا گو تھی۔

''اوکے، میں چلتی ہوں، ولید میرا ویٹ کر رہا ہے۔'' وہ کہہ کر بالوں کو جھٹکتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ کمرہ قیمتی فرنچ پرفیوم کی خوشبو سے مہکتا رہا۔

شعائر حسن سے جڑنے کے بعد اس نے کتنے ہی خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھ ڈالے تھے، مگر مقابل کو اس رشتے سے جڑنے کے بعد بھی اس کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ جب دوسروں کو منگیتر سے گفٹ وصول کرتا دیکھتی تو اپنی قسمت پر رونا آتا۔ اوروں کے منگیتر کے تعریفی پیغامات سن کر اس کا دل بھر آتا تھا۔

شعائر حسن اس کی خالہ کی جٹھانی کا بیٹا تھا۔ سائرہ آنٹی (شعائر کی ماما) اکثر عالیہ خالہ کے ساتھ ان کے گھر آیا کرتی تھیں۔ اپنے بڑے بیٹے عزیز کی شادی وہ اپنی بہن کی بیٹی سے کر چکی تھیں۔ اب وہ شعائر حسن کے لیے لڑکی کی تلاش میں تھیں۔ شعائر حسن نے ''یونی ورسٹی آف سڈنی'' سے ایم بی اے کیا تھا اور ان دنوں اپنا بزنس اسٹیبلش کرنے میں مصروف تھا۔ سائرہ آنٹی کو خوشی بہت پسند تھی۔ انہوں نے شعائر حسن کے لیے خوشی کو مانگا، تو ماما، پپا نے بخوشی رضامندی دے دی۔ جلد ہی اک خوب صورت سی شام کو شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والے شعائر حسن نے سبز پری کو انگوٹھی پہنا کر اپنے نام سے جوڑ لیا۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ اس کی خوشیوں کو گہن تب لگا جب اس کی منگنی کی تقریب میں چاچو کی بیٹی حرا زہرہ آنٹی کا انتخاب نظر ٹھہر گئی۔ زہرہ اور سائرہ آنٹی بچپن کی دوستیں تھیں۔ عمر کی کئی بہاریں دیکھنے کے بعد بھی ان کی دوستی جوں کی توں تھی۔ حرا اور ولید بھی جلد رشتے میں جڑ گئے۔ سو حرا کی انگیجمنٹ میں وہ خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ آسمانی کلر کے فراک میں وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی، مگر اب اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا، کیوں کہ شعائر نے انگیجمنٹ کی تقریب میں شرکت نہیں کی تھی۔ تقریب اختتام پذیر ہوئی تو وہ حرا کے کمرے میں چلی آئی۔ دلہن بنی حرا کو کال میں مصروف دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ولید کی کال تھی۔

اس نے اپنی سسٹر سے میرا نمبر لے کر کال کی تھی۔ بہت تعریفیں کر رہا تھا۔'' کال کاٹنے کے بعد وہ اسے بتا رہی تھی، خوشی کے دل کو اک اور چوٹ پڑی تھی۔ شعائر کا رویہ اسے مزید تکلیف پہنچانے لگا تھا۔ اب وہ قدم قدم پر اپنا موازنہ حرا سے کرنے لگی۔ اسے اپنا آپ حرا سے کم تر محسوس ہونے لگا۔ شعائر کی بے گانگی اسے بری طرح کھلنے لگی تھی۔ اس رشتے سے اسے خوشی نہیں ہوئی تھی، بلکہ غصہ آتا تھا، کیوں کہ اسی تعلق نے اسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

''گھر آنے کی فرصت مل گئی۔''

بچے باہر گھومنے کی ضد کر رہے تھے۔ ان کے بابا تو دبئی میں بیٹھے ہیں۔ میں اکیلی کہاں تک ان بچوں کے نخرے اٹھاتی پھروں، جب ہی یہاں آ گئی تھی، مگر یہاں آ کر پتا لگا موصوف گھر پر ہی نہیں ہیں۔'' ثمن بجو نے ولید کو دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا تو ولید جی بھر کر شرمندہ ہوا۔

''چلو بچوں آئس کریم کھانے چلیں۔'' اس نے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، جو منہ پھلائے کارٹون دیکھنے میں مصروف تھے۔

''نہیں، میں اب گھر جاؤں گی، تم بھی آرام کرلو۔'' ثمن بجو کا انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

''لے بھی جاؤ، جب بھائی اتنے مان سے کہہ رہا ہے۔'' خاموش بیٹھیں ماما نے ثمن بجو کو سمجھایا تھا۔

''اوکے، میں فریش ہو کر آتا ہوں، آپ سب ریڈی ہو جائیں۔'' وہ کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''تم رکنے کی نیت سے آئی تھی، پھر ولید سے کیوں کہا کے گھر جانا ہے؟'' ماما حیران تھیں۔

''آپ دیکھ نہیں رہیں ولید کس قدر بدل گیا ہے، پہلے ہر دوسرے دن میرے گھر پہنچ کر بچوں کی خبر لیتا تھا، اب تو بھولے سے بھی گھر کا رخ نہیں کرتا ہے۔ ہر وقت بچے مجھے تنگ کرتے رہتے ہیں کہ ماموں جان کو کال کریں، انہیں گھر بلائیں۔ ہم نے باہر گھومنے جانا ہے اور میں جب اسے کال کروں، وہ مصروفیت کا بہانا کر کے معذرت کر لیتا ہے اور وہ کہاں مصروف رہتا ہے۔ اس بات سے بھی میں بخوبی واقف ہوں۔ ہر اگلے دن حرا ولید کی ملاقات ہوتی ہے۔ دونوں ساتھ جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہیں اور بات صرف یہاں پر ہی ختم نہیں ہو جاتی، ہر ملاقات کی تصویریں فیس بک میں اپ لوڈ

بھی کی جاتیں ہیں۔ اس لڑکی کو اپنی عزت کی ذرا برابر بھی پروا نہیں، کوئی شرم اور لحاظ نہیں ہے۔ اگر شادی سے پہلے گھوم بھی رہی ہے تو ضروری ہے کہ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹے؟ مجھے تو شروع سے یہ لڑکی تیز لگتی تھی۔ ذرا اچھی نہیں لگی ہے مجھے، جانے ولید کو کون سی پٹیاں پڑھائی ہیں کہ وہ گھر والوں کی طرف سے اس قدر لاپروا ہوتا جا رہا ہے، شادی سے پہلے یہ حال ہے، شادی کے بعد جانے کیا کرے گی یہ لڑکی۔" بجو کی باتیں سن کر ولید کے قدم زمین پر جمے رہ گئے۔

☆☆☆

"کل کا موسم کتنا قاتل تھا۔" کلاس سے وہ کینٹین کا رخ کر رہی تھیں۔ جب سدرہ نے کہا۔

"واقعی میرے لیے کل کا دن بہت یادگار رہا۔" سارہ نے بھی کہا۔

"ایسا کیا ہوا تھا؟" حنا نے دلچسپی لی۔ سارہ کے چہرے پہ حیا کے رنگ بکھر گئے۔

"کل میں پھپھو کے گھر گئی تھی۔" اس نے شرماتے ہوئے بتایا۔

"پھر کیا ہوا؟ کامران بھائی گھر میں تھے؟" سدرہ نے کریدا۔

"جی ہاں!" دھیمی مسکان لبوں پر سجائے وہ گویا تھی۔

"پھر وہاں تم نے کیا، کیا؟" حنا کی بے چینی عروج پر تھی۔

"خوب ہلا گلا کیا، شام کی چائے میں نے بنائی، پھر ہم کزنز چھت پر واک کرتے رہے۔ وہ سب کے درمیان رہ کر بھی سارا وقت مجھ سے ٹیکسٹ میں باتیں کرتا رہا۔ سب کے بیچ رہ کر بھی وہ میرے ساتھ تھا۔ یہ احساس میرے لیے بے حد خوب صورت تھا۔" اس نے کل کا دن میرے لیے یادگار بنا دیا۔ جب وہ میری خوشیوں کا خیال کرتا ہے تو مجھے اپنا آپ بہت قیمتی محسوس ہونے لگتا ہے۔" اس کے چہرے پر چاہتوں کے رنگ قوس و قزح کی طرح بکھر گئے تھے۔ اس نے رشک سے سارہ کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ کو ابھرتا دیکھا۔

کامران اور سارہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، مگر ان دونوں کے مابین چاہت کے جو دیے روشن تھے اس بات سے گھر والے لاعلم تھے۔ گھر والوں کی لاعلمی کے باوجود کامران، سارہ کو دنیا جہان کی خوشیاں دینے کے درپہ رہتا تھا۔

"تم اس قدر بے حس، اتنے سنگ دل کیوں ہو شعائر حسن، تمہیں میری خوشیوں کا خیال کیونکر نہیں آتا؟" دل ہی دل میں دشمن جاں سے مخاطب تھی۔

"کل کا دن تم نے کیسے گزارا خوشی؟" ان سب کی توپوں کا رخ اس کی جانب مڑا، سب کی سوالیہ نظریں خود پر جمے دیکھ کر اس کا دل چاہا وہ کہیں غائب ہو جائے۔

اسے شعائر حسن کا خیال آ گیا کل جب موسم خوش گوار دیکھ کر بھابھی نے باہر گھومنے کا پھرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ شام کو واپسی پر بھائی بھابھی گاڑی سے اتر کر اندر کی جانب مڑ گئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پیچھے چلنے لگی۔ ہال میں غیر معمولی ہلچل سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شعائر حسن کو ماما پاپا کے ساتھ براجمان دیکھ کر ہال کے باہر ہی کھڑی رہ گئی۔ دلکشی سے مسکراتے ہوئے وہ ابرار سے مصافحہ کر رہا تھا۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو۔ اندر آ جاؤ۔" بھابھی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ شعائر نے اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد دوسری نظر ڈالی وہ جیسے ہی ہال کے اندر داخل ہوئی شعائر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب میں چلتا ہوں۔" آواز دلکش لہجہ مگر لفظوں نے اس کے ذہن میں زہر بھر دیا۔

"کہیں منگیتر صاحب کی سرپرائز کال موصول تو نہیں ہوئی؟" سارہ کے سوال پر وہ اپنے خیالات سے باہر آئی۔

"نہیں۔" لہجہ سپاٹ تھا اور چہرے پر سرد مہری سب نے اک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"لگتا ہے موصوف شادی کے بعد ہی سارے حساب بے باق کریں گے۔" سدرہ نے کہا تو سب کا قہقہہ کینٹین میں گونجنے لگا۔ جس پر اس نے گہرا سانس لیا۔

☆☆☆

"ربیا، آپ کل آ رہی ہیں نا؟" وہ یونی ورسٹی سے لوٹی تھی، جب رابعہ (خالہ کی بیٹی) کی کال آ گئی۔

"مگر کیوں؟" اس نے استفسار کیا۔

"آپ کو خالہ نے نہیں بتایا؟" وہ حیران ہوئی۔

"نہیں، ایسی کیا بات ہے؟" وہ رابعہ کے انداز پر جھنجلا گئی۔

"شعائر بھائی انوائٹ کرنے گئے تھے۔ کل آپ لوگوں کی دعوت ہے۔" رابعہ نے بتایا۔

"اوہ اچھا۔ دعوت کس خوشی میں۔" کل رات وہ ڈنر کیے بنا ہی سو گئی تھی اور صبح یونی ورسٹی چلی گئی۔ ماما سے اس کی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی، جو وہ اسے بتاتیں۔

"آپ ایسے آئیں گی نہیں تو دعوت دے کر ہی بلانا پڑے گا۔" انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"ایسی بات نہیں تو کل صبح آ جایئے گا دعوت کا اہتمام میں اکیلے نہیں کر سکتی۔" رابعہ اسے شرمندہ ہوتا دیکھ کر چہک اٹھی۔

"صبح مجھے یونی ورسٹی جانا ہوتا ہے۔" اس نے بہانا بنایا۔ وہ نہیں چاہتی تھی جو انسان اس کے گھر آ کر اسے نظر انداز کرتا۔ وہ صبح سے اس کے گھر پہنچ کر اس انسان کو اہمیت دے۔

"اف اپنا کل سنڈے ہے۔" رابعہ نے کہا تو وہ اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

"میں اکیلی کیسے آؤں گی؟" اس نے اک اور بہانا بنانے کی سعی کی۔

"اکیلے کیوں، آپ کو شعائر بھائی لینے آئیں گے۔ کل بارہ بجے تیار رہیے گا، او کے بائے۔" وہ اپنی بات کہہ کر کال کاٹ چکی تھی۔ شعائر پر غصے کے باوجود اس خبر کو سن کر اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

"تو جناب کو میرا خیال آ ہی گیا؟" وہ مسکرانے لگی۔ اس احساس نے تمام گلے شکوے مٹا دیے، اداسی کا ہر احساس زائل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

لائٹ پنک قمیص دوپٹے اور وائٹ چکن کی ٹراوزر پہنے وہ شیشے کے آگے کھڑی تیاری میں مصروف تھی۔ آنکھوں میں کاجل ڈالے، لائٹ پنک کلر کی لپ اسٹک سے لبوں کو رنگتے ہوئے اس نے خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھا تھا۔ لمبے بالوں کی اس نے ڈھیلی پونی بنائی تھی۔ مارنل کے پنک اور وائٹ کڑے ہاتھوں میں ڈالتے ہوئے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "بارہ بج گئے۔" عین اسی لمحے گاڑی کی ہارن کی آواز آئی تو اس کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ وائٹ چپل پیروں میں اڑستے ہوئے اس نے بیگ اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

"میں تمہیں بلانے آئی تھی۔" کمرے سے باہر کھڑی صاعقہ بھابھی گویا تھیں۔

"میں تیار ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔ اس کے پور پور سے خوشی چھلک رہی تھی۔ چہرے پر اک الگ ہی چمک تھی، بھابھی بے اختیار اسے دیکھے گئیں۔

"ماشاء اللہ، بہت پیاری لگ رہی ہو۔" بھابھی نے کہا۔

"ہاہاہا۔" اس کا دل ہر بات پر قہقہہ لگانے کو چاہ رہا تھا۔ پوری کائنات اسے مسکراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ باہر آئی تو گاڑی کھڑی تھی، اسے دیکھتے ہی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ شعائر حسن کے بجائے ڈرائیور کو باہر آتا دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ڈرائیور پچھلی سیٹ کا دروازہ وا کیے منتظر تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ

گئی۔ ذہن اور دل میں بدگمانیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ کچھ دیر قبل محسوس ہوتی خوشیوں کی موت پر اس کا دل ماتم کناں تھا۔ آنسوؤں کو ٹشو میں جذب کرتے ہوئے وہ شیشے کے باہر دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔

''اپیا! آپ کی آنکھوں کو کیا ہوا ہے۔'' رابعہ نے گرم جوشی سے ملنے کے بعد اس کی سرخ آنکھیں اور پھیلے ہوئے کاجل کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آنکھوں میں کچھ چلا گیا تھا۔'' ٹشو سے آنکھیں رگڑتے گویا تھی، وہ اسے یہ نا بتا سکی کہ شعائر حسن کا رویہ اس کے دل میں پھانس بن کر چبھ گیا ہے۔

''شعائر بھائی آپ کو لینے جا رہے تھے۔ جب ان کے دوست کی کال آ گئی۔ اس لیے انہیں وہاں جانا پڑا۔'' رابعہ بچی تو نہ تھی جو اس کے سرخ ہوتی آنکھوں کے پیچھے دکھ کی لکیروں کو جان نہ پائی۔

''تم نے مجھے سب کے سامنے تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ شعائر حسن۔'' رابعہ کے صفائی پیش کرنے پر اس نے تاسف سے سوچا تھا۔ سائرہ آنٹی اور خالہ بے حد محبت سے ملیں، ان کی محبت اور توجہ پا کر وہ قدرے پرسکون ہو چکی تھی۔ خالہ اور سائرہ آنٹی الگ پورشن میں رہتے تھے۔ ان دونوں کا رشتہ روایتی دیورانی، جٹھانی والا نہ تھا، یہ ہی وجہ تھی کہ کھانا بنانے کے لیے ایک ہی کچن استعمال ہوتا تھا۔ تمام لوگ اکٹھے ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ خالہ اور رابعہ ہر وقت سائرہ آنٹی کے پورشن میں ہی پائی جاتی تھیں۔ اس کے آتے ہی سائرہ آنٹی نے میز بھر کر ناشتا لگوا دیا۔ وہ محبت سے ایک ایک چیز اس کی پلیٹ میں ڈال رہی تھیں۔ وہ نا نا کرتی رہی، مگر ان کی اپنائیت کے آگے ہر انکار خود ہی دم توڑ گیا۔

''اوہو' بہو کے لاڈ اٹھائے جا رہے ہیں۔'' رابعہ نے اپنی بڑی ماں کو چھیڑا۔

''اتنے دنوں بعد میری بچی گھر آئی ہے۔ لاڈ نہ اٹھاؤں تو اور کیا کروں۔'' وہ محبت سے دیکھتے گویا تھیں۔

''آپ کی بچی آج بھی نہ آتیں، اگر جو میں انہیں نہ بلاتی۔'' رابعہ نے کریڈٹ لینا چاہا۔

''یہ لو تمہارا انعام۔'' انعم بھابھی نے اس کے پلیٹ میں سینڈوچ رکھتے ہوئے شرارت سے کہا تو سب ہنس دیے۔

☆☆☆

ریڈ ویل ویٹ کیک بیک کرنے کے بعد اس نے کریم سے اسے پلاسٹر کیا تھا اور کریم میں ریڈ کلر مکس کرنے کے بعد بیٹ کرنے لگی تھی۔ سفید کریم، سرخ رنگ میں تبدیل ہو گئی تو اس نے کریم پائپنگ بیگ میں بھر لیا اور مہارت سے فلاور بنانے لگی۔ وہ نوزل کی مدد سے مہارت سے کیک کی چاروں طرف فلاور بنا رہی تھی۔

''شکر ہے پزا بھی بن گیا اور کڑاہی بھی تیار ہو گئی۔'' کھیرے کاٹتے ہوئے رابعہ نے شکر کا کلمہ ادا کیا۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی سب وقت پر ہو جائے گا۔ تم ہی پریشان ہو رہی تھیں۔'' وہ کیک کو شیلف پر رکھتے گویا تھی۔

''یہ تو بہت خوب صورت ہے خوشی! شعائر تو خوش ہو جائے گا۔'' ہارٹ شیپ کے کیک پر نظریں مرکوز کیے بھابھی نے رائتہ بناتے ہوئے کہا تھا۔ چیزیں سمیٹتے ہوئے اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''تم نے کیک پر شعائر کا نام نہیں لکھا؟'' بھابھی نے کہا تو وہ مزید حیران ہوئی اور استعجابیہ نظروں سے رابعہ کو دیکھنے لگی۔

''بھول گئیں، آج شعائر بھائی کی برتھ ڈے ہے نا۔'' رابعہ نے بتایا تو وہ چپ رہ گئی تو یہ دعوت شعائر کے برتھ ڈے کی وجہ سے ارینج کی گئی تھی۔ اسے اپنی بے خبری پر جی بھر کر غصہ آیا تھا، جو انسان اسے نظر بھر کر دیکھنا گوارہ نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کے

لیے کیک، پزا اور کڑاہی بنا رہی تھی۔ اسے رابعہ پر بھی سخت تاؤ آیا۔ کم از کم اسے پہلے بتا دیتی۔ تو وہ کبھی بھی آج کے دن شعائر حسن کے گھر قدم نہ رکھتی۔ وہ اس کے ساتھ غیروں جیسا سلوک روا رکھتا تھا، تو اسے بھی کوئی شوق نہ تھا کہ وہ اسے اہمیت دیتی۔

''کیسی منگیتر ہو تم، اپنے ہونے والے ان کا برتھ ڈے تک یاد نہیں۔'' انعم بھابھی نے کہا تو اس کا موڈ مزید بگڑ گیا۔ رابعہ نے کن انکھیوں سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

''سرپرائز۔'' شعائر حسن نے گھر میں قدم رکھا تھا اور اندر مکمل تاریکی تھی۔ اس نے ٹارچ آن کرنے کے لیے جیب سے موبائل نکالا ہی تھا جب تمام لائٹس اچانک جل اٹھیں۔ میز پر غبارے اور پھولوں کی پتیوں کے ساتھ کیک دیکھ کر اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔

''اوہ...... تو یہ سرپرائز میری گڑیا نے میرے لیے پلان کیا تھا۔'' دلکشی سے مسکراتا ہوا وہ بڑے ہی اسٹائل سے چل کر رابعہ تک آیا اور اس کے گال کھینچتے گویا تھا۔

''اف بھائی۔'' اس نے کہتے ہوئے گالوں سے ہاتھ ہٹایا۔

''السلام علیکم آنٹی! دلکش مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ ماما سے مخاطب تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس کے جھکے سر پر ہاتھ رکھتے محبت سے گویا ہوئیں۔

''آپ کیسے ہیں انکل۔'' گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے وہ پاپا سے گویا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں برخوردار، تم کیسے ہو؟'' انہوں نے جواباً کہا۔

''کیسا لگ رہا ہوں؟'' وہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے استفسار کر رہا تھا۔

''ہینڈسم۔'' پاپا نے کہا تو وہ بے اختیار ان کے گلے لگ گیا۔ بھابھی سے خیریت دریافت کرنے کے بعد وہ اب بھائی کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ باری باری سب سے ملتے ہوئے اس نے خوشی کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ اس کے اس رویے سے خوشی کے دل میں درد بڑھنے لگا اور آنکھیں برسنے کو بے تاب ہونے لگیں۔ اشک پیتی وہ منظر سے غائب ہو گئی۔ اپنی بے قدری پر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا ہم سفر اسے سب سے زیادہ اہمیت دے، مگر وہ ہمیشہ اسے نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ ہال سے تالیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً وہ کیک کاٹ رہا تھا۔ اسے لگا اس لمحے اس نے کیک نہیں، اس کے دل پر چھری چلا دی ہے۔ باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں، وہ شاید باری باری سب کو کیک کھلا رہا تھا۔ وہ تو شاید کسی کھاتے میں ہی نہیں آتی تھی، سب کے بعد بالکل آخر میں بھی اس کا نمبر نہیں آتا تھا اور کتنی اذیت دو گے مجھے شعائر حسن۔'' دکھتے دل کے ساتھ اس نے سوچا تھا اور باہر آ گئی۔

''خالہ! آپ کباب لیں، میں نے بنائے ہیں۔'' رابعہ کباب سب کی پلیٹ میں ڈالتی گویا تھی۔

''مٹر پلاؤ سب نے لازمی کھانا ہے اور میری ڈھیروں تعریفیں بھی کرنی ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''شکر ہے تم نے پہلے ہی بتا دیا، اب میں ان چیزوں سے دور ہی رہوں گا۔'' وہ پلیٹ میں کڑاہی نکالتے گویا تھا۔

''بیٹا! آپ کیوں کھڑی ہو، کسی نے سزا دی ہے آپ کو۔'' حسن صاحب (شعائر کے بابا) نے خوشی کو سائڈ میں کھڑے دیکھ کر کہا تھا۔ وہ خفیف سی ہو گئی اور رابعہ کے برابر میں رکھی خالی کرسی پر براجمان ہو گئی۔

''کیسی ہو خوشی، تم تو یہاں کا راستہ ہی بھول گئی تھیں۔'' خالو نے شکوہ کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے خالو۔'' وہ شرمندہ ہوئی۔

''یہ تمہارا سسرال ہی نہیں، تمہاری خالہ کا بھی گھر ہے، آتی رہا کرو بیٹا۔'' حسن صاحب نے محبت

سے کہا تھا، وہ سراثبات میں ہلا کر رہ گئی۔
"میرا گفٹ کہاں ہے۔" سب ڈنر میں مصروف تھے۔ جب شعائر رابعہ کو دیکھتے استفسار کرنے لگا۔ اس کے برابر بیٹھی خوشی کا دل چاہا وہ خود کو وہاں سے غائب کردے اسے دکھوں کی سوغات دے کر وہ تو کیسے چہک رہا تھا۔
"یہ جو غبارے اور کینڈل آپ دیکھ رہے ہیں نہ، یہ میں نے اپنی پاکٹ منی سے خریدی ہیں اور جو پھولوں کی پتیاں آپ کو بکھری ہوئی نظر آرہی ہیں، ان پتیوں کے لیے میں عزیر بھائی کی کتنی ہی منتیں کیں۔ مگر سب بے سود، پھر مجھے اپنے تعلقات کا استعمال کرنا پڑا، یعنی بھابھی سے مدد لینی پڑی، تب جا کر عزیر بھائی نے یہ پتیاں لا کر مجھے دیں اور میڈیکل کے اسٹوڈنٹ کا ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ میں نے آپ کو اپنا پورا دن دیا، اتنی بڑی سرپرائز پارٹی ارینج کی، اب کون سے گفٹ کی بات کر رہے ہیں آپ؟" شعائر کے سوال پر رابعہ نے تقریر کر ڈالی۔
"مائی ڈیر سسٹر شکریہ کہہ کر میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا، ویسے تم نے بہت پتے کی بات بتادی ہے، اب مجھے عزیر بھائی سے کوئی کام نکلوانا ہوگا، تو میں بھی بھابھی سے ہی مدد طلب کروں گا۔" شعائر نے کہا تو بھابھی تجل سی ہوگئیں۔ جبکہ عزیز بھائی مسکرانے لگے۔
"سنو سب کی، مگر ہمیشہ وہی کرو جو آپ کی بیوی کہتی ہے۔"
حسن صاحب نے کہا تو سب بے اختیار ہنس دیے۔
"ویری ویل سیڈ بابا۔" شعائر نے سراہا۔
"ہر وقت شور کرتے رہتے ہو، کھانا تو سکون سے کھاؤ۔"
سائرہ بیگم نے ڈپٹا تھا۔
"سن لیں پاپا، آپ کو کہہ رہی ہیں۔" شعائر نے حسن صاحب کو کہا۔
"بیٹا یہ آپ کے حصے کی ڈانٹ ہے، ہماری بیگم صاحبہ کو ہمارا بہت خیال ہے، وہ ہمیں سب کے سامنے نہیں بلکہ اکیلے کمرے میں جھاڑ پلاتی ہیں۔"
حسن صاحب کا انداز شرارتی تھا۔ سائرہ بیگم خفگی سے انہیں دیکھنے لگیں۔ خوش گوار ماحول میں سب ڈنر کرتے رہے۔ شعائر حسن کے تعلقات ہر اک کے ساتھ دوستانہ تھے۔ وہ سب کی آنکھ کا تارا تھا، جانے وہ خوشی کی دل کی دھڑکن کیوں نہیں بننا چاہتا تھا۔ ڈنر سے فارغ ہو کر چائے کا دور چلا، کچھ دیر بعد وہ بوجھل دل کے ساتھ ماما، پاپا کے ہمراہ گھر آگئی۔

☆☆☆

اس کے پیپرز شروع ہونے والے تھے۔ وہ پڑھائی میں مصروف ہوگئی تھی۔ ان ہی دنوں سائرہ آنٹی اور حسن صاحب شادی کی تاریخ طے کرنے پہنچ گئے۔ دو ماہ بعد کی تاریخ طے ہوئی تھی، اس لیے زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ ان تیاریوں میں اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ پڑھائی کا بہانا بنا کر زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی، تمام تیاریاں بھابھی اور ماما ہی کر رہی تھیں۔ بھائی اور پاپا بھی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان ہی دنوں حرا کی تاریخ طے ہونے کا بھی شور تھا۔ چاچو نے پاپا کی مشاورت سے حرا کی شادی کی تاریخ بھی اسی دن طے کردی جس تاریخ پر خوشی کی شادی ہونا تھی۔ یوں حرا بھی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ حرا اگلے دن ولید کے ساتھ شاپنگ پر جانا اور آکر خوشی کو تفصیلات بتانا، اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حرا کی مسرتوں کو دیکھتے ہوئے وہ شعائر سے مزید بدگمان ہوگئی۔ کئی شب و روز چپکے سے گزر گئے، مگر اس کی یاسیت اور اداسی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جارہی تھی۔
شادی کے دن نزدیک تھے، مگر اس کے دل کو گدگدانے والا کوئی بھی جذبہ اس کی دل کی گلیوں میں پھیرے نہیں لگا سکا۔ مایوں کا دن بھی آن پہنچا۔ وہ بے دلی سے تمام رسومات کی ادائیگی ہوتا دیکھتی رہی۔ دلہن بنی وہ ہر احساس سے مبرا تھی، کسی روبوٹ کی طرح بھابھی اور ماما کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ دوسری طرف حرا کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ بے حد

خوش تھی اور ہر، ہر رسم کو خوب انجوائے کر رہی تھی۔ وہ حسرت سے حرا کو دیکھنے لگی۔ مردہ خواہشوں نے اس کی آنکھوں میں اداسی کی تحریر رقم کردی تھی۔ اداسی اور ویرانی کے ساتھ یہ دن بھی گزر گئے اور وہ دن بھی اس کی زندگی میں آگیا جس کا اسے ذرا انتظار نہ تھا۔ سفید شیروانی سے زیب تن کیے وہ کسی ریاست کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ سرخ و سفید شرارے میں وہ خود بھی پریوں کی دیس کی باسی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی در آئی تھی، مگر دل تھا کہ اپنے محسوسات بدل ہی نہیں رہا تھا۔ دل کے جہان میں ہلچل مچاتے جذبات رونما ہی نہ ہوسکے تھے۔ چپ کی مہر لبوں پر سجائے وہ پرانی زندگی سے رخصت لے کر نئی زندگی میں قدم دھر چکی تھی۔ اس کے برعکس حرا نئی زندگی کی شروعات بہت پرجوش انداز میں کرنے جارہی تھی۔ اس کے ہر، ہر انداز سے خوشی جھلک رہی تھی۔

☆☆☆

وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں کمرے کے در و دیوار کو تک رہی تھی۔ بیڈ کے چاروں اطراف کو موتیوں کی لڑیوں سے سجایا گیا تھا۔ جا بجا سرخ موم بتیاں جل رہی تھیں، کمرے کی چاروں اور سفید نیٹ کے پردے سرسرا رہے تھے۔ موتیا اور گلاب کی مسحور کن مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب شعائر حسن کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ روایتی دلہنوں کی طرح شرما کر نظریں بھی نہ جھکا سکی۔ وہ اس کے مقابل بیٹھا تھا۔ جب کہ اس کی نظریں کمرے کی آرائش سے چپکی ہوئی تھیں۔ اس کے دل کی دنیا کچھ اس طرح بدلی تھی کہ فطری شرم و جھجک اسے ذرا محسوس نہ ہوئی۔
"السلام علیکم!" دلکش مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جواباً وہ اسے سپاٹ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"کیا چاہتی ہو، تمہاری آنکھوں میں ڈوب جاؤں؟" شعائر نے شرارت سے کہا تھا۔ "ہاہاہا۔"
اس کی بات سنتے ہی سرعت سے نظریں جھکا گئی۔ جب کہ شعائر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔
"بہت پیاری لگتی ہو مجھے۔" استحقاق سے اس کی دودھیا کلائی تھام کر نرمی سے کنگن پہناتے گویا تھا۔ وہ خاموش رہی، وہ اس کی خاموشی کو شرم و جھجک سے تعبیر کر رہا تھا، جب ہی اس کے کچھ نہ کہنے پر بھی خود مسلسل بولے جارہا تھا۔
"تمہارے حسین ہاتھوں نے ان کنگن کو قیمتی بنا دیا ہے، تم سے جڑ کر کتنے خوب صورت ہوگئے ہیں۔" ہتھیلیوں کی پشت پر لب رکھتے ہوئے کہا تو وہ جیسے خواب سے جاگی اور جھٹ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس بے ساختگی پر شعائر حسن اک بار پھر قہقہہ لگا رہا تھا۔

☆☆☆

"اور کتنے ظلم کروگی؟ تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔" سیرون کلر کی فراک زیب تن کیے وہ پنک لپ اسٹک لگانے کے بعد وہ گالوں پہ بلشر لگا رہی تھی۔ جب شعائر نے اس کے پیچھے آکر کاندھوں سے اسے تھاما تھا۔ کاجل سے مزین ڈارک براؤن آنکھیں بے اختیار جھک گئیں۔ اس نے اس کا رخ اپنی جانب موڑتے ہوئے کہا تو اس کی جھکی پلکیں لرزنے لگیں۔ براؤن بالوں کی شریر لٹیں اس کے گالوں کو چومنے لگیں تو شعائر سے ان لٹوں کی گستاخی برداشت نہ ہوسکی۔ اس لیے اس نے ان لٹوں کو پکڑ کے کان کے پیچھے کردیا۔ "کس قدر دلکش لگ رہی ہو، کچھ اندازہ ہے۔" وہ اس کے دلکش چہرے پر نظریں جمائے گویا تھا۔ سفید گالوں پر بلشر کے ساتھ حیا کی سرخی بھی بکھر گئی، خوشی کی دلی کیفیت بدلنے لگی۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں، عین اسی لمحے کمرے کا دروازہ بجا، وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور بالوں کو کیچر لگا کر مقید کرلیا۔
"واؤ، کتنی پیاری لگ رہی ہو تم۔" انعم بھابھی نے بے ساختہ تعریف کی تو جھینپ گئی۔
"ناشتا تیار ہے، یہاں لگادوں یا باہر؟" انعم

بھابھی نے استفسار کیا۔

"باہر لگا دیں بھابھی۔" شعائر سے پہلے خوشی نے جواب دیا تھا۔ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"پھر چلو باہر سب کے لیے ناشتا لگا دیا ہے۔" وہ خوشی کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر نکل گئیں، تو وہ بھی ان کے پیچھے ہولیا۔

"السلام علیکم!" ناشتا میز پر سجا ہوا تھا، تمام لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے مشترکہ سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔" حسن صاحب نے محبت سے جواب دیا۔ خالہ اور سائرہ آنٹی نے اسے پیار کیا تھا۔

"خوشی آملیٹ تو لو۔" بھابھی نے پلیٹ اس کی جانب سرکائی۔

"بیٹا! بالکل بھی تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔" حسن صاحب نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"یہ لو بیٹا جوس۔" سائرہ آنٹی نے گلاس میں اورنج جوس ڈال کر اس کو پکڑایا۔ جسے اس نے مسکراتے ہوئے تھام لیا۔

"اپیا' یہ سینڈوچ آپ نے ضرور کھانا ہے، میں نے نئی ترکیب سے بنایا ہے۔" رابعہ کچن سے پلیٹ پکڑے ہال میں آئی تھی۔

"مت تنگ کرو بہن کو، خوشی بیٹا تمہارا جو دل چاہے وہ کھاؤ۔" خالہ نے اپنائیت سے کہا تھا، سب اس کو محبت اور اپنائیت کے ساتھ ناشتا کروا رہے تھے۔ اک اک چیز اس کی پلیٹ میں ڈال رہے تھے۔ وہ اس قدر محبت اور توجہ پا کر مسکرائے جا رہی تھی، شادی سے پہلے جو بے نام سی اداسی اس کے وجود کو گھیرے رکھتی تھی اتنے سارے لوگوں کی محبت اور توجہ پا کر کہیں جا چھپی تھی، مگر شعائر حسن کے لیے اس کے دل میں اب بھی بدگمانی موجود تھی۔ یہ اور بات تھی کہ جب وہ اس کے نزدیک آتا تھا تو اسے اپنا آپ بھی بھول جاتا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کی محبت کو دھتکار نہیں پائی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نکلتی محبت کی شعاعیں اس کے دل میں دبی شکایتوں کی زبان بند کر دیا کرتی تھیں۔ مگر شعائر کے دور جاتے ہی دل ماضی میں ہونے والی زیادتیوں کی طرف اس کی توجہ دلانے لگتا تھا اور پھر اسے اپنے اور شعائر کے بیچ اک ان دیکھی دیوار حائل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جو اسے شعائر سے فاصلے پر لا کھڑا کرتی تھی۔

☆☆☆

"بجو ناشتا تو لگا دیں۔" ولید کمرے سے باہر آیا تو ماما اور بجو کو کمرے میں آرام فرماتا دیکھ کر کہنے لگا۔

"دو بج رہے ہیں، یہ کوئی ناشتے کا ٹائم ہے؟" ماما نے کہا تو وہ سر جھکا گیا۔

"میں تو کب سے ناشتا بنا کر انتظار کر رہی تھی' تمہاری اور تمہاری میڈم کی صبح ہوتی تو میں ناشتا لگاتی نا۔" بجو نے جتایا تھا۔

"آپ کمرے میں ناشتا لگا دیں پلیز!" وہ شرمندہ شرمندہ سا گویا تھا۔

"میں ناشتا نکال دیتی ہوں، تم خود ہی لگا لو۔" وہ کمرے سے نکلتے ہوئے گویا تھیں، وہ تاسف سے بجو کو دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ کیوں لگا رہے ہیں ناشتا، آپ کی بجو اور ماما نہیں لگا سکتیں۔" حرا بن سنور کر بیڈ پر نیم دراز تھی۔ جب ولید نے بیڈ پر دسترخوان لگایا تھا۔

"تم چپ کرو پلیز!" ناگواری سے گویا تھا۔

"آپ کے گھر میں نئی دلہن کی یہ عزت ہے؟" ولید کے انداز پر وہ چراغ پا ہوئی تھی۔

"کیوں جان کھا رہی ہو میری؟" ولید زچ ہو گیا تھا۔

"آپ کو یا آپ کے گھر والوں کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ نئی دلہن کو کیسے ٹریٹ کرتے ہیں؟" ولید کی باتوں پر اسے تاؤ آ گیا۔ کل سے آج تک ساس اور نند نے اسے ذرا برابر اہمیت نہیں دی تھی اور ابھی بھی خود ناشتا لگانے کے بجائے ولید سے دسترخوان لگوا رہی تھیں۔

"ہمیں پتا ہے بی بی، کس کو کس طرح ٹریٹ کرنا ہے۔" پانی کی بوتل اور گلاس رکھتے ہوئے بجو نے حرا سے کہا تو ولید ان دونوں سے نظریں چرانے لگا، جبکہ حرا نے بجو کو کھا جانے والی نظروں سے جاتا دیکھا تھا۔

☆☆☆

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی چیزیں پیک کرنے لگی، اسے ولیمے کی تیاری کے لیے پارلر جانا تھا۔ بھابھی اور رابعہ نے اسے زبردستی لنچ بھی کروا دیا۔ شعائر حسن اپنے کسی کام سے باہر گیا تھا۔ وہ رابعہ اور بھابھی کے ہمراہ پارلر جانے لگی تو سائرہ آنٹی نے کھانے پینے کی ڈھیروں چیزیں اسے پکڑا دیں۔

"بڑی ماما، ہم پارلر جا رہے ہیں، پکنک پر نہیں۔" رابعہ جھنجلائی تھی۔

"یہ سب میری بہو کے لیے ہے، وہاں اسے بھوک لگے گی تو کیا کرے گی؟" سائرہ آنٹی نے کہا تو وہ ان کی محبت کی دل سے معترف ہو گئی۔ وہ تینوں عزیر کے ہمراہ پارلر سے ڈائریکٹ ہال پہنچ گئے تھے۔ شعائر حسن کے ہال پہنچتے ہی فوٹو گرافر اور مووی میکرز نے اپنا کام شروع کر دیا۔ خوشی کی فیملی بھی ہال پہنچ گئی تھی۔ وہ سب سے مل کر بے طرح خوش تھی۔ پروگرام کے اختتام پر وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے گھر آ گئی تھی۔ اگلے دن حرا کا ولیمہ تھا، وہ ماما، پاپا کے ساتھ حرا کا ولیمہ اٹینڈ کرنے آئی تھی۔ جب ماما، پاپا جانے لگے تو وہ بھی ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی، مگر شعائر حسن نے اسے روک لیا تھا۔ نتیجتاً وہ شعائر حسن کے ساتھ آ گئی۔ حرا اور ولید ولیمے کی تقریب کے بعد ہی ہنی مون ٹرپ پر روانہ ہو چکے تھے۔ جب کہ شعائر نے ایسا کوئی پلان اب تک نہیں بنایا تھا۔ یہ سوچ کر اس کا موڈ خراب ہونے لگا۔ وہ ماضی سے لے کر حال تک اپنے ساتھ ہونے والی اک اک ناانصافی کو سوچ رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی الگ ہی دنیا میں گم تھی۔

"کیا ہوا، اپ سیٹ ہو؟" وہ اسے خاموشی سے شیشے کے آگے بیٹھا دیکھ کر استفسار کر رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ کہہ کر کانوں کے آویزے اتارنے لگی تھی۔

"میں تمہیں کل ماما، پاپا سے ملوانے لے جاؤں گا۔" وہ آویزے اتارنے میں اس کی مدد کرتے گویا تھا۔

"جی ٹھیک ہے۔" لب بھینچے وہ گویا تھی۔

"کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟" اس کا سپاٹ انداز اسے پریشان کر گیا۔

"میں خوش ہوں۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لگتا تو نہیں ہے۔" وہ اس کے سامنے سے نکل رہی تھی، جب اس نے اس کی کلائی تھام لی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں، میں خوش ہوں۔" اس کی مضبوط گرفت سے کلائی کو آزاد کروانے کی کوشش کر رہی تھی، اس کی گرفت مزید سخت ہوئی تو درد کے احساس سے اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

"یہ کیسی خوشی ہے، جس نے تمہاری پلکوں کو نم کر رکھا ہے؟" شہادت کی انگلی سے اس کے آنسو سمیٹتے گویا تھا۔

"یہ خوشی آپ ہی نے دی ہے۔" وہ کلائی چھڑاتے گویا تھی۔ اس نے کلائی چھوڑ دی تو وہ واش روم میں بند ہو گئی۔ ان دنوں اس کے وجود کے اندر جنگ جاری تھی۔ شعائر کا قرب پا کر تمام شکوے موم کی طرح پگھلنے لگتے تھے۔ دل اسے معاف کر دیا کرتا تھا، مگر اس کا ذہن اتنی آسانی سے معاف کرنے پر تیار نہ تھا۔ وہ جب ماضی کی اذیت کو سوچتی تو شعائر کی توجہ اس کی محبت اسے اداکاری لگتی، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ دل اس کا قرب مانگتا تھا، جب کہ ذہن تھا کہ اسے شعائر سے دور رہنے کے مشورے دیتا تھا۔ وہ سخت ذہنی الجھن کا شکار تھی۔ شعائر کا اجنبی رویہ اور پھر اچانک شادی کے بعد چاہتیں نچھاور کرنا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ جتنا اس بارے میں سوچتی اتنا زیادہ الجھتی جاتی تھی۔

☆☆☆

مجھے نیند آتی نہیں ہے اکیلے
خوابوں میں آیا کرو
نہیں چل سکوں گا تمہارے بنا میں
میرا تم سہارا بنو
اک تمہیں چاہنے کے علاوہ
اور کچھ ہم سے ہوگا نہیں
بول دو نہ ذرا
دل میں جو ہے چھپا
میں کسی سے کہوں گا نہیں

وہ حسب وعدہ اسے ماما، پاپا سے ملوانے لے کر آیا تھا۔ اب وہ دونوں واپسی کا سفر طے کر رہے تھے۔ شعائر حسن نے رات کے واقعے کے بعد خوشی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ سفر خاموشی سے طے کرتے ہوئے اس نے اک نظر خوشی پر ڈالی تھا اور میوزک آن کردیا۔ خوب صورت الفاظ دھیمے سروں میں بج رہے تھے۔ خوشی نے نظر اٹھا کر شعائر کو دیکھا تھا۔ شعائر کی نظریں بھی خوشی پر اٹھی تھیں۔ خوشی نے اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر رخ موڑ لیا اور باہر دیکھنے لگی۔ شعائر نے گاڑی شاپنگ مال کے باہر روک دی تو خوشی نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''اپنے لیے کچھ لے لو۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا تو وہ بھی باہر نکل گئی۔

''ارے خوشی تم یہاں؟'' شناسا آواز سماعت سے ٹکرائی تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سانولی لڑکی کچھ شناسا سی معلوم ہو رہی تھی، مگر وہ اسے پہچان نہیں سکی۔

''یہ میں ہوں سارہ۔'' اس کی الجھن کو بھانپتے ہوئے سارہ نے کہا تو وہ انگشت بدنداں رہ گئی۔ گوری چٹی فربہ سی سارہ ...... یہ کس روپ میں اس کے سامنے تھی۔

''تم کہاں غائب ہوگئی تھیں، یونی ورسٹی بھی اچانک چھوڑ دیا اور کوئی رابطہ بھی نہیں رکھا۔'' وہ حیران تھی۔

''بس یار، زندگی نے بہت عجیب مذاق کیا میرے ساتھ۔'' اس نے دل گرفتی سے گویا تھی۔ کچھ فاصلے پر شعائر حسن اس کا منتظر تھا۔

''کیا ہوا ہے سارہ؟'' اس کے کمزور جسم اور سانولی رنگت کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''کامران نے اپنی بہن کی نند سے شادی کرلی خوشی۔'' نم آنکھوں کے ساتھ وہ گویا ہوئی تھی، خوشی کو اپنی سماعت پر یقین ہی نہ آیا۔ محبت کے بلند و بانگ دعوے کرنے والے کامران سے اسے قطعاً یہ امید نہ تھی۔

''وہ تو محبت کرتے تھے تم سے۔'' اسے صدمہ ہوا۔

''محبت نہیں، وقت گزاری۔'' وہ ہنس دی تو اذیت کا رنگ اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگا۔

''تم اکیلی آئی ہو؟'' سارہ نے پوچھا تھا۔

''نہیں، شعائر ساتھ ہیں۔'' اس نے شعائر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سارہ نے شعائر کی طرف دیکھا تو وہ انہیں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''ماشاء اللہ شعائر بھائی تو بہت خوش مزاج ہیں، تم ناحق پریشان ہوتی تھیں۔'' سارہ نے کہا تو وہ مسکرادی۔

''میرے بھتیجے کی سالگرہ ہے، میں اس کے لیے گفٹ لینے آئی تھی۔'' سارہ خود ہی بتانے لگی۔

''اچھا میری طرف سے اسے وش کرنا۔'' اور اپنا بہت خیال رکھنا سارہ پلیز!

'' اس نے محبت سے کہا تو سارہ مسکرادی۔ سارہ آگے بڑھ گئی تو وہ بھی شعائر حسن کی جانب چل پڑی۔ ذہن سارہ اور کامران کے محبت کے انجام میں الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

شعائر اب اس کے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ اب لیے دیے انداز میں رہنے لگا تھا۔ ضرورتاً ہی کوئی بات کرتا، ورنہ چپ رہتا۔ خوشی بھی خاموش تھی۔ ''تم سے اتنا بھی نہ ہوسکا شعائر حسن کے میرے رویے کے پیچھے چھپی وجہ کو جان سکو، الٹا تم مجھ سے خفا ہوگئے۔'' وہ تاسف سے سوچ کر رہ جاتی۔ جس رشتے میں محبت نہ ہو، احساس نہ ہو، وہ رشتہ اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

''کیا ہوا ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری، اتنی ڈل لگ رہی ہو۔'' بھابھی نے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''موسم بدل رہا ہے، شاید اس لیے۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''شعائر بھی آج کل اتنا مصروف ہوگیا ہے بچی، گھر میں رہ کر بور ہوتی رہتی ہے۔ آنے دو آج اسے، میں اس کی خبر لیتی ہوں۔'' سائرہ آنٹی نے کہا تو وہ مسکرا کر رہ گئی اور آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں آگئی۔

''تیار ہوجاؤ، کچھ دیر میں باہر جائیں گے۔'' وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز میگزین پڑھ رہی تھی، جب شعائر نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد کہا تھا۔

''لگتا ہے ماما سے خوب ڈانٹ پڑی ہے۔'' وہ میگزین رکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''یہ ڈریس پہننا تم۔'' وہ وارڈروب تک پہنچی بھی نہ تھی جب شعائر نے اسے باکس تھمایا اور چلتا بنا۔

''وہ اس کے جانے کے بعد جوڑا نکال کر دیکھنے لگی۔ فان کلر کی لمبی قمیص اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ ریڈ خوب صورت دوپٹا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ یہ شعائر کی طرف سے ملنے والا پہلا تحفہ تھا۔ وہ تیار ہو رہی تھی، جب اس کا موبائل بج اٹھا۔ حرا کا نمبر دیکھ کر اس نے کال پک کرلی۔

''کیسی ہو تم، مجھے دبئی سے لوٹے ہفتہ ہوچکا ہے، مگر تم نے مجھے اک کال تک نہیں کی۔'' موبائل کان سے لگاتے ہی حرا نے شکایت کی پٹاری کھول دی تھی۔

''چلو اب بتادو، کیسا رہا ٹور؟'' اس نے مروتاً پوچھا اور پھر جی بھر کے پچھتائی، حرا شروع ہوئی تو جیسے چپ ہونا ہی بھول گئی۔

''تم ریڈی ہو؟'' وہ جانے کون کون سے قصے سنا رہی تھی جب شعائر نے سوال کیا تھا۔

''تم لوگ کہیں جا رہے ہو؟'' شعائر کی آواز حرا نے بھی سن لی تھی۔

''ہاں...... ڈنر کا پلان ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا، پھر ایسا کرو ہمیں بھی پک کرلو، آج ہمیں بھی ڈنر پہ جانا تھا۔ نیوایئر نائٹ سیلیبریٹ کرنی تھی، مگر اینڈ موقع پر ولید کی گاڑی خراب ہوگئی۔'' حرا کی فرمائش پر وہ پریشانی سے شعائر کو دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا۔'' شعائر نے استفسار کیا تھا۔

''حرا اور ولید بھائی بھی ہمارے ساتھ باہر جائیں گے، انہیں پک کرنا ہوگا۔'' خوشی نے بتایا تھا۔

''اوکے......'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا، تو وہ حرا کو اپنے آنے کی اطلاع دے کر کال کاٹتے ہوئے شعائر کے پیچھے چلنے لگی۔

گاڑی ولید کے گھر کے باہر روک کر شعائر نے ہارن بجایا تھا۔ کافی انتظار کے بعد بھی وہ باہر نہیں نکلے تو خوشی نے حرا کو کال کی، اس نے کال اٹینڈ نہیں کی تو مجبوراً اسے گاڑی سے اتر کر گھر کے اندر جانا پڑا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ کھلا دروازہ دیکھ کر کچھ الجھ سی گئی۔ اسی الجھن میں وہ گھر کے اندر داخل ہوگئی، اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم زمین میں جکڑ لیے۔

''ابھی تم دونوں کو دبئی سے لوٹے ہفتہ نہیں ہوا اور آج پھر تم دونوں باہر جانے کے لیے تیار کھڑے ہو۔'' زہرہ آنٹی کے لہجے میں محسوس کی جانے والی کاٹ تھی۔

''اب آپ ہمارے گھومنے پھرنے پر بھی نظر رکھیں گی۔'' حرا نے بدتمیزی سے جواب دیا تھا۔

''گھوم گھوم کر تمہارا دل نہیں بھرتا؟ شادی سے پہلے بھی تو گھومتی رہی ہو میرے بیٹے کے ساتھ، اب بھی ہر اگلے دن باہر جانا ضروری ہے؟'' زہرہ بیگم طیش میں آگئیں۔

''شادی سے پہلے کون سا لندن، پیرس گھمایا تھا آپ کے بیٹے نے۔'' وہ دوبدو جواب دینے پر اتر آئی تھی۔

''تو اپنی یہ حسرت بھی پوری کرلیتیں شادی سے پہلے لندن، پیرس بھی گھوم آتیں۔ بے شرمی اور بے غیرتی میں تو یوں بھی تم نے پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔''

زہرہ بیگم کی بات پر اس کے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ جب کہ حرا نے زور، زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

"آپ اپنی ماما کو کچھ کہہ کیوں نہیں رہے ہیں۔ آپ کو سنائی نہیں دے رہا، وہ مجھے کتنی باتیں سنا رہی تھیں۔" حرا نے ولید کو بیچ میں گھسیٹنا چاہا۔

"فساد کی جڑ خود تم ہی ہو، میں نے منع بھی کیا تھا تمہیں، ایسی کون سی جگہ باقی چھوڑی ہے تم نے گھومنے کی؟ پورا کراچی گھما چکا ہوں میں تمہیں، مگر تمہارے شوق ختم ہی نہیں ہوتے۔" ولید کی آواز پر اسے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا بھی دوبھر لگنے لگا۔ وہ دیواروں کا سہارا لیتی واپس پلٹ گئی۔

"آر یو اوکے۔" وہ ہواس باختہ تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتا دیکھ کر شعائر نے سوال کیا تو اس نے بمشکل سر اثبات میں ہلایا۔ شعائر نے مزید کوئی سوال پوچھے بنا گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ اب بھی حواسوں میں نہ تھی، کچھ دیر قبل جو کچھ وہ سن کر آئی تھی، ذہن اور دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ وہ تو اک عرصے تک حرا کی خوش نصیبی پر رشک اور اپنی کم نصیبی پر اشک بہاتی آئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حرا کی مسکراتی زندگی کے پیچھے اس قدر کرواہٹ گھلی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ خود سے اس کا موازنہ کر کے کڑھتی رہتی تھی، اس نے ہمیشہ حرا کی زندگی کا مثبت اور روشن پہلو ہی دیکھا تھا۔ حرا کی زیست کے اس رخ سے وہ نابلد تھی۔ اس نے تو کبھی اس انداز سے سوچا بھی نہ تھا کہ شادی سے پہلے گھوم پھر کر خوشیاں حاصل کر لی جائیں تو بعد میں صرف طعنے سننے کو ملتے ہیں۔ کوئی خوشی ہاتھ نہیں آتی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں تھی جب گاڑی روک کر شعائر نے دروازہ وا کیا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گاڑی سے باہر آ گئی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے اک عمارت کے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ لفٹ کی مدد سے وہ اوپر گئے۔ لفٹ سے باہر آ کر شعائر چابی کی مدد سے فلیٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ دروازہ وا کرنے کے بعد وہ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے اندر آ گیا۔ ایک بڑا سا کمرہ جس کے دیواروں پر گہرے پردے تھے۔ ایک بیڈ جس پر نفاست سے چادر بچھی ہوئی تھی۔ دائیں طرف ڈریسنگ ٹیبل پر قیمتی فرنچ پرفیومز کی لائن لگی ہوئی تھی۔ بیڈ کے سامنے میز پر سرخ گلاب کی پتیاں بچھی تھیں۔ درمیان کیک رکھا تھا اور کیک کے چاروں طرف موم بتی سجی ہوئی تھی، چھت کے وسط میں لگے جھومر سے مختلف رنگوں کی روشنی نکل کر اندر کے ماحول کو خواب ناک بنا رہی تھی۔ اسی جھومر سے موسیقی کی مدھر ساز بھی پھوٹ رہی تھی۔ دھیمے سروں میں بجتی موسیقی اور خواب ناک ماحول نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔

"سالگرہ مبارک ہو!" اس نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی، تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ وہ اسے میز کے قریب لے آیا، سامنے پڑی ماچس کی ڈبیا سے ماچس نکال کر وہ اک اک کر کے تمام شمعیں روشن کرنے لگا۔ "اب کیک کاٹو بارہ بج گئے۔" پٹاخوں کی آوازیں آنے لگیں، تو شعائر نے چھری اسے تھماتے ہوئے کہا۔ اس نے کیک کاٹا تھا، وہ آہستگی سے تالیاں بجاتے ہوئے اسے سالگرہ کی مبارک باد دے رہا تھا۔ کیک کا چھوٹا سا ٹکڑا خوشی کو اپنے ہاتھوں سے کھلانے کے بعد اس نے گلاس ڈور کی سلائیڈ ہٹائی اور اسے لے کر بالکونی میں لے آیا۔ وہ بالکونی میں آئی تو ہواؤں نے بھی اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ زبردست فائر ورکس کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ وہ آسمان کی اور چہرا اٹھائے محویت سے فائر ورکس دیکھ رہی تھی۔

"جنم دن کے ساتھ نیا سال بھی مبارک ہو۔" اس نے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا تھا، وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

"اب بھی خفا ہو مجھ سے؟" استفسار کر رہا تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مطلب پہلے تم خفا تھیں۔" وہ پرسوچ انداز

میں گویا تھا۔

"جی ہاں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"مجھے پتا ہے، میں تمہیں نظر انداز کرتا تھا تو اس وجہ سے تمہیں مجھ سے بہت شکایتیں تھیں، مگر خوشی تمہیں نظر انداز کرنے کے پیچھے میرا یہ مقصد ہرگز بھی نہ تھا کہ تم ہرٹ ہو، میں صرف اس لیے تم کو نظر انداز کر رہا تھا، تاکہ باقی تمام لوگ تمہیں اہمیت دیں۔ میری محبت کے ساتھ ساتھ تمہیں ہر ہر رشتے سے بھرپور محبت اور توجہ ملے۔ یہ میری خواہش تھی کہ میرے ساتھ تم ہر اک کی توجہ کا مرکز بنو اور اپنی اس خواہش کو پورا کرنے میں، میں کامیاب بھی ہو گیا، مگر مجھے بعد میں خبر ہوئی کہ میرے اس رویے کی وجہ سے ماضی میں تم ہرٹ ہوتی رہی ہو، جب کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا، پھر بھی میں تم سے اپنے سابقہ رویوں کی معافی مانگتا ہوں اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کے آنے والی زندگی میں تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

"میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی شعائر، یہ میری سمجھ کا قصور ہے، معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔" شعائر کی باتیں سن کر اسے اپنی سوچ پر شرمندگی ہونے لگی۔ اسے اس کی خوشیوں کا کتنا خیال تھا اور نادانی میں وہ شعائر کو کیا کچھ سمجھتی رہی تھی۔ اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔

"یہ فلیٹ تمہارا برتھ ڈے گفٹ ہے۔" میں نے سوچ رکھا تھا، آج کے دن تمہیں سرپرائز دوں گا۔ اور گھر میں بھی سب کو میں نے تمہیں بتانے سے منع کر دیا تھا۔" وہ مزید گویا تھا۔

"شعائر!" اتنی ڈھیر ساری محبت پا کر اس کے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔

"جی شعائر کی زندگی بولو۔" محبت سے دیکھتے گویا تھا۔

"آپ نے اتنا سب کچھ کیوں کیا۔" اس نے سوال کیا تھا۔ اتنی چاہت پا کر پلکیں نم ہونے لگیں۔

"آئی سوئیر یہ سب پہلے سے پلان کر رکھا تھا، ماما کے کہنے پر نہیں کیا ہے۔ بے شک ماما کو کہہ دیا تھا کہ ہم رات یہاں گزاریں گے۔ وہ شرارت سے گویا تھا۔ اس کی شرارت پر شرم سے اس کی نظریں جھک گئیں۔ "جانتی ہو، خوشی تمہاری یہ ہنسی میرے لیے بے حد قیمتی ہے، شادی سے پہلے میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں بھی تم سے ملوں، باتیں کروں، لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ کبھی تم پر کوئی انگلی اٹھائے یا کوئی بھی تلخ جملہ تمہاری سماعت میں انڈیلے، اس لیے اپنے جذبوں پر بند باندھے رکھا۔ تاکہ تمام عمر تمہیں ہنستا مسکراتا دیکھ سکوں، میں وقتی خوشی تمہاری جھولی میں ڈال کر عمر بھر کے لیے تمہیں غم دان نہیں کرنا چاہتا تھا۔" وہ سچائی سے بول رہا تھا، خوشی کے دل میں اس کی محبت بڑھتی ہی جا رہی تھی، اس نے سر شعائر کے کاندھے پر ٹکا دیا۔ ساری رات ان دونوں نے باتیں کرتے ہوئے گزار دی، وہ شعائر کی محبت اور توجہ پا کر بے طرح خوش تھی۔

"اب سو جائیں۔" فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ بیڈ پر دراز تھی۔ شعائر کروٹ بدل کر لیٹے ہوئے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف محویت سے دیکھتا پا کر اس نے کہا تھا۔

"مجھے نیند آتی نہیں ہے اکیلے خوابوں میں آیا کرو۔" وہ گنگنانے لگا، جب کہ وہ مسکرانے لگی تھی۔

"آنکھیں بند کریں، نیند آ جائے گی۔ وہ اس کے آنکھوں پر ہتھیلی رکھتے گویا تھی۔

"اک تمہیں چاہنے کے علاوہ اور کچھ ہم سے ہوگا نہیں۔" اس کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹاتے اس نے سرگوشی کی تھی، اس کی سرگوشی پر خوشی نے اپنی آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ لی تھی۔ شعائر حسن کا جاندار قہقہہ کمرے میں گونجنے لگا۔ نئے سال کی صبح تو ان کے لیے خوشیوں کا پیام لے کر وارد ہوئی تھی۔ اجلی صبح نے ان کی زیست کو نکھار دیا تھا۔

☆☆

لو ہم سے ہار گئی

نزہت جبیں ضیاء

جب من کے اندر موسم خزاں کا راج ہو تو باہر کے موسم کا اثر نہ ماحول پر ہوتا ہے، نہ مزاج پر۔ انسان کے رویئے اس کے اندر کے موسم کی وضاحت بہ خوبی کر دیتے ہیں۔۔۔ اور پھر ''دسمبر'' کا موسم تو ویسے ہی اپنے اندر اداسیاں سموئے چلا آتا ہے۔۔۔ نہ جانے ''دسمبر'' اپنے اندر اتنی اداسیاں کہاں سے سمیٹ لاتا ہے۔ لگتا ہے ہر چیز اداس ہے، ایک ویرانی اور وحشت سی عمیمہ کے اندر بھی تھی۔۔۔ وہ بے سکونی، بے قراری اور اضطرابی کیفیت کا شکار تھی۔ آگے بڑھ کر کھڑکی کے شیشوں سے پھر پردہ ہٹایا۔۔۔ باہر حد نگاہ دھند اور کہر کا راج تھا۔۔۔ جتنی دھند باہر کی فضا میں تھی۔۔۔ اتنی ہی شاید عمیمہ کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔۔۔ چند گھنٹے۔۔۔ بس چند گھنٹوں کے بعد اس کو یہ۔۔۔ یہ سرزمین جسے وہ کبھی جنت کہتی تھی۔۔۔ چھوڑ جانی تھی۔۔۔ آج اس نام نہاد جنت سے واپس اپنے وطن۔۔۔ اپنی سرزمین لوٹ جانا تھا۔۔۔ کتنی شدید خواہش۔۔۔ کتنی تڑپ تھی اس کو امریکہ آنے کی اسی تڑپ اور خواہش نے اپنوں سے دور کر دیا تھا۔۔۔ گزرتے وقت نے اس کو پچھتاووں کے سوا کچھ نہ دیا تھا۔۔۔ شیشیوں کی جھری سے آتی ہوئی تیز برفانی ہوا نے اس کو چونکا دیا۔۔۔ اس نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔۔۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں ساری دنیا میں ہی نیوائیر کی تیاریاں زور پکڑ لیتی ہیں اور امریکا میں گزشتہ پانچ چھ سالوں سے وہ یہ ہنگامے دیکھ رہی تھی۔ لمبی لمبی اونچی عمارتوں روشنیوں اور زندگی کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ شہر کے اس علاقے میں اس کا فلیٹ تھا خوب صورت، پر آسائش اور تمام تر سہولتوں کے ساتھ۔۔۔ لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ تنہا تھی۔۔۔ بے چین بے قرار اور اداس۔ نا کام اور پچھتاووں کی ہاری ہوئی عورت۔۔۔ ارقم کو کمانے سے فرصت نہ تھی اور...... ہارب...... ہارب مکمل طور پر یہاں کے ماحول میں ڈھل چکا تھا۔ نہ ماں کی پروا تھی، نہ باپ کا خیال...... دوست، پکنک، پارٹیز اور گرل فرینڈ...... یہی اس کی زندگی کا مقصد رہ گیا تھا۔ ایک بار پھر وہ کھڑکی کے پاس آ گئی۔ عجیب گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ پردہ سرکایا۔ اتنی ٹھنڈ، کہر اور دھند کے باوجود سڑک پر گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ روڈ کی دوسری طرف پارک تھا۔ اس وقت قدرے سنسان تھا۔ مدھم بلب کی روشنی میں قد آور درخت ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ ویسے بھی دن کی روشنی میں اس پارک میں ہونے والے فحش اور بے باک نظارے کئی بار وہ دیکھ چکی تھی۔

یہ کتنا تکلف دہ احساس تھا کہ وہ وطن واپس لوٹ رہی تھی اور تین دن سے ارقم کام کے سلسلے میں دوسرے اسٹیٹ گئے ہوئے تھے۔ جبکہ ہارب اپنے فرینڈز کے ساتھ گھومنے گیا ہوا تھا۔ ارقم نے اطمینان سے کہہ دیا تھا کہ فلیٹ لاک کر کے چلی جانا...... یعنی اسے چھوڑنے ایرپورٹ جانے کا بھی نہ شوہر کے پاس وقت تھا، نہ بیٹے کو فرصت تھی۔ شوہر کو فرصت ہوتی بھی کیسے؟ دوسری بیوی کو بھی تو ٹائم دینا تھا۔ درد کی لہر رگ و پے میں سما گئی۔ کتنا اذیت ناک ہے کسی عورت کے لیے کہ وہ اپنا شوہر کسی اور عورت سے شیئر کرے لیکن...... یہ...... اذیت...... یہ اذیت بھی وہ سہہ چکی تھی...... مگر...... اب...... ہمت تھی، نہ حوصلہ...... برداشت جواب دینے لگی تھی۔ پچھتاووں کے ناگ لمحہ لمحہ ڈسنے لگے تھے...... اتنا بڑا...... اتنا بڑا تاوان دینا پڑا تھا اس کو...... محض اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے...... کیا کچھ کھونا پڑا، اس کا احساس اس وقت ہوا تھا جب سب کچھ کھو چکی تھیں لیکن......

وہ اپنے رشتوں، اپنے مان اور اپنی وطن کی سرزمین کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی فی الفور یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کرسی پر ٹک کر آنکھیں موند لیں۔ گزشتہ ماہ و سال ذہن کے پردے پر تھرکنے لگے۔ آنکھوں سے آنسو درد کی صورت بہ نکلے۔

☆☆☆

''تائی اماں! دادو آپ کو اپنے روم میں بلوا رہی ہیں۔'' عمیمہ اپنی الماری میں کچھ تلاش کر رہی تھی



کہ روبین نے دروازے پرآ کر آواز لگائی۔

''اچھا آتی ہوں۔'' عمیمہ نے الماری کا درواز بند کرتے ہوئے پلٹ کر جواب دیا۔

''اماں! آپ نے بلوایا ہے؟'' تھوڑی دیر بعد وہ اماں کے سامنے تھی۔

''ہاں بیٹھو!'' اماں نے تسبیح ہاتھ سے رکھتے ہوئے کرسی کی جانب اشارہ کیا تو عمیمہ کرسی پر ٹک گئی۔ ''دراصل میں چاہ رہی تھی کہ ارقم کے جانے سے پہلے ہارب اور روبین کی منگنی کی رسم ادا کردی جائے۔''

''ہائیں! اماں اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ ابھی روبین صرف پندرہ سال کی ہے۔ لیکن اگر سب یہی چاہتے ہیں، مطلب فضیلہ اور واحد بھائی بھی، تو ٹھیک ہے کردیتے ہیں۔'' عمیمہ نے اماں کی تیکھی نظروں سے گھور کر بات بدلی۔

''میں بات کروں گی ان دونوں سے۔'' اماں نے کہا تو عمیمہ سر ہلا کر رہ گئی۔

حبیبہ بیگم کے دو بیٹے ارقم اور واحد تھے۔ شوہر کا انتقال ہوچکا تھا، ان کی خواہش کے مطابق ایک گھر میں ہی دونوں بیٹے اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑے بیٹے ارقم جن کی بیوی عمیمہ اور ایک بیٹا ہارب تھا اور چھوٹے بیٹے واحد جن کی بیوی فضیلہ اور ایک بیٹی روبین تھی۔ اچھا بھلا بڑا سا گھر تھا۔ دونوں بھائی مختلف کمپنیوں میں جاب کرتے تھے۔ اچھی گزر بسر ہورہی تھی۔ فضیلہ کا میکا متوسط طبقے سے تھا، جبکہ عمیمہ کا میکا تھوڑا سا پیسے والا تھا۔ ان کے بھائی فیملی سمیت آسٹریلیا میں مقیم تھے۔ جبکہ بہنیں بھی امیر تھیں۔ والد حیات نہیں تھے۔ مگر ساری زندگی دبئی میں گزاری تھی۔ اس لیے باہر کی کمائی کی ریل پیل تھی۔ جب بھی بہنیں آتیں تو ان کے کپڑے، پرس اور جیولری دیکھ کر عمیمہ کی آنکھیں کھل جاتیں۔ عمیمہ دوسروں کی زندگی سے اپنا موازنہ کرتی اور خواہ مخواہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگی۔ اس کی عادت اپنے سے اونچے کی طرف دیکھنے والی تھی۔ جب بھائی، بھاوج باہر سے آتے اور وہاں کا ذکر کرتے، عمیمہ دل ہی دل میں مچل کر رہ جاتی۔ کاش! کاش ہمارے نصیب میں بھی یہ سب ہو، ہم بھی آسائشات میں کھیلیں، ہمارے بچے بھی ٹھاٹ کی زندگی بسر کریں۔

''ہائے سچ، باہر کی زندگی بھی کتنی حسین ہوتی ہے۔ صاف ستھرا ماحول، آلودگی سے پاک، بے فکری اور امارت سے بھرپور۔'' اپنی سوچوں کو لفظوں کا روپ دے کر حسرت سے کہتی۔

''بھابھی! دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ نہ وہاں پیار ہوتا ہے، نہ خلوص اور نہ احترام، بس ہر کوئی اپنے اپنے چکر میں رہتا ہے۔ رشتوں کا مان نہیں رکھتے وہ لوگ۔'' کبھی کبھی فضیلہ کہہ دیتی۔

''بس رہنے بھی دو۔ جب سکون، آسائش اور بے فکری نصیب ہو تو کسی چیز کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ کھلا ہاتھ، کھلا خرچا اور پیسے کی فراوانی ساری مشکلوں کا حل نکال لیتی ہے۔'' عمیمہ کی بات پر فضیلہ چپ ہوجاتی، بھلا اب ان سے کون بحث کرے۔

☆☆☆

عمیمہ کے بھانجے کی شادی تھی۔ خوب عالی شان طریقے سے میکے میں تیاریاں ہورہی تھیں۔ ادھر الماری میں اٹھا پٹخ کرتے ہوئے عمیمہ مسلسل جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

''توبہ ہے بھئی مجال ہے جو ایک بھی جوڑا ڈھنگ کا نکل جائے۔''

''کیا ہوگیا عمیمہ، کیوں چڑچڑا رہی ہو؟'' ارقم جو پاس بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے، اس کی جھنجلاہٹ پر آخرکار پوچھ بیٹھے۔

''یہ...... یہ...... دیکھ رہے ہیں آپ...... یہ کپڑے ہیں میرے پاس......'' بیڈ پر کپڑوں کا ڈھیر لگاتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں دیکھ رہا ہوں...... بے شمار کپڑے ہیں۔''

''بے شمار اور بے کار بھی۔'' عمیمہ نے ارقم کی بات مکمل کی۔

''ایسی بات بھی نہیں ہے۔ یہ ساڑھی دیکھو، یہ

ابھی تو خریدی تھی تم نے؟ پورے بارہ ہزار کی تھی۔'' ارقم نے سامنے پڑی سی گرین ساڑھی کی جانب اشارہ کیا۔

''بارہ ہزار نہ ہوئے پچاس ہزار ہوگئے...... یہ ساڑھی میں نے فضہ کی منگنی پر پہنی تھی اور دیکھیں اس کے دھاگے بھی نکل رہے ہیں۔'' اچھی بھلی ایمرائیڈری کو انگلی سے کھرچا۔

''عمیمہ ناشکرا پن مت کرو۔'' ارقم نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے پھر میں نہیں جاتی وہاں جاکر اپنا مذاق بنوانے سے بہتر ہے کہ نہ جاؤں'' منہ پھلا کر دھڑادھڑ کپڑے الماری میں ٹھونسنے لگی۔

''عمیمہ! کیا بچوں جیسی حرکتیں کررہی ہو۔۔۔ تم جانتی ہو کہ میں تم کو پچاس ہزار کا جوڑا نہیں دلوا سکتا اتنی حیثیت نہیں ہے۔ اور۔۔۔ شادی میں شریک ہونے والے تمام لوگ پچاس پچاس ہزار کے جوڑوں میں نہیں ہوں گے۔''

''پتا ہے مجھے پچاس ہزار کا جوڑا تو خواب میں بھی نہیں خرید سکتی مگر۔۔۔ میں سگی خالہ ہوں ایسے ویسے کپڑوں میں ہرگز شرکت نہیں کروں گی۔۔۔ رہی حیثیت کی بات۔۔۔ تو حیثیت انسان اپنی خود بناتا ہے۔۔۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر یونہی لکیر کے فقیر بنے رہے تو کوئی آکر لاکھوں ہاتھوں میں نہیں تھمائے گا۔۔۔ ہاتھ پیر مارنے پڑتے ہیں۔۔۔ کوشش کرنی پڑتی ہے تو حیثیت بنتی ہے۔۔۔ کتنی بار آپ کو سمجھایا ہے۔۔۔ بھائی جان نے بھی آفر دی مگر۔۔۔ آپ ہیں کہ۔۔۔ خودداری اور انا کے گنبد میں قید رہیں گے مگر۔۔۔ آگے نہیں بڑھیں گے۔۔۔ کوشش نہیں کریں گے۔۔۔ جو کرنا ہے اپنے ملک میں کرنا ہے۔۔۔ یہاں رہنا ہے۔۔۔ یہ دے رہا ہے یہ ملک۔۔۔؟ بدعنوانی۔۔۔ دہشت گردی، مہنگائی، کرپشن بجلی اور پیٹرول کی قیمتوں کے بم۔۔۔ بے روزگاری۔۔۔ ہٹائیں۔۔۔؟ یہاں رہ کر اسی طرح کچھوے کی چال چلتے چلتے آپ نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ اپنی اولاد سے بھی دشمنی کررہے ہیں'' عمیمہ بری طرح پھٹ پڑی تھی کئی دنوں سے پکنے والا لاوا الفاظ کی صورت میں بہہ نکلا تھا۔۔۔

''بس کرو عمیمہ! بہت بول چکی ہو۔۔۔ تمہاری ہر بات کی تان ایک ہی نکتے پر آکر ٹوٹتی ہے۔۔۔ باہر، باہر، باہر صرف باہر جانے کے خواب دیکھتی رہتی ہو تم'' ارقم غصے سے بولا۔

غصے سے بھلا برا کہہ کر ارقم گھر سے باہر نکل گیا، اور احتجاجاً عمیمہ روم میں بند ہوگئی۔

☆☆☆

عمیمہ اب کھلم کھلا بدتمیزیاں کرنے لگی تھی۔ آخرکار ارقم نے سنجیدگی سے باہر جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن عمیمہ کے بھائی کے توسط سے نہیں بلکہ اپنے ایک دیرینہ دوست کے توسط سے وہ کارروائی میں لگ گیا۔ کبھی کبھی عمیمہ کی بات ٹھیک بھی لگتی کہ جس حساب سے مہنگائی بڑھ رہی تھی اس کے لیے لگی بندھی آمدنی واقعی ناکافی تھی۔

آخرکار دن رات کی محنت' دعائیں اور تگ ودو کام آگئی۔۔۔ ساری جمع پونجی لگا کر ارقم کو امریکا کا بلاوا آگیا اس سارے معاملے میں ارقم کے دوست ارشاد نے بہت مدد کی اس کی بھائی وہاں پر سیٹل تھے تو ان کے تعاون سے یہ مشکل مرحلہ طے پایا۔ ارقم کو یوں سب کو چھوڑ کر جانا بہت برا لگ رہا تھا زندگی میں کبھی بھی ماں اور بھائی سے دور نہ ہوئے تھے باپ کی وفات کے بعد دونوں بیٹوں اور ماں نے بہت مشکل وقت اکٹھے گزارا تھا، ایک دوسرے کا ساتھ ہی سب سے بڑی طاقت تھی، ادھر اماں کا بھی یہی حال تھا شوہر کی وفات کے بعد دونوں بیٹوں کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا تھا ایک منٹ کے لیے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں محنت کرکے تعلیم دلوائی اور ڈھنگ کی نوکری بھی تھی، ارقم غیر معینہ مدت کے لیے امریکا روانہ ہوگیا۔

ایک سال، دو سال انتہائی تکلیف دہ سال گزر گئے، لیکن پھر ارقم کو عادت ہوگئی تھی اس کی جاب بھی

لگ گئی تھی، گو کہ آمدنی بہت زیادہ نہ تھی مگر گزارے لائق تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ بچانے کے بعد پاکستان بھی بھیج دیتے، عیمہ بہت خوش تھی، فی الحال تو ارقم دوست کے ساتھ روم میں رہتے تھے، تین سال بعد ارقم کو چھٹی ملی اور وہ پاکستان آیا تو ساتھ کافی سارا سامان تھا عیمہ تو بہت خوش تھی، ہارب بھی خوش تھا۔ ہارب انجینئرنگ پڑھ رہا تھا اس کا بھی آخری سال تھا، ڈیڑھ ماہ کے عرصے کے لیے ارقم آئے تھے اس میں اماں نے منگنی کا شوشہ بھی نکال لیا تھا، کیونکہ اس بار ارقم نے کہہ دیا تھا کہ وہ پانچ سال سے پہلے نہیں آسکے گا، کیونکہ عیمہ آتے ہی پیچھے لگ گئی تھی کہ مجھے اور ہارب کو بھی بلوالیں۔

''عیمہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ میں منسٹر نہیں ہوں جاب کرتا ہوں ایک اسٹور میں''ارقم نے کہا۔۔۔

''مگر ۔۔۔ میرے بھی کچھ خواب ہے ارقم ۔۔۔ مجھے وہاں کی زندگی جینی ہے ۔۔۔ یہ حسرت ہے میری ۔۔۔ کہ زندگی وہاں پر گزاردوں ۔۔۔ وہاں کا ماحول مجھے اٹریکٹ کرتا ہے۔۔۔''عیمہ کے لہجے میں حسرت تھی، ارقم نے غور سے اس کو دیکھا۔

''ویسے بھابی! کچھ بھی کہیں اپنا ملک اور اس کی آزاد زندگی کی بات ہی اور ہوتی ہے'' فضیلہ پھر بول پڑی تھی۔ قبل اس کے کہ عیمہ کا لیکچر شروع ہو جاتا ارقم نے عیمہ کو مخاطب کیا۔

''عیمہ میرے کپڑے پریس کردو ہاتھ لوں گا میں''اور عیمہ فضیلہ کو گھورتی ہوئی اٹھ گئی۔

☆☆☆

ارقم واپس چلے گئے، ایک بار پھر وہی دن رات اور روٹین شروع ہوگئی۔

ارقم گھر پر بھی معقول رقم بھیجتا گھر میں بھی نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ روبین منگنی کے بعد ہارب سے کترانے لگی تھی۔ گو کہ ہارب اسے بچپن سے اچھا لگتا تھا۔ اور وہ اس رشتے پر خوش بھی تھی مگر اس بات کو لے کر پریشان رہتی کہ ہارب تایا ابو کے پاس امریکا چلا جائے گا تو وہ اس کے بنا کیسے رہ پائے گی، بچپن سے آج تک دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ کھیل سے لے کر پڑھائی بھی ساتھ کرتے اور یہ بات بھی بچپن سے دونوں کو معلوم تھی کہ مستقبل میں دونوں نے ایک ہو جانا ہے، ہارب حالانکہ باہر گھومتا پھرتا، فرینڈز بھی تھیں مگر دل میں صرف اور روبین کا ہی راج تھا وہ دل سے روبین کو پسند کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ اپنائیت اور چاہت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

ادھر عیمہ مستقل ارقم کے پیچھے پڑی رہتی کہ ہمیں بلوالیں، ہمیں بلوالیں۔۔۔ ارقم اپنے طور پر کارروائی کررہے تھے، عیمہ کو خواب میں بھی امریکا کی کھلی کھلی صاف شفاف سڑکیں' بلند و بالا عمارتیں اور خوب صورت پارک' سپر اسٹورز بھی نظر آئے۔ ارقم کو دوبارہ جا کر بھی تین سال کا عرصہ ہونے والا تھا تیزی سے ضروری کارروائیاں جاری تھیں ادھر عیمہ بیگم کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کہ کسی وقت بھی بلاوا آسکتا ہے، اس کی زندگی کے اطوار ہی بدل گئے تھے بات میں بھرم اور اعتماد بڑھ گیا تھا، ہر وقت امریکا کے قصیدے پڑھتی وہیں کی مالا جپنے کی عادت ہوگئی تھی۔

اور پھر یہ پر مژدہ بھی آگیا کہ فلاں فلاں تاریخ کو عیمہ اور ہارب کی امریکہ روانگی ہے عیمہ کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، برسوں پرانی خواہش پوری ہونے جارہی تھی ۔۔۔ اماں بے چاری چپ چاپ عیمہ کو بچوں کی طرح خوش ہوتا دیکھ رہی تھیں۔ اماں کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا گنتی کے چند افراد تو تھے گھر میں ۔۔۔ ہارب اور روبین دو ہی بچے تھے'ان میں بھی پہلے ارقم اور اب ۔۔۔ عیمہ اور ہارب کے جانے کے بعد کون رہ جاتا ۔۔۔؟ اماں چپ ہو کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا اتفاق سے ہارب اس وقت گھر پر تھا اور اپنے روم میں ضروری کاغذات وغیرہ اکٹھے کر رہا تھا، دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور روبین داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

''ارے واہ! تھینک یو سو مچ، بہت دل کررہا تھا چائے پینے کا'' چائے کا کپ روبین کے ہاتھوں سے لے کر وہ خوش گوار لہجے میں بولا روبین چپ چاپ کھڑی تھی۔

''کیا ہوا بیٹھو ناں۔۔۔؟'' ہارب نے اسے گم صم دیکھ کر کہا تو وہ کرسی پر ٹک گئی۔۔۔

''آپ کتنے سال کے لیے جا رہے ہیں امریکا۔۔۔؟'' کاغذات پر نظر ڈال کر روبین نے دھیمے لہجے میں پوچھا وہ بے حد اداس تھی۔

''دیکھو شاید تین سال یا اس سے بھی زیادہ لگ جائیں لوٹنے پر۔۔۔ ویسے پاپا کے ساتھ کام بھی کروں گا اور ان شاء اللہ پڑھائی بھی جاری رکھوں گا۔۔۔ تم دعا کرنا'' وہ چائے کی چسکی لے کر بولا۔

''ہائے اللہ اتنے سال بچ۔۔۔؟ آپ کو میں یاد نہیں آؤں گی۔۔۔؟'' بے ساختگی سے سر پر ہاتھ مار کر معصومیت سے کیے گئے سوال پر ہارب کو اس پر پیار آگیا ہارب نے بہ غور اسے دیکھا بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نمایاں تھی۔

''ارے یار! یہ کیا۔۔۔؟ بہت یاد آئے گی تمہاری ۔۔۔ بھلا کیسے نہیں آئے گی ۔۔۔ بات کروں گا ناں تم سے روزانہ۔۔۔ اور جب واپس آؤں گا تو پھر۔۔۔ پھر ہماری شادی ہو جائے گی۔ اور ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے ۔۔۔ شادی کے بعد ہم لوگ ہنی مون ٹرپ پر ورلڈ کا چکر لگائیں گے ان شاء اللہ'' وہ جذب سے بولا۔

''لیکن ۔۔۔ لیکن سنا ہے وہ ایسی جگہ ہے جہاں جا کر وہاں کی رنگینیوں میں کھو کر لوگ اپنوں کو بھول جاتے ہیں ۔۔۔ انہیں فرصت نہیں ملتی ۔۔۔ اپنوں کے لیے'' وہ شاکی لہجے میں بولی۔

''ارے پگلی! وہ اور لوگ ہوتے ہوں گے ہارب ارقم نہیں ہے ایسا اور ۔۔۔ پھر پاپا کیا ہم لوگوں کو بھول گئے ۔۔۔؟'' ہارب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تایا ابو کیسے بھول سکتے ہیں ۔۔۔؟ ان کی فیملی ہے یہاں ۔۔۔ ان کی بات تو الگ ہے'' روبین بے ساختہ بولی۔

''اور میں بھی تو اپنی جان کو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں ۔۔۔ جان کے بغیر میں کیسے رہ پاؤں گا؟'' وہ اسی بے ساختگی سے ذرا سا جھک کر والہانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا تو روبین شرما گئی۔

''میں ڈیلی تم سے بات کروں گا' یار! اب تو اتنی آسانیاں ہوگئی ہیں فاصلے فاصلے نہیں لگتے لگتا ہے سامنے بیٹھ کر بات چیت ہو رہی ہے۔''

''نہیں ہارب! آپ مجھ سے بہت کم بات کیجیے گا ۔۔۔ میں آپ کو دیکھ کر آپ کی آواز سن کر ۔۔۔ برداشت نہیں کر پاؤں گی ۔۔۔ خواہ مخواہ رونا آجائے گا اور آپ ۔۔۔ پریشان ہوں گے'' بہ ظاہر معصوم اور لاابالی سی نظر آنے والی لڑکی کس قدر ٹوٹ کر اسے چاہتی تھی، یہ احساس آج ہارب کو ہوا تھا، ہارب کو بے ساختہ اس پر پیار آگیا۔۔۔

''ارے یار ۔۔۔! کیسی عجیب منطق ہے تمہاری بھی'' وہ مسکرایا۔۔۔

''ہاں میں ایسی ہی ہوں منطقی اور عجیب'' وہ بھولے پن سے بولی۔

''اف اف اف! کہاں پھنسا دیا مجھے میری اور تمہاری اماں نے مل کر' کیسے گزارا کروں گا ساری عمر اس نفسیاتی کے ساتھ؟'' ہارب اس کا سر پکڑ کر شرارت سے بولا۔

''تو مت پھنسیں ناں۔۔۔ گن پوائنٹ پر بھی رشتہ نہیں کروایا آپ کا کسی نے'' وہ روٹھ گئی تھی تب ہی منہ پھلا کر ناراضی کا اظہار کیا۔

''ارے ارے! مذاق کر رہا تھا' اب روٹھ کر مت بیٹھ جانا۔۔۔ کیسے منع کرتا اماں کو۔۔۔ بچپن سے آج تک سب ایک ہی ساتھ دیکھا ہے ۔۔۔ تمہارے ساتھ چھوٹے سے بڑا ہوا ہوں۔۔۔ ساتھ کھیلے، ساتھ پڑھے، لڑے جھگڑے مگر ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے سوفٹ کارنر ہی رکھا ہے ہم نے ۔۔۔ بس ایک ہی خواب دیکھا ہے جو صرف اور صرف تمہاری ذات سے وابستہ ہے۔'' وہ جذب

سے گنگنایا۔۔۔

ہماری نیندوں میں کیسے عذاب اترے ہیں
تمہاری ذات سے وابستہ خواب اترے ہیں
میرے قلم میں تمہاری ہی خوشبو بستی ہے
تمہارے نام سب ہی انتساب اترے ہیں

اپنا سب سے قیمتی اثاثہ تو یہاں چھوڑ کر جاؤں گا۔۔۔ اور بھلا کوئی اپنی جان کے بنا رہ سکتا ہے کیا۔۔۔؟'' کاندھے سے تھام کر خود سے لگاتے ہوئے جذبات سے لبریز لہجے میں بولا تو روبین مسکرادی۔

☆☆☆

آخر کار عمیمہ' ہارب کے ساتھ امریکا پہنچ گئی اور بے تحاشا خوش ہوتے زندگی کے دن گزارنے لگی۔ ہارب کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو چکا تھا، دو چار دن بعد ہی وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگیا، ارقم بھی صبح کا گیا رات کو لوٹتا۔ عمیمہ' موویز دیکھ لیتی۔۔۔ آس پاس کے فلیٹس والوں کی ٹوہ لے لیتی۔ گھر کے کاموں میں وقت کا احساس نہ ہوتا۔ کبھی کبھار ارقم لنچ کے لیے گھر آجاتا، ہارب شام کو لوٹتا۔۔۔ پھر کبھی دوستوں میں نکل جاتا کبھی پڑھائی میں لگ جاتا ساتھ ساتھ اس نے فرینڈ کے ساتھ مل کر ایک شاپ پر نوکری بھی کرلی تھی۔

''ارے! تم نے چھوٹی سی جاب کیوں کرلی۔۔۔؟ پڑھائی کے بعد اتنا ٹائم کہاں ملتا ہے۔۔۔ تم شاپ پر چلے جاتے ہو۔۔۔ تمہارے پاپا بھی لیٹ آتے ہیں'' عمیمہ نے ہارب کو جاب سے منع کیا۔

''مما! یہاں پر ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ سارے اسٹوڈنٹس چھوٹی چھوٹی جابز کرتے ہیں۔ ریسٹورنٹ میں آئس کریم پارلرز میں یا اسٹورز میں۔۔'' ہارب نے جواب دیا تھا۔

''اچھا! میں آج رات کو شاید گھر نہ آسکوں۔۔ کچھ ضروری کام نپٹانے ہیں''

ارے ارقم! یہ کیا بات ہوئی۔۔۔؟ سارا دن تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ رات کو بھی رکنا۔۔۔ ایسی کون سی جاب ہے۔۔۔ عمیمہ بولی۔۔۔ ویسے دن بھر میں گھر میں اکیلی پڑ جاتی ہوں۔۔۔ ہارب بھی چلا جاتا ہے اور آپ بھی''

عمیمہ! یونہی انتھک محنت اور کام کے بعد ہی یہ آسائشات حاصل کی ہیں۔۔۔ ورنہ میں یہاں کا منسٹر نہیں لگا ہوا ہوں کہ یوں فیملی کو بھی بلوالوں۔۔۔ تم گھر کے کاموں کے بعد اماں سے فضیلہ سے، روبین سے باتیں کرلیا کرو کبھی اپنی بہنوں اور بھابھی وغیرہ سے چیٹ کرلیا کرو کوئی کتابیں پڑھ لیا کرو۔۔۔ آن لائن بھی بہت سی چیزیں سیکھ سکتی ہو۔۔۔ ٹائم کو خود یوٹیلائز کروگی تو ٹائم پاس ہوگا ناں۔۔۔ یہاں پر اسی طرح ہوتا ہے۔۔۔ ہر شخص اپنے لیے خود مصروفیت تلاش کرتا ہے''

مجھے اپنے ساتھ اپنے اسٹور پر لے جایا کریں'' عمیمہ کی بات پر ارقم اچھل گئے۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا؟'' تم کیا کروگی وہاں جاکر۔۔۔؟ ٹھیک سے ایک جملہ تو ادا کر نہیں سکتیں انگریزی کا'' عمیمہ منہ بنا کر رہ گئی۔

☆☆☆

گزرتے سالوں نے عمیمہ میں خود اعتمادی پیدا کردی تھی۔ اب انگریزی بولنے اور سمجھنے لگی تھی تب ہی ایک سپر اسٹور میں ضد کرکے جاب کرلی جس کے اسٹاف میں تو کچھ مسلم لوگ تھے مگر اونر انگریز تھا اونر سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی، عمیمہ کو یہاں آکر اچھا لگا تھا وہ دل لگا کے کام کررہی تھی۔ منیجر بھی مطمئن تھے۔ اس روز بھی حسب معمول وہ اسٹور میں داخل ہوئی تو سامنے ایک تقریباً ساٹھ سالہ انگریز آدمی کو کھڑے دیکھا۔۔

''گڈ مارننگ سر'' وہ سمجھی کوئی کسٹمر ہے اس لیے مسکرا کر کہا۔

''واؤ! یو آر سو بیوٹی فل، آئی ایم دا اونر آف دس اسٹور] یو کم ٹو مائے روم یو شوڈ بی ان مائے روم ناٹ ہیئر'' (تم بہت خوب صورت ہو میں اس اسٹور کا مالک ہوں، تم میرے کمرے میں آؤ۔ تمہیں میرے کمرے میں ہونا چاہیے یہاں نہیں)

عمیمہ کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ سرد موسم کے باوجود ماتھے پر پسینے کی قطرات نمودار ہوگئے۔ اتنا بے باک انداز، اتنا چیپ لہجہ اور آنکھوں میں خباثت۔۔۔ اس عمر میں یہ انداز۔۔۔ لڑکی تو عمیمہ بھی نہیں تھی مگر تھی تو مشرقی عورت جس کے خون میں شرافت، شرم شامل ہوتی ہے جس کی تربیت میں مشرقی انداز شامل ہوتا ہے۔۔۔ اسے پیٹر کا یہ انداز بہت برا لگا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

دوسرے دن وہ تیار نہیں ہوئی تو ارقم نے پوچھا۔

''نہیں میں نے نہیں جانا وہاں'' عمیمہ نے چائے مگ میں نکالتے ہوئے کہا اور پیٹر کے بارے میں بتادیا۔

''تم کو ہی شوق تھا ناں جاب کا۔۔۔ کرلیا ناں شوق پورا۔۔۔ یہ دیار غیر ہے محترمہ ہمارے باپ کا گھر نہیں۔۔۔ یہاں پر تو یہ سب سہنا پڑتا ہے۔۔۔''

ارقم کی بات پر اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔۔۔

''کیا کروں بور ہوجاتی ہوں اکیلی پاگلوں کی طرح وقت گزارتی ہوں۔۔۔ نہ باپ کو فرصت ہے نہ بیٹے کے پاس ٹائم مجھے بھی تو کوئی مصروفیت چاہیے ناں'' عمیمہ پھٹ پڑی۔

''یہاں آپ کی مرضی اور خواہش کے مطابق مصروفیت کہیں نہیں ملے گی آئی سمجھ!۔۔۔؟'' ارقم نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا، عمیمہ چپ اسے دیکھتی رہی۔

وہ تو یہاں کی زندگی کو لے کر بہت سے خواب دیکھا کرتی تھی، لیکن یہاں نہ عید کا پتا چلتا نہ بقر عید کا اہتمام ہوتا، نہ عید میلاد النبی کا اہتمام ہوتا نہ شب برات اور رمضان المبارک کی وہ گہما گہمی دیکھنے کو ملتی، یہاں تو ایسٹر، کرسمس اور نیو ائیر پر ہی گہما گہمی نظر آتی، ادھر اماں کی طبیعت بھی خاصی خراب رہنے لگی تھی وہ چاہتی تھیں کہ ہارب اور روبین کی جلد از جلد شادی کر دیں مگر نہ ہارب کو چھٹی مل رہی تھی اور نہ ارقم کو فرصت تھی، آج کل ارقم بے حد الجھے اور پریشان رہنے لگے تھے، گھر میں رہتے تو غائب دماغ رہتے عمیمہ نے کئی بار پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئے۔

☆☆☆

دسمبر کا مہینہ اسٹارٹ ہوا تو ہر طرف کرسمس کی تیاریاں عروج پر آگئیں، خوب چہل پہل تھی، ہارب بھی اپنے امریکن دوستوں کے ساتھ تیاریوں میں مصروف تھا، اس روز عمیمہ بالکنی میں کھڑی تھی کہ ہارب اپنے دوستوں کے ساتھ آیا گاڑی سے اترا اور اترتے اترتے۔۔۔ تھوڑا سا جھک کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے ہاتھ کی ہتھیلی کے پشت پر بوسہ لیا اور مسکرایا۔۔۔ یہ منظر۔۔۔ دیکھ کر عمیمہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔۔۔ ہارب کس حد تک جارہا تھا وہ دوستی کے نام پر کیا کیا بے ہودگیاں کررہا تھا۔

''ہائے مما!'' ہارب گھر میں داخل ہوا۔

''ہارب یہ کیا واہیات پہنا ہے۔۔۔؟ کیا بے ہودگی ہے؟'' ہارب کے داخل ہوتے ہی وہ پھٹ پڑی۔

''تم کو شرم آنی چاہیے ہارب۔۔۔ تم ایک شریف اور نیک خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔۔۔ تمہاری رگوں میں شریف خون گردش کررہا ہے ہمارے یہاں ایسی باتوں کا تصور بھی گناہ کے زمرے میں آتا ہے ناکہ تم۔۔۔ آزادی ہے یہ سب حرکتیں کررہے ہو۔۔۔ تمہیں یہ بھی احساس نہیں کہ ایک معصوم اور شریف لڑکی ایک ایک دن تمہارے انتظار میں گن گن کر کاٹ رہی ہے۔۔۔ جو تمہاری منتظر ہے۔۔۔ تمہارے نام سے جڑی ہوئی ہے جس کے لیے صرف اور صرف تم ہی اس کا سب کچھ ہو۔۔۔ کیوں۔۔۔ دھوکا دے رہے ہو ایک معصوم لڑکی کو۔۔۔؟'' عمیمہ غصے سے بے قابو ہورہی تھی۔

''اوہ مما پلیز! بند کریں اپنا یہ لیکچر۔۔۔'' وہ بدتمیزی سے بولا ''نہ مجھے پاکستان میں دلچسپی رہی اور نہ پاکستانی لڑکی میں جو میری منتظر بیٹھی ہے۔۔۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس بات کو ختم کردیں۔۔۔ میں سمعیہ کو پسند کرنے لگا ہوں'' اف خدایا الفاظ تھے یا۔۔۔ زہر میں ڈوبے ہوئے خنجر۔۔۔ وہ اطمینان سے

فیصلہ سنا کر دوبارہ باہر نکل گیا تھا۔۔۔ عمیمہ آنکھیں پھاڑے اس کے لفظوں کے تانے بانے میں الجھی بیٹھی تھی۔۔۔ وہ کیا کہہ کر گیا تھا۔۔۔ کتنی آسانی سے فیصلہ سنا کر برسوں پرانا رشتہ توڑنے کا اعلان کر رہا تھا ۔۔۔ یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟ ہارب سے یہ امید تو نہ تھی کہ وہ اس حد تک چلا جائے گا'' دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔

''کیا ہوا عمیمہ ......؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری......؟'' ارقم نے بغور عمیمہ کے مضمحل چہرے کو دیکھ کر سوال کیا تو عمیمہ نے سر جھکا لیا۔ ٹپ ٹپ بے شمار آنسو آنکھوں سے بہنے لگے۔ تب عمیمہ نے ساری تفصیل بتائی۔

''ارقم آپ اس سے سختی سے بات کیجیے۔ وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کیا کہ اپنے فیصلے خود کرے۔ اچانک سے بدل گیا ہے وہ...... یہاں کے ماحول میں ڈھل گیا۔''

''دیکھو عمیمہ! میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن سختی نہیں کر سکتا...... یہ پاکستان نہیں ہے کہ جہاں چپل لے کر باپ آج بھی چار بچوں کے باپ (اپنے بیٹے) کو مار دے۔ یہاں پر اولاد اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہے۔ یہاں کا قانون ایسا نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو قید کر دیں یا اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔

عمیمہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ عجیب و غریب حالات ہو گئے تھے۔ ارقم نے اپنے طور سے ہارب کو سمجھایا مگر ہارب نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا' عمیمہ بالکل چپ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کچھ ضروری اشیاء لینے کے لیے عمیمہ اس دن سہ پہر کو قریبی اسٹور کی طرف آ گئی۔ وہاں پر وہ چیزیں نہ ملیں تو مجبوراً قدرے دور جانا پڑا وہ سر جھکائے اسٹور میں داخل ہونے والی تھی کہ شیشے کے پار سامنے کاؤنٹر پر کھڑی ایک پچاس پچپن سالہ خرانٹ سی عورت کو دیکھا اور ساتھ...... ساتھ ارقم تھا۔ وہی بلو جینز اور سفید لائننگ کی شرٹ جو صبح گھر سے پہن کر نکلے تھے وہ دونوں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ارقم کے ہاتھ میں اس عورت کا بیگ تھا اور وہ باتیں کیے جا رہے تھے' اف! یہ کون ہے؟ عمیمہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ آج تو خاص طور پر ارقم کہہ کر گیا تھا کہ ضروری کام ہے رات سے پہلے فرصت نہیں ملے گی مگر ......اس وقت شاپنگ......؟ اس کا دل چاہا اندر جا کر ارقم کا سامنا کرے مگر پھر کچھ سوچ کر واپس ہو گئی۔ گھر آ کر بھی یہی خیال رہا اور دل گھبرا رہا تھا۔ عجیب عجیب سے خدشات جنم لے رہے تھے۔ یوں کسی عورت کے ساتھ بے تکلفی سے ارقم کا ملنا مشکوک تھا۔ وہ سارا دن کانٹوں پر رہی۔ دل تھا کہ امڈتا چلا جا رہا تھا۔ رات کو ارقم گھر آیا تو اس کے پوچھے گئے سوال کا جو جواب ملا اس جواب نے عمیمہ کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔ اس کی روح تک زخمی ہو گئی تھی۔ یہ کیسا اعتراف تھا......؟ کتنی آسانی سے بنا کسی شرمندگی اور ہچکچاہٹ کے ارقم نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے یہاں شادی کر رکھی ہے، وہ بھی ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی...... لیکن وہ بوڑھی عورت اس کی بیوی نہیں تھی یہ بات بھی ارقم نے بتائی تھی۔ عمیمہ دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ کر بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ تو ہر جانب سے ناکام ہو چکی تھی۔ نہ بیٹا اپنا تھا اور نہ شوہر پر صرف اسی کا حق تھا۔

''ارقم آپ پاگل ہو گئے ہیں کیا......؟'' وہ ہذیانی انداز میں ان کی جانب بڑھی۔ ''کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں۔ آپ کو انداز بھی ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟ آپ نے دوسری شادی کر رکھی ہے اور......اور مجھے اندھیرے میں رکھا۔ کیا کمی تھی مجھ میں ارقم......؟ کیا ضرورت تھی آپ کو یہ کرنے کی۔ آپ کو نہ خیال آیا اور نہ شرم......اتنی چھوٹی حرکت کرتے ہوئے ایک بار بھی آپ کو میرا خیال نہ آیا۔'' وہ ارقم کو بری طرح جھنجوڑ

کر چیخ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔

''خیال آیا تھا......تمہارا ہی خیال تھا مجھے......'' ارقم نے ایک جھٹکے سے اس کو خود سے الگ کیا۔ ''تمہاری خواہش پر۔ تمہارے مسلسل اصرار پر ہی یہ سب ہوا ہے۔ پہلے تم نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے زبردستی مجھے باہر بھیجا۔ میں تمہیں سمجھا سمجھا کر تھک گیا لیکن...... تمہاری سمجھ میں رتی برابر بھی میری بات نہ آئی۔ تم نے ہارب کو بھی ہمیشہ شے دی۔ کبھی سمجھایا نہیں آج دیکھو اس کا حال......؟ پھر تم نے میرا جینا عذاب کر دیا کہ ہمیں بھی بلاؤ۔ یاد ہے میں نے تم کو کہا تھا کہ اس کے لیے بہت قربانی دینی پڑے گی۔ سمجھوتے کرنا پڑیں گے۔ تم نے کہا منظور ہے۔ تمہارے سر میں تو صرف امریکا کی رنگینیاں سوار تھیں۔ نہ رشتوں کا خیال تھا نہ اپنوں کی کشش۔ تم اپنی خواہشات کی غلام عورت ہو۔ میں کوئی لکھ پتی نہیں تھا کہ تم لوگوں کو یہاں بلوا لیتا۔ اس کے لیے مجھے یہاں شادی کرنی پڑی۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا عمیمہ جتنا تم نے سمجھ رکھا تھا۔ ایک آگ کا دریا تھا۔ جو میں نے پار کیا ہے۔ تمہاری ناجائز اور بے جا خواہشات پوری کرنے کے لیے۔ اب......اگرچہ حقیقت سامنے آ گئی ہے تو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھو۔ آج یہاں پر ہو تو اس وجہ سے ہو......اور بقول تمہارے کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے ناں۔ اب تم کو اندازہ ہو گا کہ کچھ پانے کے لیے کسی کو ''کچھ'' کھونا پڑتا ہے اور کسی کو ''بہت کچھ''

اف خدایا الفاظ تازیانے کی صورت عمیمہ کے وجود پر برس رہے تھے۔ عمیمہ منہ کھولے آنکھیں پھاڑے لفظوں کے یہ زہر اپنے اندر اتارتی چلی جا رہی تھی۔ ارقم کے ایک ایک لفظ میں سچائی تھی' حقیقت تھی۔ واقعی عمیمہ نے ''بہت کچھ'' کھو دیا تھا اپنے بیٹے کی سعادت مندی' اور سب سے بڑی بات کہ اپنے شوہر کو......جو اس کے علاوہ بھی کسی اور کا حصہ دار تھا۔ یہ خیال ہی کتنا جان لیوا تھا کہ اس کا شوہر صرف اس کا نہیں' واقعی وہ خواہشات کی غلام عورت تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آئی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب سچے رشتے' اپنی سرزمین اور پیار کرنے والے شدت سے یاد آئے جہاں رہ کر کم از کم اپنائیت کا احساس تو ہوتا تھا۔ جہاں اس کے دکھ پر چار لوگ دکھی ہو جاتے تھے یہاں پر...... وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

''ارقم ہم فوراً پاکستان چلیں گے۔'' دوسرے دن صبح اس نے فیصلہ سنایا۔

یہ قطعی ناممکن ہے ابھی میرے کچھ مسائل چل رہے ہیں۔ میں نہیں جا سکتا۔ ارقم نے حتمی انداز سے کہا۔

''اور میں نے بھی نیو ایئر یہیں منانا ہے'' یہ ہارب کا فیصلہ تھا۔

''او کے'' پھر مجھے فوراً بھجوا دیں مجھے ایک دن بھی یہاں نہیں رہنا۔'' یہ عمیمہ کا فیصلہ تھا۔

''ارے! کیوں بھئی......؟ امریکا ہے خوابوں کی جنت۔ یہاں پر تو زندگی لگتی ہے۔'' ارقم کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

مجھے کوئی بحث نہیں کرنی آپ لوگوں نے جب آنا ہو آ جانا مجھے فوری طور پر بھیج دیں اس نے کہا اور اٹھ گئی۔

''او کے جی'' ارقم نے سر ہلایا اور پھر چند دنوں بعد اس کے ہاتھ میں ٹکٹ تھا۔ ٹکٹ دیکھ کر ڈھیر سارے آنسو آنکھوں میں آ گئے کتنی چاہت سے وہ یہاں آئی تھی اور کتنی اداسیاں لے کر لوٹ رہی تھی۔ واپس جا کر اماں وغیرہ کو کیا جواب دے گی۔؟ کس طرح ان کو مطمئن کرے گی؟ یہ سوچیں بھی پریشان کر رہی تھیں۔

''تم کو اس بات کی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں کہ اماں اور واحد وغیرہ سے ہمارے بارے میں کیا کہنا ہے یا کیوں نہیں آئے؟ میں خود بات کر لوں گا۔'' شکر اللہ کا کہ ارقم نے یہ مشکل حل کر دی تھی۔

☆☆☆

اس کی فلائٹ سے تین دن پہلے ارقم اور ہارب دونوں ضروری کاموں کا کہہ کر اسے اللہ حافظ کر کے جا چکے تھے۔ اسے بے تحاشا رونا آ رہا تھا۔ فلائٹ کا

ٹائم بھی ہونے والا تھا۔ شال اچھی طرح لپیٹی اور ہینڈ کیری اور شولڈر بیگ لے کر فلیٹ سی باہر آ گئی۔ وہی راستے جو بھی خوش گوار احساس دلاتے تھے آج مضمحل اداس اور وحشت زدہ لگ رہے تھے۔ دماغ مسلسل سوچوں کی زد میں تھا۔ طویل ترین فلائٹ اور لمبے سفر کے بعد وہ جب کراچی ایر پورٹ پر اتری تو سامنے فضیلہ، واحد اور روبین کو دیکھ کر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اپنی سر زمین، اپنا وطن، اپنے لوگ، یہاں کی بات ہی الگ تھی ...... اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں کی سر زمین پر سجدہ ریز ہو کر اللہ پاک کا شکر ادا کرکے گھر آ کر جب اماں کی نحیف بانہوں میں سمائی تو ایک بار پھر ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے ان کے سینے سے لگ کر سکون اور عافیت کا احساس ہوا تھا، اماں جان، فضیلہ، واحد اور روبین بہت خوش تھے روبین کو گلے لگایا تو بے اختیار ہارب کی یاد آ گئی۔ کتنا سنگ دل اور سفاک ہو گیا تھا وہ ...... اسے اس پیاری اور معصوم لڑکی کا ذرا سا بھی خیال نہ رہا تھا۔ گھر پہلے سے مزید بہتر ہو گیا تھا اور رنگین قمقموں سے سجا ہوا تھا۔ صحن میں بھی لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ گھر ...... یہ آنگن ...... اور آنگن میں لگا نیم کا درخت ...... یہ سب کچھ بہت بھلا اور نیا نیا لگ رہا تھا۔

''چلو تم ذرا فریش ہو جاؤ۔ پھر باتیں کرتے ہیں۔'' اماں نے کہا تو عمیمہ جو جلتی بجھتی لائٹیں دیکھ رہی تھی چونکی۔

''جی اماں' یہ گھر نیو ائیر کی خوشی میں سجایا ہے کیا؟'' جاتے جاتے پلٹ کر روبین سے پوچھا جو اماں کے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

''نہیں بھابھی! ہمارے بچوں کے نکاح کی خوشی میں سجایا ہے۔ اب نیو ائیر بھی آ گیا تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔'' فضیلہ نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

''کیا نکاح!'' وہ چونکی اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

''نکاح!'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔ تب ہی سامنے کے کمرے سے ارقم اور ہارب نکلے ...... عمیمہ نے دیکھا ...... پھر حیرت اور بے یقینی کی کیفیت میں دوبارہ پلکیں جھپک کر دیکھا۔ اس کو یہ سب خواب لگا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دوبار دیکھا۔ پریشان ہو کر اماں کی طرف پلٹی وہ خواب کی سی کیفیت میں دو قدم پیچھے ہٹی۔

''ارے ارے بیگم صاحبہ! کہیں بے ہوش مت ہو جانا۔'' ارقم تیزی سے آگے بڑھا اور عمیمہ کو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔

آپ ...... آپ لوگ یہاں میرا مطلب ہے ......؟ وہ ابھی تک غیر یقینی کیفیت میں تھی۔

''آئی ایم سوری مما کہ آپ کو میں نے بہت ہرٹ کیا مگر سچ میں وہ سب ایک ڈراما تھا۔ اور پاپا ......''

''ہاں عمیمہ۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تمہاری خواہشات سے تنگ آ کر شادی کر لی تھی مگر ...... مجھے بعد میں احساس ہو گیا تھا۔ میں نے اس کو طلاق دے دی تھی اور وہاں کے قانون کے مطابق مجھے بہت کچھ اس کو دینا پڑ جاتا تو وہ بوڑھی خاتون وہاں کی بہترین لائر تھیں، میں نے ان کی مدد سے لورین کو طلاق دی اور ساری کارروائی میں اس طرح مصروف رہا مجھے پتا تھا کہ تم پاکستان کسی صورت نہیں آؤ گی۔ لیکن ہمیں اب واپس آنا تھا اس لیے ہارب نے اور میں نے ہارب کا وہ ڈرامہ کھیلا ...... اب اللہ کا شکر ہے کہ میں لورین کے چنگل سے آزاد ہوں جو تھوڑی بہت پراپرٹی ہے وہ میری لائر کے ذریعے مل جائے گی۔ اب ہم سب یہیں رہیں گے ساتھ مل کر اور ہم نے تم کو نیو ائیر کا یہ سرپرائز دیا ہے کل ہی ہارب اور روبین کا نکاح ہے۔'' ارقم نے تفصیلی بات کی عمیمہ جو آنکھیں پھاڑے سب کچھ سن رہی تھی اس کے چہرے پر سکون چھا گیا اس کا مرجھایا ہوا چہرہ یک دم کھل اٹھا تھا۔ کہ وہ اپنی جنت میں لوٹ آئے تھے۔

''ہارب ...... تم نے کیسا ڈرامہ کیا ......؟'' وہ ہارب کی طرف پلٹی ......

''سوری مما آپ نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ میں اتنی پیاری اور معصوم لڑکی کو بھول سکتا ہوں یہ آپ لوگوں کی خواہش ہی نہیں میری بھی زندگی ہے۔ مجھے تو ہر صورت واپس آنا تھا کبھی بھی واپس نہ جانے کے لیے'' ہارب محبت پاش نگاہوں سے روبین کو دیکھ کر کھلے دل سے اعتراف کر رہا تھا۔ روبین کے شرمائے شرمائے وجود نے اس کے دل پر قیامتیں ڈھا دی تھیں۔

''ارے بھئی نیو ائیر کی خوشی میں نکاح کے ساتھ ڈائریکٹ رخصتی بھی دے دیں تا کہ نیو ائیر بھی خود پر رشک کر سکے۔'' ہارب نے دل کی بات بڑے خوب صورت انداز میں باآواز بلند کی تو سب لوگ زور سے ہنس دیے۔

''شریر صاف کہہ دے کہ اب انتظار نہیں کر سکتا۔'' عمیمہ نے آگے بڑھ کر اس کے کان مروڑے۔

''ہائے مما! ارے یار روبین تم بھی تو کچھ بولو ناں۔'' وہ کان سہلاتے ہوئے روبین کی جانب جھکا تو روبین شرما کر اندر کی جانب بھاگی حبیبہ ولا میں نئے سال کی آمد پر پھر سے خوشیاں لوٹ آئی تھیں عمیمہ وضو کرنے جا رہی تھی کہ ایک بار پھر اللہ پاک نے ان کو اتنی ساری خوشیاں اور محبتیں بخش دی تھیں۔ اور وہ شکرانے کے طور پر اپنے رب کے آگے سر بہ سجود ہونے جا رہی تھی۔

☆☆

مکمل ناول

مہرباں ہوا

عنبرین ولی

ظہر کی نماز کے بعد ہی محلے کی خواتین ان کے گھر آنا شروع ہوگئی تھیں۔آج اس کے ابا کی برسی تھی۔انہوں نے ان کے ایصال ثواب لیے گھر میں قرآن خوانی رکھی تھی، منتہیٰ نے آج پورے گھر کی تفصیلی صفائی کی، جانوروں کا حصہ بالکل الگ تھا مگر اس کے باوجود اسے گھر کے اندر بھی بو محسوس ہوتی۔ ناک پر دوپٹا رکھ کر ڈھیر سارا اسپرے بھی کیا تاکہ آنے والے مہمان خوش ہوکر جائیں۔اسے تو یہی لگتا تھا کہ بو سونگھنے کے معاملے میں جتنی تیز ناک اس کی ہے محلے والوں کی بھی ہوگی۔حالانکہ ہر روز دن میں کئی بار محلے کی یہی عورتیں کبھی دودھ، کبھی تو کبھی مکھن کی خریداری کے لیے آیا کرتیں لیکن انہوں نے کبھی کسی بات کا شکوہ نہ کیا۔اماں تو اسے کہتی تھیں کہ تم اپنی ناک کا علاج کرواؤ۔

بڑے کمرے میں ہی سارا اہتمام کیا گیا تھا، منتہیٰ زیادہ کام کاج نہیں کرسکتی تھی اس لیے اس کی دوست بھی آج کالج سے چھٹی کر کے اس کے گھر موجود تھی۔ اماں بے چاری تو سارا دن ہی مصروف رہا کرتیں۔آج کا دن عام دنوں سے کہیں زیادہ تھکا دینے والا تھا لیکن یہی تھکن انہیں جان سے زیادہ عزیز تھی، جب رات کو وہ تھکن سے چور بدن کے ساتھ بستر پر گرتیں تو فوراً ہی سو جاتیں۔اگر یہ تھکن نہ ہوتی تکلیف دہ سوچیں اب تک ان کی جان لے چکی ہوتیں۔

عورتیں آئیں۔قرآن پاک پڑھا گیا۔ثواب منتہیٰ کے ابا مظفر کو بخشا گیا، دعا کے وقت انہیں کیا کچھ نہیں یاد آیا۔کاش وہ حادثہ نہ ہوا ہوتا نہ وہ ان سے بچھڑتے اور نہ ہی۔۔لیکن کبھی خدا کے لکھے کو بھی کوئی بدل سکا ہے؟ دعا کے بعد کھانے کا اہتمام تھا۔شام تک سب خوش اسلوبی سے نمٹ گیا۔اس کے بعد منتہیٰ اور اس کی سہیلی فوزیہ نے گھر کو صاف کیا، برتن دھوئے، ابھی وہ چائے پینے بیٹھی ہی تھیں کہ فوزیہ کا بھائی اسے واپس لینے آگیا۔جلدی جلدی چائے ختم کرکی وہ چلی گئی۔

مغرب کا وقت ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔وہ تھکی ہاری سی دروازے کی چوکھٹ پر آکر بیٹھ گئی۔اماں جو کہ برآمدے میں ہی موجود تھیں۔اسے یوں بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس آئیں۔

''تمہارے پاس دماغ ہے یا اسے بھی بیچ کر کھا گئی ہو؟''منتہیٰ نے ان کے طنز پر کافی برا منہ بنایا۔

''تم ذرا انگلیوں پر گنو تو، کتنی بار تمہیں سمجھا چکی کہ جب دو وقت مل رہے ہوں تو یہاں نہیں بیٹھتے۔ ''وہ تحمل مزاجی کا مظاہرہ کر رہی تھیں لیکن ان کی آنکھوں سے غصہ چھلک رہا تھا۔

''ہاں ہاں سارے جن بھوت اسی چوکھٹ کو ہی پار کر کے گزرتے ہیں۔انہیں تو جیسے کوئی اور راستہ ملتا ہی نہیں۔''وہ چڑ کر بولتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔اماں اس کے پیچھے آئیں۔

ان کا رخ طویلہ کی طرف تھا جہاں ان کے جانور بھوکے تھے۔کپڑے تبدیل کر کے انہوں نے کام والا مخصوص جوڑا پہنا۔ اور جانوروں کو چارا ڈالنے لگیں، ڈھیر ساری مرغیاں آزادانہ گھوم رہی تھیں ان سب کو ڈربے میں بند کیا۔باقی جتنے کام رہ گئے تھے وہ نمٹا کر نہا کر لباس تبدیل کر کے اندر آئیں تو اسے مصروف پایا۔

وہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ہاتھ میں کروشیہ اور اون لپٹا تھا، وہ بڑی مہارت اور تیزی کے ساتھ اس دھاگے کو بڑی پیاری شکل دینے میں مصروف تھی۔وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''تم نے دوا کھائی تھی؟''

''جی اماں۔دوا کے بغیر بھی بھلا میرا گزارہ ہے۔''اس نے سر اٹھا کر مسکرا کر کہا اور پھر سے سر جھکا لیا۔دونوں بظاہر بالکل معمول کے مطابق ہی کام کر رہی تھیں لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کے درد سے واقف تھیں۔سلیقہ بی بی نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔

''تم نے آج ضرورت سے زیادہ ہی کام کیا ہے۔اب اسے بند کرو اور سو جاؤ۔صبح کالج بھی جانا ہے تمہیں۔اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔''انہوں نے



محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بوسہ دیا۔ وہ بے اختیار ان کے کندھے سے لگ گئی۔

"اللہ نے ابا کو بلالیا تھا۔ مجھے بھی اپنے پاس بلا لیتے۔ میری زندگی اس اذیت میں تو نہ گزرتی۔" اس کی آواز میں شدید دکھ تھا۔ انہوں نے گہری سانس بھری۔ اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ خدا اگر چاہتا تو اس حادثے کو ہماری زندگی میں آنے ہی نہ دیتا۔ بہت سے لوگ ہیں جن کی زندگی ان حادثات سے پاک ہے، جبکہ کچھ ہم جیسے بھی ہیں۔ کس کے ساتھ کب کیا ہو، کیوں ہو، کس لیے ہو اس کی وجہ نہ ہم جانتے ہیں نا جان سکتے ہیں اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے جو ہے جیسا ہے اسے قبول کر و اور شکوے بھول جاؤ۔ زندگی میں شکایتوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، جو کہ توجہ طلب ہے۔ جیسے کہ تمہاری تعلیم اور صحت، جو ہو چکا اسے ہم بدل نہیں سکتے لیکن اپنا خیال تو رکھ سکتے ہیں نا؟" ملیحہ نے ان کی بات پر اثبات میں سر ہلایا اور مسکرا دی۔

"تم دیکھنا ایک دن آئے گا جب سب کچھ بدل جائے گا، بالکل ویسا ہو جائے گا جیسا تم چاہتی ہو لیکن اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا اور محنت بھی۔ لیکن یہ سب تب ممکن ہے جب تم مضبوط ہو گی۔ اب اٹھو سامان سمیٹو۔ یہ کل مکمل کر لینا۔ اب سو جاؤ۔" انہوں نے بستر سے سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ وہ چپ چاپ اٹھ گئی۔ چیزیں اٹھا کر جگہ پر رکھیں اور بستر جھاڑ کر لیٹ گئی۔ سلیقہ کمرے سے جا چکی تھیں۔ مستقبل کی سوچوں میں الجھی وہ نیند کی گود میں پہنچ گئی جو کہ اب اسے تھپک تھپک کر دوسرے جہان کی سیر کر دار ہی تھی۔ وہ جہان جہاں صرف بے خبری ہوتی ہے۔

☆☆☆

عبدالباری کی آنکھ کھلی تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ گھڑی میں وقت دیکھا اور ایک دم ہی بستر سے چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ آج اسے حیدر آباد کے لیے نکلنا تھا، اس کی کوشش تھی کہ وہ بارہ بجے تک وہاں پہنچ جائے اور ممکن ہو تو آج رات ہی واپسی کا بھی قصد کر لے۔

پندرہ منٹ میں وہ جانے کے لیے تیار میڑھیاں اتر رہا تھا، سامنے ہی مومنہ دکھائی دی۔ اس نے عبدالباری کی جانب مسکرا کر دیکھا لیکن وہ اسے نظر انداز کرتا آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے معاف کر چکا تھا لیکن مومنہ نے جو کچھ بھی کیا اسے بھولنا ناممکن تھا۔

کتنی عجیب بات تھی نا بہن اور بیٹی نے ایک ہی جیسی غلطی کی تھی لیکن منظور صاحب نے بیٹی کی غلطی کو کیسے چٹکیوں میں معاف کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہی انہیں اپنی بھولی ہوئی بہن یاد آئی جو نجانے کہاں تھیں، کن حالات میں تھیں۔ خدا جانے زندہ تھیں بھی کہ نہیں۔ ان سب باتوں کا احساس انہیں اب ہو رہا تھا اور فکر بھی۔

اسے اپنے پاپا کے اس دہرے معیار پر شدید غصہ تھا لیکن ان کی طبیعت کے پیش نظر وہ کچھ بھی نہیں بول پایا، احتجاج کا ایک لفظ تک نہیں۔ لیکن دل ہی دل میں وہ ان سے شدید نالاں تھا۔

اپنی پھپھی کا پتا ڈھونڈنے میں بھی اسے اچھی خاصی تگ و دو کرنا پڑی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ انہیں ہر صورت اپنے ساتھ واپس لائے گا اور دادا کی جائداد میں سے انہیں ان کا حصہ بھی پوری ایمان داری سے دے گا۔ جس علاقے میں وہ نی الحال رہائش پذیر تھیں، اس کے بارے میں اسے کچھ علم نہیں تھا، اسے بس اتنا ہی معلوم تھا کہ اسکی پھپھی نے ایک غریب طبقے کے مرد کے ساتھ شادی کی تھی۔ اور وہ جس علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ سالوں پہلے اسے چھوڑ چکے تھے، اس علاقے کے امام صاحب سے ہی اسے علم ہوا کہ مظہر ایک ایکسیڈنٹ میں چل بسے تھے۔ اور ان کے والدین اپنی بہو اور پوتی کے ساتھ حیدر آباد واپس چلے گئے۔

تب سے اب تک وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ان کی زندگی کس طرح گزری ہوگی۔ کن کن مشکلات کا انہیں سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اور اب نجانے کیسے حالات ہوں گے۔ مومنہ تو اپنی من مانی کرنے کے بعد بھی پہلے جیسی ہی زندگی گزار رہی تھی۔ جبکہ اس کی پھپھو نے اس بغاوت کی بڑی بھاری قیمت چکائی تھی۔

گاڑی چلاتے ہوئے بچپن کی بہت سی یادیں اس کے ذہن میں تازہ ہونے لگیں۔ اس کی یادوں میں ان کا حسین چہرہ اب بھی روشن تھا۔ کتنا پیار کرتی تھیں وہ اس سے۔ لیکن پھر ایک دن وہ اچانک ہی اس کی زندگی سے غائب ہو گئیں۔ اب وہ پھر سے انہیں اپنی زندگی میں واپس لانا چاہتا تھا۔ اسی عالی شان گھر میں جہاں ان کا حصہ تھا، حق تھا۔

اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ پاپا کے اس فیصلے سے اس کی ممی بالکل بھی خوش نہیں ہوئیں۔ کیونکہ جائداد میں بٹوارے کا مطلب تھا کہ ایک اچھا خاصا بڑا حصہ ان کے پاس سے کسی اور کے پاس منتقل ہو جائے۔ اور یہ بات اسٹیٹس کانشس عورت کے لیے کس حد تک تشویش ناک ہو سکتی ہے اس کا اندازہ عبدالباری کو اچھے سے تھا۔ لیکن وہ ان تمام چیزوں سے نمٹنا جانتا تھا۔

اس نے روڈ کے ایک طرف گاڑی روکی اور پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔ اسی وقت اس کا فون بجنے لگا۔ جیب سے فون نکال کر اسکرین دیکھی تو پاپا کالنگ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس نے سنجیدہ چہرے کے ساتھ فون ریسیو کیا۔

مجھے ابھی حیدر آباد پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگے گا۔

لگتا ہے آپ سے صبر نہیں ہو رہا۔

اگر آپ کی بیٹی اور میری بہن گھر سے نہ بھاگتی تو شاید آپ کو سلیقہ پھپھو کبھی یاد ہی نہ آتیں۔" اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ زبان قابو رکھے لیکن پھر بھی اس کے منہ سے یہ سچ پھسل گیا۔ دوسری جانب چند لمحوں کیلئے خاموشی چھا گئی

"باپ اور بھائی میں یہی تو فرق ہے۔ باپ کی شفقت اور بھائی کی محبت — کو ایک پیمانے پر رکھنا ہی غلط ہے۔" وہ سنجیدہ آواز میں بولے۔ وہ اب بھی ان سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش ہو گیا۔

میں وہاں پہنچ کر آپ کو فون کرتا ہوں۔ اس نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی۔ گاڑی روڈ پر رواں دواں تھی۔ اور اس کا دماغ بھی سوچوں کے جال میں الجھا تھا۔ جوں جوں وہ منزل کے قریب آ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ آنے والے لمحات کے بارے میں کوئی پیشن گوئی کرنے سے خود کو قاصر پاتا تھا۔

وہ اسے پہچان نہیں سکیں گی اور جب وہ ان سے اپنا تعارف کروائے گا تو نجانے وہ کس طرح کا رویہ دکھائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے دروازے سے اندر گھسنے ہی نہ دیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بانہیں پھیلا کر استقبال کریں۔ خدا جانے کیا ہوگا۔ اس کی بڑبڑاہٹیں جاری تھیں۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ ان کے دروازے پر تھا۔ ارد گرد کا علاقہ دیکھ کر اس کے ملال میں شدید اضافہ ہوا۔ کچے ٹوٹے ہوئے روڈ، جگہ جگہ گٹر کا کھڑا پانی، ادھ ننگے بچے، وہ پریشان حیران سا ان کے دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ لوہے کا بڑا سا زنگ آلود دروازہ۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ گلی میں موجود کئی لوگوں کی نظریں اسی پر تھیں۔ اس کی مہنگی چمکتی گاڑی کو بچے بڑی ہی پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ باری نے اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرنے سے پہلے آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کیا اور دروازہ بجایا۔ دل تھا کہ تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ دوسری دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں والی عورت موجود تھی۔ اس نے ایک نظر ان کے وجود پر ڈالی۔ کپڑوں اور پیروں پر بھوسہ لگا ہوا تھا۔ چہرے پر جھریاں تھیں لیکن بہت کم البتہ چہرے کا رنگ کالی گہرا تھا، اسے لگا شاید وہ غلط دروازے پر آ گیا ہے۔ اس عورت کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

"یہ۔۔ یہ سلیقہ بی بی کا گھر ہے؟" اس نے گلا کھنکار کے پوچھا۔

''جی۔ یہ سلیقہ بی بی کا ہی گھر ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ان کی آواز اور صاف شفاف لہجے نے اسے چونکا دیا۔

''آپ؟''

''میں ہی سلیقہ ہوں۔ کہیے کیا بات ہے؟'' وہ الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھیں۔ جبکہ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''اچھا آپ کو صوبیہ نے بھیجا ہے؟ ان سے کہیے گا کہ ملتجیٰ کی طبیعت ناساز تھی اس لیے وہ کام مکمل نہیں کر سکی۔ ایک دو دن بعد میں خود ہی کھلونے دے جاؤں گی۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ مسکراتے ہوئے ان کے گال کا ڈمپل نمایاں ہو گیا۔ کیا یہ وہی عورت تھی جس کے لیے دنیا جہان کے رشتوں کی لائن لگی رہتی تھی؟ جن کی چمکتی خوب صورت رنگت انہیں کئی لوگوں میں ممتاز کرتی تھی۔ اور ان کے گال پر پڑنے والا گڑھا جس پر بچپن میں عبدالباری نے کئی بار ہاتھ رکھا تھا، وہ ان کو حسرت، دکھ نجانے کس کس احساس کے زیر اثر دیکھنے لگا، وہ ایک اجنبی کے یوں دیکھنے پر متعجب تھیں اور الجھن سے اسے دیکھ رہی تھیں۔۔ اس نے بے اختیار ہی ان کے دائیں گال کے گڑھے پر انگلی رکھی تب ہی اس کی آنکھ چھلکی۔

سلیقہ ایک دم ہی جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹیں۔

''ک.....کون ہو تم؟'' انہوں نے کانپتی آواز میں پوچھا۔ اس ننھے سے ہاتھ کا لمس ان کے گڑھے میں اب بھی قید تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں والا عبدالباری ان کی نظروں میں گھوم گیا۔ اور یہ سامنے کھڑا خوبرو جوان۔۔ ان کے دل کی حالت بری ہونے لگی۔

''میں آپ کا عبدالباری ہوں۔'' ان کے جسم میں جو رہی سہی طاقت تھی وہ بھی جیسے نچڑ گئی۔ وہ ایک دم ہی ٹانگیں بے جان ہونے پر زمین پر بیٹھ گئیں۔ عبدالباری نے دروازہ بند کیا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ان کا وجود کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا تھا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ بلک بلک کر روتی جاتی تھیں اور اسے چومتی جاتی تھیں۔

''آپ نے جانے سے پہلے مجھے کیا کہا تھا یاد ہے؟'' اس نے ان کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے ماضی کا دروازہ بجایا۔ وہ لمحہ، وہ وقت ان کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگا۔

''میں نے ڈھونڈ لیا آپ کو۔ اب کبھی دور مت جائیے گا مجھ سے۔'' وہ ان کے ہاتھ چومتے ہوئے، روتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

آج دھوپ بہت تیز تھی، اسے اپنی طبیعت بھی کچھ بہتر نہیں لگ رہی تھی، اس پر وہ اپنا فون بھی گھر بھول آئی تھی۔ پرسوں اس نے صوبیہ سے کہا تھا کہ وہ صبح کسی کو بھیج دے لیکن اس سے کام پورا نہیں ہو پایا تھا۔ وہ اسے منع کرنا بھی بھول گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں گھنٹوں کا حساب کتاب کرنے لگی کہ آج اسے مزید کتنے گھنٹے درکار ہوں گے۔ پیپرز میں بھی صرف کچھ ہی دن رہتے تھے۔ امتحانات کی تیاری بھی کرنی تھی اور کام بھی پورا کرنا تھا۔

یوں تو ان کے گھر کا گزارہ کافی اچھا چلتا تھا۔ دودھ، دہی، مکھن، دیسی گھی ہر چیز ہی گھر میں موجود تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب اس کی ماں کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ اکیلی اتنے سارے جانور سنبھال سکیں۔ وہ انہیں ایک بار نوکر رکھنے کا مشورہ بھی دے چکی تھی اور انہوں نے وہ مشورہ مان بھی لیا تھا لیکن اس لڑکے نے ملتجیٰ پر ہی نظریں گاڑ لی تھیں۔ وہ اس کی وجہ سے اچھی خاصی پریشان ہو گئی تھی لیکن اماں کی مدد کی وجہ سے خاموش رہی، انہوں نے خود ہی اس کے تیوروں پر غور کیا تو لمحے بھر کا بھی سوچے بغیر اسے نکال باہر کیا۔

ان دنوں وہ یہی سوچتی رہتی تھی کہ اب مزید وہ چند سال ہی اس کام کو جاری رکھ پائیں گی۔ اس کے بعد انہیں یہ جانور اور دودھ کا کاروبار بند کرنا پڑتا یا کسی کے حوالے کرنا پڑتا، وہ خود ابھی تعلیم حاصل کر رہی تھی، تعلیم مکمل ہو بھی جاتی تو بھی اس کی اماں اسے نوکری نہ کرنے دیتیں۔ تبھی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلد ہی اپنا ایک چھوٹا سا اسٹور کھولے گی تاکہ امی کی پریشانی بھی ختم ہو جائے اور آمدن کا کوئی مستقل ذریعہ بھی بن جائے۔

اس سوچ کو اس نے ابھی عملہ جامہ نہیں پہنایا تھا۔ البتہ اپنی ایک سہیلی کی بھتیجی کے لیے اس نے کروشیے سے چھوٹے چھوٹے جوتے بنا کر ان کا تحفہ دیا۔ ہاتھ کی کڑھائیوں سے لے کر سویٹر بننے تک میں وہ ماہر تھی اور یہ سارے کام اس نے محلے کی ایک بوڑھی اماں سے سیکھے تھے۔ اس سہیلی کے گھر والوں کو یہ جوتے اتنے پسند آئے کہ انہوں نے باقی بچوں کے لیے بھی اس سے جوتے بنانے کی فرمائش کر دی۔ اور ایک اچھا معاوضہ بھی دیا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس کے کام میں بے حد صفائی بھی تھی۔ جلد ہی صوبیہ نامی ڈیزائنر سے اس کا رابطہ ہوا۔ وہ ملتجیٰ سے کروشیے کے پرس بنوانے لگی جن کو بے حد پسند کیا گیا۔ وہ پرس بنانے کے لیے بہت باریک اور چمکیلی زری کا استعمال کرتی تھی، جس میں اس کی بہت محنت لگتی، لیکن جب وہ مکمل ہوتا تو اتنا حسین لگتا کہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہی خوش ہو جاتی۔ لیکن اس نے صوبیہ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ مجبوری میں یہ کام نہیں کر رہی اس لیے اسے اس کی مرضی کا جائز معاوضہ دیا جائے۔ صوبیہ نے پہلے اسے کم پر راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی مجبوراً اسے اس کی بات ماننی پڑی۔

کچھ دن پہلے ہی اسے نیا آرڈر ملا تھا جسے کل رات ہی مکمل کرنا تھا۔ لیکن وہ اسے مکمل نہیں کر پائی تھی۔ اور اب سوچ رہی تھی کہ گھر جاتے ہی کام پورا کرنے کی کوشش کرے گی۔ چھٹی سے کچھ دیر پہلے ہی اسے فوزیہ دکھائی دی، خود اس نے سارا وقت لائبریری میں گزارہ تھا، ان دونوں کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ ناک میں سونے کی ننھی سے حسین نتھ پہنے، وہ تیزی سے اس کے پاس گئی۔

''ارے یہ کب ہوا؟ میرا مطلب ہے کہ تم نے کب ناک چھدوائی اور اتنی پیاری نوز رنگ۔'' اس نے اس کی ناک چھو کر اشتیاق سے پوچھا۔

''کل جب میں تمہارے گھر سے واپس گئی تو امی مارکیٹ جا رہی تھیں میں بھی ان کے ساتھ چل پڑی، وہیں سنار کے پاس کچھ لڑکیاں ناک کان چھدوا رہی تھیں، میں نے بھی سوچا نیک کام میں دیر کیسی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ فوزیہ بڑی گوری چٹی سی تھی، گلابی عارض، ناک بھی اکثر گلابی ہی رہتی، اس پر یہ سنہری نتھ بہت سج رہی تھی۔ ملتجیٰ نے دل کھول کر تعریف کی۔

''یار مجھے بھی بازار لے چلو نا۔ مجھے بھی ناک میں لونگ پہننی ہے۔'' اس نے مسکین شکل بنا کر کہا۔ فوزیہ فوراً مان گئی۔ بازار قریب ہی تھا۔ چھٹی ہوتے ہی دونوں رکشا میں بیٹھیں اور دس منٹ بعد ہی مطلوبہ دکان کے اندر تھیں۔ کچھ دیر میں ہی اس کی پتلی سی ناک میں سنہری تار سجی تھی، سامنے لگے شیشے میں اس نے ہر زاویے سے خود کو دیکھا اور پیسے دے کر واپسی کی راہ لی۔ وہ پورے راستے دکھتی ناک کو بچاتے بچاتے گھر پہنچی جہاں ایک دھماکا خیز خبر اس کی منتظر تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ گھر کے دروازے کے سامنے تھی۔ حسب معمول دروازہ کھلا ہوا تھا، کھلے دروازے سے وہ اندر داخل ہوئی اور بلند آواز سے سلام جھاڑا۔ لیکن اسے کوئی جواب موصول نہ ہوا، یقیناً اماں کسی کام سے باہر گئی تھیں، وہ اطمینان سے کمرے میں آئی بیگ رکھا، کپڑے اٹھائے اور باتھ روم میں گھس گئی، وہ جونہی نہا کر نکلی سامنے ہی ایک اجنبی گود میں میمنہ اٹھائے بڑی بے تکلفی سے کھڑا تھا، اسے دیکھتے ہی ملتجیٰ کے منہ سے چیخ نکلی۔ وہ دوپٹے کے بغیر تھی، فوراً باتھ روم میں واپس گھسی اور دوپٹا لپیٹا، اس کی چیخ سن کر باری نے میمنے کو نیچے اتار دیا تھا، وہ سخت غصے سے اسے دیکھنے لگی۔''

''کون ہو تم؟ اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟'' وہ دھاڑ کر بولی۔ اندر سے وہ بے حد خوف زدہ تھی، لیکن ظاہر ہے اس اجنبی کے سامنے اپنا خوف ظاہر نہیں کر سکتی تھی، عبدالباری نے اسے بے حد

دلچسپی سے دیکھا۔

''یہ تمہارا گھر ہے؟ لگتا تو نہیں۔'' وہ بڑے آرام سے بولا۔ ''تمہیں تو کسی محل میں ہونا چاہیے تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے قدم بڑھنے لگے، باہر کا دروازہ بھی بند کردیا گیا تھا وہ ایک دم ہی وہاں سے بھاگی اور کچن میں گھس گئی، سیکنڈز میں اس نے سب سے بڑی اور تیز چھری اٹھائی اور باہر آ گئی۔

''اب بولو۔ نہتی لڑکی کو دیکھ کر بہت شیر ہورہے تھے نا۔ اب بتاؤ یہاں کیوں آئے ہو؟'' وہ چھری سے اسے خوف زدہ کرتے ہوئے بولی۔ عبدالباری کو اس کے انداز پر شدید ہنسی آرہی تھی، لیکن وہ ہنسا نہیں بلکہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔ تبھی بیرونی دروازہ بجا، اس سے پہلے کہ وہ دروازے کی طرف پہنچتی عبدالباری نے ایک دم ہی اس کے ہاتھ سے چھری جھپٹی اور دروازے کی طرف دوڑ لگادی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگ بھی نہ پائی بلکہ وہیں کھڑی رہی۔ دروازہ کھلنے پر اس کی اماں نمودار ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں بھاری تھیلے پکڑے وہ اندر داخل ہوئیں، اس نے فوراً ہی اماں کے ہاتھ سے سامان لیا۔

''مجھے علم ہوتا کہ آپ اس کام کے لیے جارہی ہیں تو میں آپ کو جانے ہی نہ دیتا۔'' مرغی، گوشت اور پھلوں سے بھرے تھیلے دیکھ کر وہ ناراضی سے بولا۔ ملتجی اب بھی حیران سی اسے اور اماں کو دیکھ رہی تھی۔ اماں کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ وہ اس کی حیرانی سے بھی واقف تھیں اس لیے اسے پانی لانے کا اشارہ کرکے وہ چارپائی پر بیٹھ گئیں ملتجی ان کے لیے پانی لے آئی، عبدالباری بڑی ہی بے تکلفی سے کچن میں جاچکا تھا۔ اماں نے آدھا گلاس پانی پی کر اسے واپس کیا۔

''یہ نمونہ کون ہے؟ اور اس گھر میں اس قدر بے تکلفی سے کیوں گھوم رہا ہے؟'' سامان رکھتے عبدالباری کی طرف خوں خوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے اماں سے سوال کیا اور پانی پینے لگی

''یہ عبدالباری ہے۔ تمہارے ماموں کا بیٹا۔'' انہوں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اسے اچھو لگ گیا۔ ایک دم ہی اس نے گلاس خود سے دور کیا اور بے یقین نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''آپ نے اسے گھر میں گھسنے کیسے دیا؟'' اس نے شدید غصے سے ہاتھ میں پکڑا گلاس نیچے پھینکا۔ عبدالباری بھی باہر آچکا تھا اور اس سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

''اسے ابھی اور اسی وقت اس گھر سے نکالیے اور اسے واپس جانے کا کہیے۔ ہم اس دنیا میں اکیلے ہیں، ہمارا کوئی نہیں ہے۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ دروازہ بند نہیں کرسکتی تھی وہ۔ اسے بے بسی کی موت سے شدید خوف آتا تھا۔ اماں بھتیجے کی دل جوئی بھول کر اس کے پیچھے لپکیں۔ وہ بستر پر بیٹھی گہرے سانس لے رہی تھی اور چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

''ملتجی خدا کا واسطہ غصہ مت کرو، پرسکون ہوجاؤ۔ تمہاری طبیعت خراب ہوجائے گی۔'' اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اپنی طبیعت کے خراب ہوجانے سے بے حد خوف زدہ رہتی تھی لیکن اس وقت اس کا دماغ غصے سے کھول رہا تھا۔

''میری طبیعت کی اتنی ہی فکر تھی تو اسے گھر میں کیوں گھسنے دیا آپ نے؟'' اسی وقت دروازہ بند کیوں نہیں کیا، دھکے دے کر باہر کیوں نہیں نکالا؟ یہ ان ہی ماں باپ کی اولاد ہے نا جنہوں نے ابا کو چوکیدار کے ہاتھوں ذلیل کروایا تھا۔ آپ کو کیوں کچھ یاد نہیں؟ کیوں اس آدمی کی صورت دیکھ کر ان کے ماں باپ کی کرنی بھول گئیں آپ؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔ انہوں نے فوراً ہی اسے دوا نکال کر دی اور زبردستی کھلائی۔

''ان کا وہ سلوک میری کرنی کا پھل تھا۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ تم بس کچھ بھی الٹا سیدھا مت سوچو۔ اور آرام کرو۔ میں گھر سے بھاگی تھی، لوگ اس جرم کی پاداش میں تو قتل بھی کردیتے ہیں، مجھ سے تو صرف تعلق توڑا گیا۔'' وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں،

''آپ کے بھائی کی بھی تو کوئی بیٹی ہوگی، خدا کرے وہ بھی گھر چھوڑ کر جائے۔'' اس نے شدید نفرت سے بددعا دی

''تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیسی باتیں کررہی ہو؟'' انہیں بہت برا لگا۔

''پھر میں دیکھوں گی کہ کتنے دن اس سے رابطہ توڑیں گے۔'' اس نے آنکھیں رگڑیں۔

تمہارا دماغ بالکل خراب ہوگیا ہے ملتجی، کیا تم میرے ماضی کی طرف داری کررہی ہو؟ یا میں نے جو گناہ کیا اسے تم غلط نہیں سمجھتیں؟ انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا، نگاہیں اس کے کملائے ہوئے چہرے پر ٹکی تھیں۔

''آپ نے وہ گناہ تب کیا تھا جب آپ صرف سلیقہ بی بی تھیں، میں نے آپ کو سلیقہ مظہر اور ملتجی کی ماں کے روپ میں دیکھا ہے اور مائیں کبھی غلط نہیں ہوتیں۔'' اس نے اتنا کہہ کر منہ پھیر لیا، وہ کچھ دیر وہیں بیٹھی رہیں پھر باہر آگئیں۔ عبدالباری طویلے میں تھا۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔

''ملتجی غصے کی تھوڑی تیز ہے۔ اور ساری زندگی رشتوں کے لیے ترستے ہوئے ہی گزاری ہے اس نے، اس لیے اس کے دل میں سب کے لیے خفگی ہے غصہ ہے۔ تم اس کی باتوں کا برا مت منانا۔ وہ اسے صفائی دینے لگیں، وہ بس ہلکا سا مسکرایا۔

''اسے منالوں گا میں، آپ پریشان نہ ہوں۔ ابھی تو کھانے کے لیے کچھ دے دیں مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے ان کی توجہ کا محور کھانے کو بنا دیا۔ وہ فوراً ہی باورچی خانے کی طرف گئیں۔ لیکن اسے اپنے کمرے میں بٹھانا نہ بھولیں، عبدالباری نے بڑی توجہ سے ان کے کمرے کو دیکھا، لکڑی کا پرانا سا بیڈ جو ایک کونے میں پڑا تھا۔ اس پر پتلا سا گدا اور اس پر ہاتھ سے کڑھی ہوئی سفید چادر، دوسرے کونے میں ایک طرف پرانی سی الماری رکھی تھی جس کے دروازے کا لاک بھی ٹوٹا ہوا تھا، چھوٹی سی ٹیبل جس پر ڈھیر ساری دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور دیوار پر سلیقہ اور مظہر کی ایک یادگار تصویر بھی تھی۔ وہ گہری سانس بھرتا بستر پر بیٹھ گیا۔ دماغ ملتجی کے گرد گھومنے لگا۔ وہ اس قدر تیخ پا تھی کہ اگر اسے حقیقت معلوم ہوجاتی تو وہ کبھی بھی اس کے ساتھ کراچی نہ جاتی، اور ظاہر ہے پھپھو اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کے بغیر کبھی بھی اس کے ہمراہ نہ جاتیں۔ اسے کسی بھی طرح ملتجی کو منانا تھا لیکن کیسے؟ وہ یہ نہیں سمجھ پارہا تھا۔ پاپا کو فون کرکے اس نے اس مشکل کا اظہار کیا۔ انہوں نے اس سے یہی کہا کہ ''وہ ان ماں بیٹی کے بغیر کراچی نہ آئے۔'' تھوڑی ہی دیر بعد اس کی ممی کا فون آگیا۔

''اگر وہ یہاں آنے کے لیے راضی نہیں ہیں تو کیوں زبردستی کررہے ہو؟ تمہارے پاپا کا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اب بھلا اس وقت سلیقہ کو واپس بلا کر گڑھے مردے کیوں اکھاڑ رہے ہیں۔ مومنہ کی وجہ سے پہلے ہی ہماری اچھی خاصی جگ ہنسائی ہوچکی ہے۔'' وہ غصے سے بولیں۔

''مومنہ کی وجہ سے جگ ہنسائی ہوئی ہے۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' اس نے طنز کیا۔

اس کی وجہ سے اتنی ذلت اٹھانے کے بعد بھی اسے گھر واپس بلا کر لوگوں کو نئے سرے سے باتیں کرنے کا موقع کیوں فراہم کیا ہے آپ نے اور پاپا نے؟ چھوڑ دیتے اسے اس کے حال پر۔ جس کے ساتھ بھاگ کر گئی تھی رہتی اسی کے ساتھ۔ ایک مہینے میں ہی طلاق لے کر کیوں واپس آگئی وہ؟'' وہ بمشکل تحمل مزاجی کا مظاہرہ کررہا تھا۔

''بیٹی ہے وہ میری۔ ایسے کیسے چھوڑ دیتی؟ اس نکھٹو اور خالی جیب والے کے ساتھ محبت کے دو بولوں کا نشہ بھلا کتنے دن رہتا؟ سسک سسک کر زندگی گزارنے سے بہتر طلاق کا فیصلہ تھا۔ جو کہ اس نے لیا۔ اب پھر سے وہ اپنی دنیا میں ہے۔ اس ایک غلطی سے اس نے یہ سبق تو سیکھ ہی لیا کہ اپنے سے کم حیثیت کے مرد سے محبت ہو بھی جائے تو بھی اس کی خاطر ان آسائشات کو چھوڑ کر جانا نری حماقت

ہے۔اور طلاق کے بعد وہ کس کے پاس رہتی؟ اتنا بڑا گھر کیا نوکروں کے لیے بنا کر رکھا ہے ہم نے؟ لوگوں کو بکواس کرنے کی عادت ہے۔ وہ تو کسی کو اچھا کھاتا دیکھ لیں تو بھی دس باتیں بناتے ہیں۔ ان کو کون اہمیت دیتا ہے؟'' وہ فون پر بھی ان کے غصے کی شدت کو محسوس کر رہا تھا۔ جوش خطابت میں وہ بھول ہی گئی تھیں کہ انہوں نے کیا کچھ کہہ دیا ہے۔

''تو جب آپ اپنی راج دلاری کے لیے دنیا کو جوتے کی نوک پر رکھ سکتی ہیں تو پاپا کو بھی پھپھو کے لیے ایسا قدم اٹھانے دیں۔ انہوں نے اپنی زندگی بہت سختیوں میں گزاری ہے۔ شادی کے سات سال بعد ہی مظہر انکل کا ایک کار حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔'' اس نے اپنی کنپٹی کو دباتے ہوئے کہا۔ آج کا دن اس کے لیے ذہنی اذیت سے بھرا تھا۔ یہ خبر سن کر کچھ لمحوں کے لیے دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

''پھپھو حیدر آباد کے ایک معمولی سے علاقے میں رہتی ہیں۔ دن رات محنت کرتی ہیں۔ ان کے گھر میں مرد ذات نہیں۔ کئی سالوں سے اکیلی ہیں۔ پریشانیوں کے بوجھ تلے دب دب کے ان کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ وہ آپ سے بھی دس سال بڑی لگتی ہیں۔ سارا دن کام کرتی ہیں وہ۔ ان کے ہاتھ کسی مزدور کے ہاتھوں کی طرح سخت ہیں۔'' دوسری طرف وہ اپنے بیٹے کی اس درجہ حساسیت سے سخت الجھن محسوس کر رہی تھیں۔

''یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ نہ کرتی اس مظہر سے شادی اور نہ ہی یہ حالات اس کی زندگی میں آتے۔'' انہوں نے نخوت سے کہا۔

''یہ حالات ان کی زندگی میں نہ آتے اگر پاپا انہیں اس وقت معاف کر دیتے۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''کیسے معاف کر دیتے؟ اس دور میں لوگ بھاگنے والیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ تمہارے پاپا نے تو صرف رشتہ ختم کیا تھا۔'' وہ بے رحمی سے بولیں۔

''آج کے دور میں بھی بہت سے لوگ یہی کرتے ہیں۔ آپ سے تو رشتہ بھی ختم نہ کیا گیا۔'' وہ دوبدو بولا۔

''عبدالباری! تم اپنی ہر حد پار کر رہے ہو۔ زبان سنبھال کر بات کرو۔ مومنہ ہماری بیٹی ہے۔ ابھی وہ تمہاری سرپرستی میں نہیں آئی کہ تمہارا جو جی چاہے گا تم اسے وہ سزا سنا دو گے۔ ہم ابھی زندہ ہیں، ہم جو مناسب محسوس کرتے ہیں ہم وہی کریں گے۔'' ان کی آواز بے حد بلند تھی۔

''سلیقہ پھپھو بھی اسی گھر کی بیٹی ہیں۔ وہ گھر جس میں آپ میں اور ہم سب رہتے ہیں۔ اور اس گھر کا آدھا حصہ ان کے نام ہے۔ آپ چاہے رشتہ رکھیں یا توڑیں۔ جائداد ان کی تھی، ان کی ہے اور ان کی رہے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے لائن منقطع کر دی۔

چاروں طرف گہری خاموشی تھی، صرف پنکھے کی گھوں گھوں کی آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔ یہاں اس کمرے میں اسے عجیب سا سکون ملا۔ اس نے آنکھیں موند لیں، اور کچھ ہی دیر میں سو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر جاگا۔ یہ ہڑبڑاہٹ بے وجہ نہیں تھی۔ ملتجیٰ نے اس زور سے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا کہ اس کی بھیانک آواز نے عبدالباری کو ڈرا دیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر سنجیدگی لیے۔

''اماں نے کھانا لگا دیا ہے۔ آ کر کھا لو۔'' اس نے پیغام دیا اور باہر جانے لگی۔

''ملتجیٰ پلیز میری بات سنو۔'' وہ ایک دم بیڈ سے اٹھا۔

''میں ملتجیٰ ہوں۔ آپ کی پھپھو سلیقہ نہیں جو خون کی کشش کے آگے خود کو بے بس محسوس کروں۔ مجھے آپ سے یا آپ کے خاندان سے نہ تو کوئی نسبت رکھنی ہے اور نہ ہی مجھے آپ لوگوں میں دلچسپی ہے، مجھے شیشے میں اتارنے کے لیے اپنی محنت ضائع نہ کریں۔'' وہ دوٹوک بات کر کے وہاں سے چلی گئی۔

وہ چپ چاپ اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ بڑے کمرے میں پھپھو دسترخوان سجائے اس کے انتظار میں تھیں، اسے اندر آتا دیکھ کر مسکرائیں۔ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''سو گئے تھے تم؟ اتنا لمبا سفر کر کے تھک گئے ہو گے نا؟''

''نہیں پھپھو میں بالکل نہیں تھکا۔ خاموشی اتنی تھی کہ نیند آ گئی۔'' اس نے جھینپ کر کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ ابھی تم کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد پھر سے آرام کر لینا۔'' انہوں نے اس کے آگے پلیٹ رکھی اور چاول ڈالنے لگیں، دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے موجود تھے۔ اور یہ سارا اہتمام انہوں نے اکیلے ہی کیا تھا۔ چہرہ تھکن سے کملایا ہوا تھا۔ وہ اداس دل کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ اس کے بعد وہ باہر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے لیے کڑک سی چائے لے آئیں۔

''ملتجیٰ نے کھانا نہیں کھایا؟'' ان کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''وہ تو کب کا کھانا کھا چکی۔'' عبدالباری کو حیرت ہوئی۔

''جتنے غصے میں وہ مجھے باتیں سنا کر گئی تھی مجھے تو لگا کہ وہ آپ کو بلیک میل کرنے کو کھانا ہی نہیں کھائے گی۔'' اس کی بات سن کر وہ ہنسیں۔

''اسے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' وہ مسکرائیں۔ ایسی مسکراہٹ جو تھکن سے پر تھی۔

''میری ملتجیٰ بھوک کی بہت کچی ہے۔ مجھے تو یہ خوف تھا کہ کہیں وہ رمضان کے روزے بھی نہیں رکھ پائے گی لیکن ماہ رمضان کے علاوہ میں نے اسے کبھی ایک وقت کا کھانا چھوڑتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔'' اس بار ان کے لہجے میں شرارت تھی۔

''آپ پھپھی بھتیجا میری غیبتوں کے علاوہ بھی بہت سی باتیں کر سکتے ہیں۔'' وہ کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی غصے سے بولی۔

''تم کیا چھاچھا کٹنی عورتوں کی طرح ہماری باتوں کو چھپ چھپ کر سن رہی تھیں؟ اس کی زبان کو بھی کھجلی ہوئی۔ اس کا چہرہ مزید پھول گیا۔ اس نے شدید غصے سے اسے دیکھا۔ اور برآمدے میں آ گئی۔ سر پر جوڑے کا ہم رنگ دوپٹا اوڑھے وہ کہیں جانے کی تیاری میں لگ رہی تھی۔

''اماں میں فوزیہ کے ساتھ صوبیہ کی طرف جا رہی ہوں۔'' اس نے عبدالباری کی شرارت نظر انداز کر دی۔

''اس وقت؟ شام ہو جائے گی کچھ دیر میں۔ تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔'' وہ پریشان ہوئیں۔

''اماں جانا ضروری ہے۔'' اس کی آنکھیں ہلکی سرخ ہو رہی تھیں۔

''جہاں بھی جانا ہے مجھے بتا دو میں لے جاتا ہوں تمہیں۔'' اس نے آفر کی۔

''جب تم نہیں تھے تب بھی میں باہر آتی جاتی تھی۔ اب تم ہو تو بھی میں اکیلی بس یا رکشے میں سفر کر سکتی ہوں۔ تم ان سے ملنے آئے ہو۔ ان ہی کے ساتھ وقت گزارو اور واپسی کی راہ لو۔ دوبارہ میرے منہ لگنے کی کوشش مت کرنا۔'' آج تک کبھی کسی لڑکی نے اس سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اسے شدید برا لگا، بے عزتی بھی محسوس ہوئی لیکن خاموش رہا۔ سلیقہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

''عبدالباری تم اس کی باتوں کا برا مت منانا۔ اس کی طرف سے میں معذرت کرتی ہوں۔'' ان کی بات پر وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

''وہ جو کچھ کر رہی ہے، ایسا رویہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس لیے میں نہ تو برا منا رہا ہوں اور نہ ہی آپ کو شرمندہ ہونے یا معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔ کچھ وقت لگے گا سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن جتنا بھی وقت لگے میں آپ دونوں کے بغیر یہاں سے جانے والا نہیں۔'' وہ بھلا کیا کہتیں اسے، محض دیکھ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

ملتجیٰ کے لیے عبدالباری کا آنا اور گھر میں یوں بے تکلفانہ گھومنا ناقابل قبول تھا۔ صوبیہ کے پاس جانا تو

محض بہانہ تھا، وہ فوزیہ سے مل کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا چاہتی تھی۔ ایک تو امتحانات سر پر تھے۔ بائیو کیمسٹری کی بہت ہی کم تیاری کر رکھی تھی اس نے۔ اس پر اچانک سے کزن کا برآمد ہو جانا کافی پریشان کن تھا۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ کہیں اماں واپس جانے کے لیے راضی نہ ہو جائیں۔ ایسا تو وہ کسی صورت نہیں ہونے دے سکتی تھی۔ اب بھی وہ اس کے بھائی کے ہاتھ سامان بھجوا کر خود اس کے گھر، اس کے کمرے میں سر پکڑ کر بیٹھی تھی۔ فوزیہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس الٹے دماغ کی لڑکی کو کیسے سمجھائے۔ ملتجیٰ جب سے آئی تھی تب سے بولے ہی چلی جا رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے اس وقت میں ساڑھے پانچ سال کی تھی جب ابو امی کی ضد پر مجھے اور امی کو لے کر ان کے گھر گئے تھے۔ ایک بار پھر معافی مانگنے۔ امی کو اپنا میکا بہت یاد آتا تھا۔ میکے میں تھا ہی کون جس کے لیے بھاگی بھاگی جاتی تھیں وہ۔ ایک بھائی؟ جو کہ حد درجہ خود غرض ہیں۔ انہوں نے پتا ہے کیا کیا؟ ابا کو چوکیدار اور گارڈز سے دھکے دے کر باہر نکالا۔ اور امی سے کہا کہ اگر وہ یہاں واپس آنا چاہتی ہیں تو ابو سے طلاق لے لیں اور مجھے ابو کے حوالے کر دیں۔ تب وہ امی کو معاف کر کے پھر سے اپنا بنا لیں گے۔

لوگوں کو لگتا ہے کہ بچے سب بھول جاتے ہیں۔ بچے ناسمجھ ہوتے ہیں، ان کے سامنے کچھ بھی کرو، کچھ بھی کہو انہیں کیا علم کسی بات کا؟ یہ ان کی سب بڑی غلطی ہوتی ہے۔ غیر معمولی واقعات تو ذہن کی سلیٹ پر بڑی پکی روشنائی سے لکھے ہوتے ہیں جو ہمیں بڑھاپے تک یاد رہتے ہیں۔ یہ واقعہ میرے دماغ سے چپک گیا ہے۔ مجھے امی کی وہ امید بھری نظریں کبھی نہیں بھولتیں جن سے انہوں نے اپنی چڑیل بھابھی کو دیکھا تھا۔" اس کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔

"ملتجیٰ ملتجیٰ ۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ایسی تو نہیں تھیں؟" فوزیہ بے چاری حیران ہی ہو گئی تھی اس نے پہلی بار اس کا یہ روپ دیکھا تھا۔ وہ ہنس پڑی۔

"ایک اور بات بتاؤں؟ جب امی روتے ہوئے ابو کی طرف دوڑ کر گئیں نا۔ تب انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں وہاں پیچھے رہ گئی ہوں اور تب پتا ہے کیا ہوا تھا؟" فوزیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"تب اس نیک فرشتے عبدالباری کی ماں نے مجھے زور سے دھکا دیا تھا اور میں سیڑھیوں سے نیچے گری تھی۔ میرے سر پر چوٹ لگی۔ اس ذلت بھرے دن کے گزرنے کے چند دن بعد ہی میرا اور ابا کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ اور میں ان کی شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ لیکن میں زندہ رہ گئی لیکن عبرت کا نشان بن کر۔" اس نے شدید ضبط سے کہا۔ فوزیہ نے بے اختیار ہی اسے گلے لگایا۔

"یہ ساری باتیں ماضی کی ہیں۔ تمہیں ماضی نہیں مستقبل کو سوچنا ہے، کیا کرو گی آگے؟ کب تک آنٹی محنت کرتی رہیں گی؟ وہ لڑکا تو تمہیں یاد ہی ہوگا جسے مددگار کے طور پر رکھا تھا۔ ایسے ٹھرکی اور بے ہودہ لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔" وہ سمجھانے کو بولی۔

"میں جلد ہی اپنا اسٹور کھولوں گی۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"یہ نری بے وقوفی ہوگی، اس علاقے میں اتنا مہنگا سامان کوئی خریدے گا ہی نہیں۔ اگر تم یہاں کے کسی اچھے علاقے میں بھی کرائے پر ہی کہیں جگہ لے لو تو اسٹور سیٹ کرنے میں ہی لاکھوں لگ جائیں گے۔ کہاں سے لاؤ گی اتنا سرمایہ؟ کیا سب کچھ بیچ باچ کر ایسی جگہ پیسا برباد کرو گی جس کا تمہیں کوئی تجربہ نہیں؟ اور کیا تم اکیلی اتنا کام کر سکتی ہو؟ تمہاری نظر کمزور ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر نے تمہیں زیادہ کام سے، اسٹریس لینے سے منع کیا ہے۔ ان سب چیزوں کو کیسے ہینڈل کرو گی؟ اپنے جیسے کاریگر کہاں سے ڈھونڈو گی؟" اس کی ساری باتیں بالکل درست تھیں لیکن دماغ پھر بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

"چاہے مجھے سڑک پر ہی آنا پڑے۔ میں ان گھٹیا لوگوں کے گھر کسی صورت نہیں جاؤں گی۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا اور ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہاں بیٹھو میری بات سنو۔ انہوں نے تمہیں دھتکارا تھا۔ اب اگر تم انہیں دھتکار رہی ہو تو نقصان کس کا ہوگا؟ پہلے بھی تمہارا نقصان ہوا اور اب بھی تم اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہو۔" ملتجیٰ نے اسے ناسمجھی سے دیکھا۔

"میری بات غور سے سنو۔ دیکھو۔ تمہارے ماموں بے حد امیر ہیں اور یہ دولت صرف ان کی کمائی ہوئی نہیں ہے۔ تمہارے نانا نے بھی اپنے وقت میں بہت کمایا ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟" اس کے سوال پر ملتجیٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو جو نانا نے کمایا تھا، اور جو جائداد انہوں نے بنائی تھی۔ اس میں سے تمہاری امی کو کیا ملا؟" ملتجیٰ نے جواب میں اسے انگوٹھا دکھایا۔

"ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی، بلکہ امی کی شادی کے لیے جو زیور بنوائے گئے تھے وہ سب بھی امی وہیں چھوڑ آئی تھیں۔" اس نے غصے سے کہا۔

"ہاں تو بس تم جاؤ۔ وہاں رہو اور اپنے حصے کی جائداد ان سے واپس لے کر اپنا مستقبل محفوظ کر لو۔ تمہیں اتنا تو مل ہی جائے گا کہ تم اور آنٹی بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ہی ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔" فوزیہ کا دماغ اتنا تیز چلتا ہوگا یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"مائنڈ بلوئنگ آئیڈیا یار۔ لیکن اگر میں جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئی تو اس نمونے کو مجھ پر شک ہو جائے گا۔ اس لیے مجھے کچھ دن تو اس کی بینڈ بجانی ہی پڑے گی اس کے بعد جب وہ دوبارہ مجھ سے اپنے بڑوں کے کارناموں کی معافی مانگے گا تب میں اس کے سامنے اپنا مدعا رکھوں گی اور اس کے یقین دلانے پر ہی اس کے ساتھ جاؤں گی۔ کیسا؟" وہ ایک دم خوش ہو گئی تھی۔ فوزیہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔

"چلو اسی خوشی میں، میں تمہیں آئسکریم کھلانے لے چلتی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ فوزیہ نے اسے غور سے دیکھا۔ کچھ دیر پہلے کا غصہ بالکل ہی غائب ہو چکا تھا، اب وہ یوں پرسکون تھی جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو۔

"میں جانے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سڑے ہوئے حلیے میں ہم بالکل نہیں جائیں گے۔ تیار ہو کر چلتے ہیں۔ کل ابا اپنے لیے نیا فون لے کر آئے ہیں۔ وہ ساتھ لے چلوں گی اور پھر ہم دونوں بھی پاؤٹس بنا بنا کر سر جوڑے تصویریں بنائیں گے۔ کیسا؟" وہ کچھ زیادہ ہی پرجوش ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ پھر چلو تیار ہو جاؤ۔" ملتجیٰ نے فوراً ہامی بھر لی۔

☆☆☆

مغرب سے کچھ پہلے ہی وہ گھر واپس آئی تھی، اماں کو کام میں مصروف دیکھ کر اس نے ان کے ہاتھوں سے چھری لی۔

"نہیں۔ میں کر لوں گی تم جاؤ جا کر امتحانات کی تیاری کرو۔" انہوں نے اس کے ہاتھ سے چھری واپس لے لی۔

"امی یہ چھوٹے موٹے کام تو کرنے دیا کریں مجھے۔" اس نے ناراضی سے کہا تھا۔

"جب میں یہ چھوٹے چھوٹے کام خود کر سکتی ہوں تو تمہیں کیوں پریشان کروں میں؟"

"میں نہیں ہوتی پریشان۔"

"میں بھی پریشان نہیں ہونا چاہتی۔" انہوں نے اس کا گال چھو کر کہا۔ وہ گہری سانس بھرتی کچن سے باہر نکل آئی۔ اس کی نظروں نے یہاں وہاں عبدالباری کو ڈھونڈا لیکن وہ دکھائی نہیں دیا۔

"یہ آپ کا بھتیجا واپس چلا گیا کیا؟" یہاں وہاں دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ اندر کمرے میں ہے۔ اسے حرارت ہو رہی تھی تو میں نے دوا دے کر اندر لٹا دیا۔" انہوں نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

"کتنا نازک بھتیجا ہے آپ کا۔ حد ہوگئی۔" وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کمرے میں پہنچی اور سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا خون کھول کر رہ گیا۔ وہ

اس کے کمرے میں، اس کے بستر پر دراز کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ منتہیٰ کو یوں سر پر کھڑا دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا۔

"میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ اس کی آنکھیں ہلکی سرخ ہو رہی تھیں۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں گھسنے کی؟" اسے سچ مچ شدید غصہ آ گیا تھا۔ یہ اس کا ذاتی کمرہ تھا، بیڈ روم تھا، اس کمرے میں اس کی ہر ضرورت کی چیز موجود تھی۔ اس نے اماں کو سختی سے منع کیا تھا کہ کوئی بھی کتنا ہی اہم مہمان کیوں نہ ہو اسے اس کے کمرے سے دور ہی رکھا جائے۔

وہ کسی ہائی کلاس سے تو تعلق رکھتی نہیں تھی کہ ان باریکیوں پر غور کیا جاتا۔ اس کے ددھیال میں بھی یہی سسٹم تھا جو گھر کا سب سے اچھا کمرہ ہوتا چاہے وہ بیڈ روم ہی کیوں نہ ہو، مہمان وہیں بیٹھتے۔ اماں نے بھی یہی سب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس قدر بگڑی کہ انہیں اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ لیکن آج اسے یہاں دیکھ کر اس کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔

"میں نہیں گھسا، مجھے پھپھو نے کہا تھا کہ میں یہاں آرام کر لوں۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ "اور بالفرض اگر میں خود بھی اس کمرے میں آیا ہوتا تو بطور میزبان آپ کو یہ بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا کہ اس لہجے اور اس انداز میں کسی مہمان سے بات کی جائے۔" اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کی لیکن عبدالباری نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"اب آپ یہ مت فرمایئے گا کہ میں بن بلایا مہمان ہوں۔ میرے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ ہوتا تو یقیناً اطلاع دے کر آتا۔ اور میں یہاں اس لیے موجود ہوں کہ مجھے پھپھو نے روکا ہے، اور وہ اس گھر کی بڑی ہیں، یہ گھر بھی ان کا ہے، اگر آپ کا ہوتا تو میں یہاں ایک سیکنڈ بھی نہ رکتا۔ میں یہیں اس گھر میں رہوں گا، اس وقت تک جب تک کہ پھپھو میرے ساتھ چلنے کو راضی نہیں ہو جاتیں۔ آپ کو میری موجودگی سے تکلیف ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔" اتنا کہہ کر اس نے پلٹ کر بستر پر رکھا فون اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈز بعد ہی سلیقہ اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم اتنی بدتہذیب ہو گئی ہو کہ گھر آئے مہمان کی عزت نفس مجروح کرنے سے بھی نہیں چوکتی؟" وہ دکھ سے بولیں۔

"ایسا کیا گناہ کر دیا تھا میرے بھائی یا بھتیجے نے جو تم نے اتنی نفرت پالی ہے؟ یہ مت بھولو کہ تم ایک ایسی عورت کی بیٹی ہو جو گھر سے بھاگی تھی۔"

"بس کر دیں اماں۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ یہ سب کریں۔ اور اگر آپ یہ سب کر چکی ہیں تو مجھے سر جھکا کر چلنے کا مت کہیے گا کیونکہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اور آپ نے بھی اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت لیا ہے۔ اب خدا کا واسطہ دوبارہ اس بات کو میرے سامنے نہ دہرایئے گا۔" وہ چلا کر بولی۔

"میں روزانہ ایک ہی بات نہیں سن سکتی۔ تم گھر سے بھاگی ہوئی عورت کی بیٹی ہو۔ یہ طعنے دنیا دیتی ہے۔ خود مائیں نہیں دیا کرتیں۔ اور آپ۔۔۔ آپ نے تو بچپن سے ہی مجھے اسی ایک بات کو کلمے کی طرح یاد کروایا ہے۔ اگر اتنا ہی غم تھا آپ کو تو واپس چلی جاتیں۔ لے لیتیں طلاق ابا سے اور کر دیتیں مجھے ان کے حوالے۔ کم از کم مجھے روز یہ طعنہ تو نہ ملتا۔ وہ چیزیں پٹخنے لگی۔ سلیقہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ایک دم کمرے سے باہر نکلیں تو سامنے عبدالباری موجود تھا۔

"پھپھو چلیں میرے ساتھ۔" اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ سلیقہ نے نہایت آہستگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور چلی گئیں۔ سامنے بیڈ پر منتہیٰ شدید غصے میں بیٹھی تھی۔ وہ گہرے سانس لے رہی تھی اور اپنی کنپٹیوں کو دبا رہی تھی۔ ایک بات کا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نا صرف غصے کی بہت تیز تھی بلکہ غصہ قابو کرنے میں بھی اناڑی تھی۔ چند

سیکنڈز بعد ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے تسلی دے لیکن وہ وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

رات ہوتے ہی جب وہ بڑے کمرے میں آیا، کمرے میں اس کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ فرش پر بڑا بھاری سا گدا بچھا تھا جس پر ایک خوبصورت رنگوں والی چادر تھی۔ وہ کپڑے بدل چکا تھا اس لیے گدے پر آ کر لیٹ گیا۔ شانزے کے صبح سے کئی میسجز آ چکے تھے، شام کو بھی وہ اسی سے بات کر رہا تھا لیکن منتہیٰ کی بچی نے آ کر ڈسٹرب کر دیا۔ وہ اب بھی اپنے دماغ کو بوجھ سے آزاد نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ ان سب سے اتنی نفرت کرتی ہو گی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اس کا بدتمیزانہ لہجہ، ملکیت کا حق جتاتا انداز انتہائی ناگوار گزر رہا تھا لیکن وہ یہ سب برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ اسے اس عورت کو اپنے گھر میں واپس لانا تھا جس نے اس کا بچپن محبتوں سے بھر دیا تھا، انہوں نے اپنے اس بھتیجے سے بے تحاشا محبت کی تھی، یہ نام بھی انہوں نے ہی رکھا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد کافی عرصے تک اس کی ممی ملکہ بیگم بیمار رہی تھیں۔ اس تمام عرصے میں اور پھر اس کے بعد بھی وہ انہی کی شفقت اور محبت میں رہا۔ مومنہ بچپن سے ہی حد سے زیادہ نخریلی تھی جبکہ عبدالباری بڑا ہی پرسکون بچہ تھا، اس لیے ان کی تمام توجہ اسی پر فکس ہو گئی۔

اسے آج بھی وہ دن یاد تھا جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس گھر میں آئی تھیں اور انہیں ذلیل کر کے نکال دیا تھا۔ جاتے ہوئے انہوں نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی کہ جب وہ بڑا ہو جائے تو انہیں ملنے ضرور آئے وہ اس کا انتظار کریں گی۔ اگلی کئی راتیں وہ اپنے اردگرد اس پکار کو گونجتا محسوس کرتا رہا۔ وہ اسے بہت یاد آتی تھیں۔ وہ رات کو اٹھ کر رونے لگتا۔ انہیں یاد کرتا، اور تب اس کی ممی سلیقہ کو کوستے ہوئے اسے ڈانٹتیں۔

بچپن کے وہ تمام مناظر اس کی پلکوں کو بھگونے لگے۔ وہ آنکھیں بند کیے اندھیرے میں لیٹا تھا۔ اسے آہٹ محسوس ہوئی۔ اور پھر کوئی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"عبدالباری سو گئے ہو؟" ان کی نرم شفقت سے لبریز آواز اس کے کانوں میں اتری۔

"نہیں۔ جاگ رہا ہوں۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی

"سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ اس نے ان کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے لگا کہ وہ بہت گہری نیند سو جائے گا۔ پلکیں بے حد بھاری ہو گئی تھیں لیکن اسی وقت کمرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ وہ آنکھیں نہ کھولتا اگر اسے سلیقہ پھپھو کی حیران آواز سنائی نہ دیتی۔

"منتہیٰ تم یہاں؟ کیا بات ہے؟" ان کے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں زبردستی کھولی تھیں مگر اسے دیکھتے ہی نیند جیسے فضا میں تحلیل ہو گئی۔ سرخ رنگ کی چھوٹی سی قمیص اور سفید پٹیالہ شلوار پہنے بال کھولے وہ شدید غصے میں سلیقہ کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس وقت کتنی حسین لگ رہی تھی۔ عبدالباری اسے پلک جھپکائے بنا دیکھے گیا لیکن فون بھی ہاتھ میں لے لیا۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی لیکن اس وقت اس کے بال دونوں جانب یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے وہ کوئی بھٹکتی ہوئی بدروح ہو۔ اس لمحے کو کیمرے میں قید نہ کرنا زیادتی تھی، تصویر کھینچنے کا کسی کو بھی علم نہیں ہوا۔

"یہ جو آپ کے لاڈلے بھتیجے ہیں نا۔ ان کا آج یہاں آخری دن نہیں ہے۔ یہ سارے لاڈ پھر کسی اور وقت کے لیے بچا کر رکھیے۔ وہ غصے سے بولی۔ اور ایک دم ان کے پاس آئی۔ عبدالباری نے ابھی بھی ان کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس نے ایک دم ہی اس کے ہاتھ سے ان کا ہاتھ الگ کیا۔

"میرے خیال سے کراچی میں آپ کی ایک عدد ذاتی والدہ موجود ہیں۔ ان سے جا کر لاڈ

اٹھوایئے گا۔ یہ میری امی ہیں۔ اور مجھے ان کی محبت شیئر کرنے کی بالکل بھی عادت نہیں ہے۔" وہ اس کے قریب بیٹھی غصے سے پھنکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ بنا کچھ بولے یک ٹک اسی کو دیکھ رہا تھا۔ سلیقہ سمجھیں کہ وہ اس کی باتوں کا برا منا گیا ہے۔

"ارے ہاتھ چھوڑو میرا۔ تم کیا جانو پھپھی بھتیجے کے لاڈ کو۔ تمہاری پھپھو تو ایک نمبر کی چنڈالنی تھیں۔ کبھی تمہیں پیار سے گود میں نہیں اٹھایا۔ سارا وقت دیوار سے لگی منگیتر سے باتیں کرتی رہتی تھی۔" انہیں اس کی حرکت پر شدید غصہ آیا تھا۔

"خدا کا خوف کریں اماں۔ وہ میری سگی پھپھو نہیں تھیں۔ ابا کی کزن تھیں۔" اسے شدید ذلت کا احساس ہوا۔

"ہاں تو میں اس کی سگی پھپھو ہوں۔ یہ پہلا بچہ ہے جس سے میں نے پہلی بار محبت کی تھی۔ شدید محبت۔" اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بے حد لاڈ سے کہا۔ جلن کے مارے اس کا چہرہ کالا ہو گیا تھا۔ عبدالباری کا دل چاہا کہ وہ قہقہہ لگا کر ہنسے، اچھی خاصی جذباتی صورت حال مضحکہ خیز بن گئی تھی۔

"ہاں تو آج کے بعد بھی اسی بچے پر پیار لٹایئے گا، مجھ سے دوبارہ بات بھی مت کیجیے گا۔ وہ روتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔

"لائٹ آف کر کے جانا۔" اس نے پیچھے سے آواز دی۔ جواب میں اس نے زور سے دروازہ مارا

"مجھے آج سے پہلے اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ اتنی جیلس ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ عبدالباری نے پھر سے ان کا ہاتھ پکڑا اور سینے پر رکھ دیا۔ ایک بے حد پرسکون نیند اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

شانزے کے اندر باہر بے چینی پھیلی تھی۔ اسے کچھ دیر پہلے ہی عبدالباری کی طرف سے کچھ پیغامات موصول ہوئے تھے۔ جن میں اس کی پھپھو اور ان کی بیٹی کی تصاویر تھیں۔ ملیحہ کی تصویر نے اس کے دل کو عجیب ہی حال میں پہنچا دیا تھا۔ ایک عجیب سا خوف اس کے ارد گرد بھوت بن کر منڈلانے لگا۔ وہ خود بھی کوئی کم حسین نہیں تھی لیکن وہ عبدالباری کی فطرت سے بھی واقف تھی۔

اگر یہ لڑکی اس مزاج کی ہوئی جیسی عبدالباری کو پسند ہیں تو پھر وہ مجھ سے کسی صورت شادی نہیں کرے گا۔ کیا میں اس کے بغیر رہ سکتی ہوں؟ وہ سوچنے پر مجبور ہوئی، جواب اسے معلوم تھا لیکن پھر بھی دل کی تسلی کو اس نے ایک بار پھر خود کو ٹٹولا۔ وہ بے چینی جو ملیحہ کی محض تصویر دیکھ کر ہی اس کے وجود میں پھیلنے لگی تھی وہ جلن ہرگز نہیں تھی۔ عبدالباری کے دور چلے جانے کا خوف تھا۔ اور یہ خوف اسے کیوں لاحق ہوا تھا؟ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس خیال کے آنے کا محرک جو بھی تھا مگر وہ تو بے سکون ہو چکی تھی۔ وہ اسے واپس آنے کا کہہ چکی تھی لیکن اس کا وہی جواب تھا کہ وہ ان دونوں کے بغیر کراچی نہیں لوٹے گا۔

شانزے صرف اس کی خالہ کی بیٹی نہیں تھی بلکہ اس کے بچپن کی ساتھی بھی تھی۔ دونوں نے ساتھ ہی اسکول پڑھا، ایک ہی کالج اور یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی اور اب وہ اپنے پاپا کا آفس چھوڑ کر اس کے پاپا کے آفس میں اس کے ساتھ ہی کام کر رہی تھی۔ اس نے اب تک عبدالباری سے اظہار محبت نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا نہیں۔ اور جب تک اس کے دل میں شانزے کی محبت نہیں پیدا ہو جاتی تب تک اس سے اظہار کرنا بالکل ہی بے سود تھا۔ لیکن وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کی خالہ ملکہ ہی عبدالباری تک رسائی کا واحد حل تھیں۔ وہ اس کے جذبات سے واقف تھیں لیکن وہ کوئی روایتی خالہ ہرگز نہیں تھیں کہ وہ اس کی شادی زبردستی شانزے سے کر دیتیں۔ اس کی امی نے ان سے شانزے کی پسندیدگی بیان کی تھی اور یہ خواہش بھی کہ وہ عبدالباری کو اپنا داماد بنانا چاہتی ہیں۔ جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر عبدالباری

کی مرضی ہوئی تو ہی وہ اس معاملے کو آگے بڑھائیں گی لیکن فی الحال وہ شادی کرنا نہیں چاہتا۔ ان کے اس جواب نے بھی اسے پریشان نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر عبدالباری مان جائے تو پھر مسئلے کی کوئی بات ہی نہ رہے۔ اسے کبھی کوئی خطرہ محسوس ہی نہیں ہوا تھا کیونکہ اس نے شانزے کے علاوہ آج تک کسی اور سے گہری دوستی نہیں رکھی تھی۔ دوست اس کے بہت سے تھے۔ اچھا خاصا سرکل تھا لیکن وہ کبھی کسی کے بھی قریب نہیں ہوا۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ اس کے دل میں خوف کی گھنٹی بجی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اور کچھ نہیں سوجھا تو ملکہ کے گھر ان سے ملنے آ گئی۔ اسے دیکھ کر انہوں نے بہت محبت سے اسے گلے لگایا۔ وہیں لاؤنج میں مومنہ بھی موجود تھی لیکن اسے دیکھ کر وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ شانزے کو سخت برا محسوس ہوا۔ ملکہ نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ لیے تھے۔

"تم جانتی تو ہو کہ مومنہ اتنے بڑے دل کی نہیں کہ وہ اس بات کو بھلا سکے۔" انہوں نے اس کی طرف داری کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن اس معاملے میں میرا کیا قصور ہے؟ کیا اس کا شادی چھوڑ کر بھاگنا کسی بھی لحاظ سے درست تھا؟ اور وہ جانے سے پہلے ساری تفصیل بھی مجھے بتا کر گئی۔ کیا میں آپ لوگوں کی عزت کا سوچے بغیر اس سے دوستی نبھاتی؟" اسے غصہ ہی آ گیا تھا۔

"لیکن پھر بھی ہم لیٹ ہو گئے۔ انہیں آج بھی بہت افسوس تھا۔"

آنٹی ہم لوگ جتنے بھی ماڈرن ہو جائیں لیکن ان معاملات میں ہمیشہ ویسے ہی رہیں گے جیسے ہمارے بڑے تھے۔ میں خاموش بھی رہ لیتی لیکن اس وقت مہمانوں سے بھی زیادہ اہم مومنہ کی سیفٹی تھی، مجھے اس کی پسند کبھی اس لائق نہیں لگی کہ اس سے بات کی جائے کجا کہ اس کے لیے گھر والوں کو چھوڑ کر جانا۔ ایسے میں، میں کیسے چپ رہتی؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی صفائی دے رہی تھی، اسے مومنہ کے رویے سے بہت دکھ ہوتا تھا۔ وہ یہاں اپنا دل ہلکا کرنے آئی تھی لیکن وہ مزید بوجھل ہو گیا۔ وہ کچھ ہی دیر وہاں بیٹھی پھر کسی دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے چلی گئی۔

ملکہ کو مومنہ پر شدید غصہ چڑھا تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ اس کے کمرے میں آئیں جہاں وہ ٹی وی دیکھنے میں محو تھی۔ ان کی آمد کا بھی اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی تھی؟ ایک مہینہ جاہلوں میں گزار کر ساری زندگی کی تربیت کو بھلا بیٹھی ہو؟" انہیں اس کے انداز پر شدید غصہ آرہا تھا۔ انہوں نے تو سوچا تھا کہ وہ غصہ قابو کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کریں گی لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ دوسروں کے سامنے اس کے رویے اور حرکتوں کی وضاحتیں پیش کرتے کرتے وہ تھک چکی تھیں۔ ان کی بات سن کر اس نے ریموٹ نیچے پٹخا۔

"وہ جاہل نہیں تھے۔ یہ آپ کی عزیز از جان بھانجی جاہل ہے جس نے نمبر بڑھانے کے چکر میں یہ سب کیا۔" اس نے نفرت سے کہا

"اسے اس کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہے۔ وہ ایک سمجھدار اور ذمہ دار لڑکی ہے۔ تمہاری طرح شادی کے دن گھر چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں۔" اس کی اکڑ نے انہیں مزید تاؤ دلایا تھا۔ ان کے طعنے نے مومنہ کے بدن کو آگ ہی لگا دی۔

"میری مرضی کے خلاف شادی کروائیں گی تو ایک نہیں دس بار گھر چھوڑ کر بھاگوں گی۔ کیا کریں گے آپ لوگ؟" اس کی آنکھوں میں ایسی بغاوت تھی کہ ملکہ حیران رہ گئیں۔

"تمہاری مرضی کے خلاف شادی کروا رہے تھے ہم؟" انہیں اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے اس کا بازو دبوچ لیا۔ ان کی اس حرکت پر مومنہ نے تحیر سے انہیں دیکھا۔

"پورا ایک سال احمر کے ساتھ گھومتی رہی ہو تم۔ تمہاری مرضی معلوم کرنے کے بعد ہی اس نے

رشتہ بھیجا تھا اور تم سے تمہاری رضا پوچھنے کے بعد ہی ہم نے ہاں کی تھی۔ تم شادی سے محض دو ماہ پہلے کسی گھٹیا اور مفلس شاعر کے عشق میں مبتلا ہو جاؤ اور جب ہم شادی کی ساری تیاریاں کرلیں، کارڈز بھی بانٹ دیں تب تم حقیقت سے پردہ اٹھاؤ اور کہو کہ احمر تمہیں پسند نہیں۔ تو ہم تمہیں اس کے ساتھ آسانی سے جانے دے دیں؟'' وہ چیخ کر بولیں ساتھ ہی اس کا بازو جھنجوڑا۔ ان کی آنکھیں غصے کی شدت سے سرخ ہوگئی تھیں۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ تمہارے باپ نے تمہیں آسانی سے معاف کردیا؟ مجھ سے پوچھو، میں نے کتنی منتیں کیں، ہاتھ جوڑے واسطے دیے تب ان کے دل میں رحم آیا تمہارے لیے۔ اگر میں ہر ایک کے سامنے تمہاری طرف داری کرتی ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے تمہارا گناہ معاف کردیا۔

ایک سلیقہ تھی جس نے مظفر سے سچی محبت کی تھی۔ اس کے لیے گھر چھوڑا بھی تو بھی ہم سے شرمندہ رہی۔ اس دروازے پر نجانے کتنی بار سر جھکا کر آئی۔ تم نہیں جانتیں یہ بات۔ ہم نے جب اس کا رشتہ طے کیا تب اس نے صاف لفظوں میں انکار کردیا۔ لیکن تمہارے ابو نہیں مانے۔ میں نے اسے خود اپنی ان آنکھوں سے ساری ساری رات بے چینی سے چکر کاٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ رات بھر سو نہیں پاتی تھی۔ مصلے پر بیٹھ کر اس سے شادی کے لیے دعائیں مانگتی تھی۔ دن میں دس بار وہ ان کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتی تھی کہ شاید وہ اپنا فیصلہ بدل لیں، لیکن ان کا دل پتھر ہی رہا۔ میرا دل بھی اس کی طرف سے سخت ہوگیا تھا۔ جو آج تک سخت ہی تھا لیکن تمہارا بہت شکریہ جس نے میری آنکھیں کھول دیں، شادی کے چند سال بعد ہی مظفر کا انتقال ہوگیا۔ دوبارہ اس نے پلٹ کر کسی جانب نہیں دیکھا۔ اس نے اپنی زندگی کیسے گزاری ہے جانتی ہو؟'' ملکہ نے موبائل نکال کر عبدالباری کی بھیجی ہوئی تصاویر اسے دکھائیں۔ جہاں وہ جانوروں کو کہیں چارہ ڈال رہی تھیں تو کہیں دودھ دھو رہی تھیں۔ کہیں طویلے کی صفائی کرنے کے مناظر تھے۔ مومنہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''اس نے ایک غلطی کی اور آج تک وہ اس غلطی کو اپنے سینے پر بھاری پتھر کی طرح محسوس کرتی ہے۔ اور ایک تم ہو بے دید، بے لحاظ اور بے حیا۔ جسے یہ لگتا ہے کہ گھر سے بھاگ کر اور مہینے بعد طلاق لے کر کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا ہے۔ اس لیے اب تمہارا جو جی چاہے گا جیسے جی چاہے گا رہو گی۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر آج کے بعد تم نے اپنے رویئے میں تبدیلی نہ دکھائی تو جس طرح پہلے تمہارے باپ نے تمہیں جائداد سے عاق کردیا تھا ٹھیک ویسے ہی وہ دوبارہ یہ حرکت کریں گے۔ اور اب کی بار ایسا ہوا تو ان کا فیصلہ کسی صورت تبدیل نہیں ہوگا۔ یہ بات اپنے دماغ میں بٹھا لو تم۔''

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں جبکہ وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ اپنی ماں کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی بولتی بالکل ہی بند ہوگئی تھی۔

ان کی ساری باتیں سچائی پر مبنی تھیں۔ اس شاعر کی باتوں کے سحر میں وہ اس طرح خود کو جکڑا ہوا محسوس کرنے لگی تھی کہ اس نے بنا کچھ سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ اس کے گھر والے زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے؟ کورٹ میں لے جائیں گے۔ اور پھر کچھ ہی ماہ میں بات ختم ہو کر سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا، لیکن اس کی سوچ کے مطابق کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ گھر چھوڑتے وقت ایک پھوٹی کوڑی بھی ساتھ نہیں لے کر گئی تھی، شادی کے تیسرے دن ہی اسے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی کیونکہ اس کا شوہر بہت قلیل تنخواہ پر ملازم تھا اور گھر بھی کرائے کا تھا۔ نکاح اور دو دن کے کھانے پینے میں ہی اس کی آدھی تنخواہ خرچ ہوگئی۔ مومنہ کی خاطر داری کرنا کوئی آسان کام تو تھا نہیں۔ وہ بے چارہ کیا کرتا، دوستوں سے ادھار تک نہیں ملا۔ مجبوراً اس نے

مومنہ کو ایک ہی ڈش پر گزارہ کرنے کا کہا، وہ بھی گھر کی بنی ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے حالات آئیں گے لیکن شادی کے تیسرے دن ہی سے یہ سب شروع ہو جائے گا یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اس کے ساتھ بینک گئی تاکہ کچھ پیسے نکلوا سکے لیکن وہاں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کا اکاؤنٹ فریز ہو چکا تھا۔

کچھ ہی دن وہ آسائشات کے بغیر رہ سکی۔ اس کے شوہر نے کوشش کی کہ وہ اس کے لیے مزید مشکلات پیدا نہ کرے اس لیے جس طرح وہ شادی سے پہلے اپنے سارے کام خود کرتا تھا اب بھی اس نے یہ ذمہ داری اپنے ہی سر لی۔ بلکہ اس کے اکثر کام بھی وہ خود ہی سرانجام دے دیتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایڈجسٹ نہیں کرپائی۔ اور فقط ایک ماہ کے اندر ہی اس سے طلاق لے کر واپس آگئی۔ اور حیران کن بات یہ تھی کہ اسے اس سب پر ایک ذرا ملال نہیں تھا۔ ملال ہوتا بھی کیسے؟ اس کے اندر یہ حس تھی ہی نہیں۔

☆☆☆

صبح وہ ناشتا کیے بغیر ہی کالج چلی گئی۔ یہ اس کی ناراضی کا اعلان تھا، سلیقہ کو اس کی اس حرکت پر شدید غصہ آیا تھا اور اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد اس کے نمبر پر کال کر کے انہوں نے ملتجیٰ کو خوب کھری کھری سنائی تھیں۔ جواب میں وہ کچھ بھی بول نہیں پائی البتہ کینٹین کھلتے ہی اس نے ناشتا کیا تھا اور خود ہی فون کر کے اماں کو بتا بھی دیا تھا۔

فری پیریڈ میں وہ دونوں گراؤنڈ میں بیٹھی تھیں۔ ملتجیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ فوزیہ بڑے انہماک سے کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھینی۔

''پیپرز سر پر ہیں، نہ خود کچھ پڑھتی ہو نہ ہی مجھے کچھ پڑھنے دیتی ہو۔'' فوزیہ نے منہ بناتے ہوئے کتاب اس کے ہاتھ سے واپس جھپٹی۔

''بات تو سن لو۔'' وہ کچھ بے چین سی تھی۔

فوزیہ نے بے زاری سے کتاب بند کی اور اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے کل رات کے بعد سے یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے کچھ زیادہ ہی اوور ری ایکٹ کردیا ہے۔ اس عبدالباری کی تو ایسی کی تیسی لیکن۔۔۔ اماں کو میں نے بہت پریشان کردیا ہے۔'' وہ افسوس میں مبتلا ہوگئی۔

''شکر ہے تمہیں احساس تو ہوا۔ اب گھر جاؤ تو آنٹی سے معذرت کرلینا۔ انہوں نے کون سا تمہیں دو تھپڑ لگانے ہیں۔ الٹا نہال ہو جائیں گی کہ ان کی بچی کو احساس جرم ہوگیا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تو ملتجیٰ نے اسے مکا مارا۔

جب وہ گھر واپس آئی تو عبدالہادی کو کچن میں مصروف پایا۔ سارا کچن پھیلا رکھا تھا، اور وہ کوئی بدیسی ڈش بنانے میں مصروف تھا۔ اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر وہ کھسیا کر مسکرایا۔

''یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے تعجب سے پوچھا اور اندر داخل ہوگئی۔ کولر میں سے پانی نکال کر گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اس نے خوف زدہ انداز میں پورے کچن میں نظر دوڑائی۔ عبدالباری اس کے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' اس نے نا سمجھی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کل میری امی نے آپ کی خاطر داری میں ایسی کون سی کمی چھوڑ دی تھی کہ آپ کو خود یہاں آکر کھانا بنانا پڑا؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''مجھے ان کی طبیعت کچھ ناساز لگ رہی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ......'' اس نے عبدالباری کی بات کاٹ دی۔

''آپ اتنا مت سوچا کیجیے۔ میں ہوں ان کا خیال رکھنے کے لیے اور یہ سب کچھ سوچنے کے لیے۔'' اتنا کہہ کر وہ سلیب پر رکھی چھری اٹھانے کو آگے جھکی، اسی وقت عبدالباری بھی آگے کو ہوا۔ ملتجیٰ کا سر اس کے سینے سے ٹکرایا تھا جیسے ہی وہ پیچھے ہوئی۔ اس کی

شرٹ میں ملتجیٰ کی نوز رنگ کالاک اٹک گیا۔

''اُف۔'' اس کے منہ سے درد بھری آواز نکلی۔ نہ وہ دور ہٹ پا رہی تھی اور نہ ہی اس مصیبت سے نجات۔

''ایک منٹ ٹک کر کھڑی ہو جاؤ۔ میں نکالتا ہوں اسے۔'' اتنا کہہ کر اس نے آہستگی سے شرٹ کے دھاگے کو توڑا جس کے ساتھ وہ پھنس گئی تھی۔ دھاگا الگ ہوتے ہی ملتجیٰ اس سے دور ہوئی اور ایک دم ہی کچن سے باہر نکل گئی۔ اس کے کندھے سے بیگ لٹکا تھا، سفید دوپٹے میں چمکتا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ وہ سیدھی ماں کے پاس پہنچی۔

''امی کیا ہے یہ سب؟ اب وہ کچن میں کھڑا ہو کر کھانا بنائے گا؟'' وہ سلام دعا بھول کر غصے سے بیگ بستر پر پھینکتے ہوئے بولی۔ وہ بستر پر لیٹی تھیں۔ ان کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ پریشان ہو کر ان کے پاس آگئی۔

''کیا ہوا آپ کو؟'' ملتجیٰ نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، وہ بخار سے تپ رہی تھیں۔

''اتنا تیز بخار کیسے ہو گیا آپ کو؟'' بولتے ہوئے وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور سر دبانے لگی۔

''کل سے حرارت محسوس ہو رہی تھی مجھے۔ صبح اٹھی تو بخار تھا۔'' وہ نقاہت سے بولیں۔

''تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟ میں کالج سے چھٹی کر لیتی۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

تم نے صبح اٹھتے ساتھ ہی کسی سے بھی بات کیے بنا باہر کا راستہ پکڑ لیا تھا۔ ایسے میں کیا کہتی میں؟'' انہوں نے بھی غصے سے کہا۔

''جب آپ مجھے فون کر کے باتیں سنا کر ناشتا کروا سکتی تھیں تو اپنی طبیعت کا بھی بتا دیتیں۔ فوراً انھیں ڈاکٹر کے پاس چلیں۔'' اس نے ان کا بازو تھاما۔

''عبدالباری مجھے کچھ دیر پہلے ہی ہسپتال سے واپس لایا ہے۔ ڈاکٹر نے دواؤں کی پوری پوٹلی اٹھا کر دے دی ہے۔'' ان کا دل سخت بے زار تھا۔ اسی وقت وہ سوپ سے بھرا پیالہ لے کر اندر داخل ہوا۔ ملتجیٰ کی نگاہوں میں تھوڑی دیر پہلے کا منظر گھوم گیا، وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہ پائی۔ اور کپڑے بدلنے کا بہانہ بنا کر ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

نہا کر کپڑے تبدیل کر کے وہ بال سنوارنے کو آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نگاہیں آئینے پر تھیں لیکن دھیان کہیں دور بھٹک رہا تھا۔

''امی کی اتنی طبیعت خراب تھی پھر بھی انہوں نے مجھے نہیں بتایا۔ بتا کر کرتیں بھی کیا؟ میں بھلا ان کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟ اسی لیے تو وہ مجھے اپنا درد بھی نہیں بتاتیں۔ خدا نے ایک ہی بیٹی دی وہ بھی۔'' اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ ایک دم ہی سارے بال سمیٹ کر اس نے دوپٹا اٹھا کر جیسے ہی اوڑھنے کو سیدھا کیا، ایک بار پھر لاک کا ہک دوپٹے کی پِکو میں اٹک گیا۔ پورے دس منٹ لگا کر اس نے اس مسئلے سے جان چھڑائی۔ کھنچاؤ کے باعث ناک بالکل ہی سرخ ہو گئی تھی۔ ایک تو پہلے ہی طبیعت مضمحل تھی اس پر اس مصیبت نے دل کو کچھ اور بوجھل کر دیا۔ دل کو سکون صرف فوزیہ سے بات کرنے سے ہی مل سکتا تھا۔ اس نے اسے میسج کیا۔

''ان دنوں مجھے اپنا وجود پھر سے ناکارہ محسوس ہونے لگا ہے۔ امی مجھے صرف اس لیے اپنی تکلیف نہیں بتاتیں کہ میں ان کی مدد نہیں کر سکتی۔'' اس نے میسج لکھ کر سینڈ کا بٹن دبا دیا۔ چند سیکنڈز بعد ہی اس کا جوابی پیغام موجود تھا۔

''وہ تمہاری امی ہیں۔ تمہاری صحت کے حوالے سے ان کی پریشانی بالکل بجا ہے، تم لوگوں کو کوئی کام والی رکھ لینی چاہیے۔ ویسے بھی تم امتحانات کے بعد فری ہو گی۔ اپنی نگرانی میں سارے کام کروانا۔ آنٹی کا کافی بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

تم صرف دو ہی لوگ ہو۔ اتنی سی دیر کے لیے تو تم کچن میں کھانا بنانے جا سکتی ہو۔ پچھلے کئی ماہ سے تمہاری طبیعت بہتر ہے۔ تم اس بارے میں سوچ سکتی ہو۔''

ملتجیٰ واقعی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی کلائی سے آستین کھینچ کر اوپر چڑھائی اور جلنے کے اس نشان کو دیکھا جو آج بھی اچھا خاصا گہرا تھا۔ اس واقعے کو کافی وقت گزر چکا تھا لیکن وہ دن اسے اب بھی یاد تھا۔ گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے آستین نیچے کر لی۔ ہلکے پیلے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس، گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے وہ مختلف سوچوں میں الجھی تھی۔ تبھی اس کے پاس عبدالباری آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔ ملتجیٰ کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا تھا۔

''دیکھو ملتجیٰ۔ میں یہاں تمہاری یا پھپھو کی زندگی ڈسٹرب کرنے نہیں آیا۔ میری صرف ایک التجا ہے وہ مان جاؤ۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''وہ ایک التجا ہی میں نہیں مان سکتی۔ تمہارے گھر والوں نے میرے باپ کو ذلیل کر کے دھکے دے کر گھر سے نکالا تھا۔ میں وہ تذلیل کبھی نہیں بھول سکتی۔'' اس نے غصے سے کہا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ محض چند لمحوں کے لیے ہی کراچی جانے کے لیے راضی ہوئی تھی۔ مگر اس کے بعد پھر سے اس کے دماغ میں وہی باتیں گونجنے لگ گئیں جو فوزیہ کے سمجھانے پر کچھ دیر کے لیے سو گئی تھیں۔

''تم بھی مجھے اچھا خاصا ذلیل کر چکی ہو۔'' اس نے نرمی سے کہا لیکن وہ بھڑک گئی۔

''واہ۔ انصاف کا کیا معیار ہے آپ کا۔ میں نے آپ کو دھکے دے کر گھر سے نہیں نکالا نہ ہی چوکیدار اور گارڈز کے ہاتھوں پٹوایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ اس نے ایک دم رخ پھیر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر جاتی۔ عبدالہادی فوراً ہی اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا اس طرح قدموں میں بیٹھنا ملتجیٰ کے لیے اچنبھے کا باعث تھا۔ اس نے ایک دم اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔

''اگر تمہارے دل کو ایسا کچھ کرنے سے سکون ملتا ہے تو یہ بھی کر لو۔ لیکن پلیز ساتھ جانے سے انکار مت کرو۔'' ملتجیٰ کو پھر غصہ آ گیا۔

''میں آپ کو کوئی منتقم مزاج لگتی ہوں؟ میرا دل آپ کے والدین کی طرح سخت اور بے حس نہیں۔'' وہ تپ کر بولی۔ وہ بے اختیار مسکرایا،

''تم تو مجھے بے حد سادہ دل اور معصوم لگتی ہو۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ان سب باتوں کو چاہے نہ بھولو لیکن معاف کر دو۔ پھپھو سارا دن اتنا کام کرتی ہیں کہ ان کی مشقت دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔'' وہ افسردہ سا بولا۔

''یہ مشقت وہ ابو کی وفات کے بعد سے کر رہی ہیں۔ عادی ہو چکی ہیں وہ ان کاموں کی۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنی زندگی کا مشکلات سے بھرا دور گزار چکے ہیں۔ اب ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اجنبیت بھرے لہجے میں کہا۔ عبدالہادی نے گہری سانس بھری۔

''انسان کی زندگی سے کبھی بھی مشکلات ختم نہیں ہوتیں، ان کی نوعیت بدل جاتی ہے لیکن پریشانیاں آخری سانس تک ساتھ رہتی ہیں۔'' اس کے فلسفے پر ملتجیٰ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

''مشکلات اب بھی موجود ہیں۔ گھر کے کام بھی اور باہر کے کام وہ اکیلی ہی کرتی ہیں۔ میں نے تو سنا تھا کہ مڈل کلاس لڑکیاں جوان ہوتے ہی ماؤں کا سہارا بن جاتی ہیں لیکن میں کل سے دیکھ رہا ہوں کہ تم ان کا ہاتھ بٹانے کے بجائے الٹا ان سے اپنی خدمت کروا رہی ہو۔ چہرے اور وزن کو دیکھا جائے تو اچھی خاصی صحت مند ہو۔ یہ تمام کام اکیلے کر سکتی ہو۔'' وہ انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، لیکن آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ ملتجیٰ کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

''میری صحت اور چہرے کی چمک سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں ہے، اور میری اماں کے زیادہ ہمدرد بھی مت بنیے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی کیسے گزارنی ہے۔'' اسے لگا تھا کہ وہ اس کی بات کو ہلکا

لے گی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے انجانے میں ہی سہی اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہے۔ منتہیٰ کے چہرے کے بدلتے رنگ نے اسے حیران کیا۔

''ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ خیر لڑنے کے لیے پوری زندگی موجود ہے۔ تم اس بارے میں سوچو اور جواب مجھے ہاں میں ہی چاہیے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کچھ ہی دن بعد میرے امتحانات شروع ہوجائیں گے اور اس دوران میں کسی بھی قسم کی بے ترتیبی نہیں چاہتی۔ آپ کراچی واپس چلے جائیے۔ امتحانات ختم ہوجائیں گے تو میں اس بارے میں سوچوں گی اور اگر میرا دل راضی ہوا تو میں آپ کو اطلاع کردوں گی۔ ڈرائیور کو بھیج دیجیے گا۔'' اس نے بات ختم کی۔

''میں تمہارے جھوٹے دلاسوں کے ساتھ واپس نہیں جاؤں گا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اس کے لہجے اور آنکھوں میں کچھ تو ایسا تھا کہ وہ ایک دم ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس نے عبدالباری کی آنکھوں میں دیکھا لیکن چند سیکنڈز میں ہی اسے رخ پھیرنا پڑا۔ ایک عجیب سی کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لیا تھا۔ وہ فوراً ہی کمرے میں گھس گئی۔

☆☆☆

رات ہوچکی تھی۔ آج تیسرا دن تھا لیکن عبدالباری ان کے ساتھ ان کے گھر موجود تھا۔ سلیقہ کی طبیعت قدرے بہتر تھی لیکن اس نے انہیں بستر سے اٹھنے بھی نہیں دیا تھا۔ فوزیہ اس دوران دو دفعہ آئی تھی اور عبدالباری نے اسی کے ذریعے اس کے ابو سے ملاقات کی اور جانوروں کو سنبھالنے کے لیے ایک لڑکے کو بلوالیا۔ ان کا بھی دودھ کا کاروبار تھا، باڑے میں سے ہی انہوں نے لڑکے کو بھیج دیا۔

اسی نے سارا کام کیا تھا، لیکن عبدالباری اس کے سر پر کھڑا رہا اور ہر کام اپنی نگرانی میں کروایا۔ گھر کی صفائی اور برتن وغیرہ کا کام فوزیہ نے ہی دیکھا۔ منتہیٰ کی بھی طبیعت ناساز تھی، اس نے اسے بھی بستر پر بٹھادیا۔ فوزیہ جیسی دوست کا ہونا بھی کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی دن بھر کے واقعات کو سوچ رہی تھی۔

عبدالباری اتنا اچھا کک ہوگا اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ کل اسے سوپ بناتے دیکھ کر وہ یہی سمجھی تھی کہ اسے اسی قسم کی ایک دو چیزیں بنانا آتی ہوں گی۔ لیکن آج کے دن اور رات کے کھانے کو دیکھ کر وہ بے حد حیران ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے سلیقہ کو کھانا کھلایا تھا اور وہ نجانے کتنی ہی دیر اس کے گلے لگ کر روتی رہی تھیں۔ منتہیٰ کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دل تھا کہ عبدالباری کی بات ماننے کو راضی تھا، دماغ تھا کہ اسے اس بات سے باز رہنے کو کہہ رہا تھا۔ اس نے تھک کر ساری توجہ کتاب پر رکھ دی۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب بھول بھال کر پڑھنے میں مگن تھی۔ سلیقہ کافی دیر پہلے سو چکی تھیں۔ عبدالباری بھی اپنے کمرے میں تھا۔ رات ایک بجے اسے نیند نے پریشان کرنا شروع کردیا تھا۔ اب اسے صرف ایڈمٹ کارڈ لینے ہی کالج جانا تھا۔

وہ کافی بنانے کا سوچتی ہوئی اٹھی اور کمرے سے باہر آئی۔ آج بھی اس نے سرخ چھوٹی سی قمیص اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ بال البتہ چوٹی میں قید تھے۔ کچن کی لائٹ آن تھی۔ اندر جھانکنے پر اسے عبدالباری دکھائی دیا جو کہ چائے بنا رہا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی مسکرایا۔

''میں نے تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی تو سوچا تمہارے لیے چائے بنا دوں۔'' خیرسگالی کے اس انداز پر بھی وہ سنجیدہ رہی۔

''لیکن میں چائے نہیں کافی بنانے کے لیے آئی تھی۔'' وہ اندر آگئی، اس کی لمبی چوٹی کمر پر جھول رہی تھی۔ عبدالباری کا دل چاہا اس کی چوٹی کو اس زور سے کھینچے کہ اس چھپکلی نما لڑکی کی ساری اکڑ نکل جائے لیکن وہ ایسا کر نہیں پایا۔

''میں بھی کافی بنانے ہی آیا تھا لیکن کافی ختم ہوچکی ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔

''کافی کیسے ختم ہوگئی۔؟''

''میں نے پی لی۔'' اسے لگا تھا کہ اب منتہیٰ اسے باتیں سنائے گی لیکن خاموش رہی۔ وہ اس بے ضرر انسان سے بھلا کتنے دن لڑ سکتی تھی۔ خاموشی سے کچن سے باہر نکلنے لگی۔

''ایک بات بتاؤ۔ یہ تمہارا نائٹ ڈریس ہے؟'' اس کے سوال پر منتہیٰ نے کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ ایک دم چپ ہوگیا۔

''یہ چائے......'' اس نے ایک دم ہی گرما گرم چائے کا کپ اس کے سامنے کیا۔ وہ بنا کچھ بولے کپ لے کر چلی گئی۔

رات تین بجے تک وہ بمشکل جاگ پائی۔ ایسا سوئی کہ صبح دس بجے جاگی۔ جاگتے ہی اس نے جلدی سے ناشتا کیا اور پھر سے پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔ اسے علم نہیں تھا کہ کام والی بھی ارینج ہوچکی ہے۔ جب وہ اسے کافی دینے آئی تب اسے اس بات کا علم ہوا۔ وہ کمرے سے باہر آگئی۔ سلیقہ عبدالباری کے سر میں تیل لگا رہی تھیں۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے امی؟'' وہ ان کے پاس آکر بیٹھی۔ انداز میں ناراضی تھی۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' آج وہ کافی فریش لگ رہی تھیں۔

''پہلے جب میں آپ سے کہتی تھی کہ کام والی رکھ لیں، تب تو آپ سو بہانے بناتی تھیں، اب ایک دن میں یہ کایا پلٹ کیسے؟'' اس نے عبدالباری کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ جب سلیقہ اسے توجہ دیتیں یا اس کی بات مانتیں تو منتہیٰ کو شدید جلن محسوس ہوتی تھی۔ اس نے کبھی کسی سے اپنی امی کو بانٹا نہیں۔ تھا۔ اس لیے ان کے لاڈ اسے سخت طیش دلاتے تھے۔

''میں نے عبدالباری کو بھی منع کیا تھا لیکن وہ نہیں مانا۔'' انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت محبت سے کہا۔ اس کی جان مزید جل گئی۔ لیکن بنا کچھ کہے کمرے میں واپس چلی گئی۔

''یہ آپ کی بیٹی اتنی جل ککڑی کیوں ہے؟'' اسے جاتا دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''میری بیٹی بہت پیاری ہے۔'' انہوں نے اس کی تعریف کی۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور کھڑکی سے دکھائی دیتی منتہیٰ پر نگاہیں جمادیں۔ وہ کمرے میں یہاں سے وہاں چکرا رہی تھی۔ ہاتھ میں بے حد موٹی کتاب پکڑی تھی اور آنکھیں موندے کچھ دہرانے میں مصروف تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا۔ سلیقہ کی نگاہ اچانک ہی اس پر پڑی، وہ مگن سا اسے دیکھنے میں مصروف تھا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''عبدل بیٹا۔ ہوگئی مالش۔ اب تم آرام کرو۔'' وہ تیل کی شیشی بند کرتے ہوئے بولیں۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے ہوئے ایک بھرپور نگاہ منتہیٰ پر ڈال کر ہی اس نے قدم بڑھائے تھے۔ سلیقہ کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں پھیلنے لگیں۔

''کیا عبدالباری منتہیٰ میں دلچسپی لے رہا ہے یا پھر محض یونہی اس کی طرف متوجہ ہوگیا؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچ مجھے اسے منتہیٰ کی بیماری کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ ابھی وہ ان ہی سوچوں میں الجھی تھیں کہ وہ آگئی۔

''اماں۔ میری گولیاں ختم ہوچکی ہیں۔ آپ جا کر لے آئیں پلیز۔ میں خود چلی جاتی لیکن ابھی پڑھنے میں مصروف ہوں میں۔'' اس نے عذر بتایا۔ انہوں نے محض سر ہلایا۔

''کیا بات ہے امی؟ آپ پریشان کیوں ہیں؟'' اس نے فوراً ہی ان کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

''میں پریشان نہیں ہوں۔ دو دن سے طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کام دام نہیں کیا تو بدن سست ہو رہا ہے۔ تم جاؤ کمرے میں۔ میں لے آتی ہوں۔'' وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ وہ اندر چلی گئی۔ وہ چادر اوڑھ کر باہر جانے کو تیار تھیں جب عبدالباری

کی نظر ان پر پڑی، وہ فوراً ان کے پاس آیا۔

''کہاں جارہی ہیں آپ؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ملتجیٰ کی دوائیں ختم ہوگئی تھیں وہ لینے جارہی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولیں۔

''آپ مجھے بتائیں میں لے آتا ہوں۔'' انہوں نے کچھ سوچ کر پرچی اس کے حوالے کی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دواؤں کے شاپر کے ساتھ موجود تھا۔ سلیقہ نے اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ بالکل نارمل تھا۔ اس نے ان کے ہاتھ میں شاپر تھمایا۔ اس کے کان سے موبائل لگا تھا، اس نے سلیقہ کو ہاتھ کے اشارے سے جانے سے روکا۔

''ابو آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے موبائل ان کی طرف بڑھایا۔ سلیقہ نے کانپتے ہاتھوں سے فون تھاما تھا۔ وہ ملتجیٰ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے دوائیں ٹیبل پر رکھ دیں۔ سلیقہ چارپائی پر بیٹھی روتے ہوئے ان سے بات کررہی تھیں۔ تقریباً دس منٹ تک ان کی گفتگو ہوئی۔ اور پھر فون بند ہوگیا۔ نجانے کتنے سالوں بعد انہوں نے اپنے بھائی کی آواز سنی تھی۔ اس میں وہی شفقت اور محبت تھی جو کسی زمانے میں ان سے بات کرتے ہوئے ازخود ان کے لہجے میں بھر جاتی تھی۔ انہیں مظفر سے شادی کرنے کا کبھی ملال نہیں ہوا، وہ بلاشبہ بہت اچھے انسان تھے۔ لیکن اس دن سے آج تک گھر چھوڑنے کا ملال، اپنی من مانی کرنے کا ملال ان کی نگاہوں کو اٹھنے نہیں دیتا تھا۔ وہ نظریں جھکائے آنسو صاف کرنے لگیں، عبدالباری نے انہیں کچھ بھی نہ کہا، نہ ان سے کچھ پوچھا۔

''ابو کہہ رہے ہیں کہ آپ جلد از جلد کراچی آجائیں۔'' اس نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ملتجیٰ کے پیپرز ہیں، میں ابھی نہیں جاسکتی۔'' انہوں نے مسئلہ بتایا۔

''ملتجیٰ کے ایگزامز میں ابھی کافی دن ہیں۔ اور پیپرز بھی اچھے خاصے دن چلیں گے پھر پریکٹیکلز۔ اس میں کافی وقت لگ جائے گا۔

''اگر تمہیں کراچی میں کوئی کام ہے تو تم چلے جاؤ۔ میں تمہیں فون کرکے دوبارہ بلالوں گی۔'' ان کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ وہ چونک گیا۔

''میں نے آپ سے ملنے کے لیے بہت سال انتظار میں گزارے ہیں۔ اب میں مزید انتظار کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ آپ کو چلنا ہوگا میرے ساتھ۔ آج ہی۔ ملتجیٰ سے میں بات کرلوں گا۔ سمجھاؤں گا اسے۔ وہ مان جائے گی۔'' اس نے اس قدر وثوق سے کہا کہ ان کے اندر باہر بے چینی پھیل گئی۔

''وہ پڑھائی کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرے گی۔''

''میں نے اس سے ایسا کچھ کہنا بھی نہیں ہے۔ گھر میں ذاتی گاڑی ہے، ڈرائیور ہے۔ پیپرز دینے میں اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' چار گھنٹوں کا ہی تو راستہ ہے۔ وہ سب کچھ سوچ کر بیٹھا تھا۔ سلیقہ خاموش ہوگئیں۔

''تم اس سے بات کرلو، اگر وہ مان گئی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ زبردستی مسکرائیں۔ عبدالباری کی بے چینی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اس کے یہ انداز سلیقہ کے لیے کافی پریشان کن تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ عبدالباری یا ملتجیٰ ایک دوسرے میں دلچسپی لیں۔ عبدالباری لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس کے روبرو تھا۔ وہ کچن میں تھی تاکہ کچھ کھا سکے۔ ان دو دنوں اس نے اپنے فریج میں موجود سارے اسٹاک کو خرچ کردیا تھا۔ جب وہ پڑھتی تھی اس دوران اسے بہت بھوک لگتی تھی۔ ہر گھنٹے وہ کچھ نہ کچھ کھاتی اور پیتی تھی۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ پھل کاٹ رہی تھی کہ اس کی آواز پر چونکی۔

''بولو۔'' ملتجیٰ نے چھری نیچے رکھ لی۔

''میں آج کراچی واپس جارہا ہوں۔ لیکن پھپھو اور تم بھی میرے ساتھ چلو۔'' ملتجیٰ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ خراب ہوگیا ہو۔

''میں نے جانے کی ہامی نہیں بھری ابھی تک۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

''لیکن تمہیں ہامی بھرنا پڑے گی۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا۔

''کیوں؟'' ملتجیٰ کو یہ حاکمانہ انداز بے حد ناگوار گزرا لیکن اس نے آرام سے سوال کیا۔

''میں جب پھپھو کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تو ڈاکٹر نے خون کے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے جن کی رپورٹس ٹھیک نہیں آئیں۔''

''ک۔ کیا مطلب۔ کیا آیا ہے رپورٹس میں۔'' وہ ایک دم گھبرا گئی۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔

''ملتجیٰ ریلیکس۔ تم اتنا کیوں گھبرا رہی ہو؟'' وہ ایک دم کرسی پر بیٹھ گئی۔ عبدالباری نے اسے پانی دیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنے کمزور اعصاب کی ہوگی۔

''ملتجیٰ تم ایک دم اس طرح خوف زدہ کیوں ہوگئیں؟ رپورٹس ٹھیک نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بلڈ رپورٹ ہیپاٹائٹس کی شکایت دکھا رہی ہے۔ کنفرم کرنے کے لیے ہم کچھ مزید ٹیسٹس کروانے ہوں گے اس لیے میں نے کراچی جانے کا کہا ہے۔ مجھے علم ہوتا کہ تم ایسے ری ایکٹ کروگی میں تمہیں کبھی نہ بتاتا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سچ جانے بغیر تم ساتھ نہ چلتیں۔'' وہ اسے تمام تفصیل بتا کر اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اور ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے۔

''میں جانے کے لیے تیار ہوں، ابھی مجھے پڑھنا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر کچن سے نکل گئی اور کمرے میں جاتے ہی دوائیں نکال لیں۔ وہ دوا لینا بھی بھول گئی تھی۔ گولیاں کھا کر وہ بستر پر بے جان سی لیٹ گئی۔ آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

سلیقہ اکثر بیمار رہتی تھیں، سینے میں جلن ہوتی تو دودھ کے ساتھ روٹی کھالیتیں، بخار محسوس ہوتا تو اسے تھکن سے جوڑ کر بخار کی دوا کھالیتیں۔ اگر وہ انہیں زبردستی ہسپتال نہ لے کر جاتا تو نہ ہی خون کے ٹیسٹ ہوتے اور نہ ہی انہیں اس بارے میں کچھ پتا چلتا۔ اسے خود پر شدید غصہ آرہا تھا۔ وہ کیوں اتنی لاپروا ہوتی جارہی تھی؟ اپنی پڑھائی کو اتنا سر پر سوار کرلیا تھا کہ ماں کی فکر ہی ذہن سے نکل گئی۔ وہ افسوس میں مبتلا آنکھیں صاف کرتی اٹھی تو سامنے سلیقہ کو کھڑے پایا۔

''تم جانے کے لیے راضی کیسے ہوگئیں؟'' وہ مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں لیکن اس نے غور ہی نہیں کیا۔

''آپ اپنے بھائی کو اتنا یاد کرتی ہیں۔ بھتیجے کی محبت میں آنسو بہاتی ہیں، ایسے میں، میں بے وجہ دیوار کیوں بنوں؟ امتحانات اتنے بھی ضروری نہیں۔ میں وہاں جاکر کچھ اور پڑھ لوں گی۔'' اس نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا۔ سلیقہ اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

''مجھے تم اس وجہ کے ساتھ مطمئن نہیں کرسکتیں۔'' ملتجیٰ کو نگاہ چرانی پڑی۔ اس کا انہوں نے کچھ اور مطلب لیا۔

''منتجیٰ۔ ایک بات یاد رکھنا۔ تمہارا نکاح بلال سے ہوچکا ہے، اور یہی بات تم ہر اس شخص کو بتاؤ گی جو تمہارے قریب آنے کی کوشش کرے گا۔ ان کی تنبیہہ پر اس نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا، لیکن خاموش رہی۔

''تم جاؤ، جاکر فوزیہ سے مل لو اور اس کے بابا سے کہو کہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ وہاں سے اٹھ آئی۔ رات تک سلیقہ نے تمام تر چیزیں، سامان اور جانور فوزیہ کے والد حوالے کیے۔ سب ان کے اس طرح اچانک جانے کے فیصلے پر بے حد اداس ہوگئے تھے۔ فوزیہ تو ان سے الوداع کہتے وقت باقاعدہ رونے لگ گئی تھی۔ آخر بچپن کا ساتھ تھا۔ صبح سویرے وہ حیدرآباد سے کراچی کے لیے

نکلے۔ ملتجیٰ اتنی اداس تھی کہ اس نے ناشتا بھی نہیں کیا، تمام راستے وہ آنسو پونچھتی رہی۔ عبدالباری شیشے سے اسے وقتاً فوقتاً دیکھتا رہا۔ اس نے راستے میں کئی بار گاڑی روکی، اسے کھانے کا کہا لیکن اس نے انکار ہی کیا۔ دل پر ایک عجیب سی مردنی چھائی تھی۔ وہ مستقبل سے بے خبر ماں کی بیماری اور بچپن کے ساتھیوں سے دوری پر شدید رنجیدہ تھی۔

☆☆☆

ان کا استقبال نہایت شاندار طریقے سے ہوا تھا۔ منظور صاحب نے جب سلیقہ کو دیکھا تو بہت دیر تک وہ انہیں پہچان ہی نہ پائے۔ کملائی رنگت۔ بے رونق آنکھیں، اگر وہ اتنی طویل ناراضی نہ رکھتے تو آج وہ ان سے اس حال میں نہ مل رہے ہوتے۔ عبدالباری نے انہیں ان کی رپورٹس کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ ملتجیٰ کو دیکھتے ہی انہیں سلیقہ کی جوانی یاد آ گئی۔ وہ ہو بہو ماں جیسی تھی۔

مومنہ اور ملکہ نے ان کے گھر اور رہن سہن کی تصاویر دیکھی تھیں، انہیں یہی لگا تھا کہ وہ اتنے بڑے گھر کو دیکھ کر مرعوب ہوگی یا کم از کم وہ خود کو کنفیوز محسوس کرے گی لیکن وہ۔۔۔ ان سے نہایت تکلف سے ملی۔ وہ ان کے ہمراہ اندر آئی اور ایک سرسری نگاہ ڈال کر ایک طرف خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

منظور اسے کسی بات میں شامل کرتے تو وہ جواب دے دیتی ورنہ وہ خاموش ہی رہتی۔ کچھ ہی دیر بعد ناشتا لگا دیا گیا۔ لیکن اس سے پہلے انہیں ان کے کمرے دکھا دیے گئے تھے۔ اس نے جاتے ساتھ شاور لیا اور کپڑے تبدیل کیے۔ بال سکھا کر اس نے انہیں کھلا ہی چھوڑ دیا۔ ناشتے کے دوران مومنہ اس کے مشاہدے میں مصروف رہی اور اسے یہ ماننا پڑا کہ اس کی پھپھو نے اسے تمام آداب بڑے اچھے طریقے سے سکھائے تھے۔ ملتجیٰ کے کپڑے بھی اسے حیران کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ عبدالباری کے پاس پہنچی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھا اور سونے کی خواہش رکھتا تھا۔ مومنہ کو دیکھ کر بھی اس نے کوئی رسپانس نہیں دیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"تم نے جو تصاویر بھیجی تھیں، انہیں دیکھ کر تو لگتا تھا کہ دونوں کی زندگی بہت مشکل میں گزر رہی ہے۔" اس نے آتے ساتھ ہی بات شروع کر دی، باری کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے مومنہ کی طرف دیکھا۔

"تو تمہیں کچھ ہی گھنٹوں میں ان کی زندگی میں کیا بہتری اور آسانی دکھ گئی؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ مومنہ کو امید نہیں تھی کہ وہ اسے جواب دے گا، وہ فوراً ہی اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"تم نے اسے ناشتا کرتے ہوئے دیکھا تھا؟ اتنی تمیز اور ترتیب کے ساتھ تو کبھی ہم نے ناشتا نہیں کیا۔ کیا اسٹائل تھا چھری کے استعمال کا، اور اس کے کپڑے دیکھے ہیں؟ کتنے بہترین ہیں۔ یہ تو بالکل بھی کسی ایسے ویسے علاقے کی رہائشی نہیں لگتی۔" اس کی حیرت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عبدالباری کے ہونٹ پھیل گئے۔

"زندگی میں مشکلات کا تعلق صرف پیسے کی کمی سے مشروط کرنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں اور نہ ہی چھری کانٹے سے کھانا کھانا تمیز یا تہذیب کا اظہار ہے۔ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے آداب پھپھو کے علاوہ بھلا کون سکھائے گا اسے؟

اس پرانے زمانے کے گھر میں رہتے ہوئے بھی ملتجیٰ کے کمرے میں ضرورت کی ہر وہ چیز موجود تھی جو تمہارے یا میرے کمرے میں ہے۔ پھپھو نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ سارا دن محنت صرف اس لیے کرتی ہیں کہ تاکہ ملتجیٰ کو ہر سہولت دے سکیں۔ وہ اکیلے پورے گھر کو اور اپنے اس کاروبار کو سنبھالتی تھیں۔ انہیں پیسوں کی کمی نہیں ہے، تحفظ اور تعاون کی کمی ہے۔" اس نے تفصیل سے جواب دیا۔ مومنہ چپ ہو گئی۔

"اور ہاں ایک بات یاد رکھنا، تمہارے یہ گھر چھوڑ کر جانے کی داستان ملتجیٰ کو مت سنانا۔ وہ بہت مشکل سے کراچی آئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ دوبارہ وہاں جائے۔" اس نے تنبیہہ کی اور لیٹ گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب آپ یہاں سے تشریف لے جا سکتی ہیں۔ وہ اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

ملتجیٰ اسے مغرور سی محسوس ہوئی حالانکہ وہ خود بھی کسی سے جلدی گھلتی ملتی نہیں تھی لیکن پھر بھی نجانے اسے کیوں لگا کہ وہ آتے ہی اس کے گلے کا ہار بن جائے گی۔ کچھ بھی اس کی سوچ کے مطابق نہیں ہوا تھا۔ مزید اس کے بارے میں سوچنے کا ارادہ کیے بغیر وہ ابھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ نیچے لاؤنج میں اسے شازے بیٹھی دکھائی دی۔ اس کے سامنے والے صوفے پر ملتجیٰ بیٹھی تھی۔ دونوں خوشگوار انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں، مومنہ کو ایک دم ہی غصہ آ گیا اور وہ سیدھا کمرے میں گھس گئی۔

اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

☆☆☆

شام پھیلی تو اس نے لان میں قدم رکھا۔ صبح جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تب ذہن عجیب و غریب سوچوں کے جال میں قید تھا۔ وہ کسی بھی طرف توجہ دینے سے قاصر رہی تھی۔ مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ موسم اچھا خاصا خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل بھی چھائے تھے۔ وہ یوں ہی مالی بابا کے قریب آ گئی۔

"میں نے تو سنا تھا کہ کراچی میں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں لیکن دیکھیں آسمان تو کالے بادلوں سے بھرا پڑا ہے۔" اس نے بات کرنے کی غرض سے کہا۔ اسے بوڑھے لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے اور وقت گزارنے میں بہت مزا آتا تھا۔

"بیٹا یہ کراچی ہے۔ یہاں صرف بادل آتے ہیں اور اپنی جھلک دکھا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ کئی بار تو ایسے زور سے بجلی کڑکتی ہے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے لیکن بارش۔۔۔ صرف اتنی سی برستی ہے۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے پائپ کے منہ کو آدھے سے زیادہ ہاتھ سے بند کیا، پانی ایک پتلی دھار کی صورت بہنے لگا۔ وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی۔ اوپر ٹیرس پر کھڑا عبدالہادی اسی کی جانب ہی متوجہ تھا۔ اسی وقت اچانک ملتجیٰ کے گال پر پانی کا قطرہ گرا۔

"یہ دیکھیں مالی بابا۔ بوندا باندی ہو رہی ہے۔" وہ چلا کر خوشی سے بولی۔

کچھ ہی دیر میں اچھی خاصی بارش برسنے لگی۔ مالی بابا حیران ہی رہ گئے اور موٹر بند کرنے کے لیے چلے گئے۔ وہ وہیں کھڑی بارش میں بھیگتی رہی۔ مومنہ نے جب کھڑکی سے برستی بارش کو دیکھا تو وہ بھی باہر دوڑ آئی۔ وہ دونوں بھیگنے لگیں مگر یہ خوشی محض پندرہ منٹ کی ہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی بارش ہلکی ہوئی اور پھر ایک دم رک گئی۔

"یہ کیا ہوا؟" وہ حیران تھی۔

"یہاں ایسی ہی بارش ہوتی ہے۔" مومنہ نے ہنستے ہوئے کہا اور اندر چلی گئی۔ ملتجیٰ کا موڈ خراب ہو گیا تھا، اس کی نظر اب تک عبدالہادی پر نہیں پڑی تھی۔ وہ منہ بناتی گھر کے اندر چلی گئی۔ کپڑے بدل کر ابھی وہ بستر پر بیٹھی ہی تھی کہ ملازمہ کافی لے آئی۔

"تم سے کس نے کہا کہ مجھے کافی پینی ہے؟" ملازمہ کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"چھوٹے صاحب نے بنا کر بھیجی ہے۔"

ملازمہ کے جواب پر اس نے کوئی بھی ری ایکشن ظاہر کیے بغیر کپ تھام لیا۔ سلیقہ اسی وقت کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ملازمہ کی بات سن لی تھی۔ اسے بھیج کر وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے کے نقوش تن گئے تھے۔

"میں ایک بات سوچ رہی تھی۔" انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے گفتگو کی ابتداء کی۔

"تمہارے پیپرز سر پر ہیں۔ پھر روز اتنے

گھنٹوں کا سفر کہیں تمہیں بیمار نہ کردے۔ تم ایک کام کرنا پہلے پرچے کے دن تم فوزیہ کے ساتھ اس کے گھر چلی جانا اور امتحانات مکمل ہونے تک وہیں رہ کر تیاری کرنا۔'' انہوں نے ابھی بات مکمل کی بھی نہیں تھی کہ خوشی سے اسکی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''میرے دل میں بھی کل سے یہی بات چل رہی تھی۔ اور سچ پوچھیں تو مجھے گھر اور وہ سب لوگ بہت یاد آرہے ہیں۔'' اس نے اداسی سے کہا۔ اداس تو وہ بھی تھیں۔ ایک عرصہ گزرا تھا ان کے ساتھ۔ مظفر کے جانے کے بعد ان کی سب سے زیادہ مدد اسی خاندان نے کی تھی۔ اور ملتجیٰ کو ماں کے بعد سب سے زیادہ پیار بھی اسی گھر سے ملا۔ ملتجیٰ کا اس گھر سے بے حد گہرا قلبی رشتہ تھا۔

کافی پی کر اس نے کتاب اٹھالی اور پڑھنے لگی۔ وہ اسے پڑھتا دیکھ کر باہر نکل گئیں۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کے موبائل پر عبدالباری کی کال آرہی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے کال اٹھائی

''میں انتظار ہی کرتا رہا کہ تم مجھے شکریہ کا ایک میسج بھیجو گی، کافی کی تعریف کرو گی لیکن تم سے اتنی سی بھی زحمت نہ کی گئی۔'' وہ مصنوعی شکوے سے بولا۔

''شکریہ۔'' وہ سنجیدہ سے انداز میں بولی۔ دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

''میں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا ہے کیا؟'' دھیمی آواز میں پوچھا گیا۔

''خیر سے کچھ ہی دن بعد میرے پیپرز شروع ہونے والے ہیں۔ اور میں پڑھنے میں مصروف تھی۔ ایسے میں کسی کی کال آئے گی وہ بھی کسی ایسے کی جو ایک ہی گھر میں موجود ہوں تو بندہ ڈسٹرب کیسے نہیں ہوگا۔؟'' ملتجیٰ نے اطمینان سے کہا۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

''اچھا تم پڑھو۔'' اتنا کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ ملتجیٰ فون نیچے رکھ کر پھر سے پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک بار پھر اس کا موبائل بجا۔ اب تھکاوٹ محسوس کرنے لگی تھی۔ فوزی کالنگ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ اس نے کتاب بند کی اور کمرے سے نکل کر باہر آگئی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے یہاں سے وہاں چکرا رہی تھی کہ اس کی نظر سامنے والے کمرے کی جانب اٹھ گئی۔ وہ کمرہ بالکل خالی تھا، بس ایک بڑا سا جھولا موجود تھا۔ وہ اس کمرے میں داخل ہو گئی۔ لکڑی کا منقش جھولے کا ڈیزائن جدت سے عاری تھا لیکن اس کی قدیمیت ہی اسے بے حد پرکشش بنا رہی تھی۔ وہ محویت سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگی اور پھر اس پر بیٹھ گئی، اور جھولا جھولنے لگی۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ وہ جھولے پر بیٹھی فون کان سے لگائے بڑی ہی دلچسپی سے باتیں کرنے اور سننے میں مگن تھی، کچھ دیر بعد وہ وہیں لیٹ گئی۔ ایک گھنٹہ بات کرنے کے بعد جب کال از خود کٹ گئی تو اس نے آنکھیں موند لیں، اسے یہاں عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

رات کے کھانے پر جب ملازمہ اسے بلانے آئی تو کمرہ خالی تھا۔ اس نے جا کر سلیقہ کو بتایا۔ وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کمرے میں آگئیں۔ جہاں وہ سب سے بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے اسے جگایا۔

''کھانا لگ چکا ہے۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس کے اٹھ کر بیٹھتے ہی انہوں نے اسے بتایا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، موبائل کمرے میں رکھ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور نیچے آگئی جہاں گھر کے تمام افراد موجود تھے۔ اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پلکیں بھی گیلی تھیں۔

سب کھانا کھانے لگے۔ اس کے بعد میٹھے کا اور پھر چائے کا دور چلا۔ اس کی تھکن بھی ختم ہو چکی تھی اور نیند بھی پوری تھی۔ نشست کے برخاست ہوتے ہی اس نے اسی کمرے میں پناہ لی جہاں جھولا موجود تھا۔

البتہ اب اس کے ہمراہ کتاب تھی۔ وہ جھولے پر چوکڑی مار کر بیٹھی ہل ہل کر پڑھنے میں مصروف تھی کہ عبدالباری دو کافی کے کپ تھامے اندر آیا۔

''ایک تو جب میں مصروف ہوتی ہوں تب ہی اسے باتیں کرنا یاد آتی ہیں۔'' اس نے کوفت سے سوچا لیکن اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''لگتا ہے میں نے پھر سے ڈسٹرب کر دیا ہے۔'' وہ افسوس سے بولا۔ ایک بار پھر اس کے دماغ نے صلاح دی کہ وہ صاف گوئی کا سہارا لے لیکن اس کا دل نہیں مانا۔

''نہیں۔ مجھے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔'' اس نے جلدی سے کہا اور اس کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔

''کیسا لگا گھر؟ گھر کے لوگ کیسے لگے؟'' وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ کمرے میں اس ایک جھولے کے سوا اور کوئی دوسری چیز موجود نہیں تھی۔ جھولا اتنا بڑا تھا کہ دو سے تین لوگ آرام سے بیٹھ سکتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ ملتجیٰ اسے بیٹھنے کی آفر نہیں کرے گی۔

''گھر تو بلاشبہ بہت خوب صورت ہے۔ اور گھر کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ شانزے پسند آئی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس نے تعریف کی۔

''ہاں۔ وہ واقعی بہت اچھی ہے۔ میری بچپن کی دوست بھی ہے۔'' اس نے ملتجیٰ کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے اور شادی کی خواہش مند ہے۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی لیکن عبدالباری حیران ہوا۔

''تم میری کسی دوست سے دو گھنٹوں کی ملاقات کے بعد یہ نتیجہ نکالو گی؟'' اسے واقعی بہت حیرت ہوئی تھی۔ اسے ہنسی آگئی۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم یہی ری ایکشن دو گے۔ مجھے کچھ وجوہات کی وجہ سے ایسا لگا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ عبدالباری نے بہت توجہ سے اسے دیکھا۔ وہ اس وقت بھی اسی حلیے میں تھی جس طرح وہ اپنے گھر میں رات کے وقت اسے دکھائی دی تھی بس کپڑوں کا رنگ مختلف تھا۔ اب بھی اس کے لمبے بال دونوں شانوں سے ہوتے ہوئے گود میں گر رہے تھے۔ اور وہ نظر کا چشمہ لگائے کسی پروفیسر کے سے انداز میں ان نکات پر روشنی ڈال رہی تھی جن کی وجہ سے اس نے یہ انکشاف کیا۔

''پہلی وجہ یہ ہے کہ اس نے مجھ سے دو گھنٹے باتیں کیں اور ان دو گھنٹوں میں اس نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تمہاری تعریفیں کیں۔ باقی کے آدھے گھنٹے میں اس نے باقی باتیں کیں۔ دوسری وجہ یہ کہ جب مومنہ کمرے سے نکلی تو میری نگاہ اس پر پڑی، اس نے جس طرح شانزے کی طرف دیکھا تھا، ان نگاہوں سے صرف نندیں ہی اپنی بھاوج کو دیکھا کرتی ہیں۔ غصہ، جیلسی اور نجانے کیا کیا تھا اس کی آنکھوں میں۔

''اور میری آنکھوں میں کیا دکھتا ہے؟'' اس سوال پر اس نے بڑے ہی اطمینان سے باری کی طرف دیکھا۔

''خود سے منسلک تمام رشتوں کی محبت۔'' اس جواب پر وہ بے اختیار مسکرایا۔

''مومنہ اور شانزے دونوں کی بہت اچھی دوستی تھی لیکن۔۔۔''

''لیکن مومنہ نے اپنی من مانیاں کیں اور جب شانزے نے اس کا ساتھ نہ دیا تو مومنہ نے اس سے دوستی ختم کر دی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ہکا بکا رہ گیا تھا۔

''مجھے یہ ساری باتیں ممانی سے معلوم ہوئی ہیں۔ وہ امی کو بتا رہی تھیں اور ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ یہ بات مجھے کسی صورت پتا نہ چلنے دیں۔ تم ان سے بدگمان مت ہونا، کل یا پرسوں یا کسی بھی دن کسی نہ کسی سے یہ بات ہمیں معلوم ہو ہی جاتی، تب ہمیں زیادہ برا لگتا۔'' عبدالباری نے محض اثبات میں سر ہلایا، اور کافی ختم ہوتے ہی وہاں سے نکل آیا۔

جب وہ حیدرآباد میں تھی تب اس کا رویہ، انداز

بالکل مختلف تھا اور جب سے یہاں آئی تھی تب سے وہ اسے بے حد سمجھ دار، سلجھی ہوئی اور معاملہ فہم لڑکی لگ رہی تھی۔ وہ جو اس بات سے خوف زدہ تھا کہ اگر اسے حقیقت معلوم ہوئی تو وہ ہنگامہ کرے گی لیکن اس نے اتنے سکون سے اسے مطلع کیا کہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ اسے اپنا وجود شرمندگی میں ڈوبا ہوا لگا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ پیپر دینے حیدرآباد کے لیے عبدالباری کے ساتھ روانہ ہوئی۔

وہ سلیقہ سے ڈھیروں دعائیں لے کر نکلی۔ ان کے ساتھ شانزے بھی تھی۔ اس کی کوئی دوست کچھ ماہ قبل شادی کے بعد حیدرآباد شفٹ ہوئی تھی۔ وہ اس سے ملنے جانے کا سوچ رہی تھی، جب اسے ان کے پروگرام کا علم ہوا تو وہ بھی ساتھ ہوگئی۔ لیکن اس کا ساتھ ملتجیٰ کو کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ وہ پورے راستے کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجتی رہی تھی۔ ملتجیٰ نے کئی بار کتاب کھولی، بند کی لیکن توجہ برقرار نہ رکھ پائی۔ عبدالباری اس کا مسئلہ سمجھ رہا تھا، وہ دو سے تین بار شانزے کو ٹوک بھی چکا تھا لیکن اس نے اس ٹوکنے کو بالکل بھی سنجیدہ نہیں لیا۔ کالج کے دروازے پر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی۔

''میں یہیں رہوں گی کچھ دن۔ پیپرز کے بعد ہی واپس آؤں گی۔'' اس نے اپنی بات دوبارہ دہرائی

''نہیں۔ تم یہاں نہیں رکو گی۔ میں تمہیں لے کر آیا ہوں تو میں ہی تمہیں ساتھ واپس لے کر جاؤں گا۔'' ملتجیٰ کو اس کا یہ انداز برا لگا۔

''میں سب کچھ پلان کر چکی ہوں۔ فوزیہ کے گھر والوں کو بھی آگاہ کر دیا ہے۔'' اس نے تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا حالانکہ چہرے سے غصہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

''ملتجیٰ۔ تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ پھپھو بتا رہی تھیں کہ تم اپنا خیال نہیں رکھتیں۔ پیپرز کے دوران پڑھائی کے بوجھ کی وجہ سے تم کئی بار بیمار ہو چکی ہو۔ میں اسی لیے تمہیں منع کر رہا ہوں۔

''تم مجھے منع نہیں کر رہے آرڈر دے رہے ہو اور آرڈر میں صرف اپنی امی کا ہی مانتی ہوں۔ جہاں تک طبیعت کی بات ہے تو ایک دن میں آٹھ سے دس گھنٹے کا سفر میری صحت کے لیے زیادہ نقصان دہ ہے۔ یہاں رہ کر بھی اگر میں بیمار ہوگئی یا مجھے کوئی مسئلہ ہوا تو فوزیہ کی امی ہیں۔ وہ میرا بالکل ویسے ہی خیال رکھتی ہیں جیسے کہ میری اپنی امی۔ اس لیے تم فکر مند نہ ہو۔ میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا کہ عبدالباری کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

اس نے بگڑے موڈ کے ساتھ گاڑی اسٹارٹ کی۔

''تم کیوں موڈ خراب کر رہے ہو؟ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

'' ویسے مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ ملتجیٰ کی صحت اچھی خاصی ہے۔ کھاتی پیتی بھی بالکل ٹھیک ہے۔ کیا تم نے اس کی طبیعت خراب دیکھی ہے؟''

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے بھی ایسا کوئی لمحہ یاد نہ آیا جس میں ملتجیٰ نے چھینک بھی ماری ہو۔

''میں نے اسے بیمار تو نہیں دیکھا' لیکن ہاں ایک بار پھپھو اس کی دوائیں لینے جا رہی تھیں تو میں نے ان سے کہا کہ میں لے آتا ہوں۔ دواؤں کے نام پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ پاپا کی کال آگئی تھی۔ ہوسکتا ہے اسے بی پی ایشو ہو یا پھر کمزوری۔ بات ہوگی تو پوچھوں گا۔'' اس نے اپنی بات مکمل کر کے ریڈیو آن کر دیا لیکن شانزے نے ریڈیو ایک دم ہی آف کر دیا۔

''کیا ہوا؟'' اس کی ساری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔

''مجھے نجانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ تمہارا اس کے لیے فکر مند ہونا یا زیادہ کنسرن دکھانا اسے پسند نہیں۔'' اس پر وہ کیا کہتا، اسے بھی یہی لگتا تھا۔ وہ اچھی خاصی ہوتی لیکن جونہی وہ اس کی فکر میں مبتلا ہوتا یا پھر اس کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرتا وہ ایک دم ہی اجنبیت کی دیوار کھڑی کر دیتی تھی۔ وہ اسے اچھا

خاصا پسند کرنے لگا تھا اور ملتجیٰ کا رویہ اکثر اس کا دل توڑ دیتا۔

''وہ بہت صاف گو قسم کی لڑکی ہے۔ اسے جو بات بری لگتی ہے وہ بغیر لحاظ کیے کہہ دیتی ہے۔ میری غلطی ہے۔ جب وہ پھپھو سے اجازت لے کر آئی تھی تو مجھے خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔'' اس نے ملتجیٰ کی طرف داری کی۔ ملتجیٰ کے انداز نے تو شانزے کے دل سے تمام وہم ختم کر دیے تھے لیکن عبدالباری کی طرف داریاں کرنا اور پورا راستہ گاہ بہ گاہ ملتجیٰ کو دیکھنا اسے بری طرح بے چین کر گیا۔ اس کا دل چاہا وہ ابھی اسی وقت اس سے اظہار محبت کر ڈالے لیکن اس کی نسوانیت اسے ایسا کرنے سے روک دیتی تھی۔

''کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟'' اس نے بہت اچانک یہ سوال پوچھا، لیکن اس نے کوئی خاص رسپانس نہ دیا۔

''اسے ناپسند کرنے کی وجہ بھی نہیں۔'' اس گول مول جواب پر وہ سلگ گئی۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔'' عبدالباری نے ایک دم ہی گاڑی روکی۔

''میں کسے پسند کرتا ہوں، اور کس سے شادی کروں گا، اس بارے میں تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ اب ان باتوں کو چھوڑو اور وہ دیکھو تمہارا مطلوبہ مقام آگیا ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ شانزے کا دل بے حد بوجھل ہوگیا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے نیچے اتری اور پلٹ کر خدا حافظ بھی نہ کہہ پائی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی لیکن جس کے لیے وہ رو رہی تھی، وہ اس کے درد سے بے خبر ملتجیٰ کو پرپوز کرنے کا سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

آج ملتجیٰ کا آخری پیپر تھا۔ جتنے بھی دن اس نے وہاں گزارے، اس دوران ایک بار سلیقہ اس سے ملنے حیدرآباد آئی تھیں، جبکہ عبدالباری کے کتنے چکر لگ چکے تھے۔ آج بھی جب وہ پیپر دے کر گھر پہنچی کچھ ہی دیر بعد اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چیزیں سمیٹنے، کھانا وغیرہ کھانے میں ہی شام ہوگئی۔ وہ ان سب سے رخصت لے کر نکلی۔ اب نجانے کتنے دن یا مہینوں بعد ان سے ملاقات ہونی تھی۔ اس کے اندر باہر اداسی پھیلی تھی۔

''کیا بات ہے؟ اتنی خاموش کیوں ہو؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں۔ کچھ نہیں، بس تھکن ہے۔'' اس نے انگلیوں سے سر دباتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا دھیان بالکل بھی عبدالباری کی جانب نہیں تھا۔ ملتجیٰ نے اپنا بیگ کھنگالا۔ وہ اپنی دوائیں بھول آئی تھی۔ اس نے شدید پریشانی کے عالم میں فوزیہ کو میسج کیا۔

''تم اس سے کہو کہ وہ تمہیں کسی میڈیکل اسٹور لے جائے، تم دوائیں خرید لینا۔ گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔' اس کا جوابی میسج پڑھ کر ملتجیٰ نے پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔ اور اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے میڈیکل اسٹور لے جاؤ۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں میری۔ وہاں سے دوائیں لوں گی تو شاید ٹھیک ہو جاؤں۔'' وہ نقاہت سے بولی۔

''میرے پاس کچھ ٹیبلٹس پڑی ہیں۔ پہلے کھانا کھا لو پھر دوا لے لینا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ مزید کچھ کہتی کہ اس کا فون بجنے لگا۔ دس منٹ کال کی نذر ہوگئے۔ جب گاڑی رکی تو وہ ایک ریسٹورنٹ کے قریب تھے۔ گاڑی پارکنگ ایریا میں داخل ہو چکی تھی

''مجھے کچھ نہیں کھانا۔ میں ریسٹورنٹ کے اندر نہیں جاؤں گی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''میں نے ان کے گھر ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے اور ابھی اچھا خاصا سفر باقی ہے۔'' اس نے وضاحت دی

ملتجیٰ کو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ عبدالباری گاڑی روک چکا تھا۔ اسے مجبوراً نیچے اترنا پڑا۔ دل ہی دل میں وہ خیر کی دعائیں

مانگ رہی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ میری طبیعت خراب نہ ہو۔ میں کچھ زیادہ ہی خوف زدہ رہنے لگی ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا مجھے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دیتی اس کے پیچھے اندر داخل ہوگئی۔ ٹیبل پر بیٹھتے ہی ویٹر ان کے سامنے حاضر ہوگیا۔ عبدالباری نے کھانے کا آرڈر دیا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

''میں جانتا ہوں کہ اگر میں کسی بھی معاملے میں اپنی من مانی کروں تو تمہیں شدید غصہ آتا ہے۔ اس کے لیے بہت معذرت۔ لیکن آج میں نے یہ ضد ایک خاص وجہ سے کی ہے۔ میں یہ ساری باتیں تم سے گھر جانے کے بعد بھی کہہ سکتا تھا لیکن کل شام مجھے آفس کے کام سے لندن جانا ہے۔ واپسی میں کافی دن لگ جائیں گے اور میں مزید انتظار نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے تمہید باندھی منتہیٰ کے کان کھڑے ہوگئے اور دل عجیب سی حالت میں مبتلا ہوگیا۔ کچھ دیر پہلے کی بے چینی جوں کی توں تھی بس وجہ بدل رہی تھی۔

می مجھ سے کئی بار میری پسند کے بارے میں پوچھ چکی ہیں کیونکہ وہ چاہتی ہیں کہ اگر میں کسی میں انٹرسٹڈ نہیں تو وہ میرا رشتہ شانزے کے ساتھ طے کردیں۔ خالہ کی بھی یہی خواہش ہے اور شانزے کی بھی لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ منتہیٰ کے کپکپاتے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ ساکت ہوگئی تھی۔ اس کے لیے عبدالباری کا یہ اظہار محبت غیر متوقع تھا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تب ہی تم مجھے بھا گئیں۔ پھر جتنا بھی وقت تمہاری سنگت میں گزرا اس کے ہر ایک لمحے میں تم میرے دل میں سماتی گئیں۔ پہلے یہ صرف پسندیدگی تھی لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ پسندیدگی محبت میں بدلتی گئی۔ تم میرے لیے دنیا کی سب سے خاص لڑکی ہو۔ بہت چاہتا ہوں میں تمہیں۔ کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟ منتہیٰ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے تمام تر برے اور ضرورت سے زیادہ ہی صاف گو رویے کے باوجود بھی وہ اس کی جانب پرامید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ وہ اسے کبھی انکار نہیں کرے گی۔ اگر وہ ایک عام لڑکی ہوتی تو کیا اسے انکار کرتی؟ یقیناً عبدالباری جیسے لڑکے کو انکار کرنا اس کی بدبختی ہوتی۔ منتہیٰ کچھ دیر اسکی آنکھوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں پانی بھرتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھلکنے لگا۔ عبدالباری گھبرا گیا۔

''کیا ہوا منتہیٰ؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟'' اس نے جیسے منتہیٰ کی مشکل آسان کردی۔

''ہاں میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔'' اس کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی۔ عبدالباری جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن وہ کیوں ایسا کررہی ہے اس بات کو سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔ اس وقت وہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تو اس میں رونے کی کیا بات ہے پلیز ریلیکس۔ اس نے منتہیٰ کا ہاتھ دبایا۔ وہ آنکھیں صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں کچھ دیر باہر بیٹھنا چاہتی ہوں۔ تم کھانا کھا کر آجانا۔'' اس کا لہجہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے خاموشی سے گاڑی کی چابی اسے تھمائی۔ وہ ابھی بمشکل پارکنگ میں ہی پہنچی تھی کہ اس کا بدن جھٹکے کھانے لگا۔ تماشا بننے کے خوف نے ہی اس کی رنگت زردی مائل کردی تھی۔ وہ بمشکل گاڑی تک پہنچی۔ عبدالباری نے بھی آرڈر کینسل کردیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے آیا۔

''کیا ہوا منتہیٰ؟'' وہ بمشکل پلٹی اور ایک دم ہی اس کا ہاتھ پکڑا۔ منتہیٰ کی سانس پھول رہی تھی

''م۔ مجھے، ہاسپٹل......'' وہ جملہ مکمل نہ کرپائی، اس کا بدن جھٹکے کھا رہا تھا اور ان جھٹکوں کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ☆☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

امید سحر

ماہ وش طالب



اسٹاپ پر بس آ کر رکی تو وہ جلدی سے نیچے اتری، رش اتنا زیادہ تھا کہ مسافر ایک دوسرے کو دھکا دیتے اتر رہے تھے۔ اچانک اسٹاپ پہ کسی لڑکی کے چلانے کی آواز آئی غالباً کسی لڑکے نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی کوشش کی تھی اور پھر اس نے دیکھا کہ کسی حیادار لڑکے نے آگے بڑھ کر اس لوفر کو جھانپڑ رسید کیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تو بت بنی کھڑی عنایا کو ہوش آیا اور فوراً ان اوباشوں کی جانب لپک کر انہیں مزید ہاتھا پائی سے روکا۔

''دفع ہو جاؤ ذلیلوں گھر میں بیٹھی بہن سے چھیڑ چھاڑ کرو۔'' اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور مردوں کی غیرت بھی جاگ اٹھی، اور آوارہ لڑکوں کو اس لڑکی کے ساتھ بدتمیزی سے روکا۔

وہ لڑکا حیرت سے عنایا کی جانب دیکھتا رہا جب رش چھٹ جانے پر وہ اگلی وین کے لیے اسٹاپ پر رکھے بینچ پر بیٹھ گئی۔ ''کیا ضرورت تھی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی؟'' وہ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر درشتی سے بولی، اب کے لڑکے کی حیرت حد سے سوا ہو گئی یعنی وہ انجان لڑکی اپنے گریبان میں جھانکے بغیر اسے نصیحت کر رہی تھی اور قبل اس سے کہ وہ یہ بات اس کے سامنے کہتا وین آ گئی اور وہ لڑکی یا جا وہ جا......

☆☆☆

دور کہیں کھلی فضا میں فلک بوس پیڑوں اور خون آشام آکاش کا عکس گہرے سبز پانیوں میں جھلک رہا تھا، بالکل اسی طرح جیسے آئینے کے پاس کھڑے ہو کر اسے اپنا اصل روپ نظر آ رہا تھا اسے آج اندازہ ہوا تھا کہ اس کے دو چہرے ہیں ایک اس کی اپنی ذات کے لیے اور ان کے لیے جن کی وجہ سے ابھی زمین نے برداشت سے باہر ہو کر اپنا سب کچھ اگلا نہیں تھا اور دوسرا وہ روپ جو اس نے گھر سے باہر راستہ کاٹنے کو بیٹھے معاشرے کے درندوں سے نپٹنے کے لیے اپنایا ہوا تھا۔ وہ جیسا دیس ویسا بھیس کے اصول کے مطابق ہی تو زندگی گزار رہی تھی ورنہ کب کی زمانے کی کم ظرفی کی نذر ہو گئی ہوتی، آئینے سے ہٹ کر وہ واپس اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی جہاں سے وہ صحن میں مایوسی کی مانند پھیلے خزاں رسیدہ پتے دیکھنے لگی اور جہاں سے پیپل کی ہری شاخوں پر پھیلی امید کی گہری چھاؤں بھی وہ دیکھ سکتی تھی۔

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

اسے کوریئر سروس میں نئی نوکری ملی تھی۔ تب جب حالات اچھے تھے اور ابو کو فالج جیسے سانپ نے ڈس کر بیمار نہیں کر دیا تھا اس نے انٹر پاس کیا فلک بھی نویں کی پرچوں کی تیاری میں مصروف تھی، لیکن پھر حالات اچانک یوں بدلے جیسے صاف ستھرے آنگن میں آندھی کے بعد ہر چیز بکھر جاتی ہے اور اس بکھراوے کو سمیٹنا انتہائی ہمت طلب لگتا ہے۔ نجیب بھائی کے غیر قانونی طریقے سے کینیڈا بھاگ جانے کے بعد سہیل صاحب کو جیسے سکتہ ہو گیا اور خدیجہ بیگم چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

ابو کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی ایسے میں جوان ہوتے مستقبل کے سہارے کا یوں ساتھ چھوڑ جانا امی اور ابو دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ نجانے کیوں ماں باپ اپنے پالنے میں لیٹے معصوم فرشتے جیسے بیٹوں سے امید لگا لیتے ہیں۔ وہ کیوں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا بدلہ سود سمیت اپنی اولاد سے لینا چاہتے ہیں۔ اولاد کو اے ٹی ایم نہیں سمجھنا چاہیے کہ جس میں ایک کارڈ ڈالو اور وہ ہزاروں کے نوٹ پلٹ کر دے گی۔ بیٹوں کو انسان ہی سمجھنا چاہیے ان کے خواب خواہشوں اور کمزوریوں کو سمجھنا چاہیے، والدین اگر اپنا فرض ادا کرتے ہیں تو آخر میں انہیں اس کا اجر ملے گا اور اگر اولاد نافرمانی کرتی ہے تو وہ جواب دہ ہے۔ تمام ناراضی اور شکایات کے باوجود خدیجہ بیگم، نجیب کی سلامتی اور اس کی معجزاتی واپسی کے لیے دعاگو تھیں۔ شروع شروع میں تنگ آ کر امی نے گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا، عنایا ایسا

نہیں چاہتی تھی۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ حالات سے کیسے نپٹا جائے، بس اچھی بات یہ ہوئی کہ فلک نے جیسے تیسے کر کے میٹرک پاس کیا پھر کچھ عرصے بعد عنایا ان منہ زور بگڑتے حالات پر قابو پانے کے لیے کمر کس کر میدان میں اتری، سیلز گرل سے ٹیچر اور پھر کال آپریٹر کا سفر اس نے کانٹوں پر چل کر طے کیا تھا مگر ابھی منزل دور تھی، اسے ان پتھروں سے بھری رہ گزر کو بحفاظت پار کر کے سرخرو ہونا تھا اور اسے یقین تھا جس امید پر اس کی زندگی قائم ہے اس کی سحر ایک دن ضرور ہو گی۔

☆☆☆

فاروق کرکٹ گراؤنڈ جانے کی تیاری کر رہا تھا جب ایک سلوٹوں بھری پیشانی والا اور خود سے بھی بے نیاز چہرہ چھم سے اس کے ذہن کے پردے کے سامنے آ گیا اور پھر وہ اگلے کئی دنوں تک چاہ کر بھی اس لڑکی کو بھلا نہ سکا۔ ابا کی وفات کے بعد اس نے اپنے لیے سوچنا تو کب سے چھوڑ دیا تھا، دو چھوٹی بہنوں کی تعلیم اور شادی کی ذمہ داری اس پر تھی۔ امی بھی سلائی کر کے خرچوں کو بانٹنے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھیں، وہ نادرہ کے دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا، اباجی کی پنشن سے مل کر اچھا گزارا ہو جاتا تھا، نائلہ کی بات پکی ہو جانے کے بعد رضیہ بیگم اس کا سہرا بھی سجانا چاہتی تھیں، مگر وہ فی الحال اس سے بے نیاز تھا لیکن اب جب رت جگے بے چین کرنے لگے تو اس نے سوچا کہ اب کے امی نے دوبارہ بات کی تو ہاتھ نہیں چھڑائے گا اور یہ فیصلہ اچانک نہیں ہوا تھا۔ ہفتہ بعد ہی تو اس بے نیاز سی مار خان سے ٹکر ہو گئی تھی' جب حیرت انگیز طور پر وہ صبح کے وقت اسی اسٹاپ پر موجود تھی۔ عنایا کی اس پر نظر پڑی تو ایک چونکتی نظر فاروق پر ڈال کر بے نیاز ہو گئی اور پھر اگلے کئی دنوں تک فاروق خواب میں اس سے ملتا رہا......

☆☆☆

''عنایا میری بچی اب بس کر دے تو نے اپنی ذمہ داری سے بڑھ کر نبھایا اب مجھے بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہونا ہے۔ ایک دو رشتے دیکھ کر تیری شادی کر دوں گی میں۔'' برتن دھونے کے بعد وہ امی کے پاس آ کر بیٹھی تھی۔

''امی ابھی ابو کا علاج کروانا ہے، فلک نے کالج میں داخلہ لینا ہے۔ میں اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے نظریں جھکائے جواب دیا۔

کوئی گہری نگاہیں اس پر ٹکائے اک چہرہ عنایا کے خیال میں دستک دینے لگا۔ نجانے کیوں دوسری تیسری بار اسے دیکھنے پر عنایا کو احساس ہوا جیسے وہ اسے عرصے سے جانتی ہے، جیسے وہ دونوں ایک ہی چکی کے دو پاٹ ہوں۔ جو معاشرے سے اپنے جینے کا حق وصول کرنا چاہتے ہیں۔ فی الحال وہ بحث سے کتراتی وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

کئی موسم بدلے وقت بیتتا گیا مگر کچھ لوگ آپ کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے ٹھہر جاتے ہیں یادوں کی صورت وہ بھی فاروق کے خیالوں میں ڈیرا ڈالے بیٹھی تھی۔ نائلہ اور منیبہ کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ یونہی اپنے دل کو سنبھالے پھرتا رہا......

اور پھر ایک دن اچانک وہ اسے اسٹاپ پہ نظر آیا اس بار بھی وہ چونکی مگر نظریں نہ ہٹا سکی اور فاروق اسے اپنی بصارت پہ یقین نہ آیا۔ اس نے سامنے نظریں ٹکائیں تو عنایا کی آنکھیں بے اختیار جھک گئیں جن میں چھپا محبت کا پیغام فاروق کو اندر تک مسرور کر گیا۔

جاب کے کچھ عرصے بعد ہی عنایا کی شفٹنگ دور دراز کی برانچ میں ہوئی تو امی کے کہنے پر مقامی بس چھوڑ کر اس نے رکشا لگوالیا۔ وہ جو ایک "خاص" معمول کی عادی ہونے لگی تھی۔ یک دم کچھ کھو جانے کا احساس حاوی ہونے لگا تھا اور آج کسی ضروری کام سے اسے ہیڈ آفس جانا پڑا۔ واپسی پر رکشا والا غائب تھا لہٰذا بس اسٹاپ کا رخ کیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی دھندلایا ہوا چہرہ زندگی کی بھیڑ میں یوں بھی واضح ہوسکتا ہے۔

اور اس ایک لمحے میں عنایا کو یقین ہوگیا کہ زندگی کے دیے ان چاہے بوجھ کو وہ دونوں مل کر بھلے انداز میں ڈھو سکتے ہیں۔ مگر قسمت میں اس کا نصیب کیسا اور کس کے ساتھ جڑا ہے۔ یہ خیال اسے مزید کچھ سوچنے نہ دیتا، اس کی مطلوبہ بس آچکی تھی لہٰذا وہ یک دم انجان بنی بس میں سوار ہوگئی دل کی دھڑکن خواہ مخواہ اتھل پتھل ہوئے جارہی تھی۔ یوں لگا جیسے شبنم کی کتنی ہی بوندیں اس کا دامن بھگو گئی ہوں۔ وہ اس بات سے قطعی انجان تھی کہ کوئی آج اپنے معمول کو ترک کرکے اس کا پیچھا کررہا ہے۔

☆☆☆

"بیٹی آج شام جلدی آجانا اور تیار ہوجانا کچھ مہمان آرہے ہیں۔" خدیجہ کا انداز اس قدر سپاٹ تھا کہ وہ "کیوں" جیسا احتجاج نہ کرسکی۔ لوگ سادہ تھے کم و بیش ان ہی کی حیثیت کے۔ لڑکا معمولی تنخواہ دار مگر محنتی لگتا تھا، ایک ہی نظر میں عنایا ان کی پسند ٹھہری۔

"مجھے تو لگتا ہے پہلے سے کسی شادی وادی پر تجھے دیکھ رکھا تھا۔ تبھی کسی تکلف میں نہیں پڑے۔" وہ خشک تاثرات لیے ان کی باتیں سنتی رہی، لڑکے کی تصویر پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا۔ "جب دل میں کوئی احساس نہیں تو بے خبر رہنا ہی اچھا ہے۔" صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹے وہ سوچ رہی تھی تاروں بھرا آسمان اسے بیرن محسوس ہورہا تھا۔

نکاح بڑے دھوم دھام سے ہوا تھا۔ لڑکے والوں نے اپنی اوقات سے بڑھ کر ارمان نکالے تھے یقیناً۔

"باجی فاروق بھائی تو بڑے وجیہہ شخصیت کے مالک ہیں۔" فلک جس نے حال ہی میں یونی میں داخلہ لیا تھا اس کی اپنی ایک شخصیت بن گئی تھی چار لوگوں میں، اسی لیے رکھ رکھاؤ سے اگلے بندے کو پرکھتی تھی۔ مگر اس کی چہکار نے بھی عنایا کی دل کی دھڑکنوں کو بے قابو نہ کیا۔ فلک جس عجلت میں آئی تھی اسی بے نیازی سے باہر لوٹ گئی۔

کچھ دنوں بعد ہی باقاعدہ رخصتی اور ولیمے کی رسم تھی۔ عنایا بے دلی سے تیار ہوئی کچھ خاموش آنسو پلکوں کی باڑ پھلانگ گئے۔ اور پھر رخصتی کے بعد فاروق کے کمرے میں داخل ہونے پر بھی جب اس کا جھکا سر نہ اٹھا تو اس نے گلا کھنکارا۔

"کیا میں اس قابل بھی نہیں کہ میری نئی نکور دلہن ایک بار مجھے غور سے دیکھ ہی لے۔"

اس بار مجبوراً عنایا کو رخ انور اٹھانا پڑا اور آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"کیا؟ کب۔ کیسے؟ جیسے سوالات اس کے چہرے پر کھڑے تھے۔ جنہیں پڑھ کر فاروق کتنی ہی دیر لطف لیتا رہا۔ اور پھر جب اس نے تفصیلات عنایا کو بتانی شروع کیں تو یوں چاہے جانے کا الوہی احساس، چمک بن کر اس کے اردگرد رقص کرنے لگا۔

"قسمت یوں بھی مہربان ہوتی ہے فاروق"

گزرتے دنوں کے ساتھ ان دونوں میں ہم آہنگی بڑھ گئی تھی۔

"ہاں عنایا، نیت شفاف ہو تو پھر تقدیر کھوٹی نہیں ہوسکتی۔" عنایا نے مسکرا کر اس کے کاندھے سے سر ٹکا دیا۔

☆☆

بقیہ مقابل ہے آئینہ

☆"آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"

×"بچوں کے معاملے میں تھوڑی سی فضول خرچ ہوں ورنہ سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہوں۔"

☆"ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟"

×"بالکل بھی نہیں میں ستاروں کو بنانے والے پر یقین رکھتی ہوں۔"

☆"کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"

×"میرے خیال میں نہیں میں نے بہت اچھے ناموں والوں کو بھی برے کام کرتے دیکھا ہے۔"

☆"آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے؟"

×"آپ کتے کی بات کررہی ہیں کتا تو ہوتا ہی بڑا۔۔۔ کتا ہے میرے پیچھے اگر مرغی بھی لگ جائے تو جھٹ سے بے ہوش ہوجاؤں گی کیونکہ بھاگ آمنہ بھاگ تو میں ہوں نہیں۔"

☆"کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟"

×"میں کسی کا احسان ہمیشہ یاد رکھتی ہوں۔ اور ان کے لیے دعا ضرور کرتی ہوں اقبال صاحب کی وفات کے بعد ہر اس شخص کی احسان مند ہوں جنہوں نے دکھ کی گھڑی میں میرا ساتھ دیا۔"

☆"ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

×"دیکھتی ہوں۔ مجھے نعمان اعجاز کی اداکاری بہت پسند ہے ان کا ڈرامہ مس نہیں کرتی۔"

☆"پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور اور مطمئن کردیا ہو؟"

×"بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ جنہیں دوسروں کو سونپ کر خوشی ہوتی ہے پچھلے سال اپنی اکلوتی بیٹی عالیہ کی شادی اور پھر اس کا صاحب اولاد ہونا مسرور کر گیا۔"

☆"حقیقی خوشی کب ہوتی ہے؟"

×"جب میری ذات سے کسی کو فائدہ پہنچے۔"

☆"اگر دوست ناراض ہوجائے تو کیسے مناتی ہیں؟"

×"بدقسمتی کی بات ہے میری اور میری بیٹی کی کوئی دوست نہیں ہم ماں بیٹی ہی ایک دوسرے کی دوست ہیں نہ وہ کبھی مجھ سے اور نہ میں کبھی اس سے ناراض ہوئی تو پھر منانا کیسا۔"

☆"آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

×"میرا اپنے رب پر ایمان کے ساتھ مکمل بھروسا اور کامل یقین جو کبھی ہوتا ہے منجانب اللہ ہوتا ہے۔"

☆"اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"

×"اقبال صاحب کی عارضی جدائی (وہ بیرون ملک جاب کرتے تھے) اور پھر ان کی دائمی جدائی۔ گھر اور بچوں کی ذمہ داریاں ان دشوار گزار لمحوں کو میرا قلم تحریر نہیں کرسکتا۔"

بات چلی تو نیل گگن سے تارے توڑے لوگوں نے
وقت پڑا تو آنکھ چرالی جان سے پیارے لوگوں نے

☆"وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے دنیا کیا کہے گی؟"

×"دنیا کب چپ رہتی ہے کہنے دے جو کہتی ہے دنیا نہیں مجھے ہر وہ کام کرتے ہوئے خیال آتا ہے میرا رب کیا کہے گا۔"

☆"مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"

×میرے بے قرار دل نوں قرار آوے
رب میتوں جے اپنے گھر بلاوے

"اللہ کے گھر کی زیارت کی تڑپ ہے اور اپنی شاعری کو کتابی شکل دینے کی خواہش ہے۔"

☆"کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہو؟"

×"اپنے گناہ، اپنی غلطیاں، قبر کی وحشت، روز آخرت کی دہشت اللہ سے توبہ اللہ کی رحمت۔"

☆"کوئی آخری بات؟"

×کوئی ایج دا سجدہ لب جاوے
میں ہتھ چاواں رب من جاوے

☆☆

کرن کرن خوشبو

شعاع عمیر

القرآن

آسمان کی قسم اور رات کو آنے والے کی۔ اور کچھ تم نے جانا وہ رات کو آنے والا کیا ہے۔ خوب چمکتا تارا۔ کوئی جان نہیں جس پر نگہبان نہ ہو۔ تو چاہیے کہ آدمی غور کرے کہ کس چیز سے بنایا گیا۔ جست کرتے پانی سے۔ جو نکلتا ہے پیٹھ اور سینوں کے بیچ سے۔ بے شک اللہ اس کے واپس کردینے پر قادر ہے جس دن چھپی باتوں کی جانچ ہوگی۔ تو آدمی کے پاس نہ کچھ زور ہوگا نہ کوئی مددگار۔ آسمان کی قسم جس سے مینہ اترتا ہے۔ اور زمین کی جو اس سے کھلتی ہے۔ بے شک قرآن ضرور فیصلہ کی بات ہے۔ اور کوئی ہنسی کی بات نہیں۔ بے شک کافر اپنا سا داؤں چلتے ہیں۔ اور میں اپنی خفیہ تدبیر فرماتا ہوں۔ پس تو کافروں کو مہلت دے، انہیں تھوڑی دیر رہنے دے۔

(سورۃ الطارق......۱......۱۷)

احادیث نبوی

☆ حضور اکرم ﷺ گھر تشریف لائے تو روٹی کا ٹکڑا گرا ہوا دیکھا آپ ﷺ نے اسے اٹھا کر صاف کیا اور کھالیا اور فرمایا "اے عائشہ عزت دار چیز کی عزت کرو جب اللہ کسی قوم کا رزق چھین لیتا ہے تو واپس نہیں کرتا۔"

(ابن ماجہ جلد ۲ حدیث ۱۱۴۲)

☆ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:

"جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا نہیں کرتا، میں اس کے لیے اعلا جنت میں گھر کا ضامن ہوں۔"

(سنن ابی داؤد)

دیانت داری

ابن سعد فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک دن حضرت امیرالمومنین کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کنیز گزری۔ بعض کہنے لگے یہ باندی حضرت کی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ امیرالمومنین کو کیا حق ہے وہ خدا کے مال میں سے باندی رکھے۔ میرے لیے صرف دو جوڑے کپڑے ایک گرمی کا اور دوسرا جاڑے کا اور اوسط درجے کا کھانا بیت المال سے لینا جائز ہے۔ باقی میری وہی حیثیت ہے جو ایک عام مسلمان کی ہے۔ جب آپ کسی بزرگ کو عامل بنا کر بھیجتے تھے تو یہ شرائط سنا دیتے تھے۔

(1) گھوڑے پر سوار مت ہونا (2) عمدہ کھانا نہ کھانا (3) باریک کپڑا نہ پہننا (4) حاجت مندوں کی دادرسی کرنا۔

اگر اس کے خلاف ہوتا سزائیں دیتے۔

حافظہ رملہ مشتاق......حاصل پور

محبت

☆ پہلی محبت اور پہلی بارش دونوں ہی انسان کو مبہوت کردیتے ہیں۔

(ناصر کاظمی)

☆ سچی محبت یہ بھی ہے کہ بچھڑ جانے کے بعد اس کی کسک محسوس ہو۔

(بلراج ساہنی)

☆ محبت کے معاملے میں سب یکساں طور پر بے وقوف ہیں۔

(گوئٹے)

☆ محبت ایک خزانہ ہے جسے خوش قسمت لوگ

پاتے ہیں۔

(صوفیہ لورین)

☆ اکثر محبتیں اس لیے ضائع ہوجاتی ہیں کہ ہم اسے غلط آدمی کو سونپ دیتے ہیں۔

(مادام ایملی)

☆ محبت کے دھنک رنگوں میں سب سے گہرا رنگ جدائی کا ہوتا ہے۔

(ایڈگر ایلن پو)

کنول شاہین قیصر......تلہ گنگ

سات جاندار جو بن ماں کے پیدا ہوئے

1- حضرت آدم علیہ السلام
2- حضرت بی بی حوا علیہ السلام
3- حضرت محمد ﷺ کو معراج پر لے جانے والا براق (گھوڑا)
4- حضرت انس علیہ السلام کی اونٹنی
5- حضرت یونس علیہ السلام کو پیٹ میں رکھنے والی مچھلی
6- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مبارک سے بننے والا اژدھا
7- حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے وقت آنے والا دنبہ

افشاں سمیع......کراچی

عقلمند آدمی

ایک پرائیویٹ ہوائی جہاز میں چار لوگ سفر کررہے تھے۔ ایک ڈاکٹر، ایک وکیل، ایک مولوی صاحب اور ایک اسکول کا طالب علم۔ جہاز کا انجن جواب دے گیا، پائلٹ نے کاک پٹ سے نکل کر سب سے بولا کہ "میں پوری جان لگادی مگر یہ جہاز نہیں بچے گا بس کریش ہونے والا ہے۔ سب پیراشوٹ پہنیں اور چھلانگ لگادیں۔" مسئلہ یہ تھا کہ اب مسافر چار تھے اور پیراشوٹ تین۔ ڈاکٹر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پیراشوٹ پہنا اور چھلانگ لگادی اور جاتے ہوئے چیخا" میں ڈاکٹر ہوں دنیا کو میری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ میں لوگوں کو شفایاب کرتا ہوں۔"

پھر وکیل بولا "میں دنیا کا سب سے عقل مند آدمی ہوں میں وکیل ہوں" اور پیراشوٹ پہن کر یہ جا وہ جا۔ مولوی صاحب بوڑھے تھے۔ اسکول کے طالب علم سے بولے "بیٹا میں نے ساری زندگی گزارلی ہے آپ یہ پیراشوٹ لو اور جان بچاؤ" لڑکا ہنسا اور بولا کہ "انکل اس کی کوئی ضرورت نہیں یہ آپ ہی پہنیں، دنیا کا سب سے عقل مند آدمی میرا اسکول بیگ پہن کر چھلانگ لگا چکا ہے۔"

اقراجٹ......چمن آباد

بابا فرید

نہ غریب نوں دیکھ کے ہسیا کر
نہ بری نظر نال تکیا کر
لوکاں دے عیب لبھدا ایں فریدا
کدی اپنے اندر وی تکیا کر

فوزیہ ثمر بٹ......گجرات

روشن ستارے

☆ وہ گناہ سب گناہوں سے سخت ہے جو کرنے والے کے نزدیک معمولی ہے۔

☆ خدا سے ہمیشہ وہ طلب کرو جس کے تم حق دار ہو نہ کہ وہ جو تم چاہتے ہو، ہوسکتا ہے تمہاری چاہت کم ہو اور تم حق دار بہت زیادہ کے ہو۔

☆ سونے کو آگ پرکھتی ہے اور انسان کو مصائب زمانہ

☆ لوگ اونچے پہاڑوں سے ہی نہیں اکثر کنکریوں سے بھی پھسل جاتے ہیں۔

☆ جو شخص نرم دل رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کردیتا ہے۔

شبنم حنیف......لاہور

کافی

کیا آپ کو معلوم ہے کہ کافی جو آج دنیا کے مقبول ترین مشروبات میں سے ایک ہے، درحقیقت

مسلمانوں کی ایجاد ہے اور یہ کسی سائنس دان کا نہیں بلکہ عام چرواہے عرب کا کارنامہ ہے، جو اپنے جانوروں کو چرا رہا تھا کہ اسے ایک نئے طرز کا بیری ملا اور انہیں ابالنے کے بعد دنیا میں پہلی بار کافی تیار ہوئی۔

عائشہ تحریم......گوجرا

دیس دیس کی کہاوتیں

☆ آسمان کا حسن ستاروں سے ہے اور عورت کا حسن بالوں سے ہے۔(اٹالین کہاوت)

☆ نوجوان اور خرگوش کو کان سے پکڑنا چاہیے۔(جرمنی کہاوت)

☆ کسی کو جنگ پر جانے اور شادی کرنے کا مشورہ نہیں دینا چاہیے۔(اسپینی کہاوت)

☆ حسن خاموش بھی ہوتا تو بولتا ہے۔ (فرانسیسی کہاوت)

☆ شادی کے دن کوئی عورت دلہن سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوتی۔(اسپینی کہاوت)

☆ بیلوں کی لڑائی میں ہمیشہ مینڈک ہی مارے جاتے ہیں۔(جاپانی کہاوت)

اقرا عزیز......دریا خان جلبانی

کہیں ہم بھی تو......

بھیڑوں کو آج تک اس بات کا اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ نئی جگہ سے گزر رہی ہیں یا وہ ہی پرانا راستہ ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ چراگاہ نئی ہے یا بہار نے خزاں کی جگہ لے لی ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف چارے اور پانی کا حصول ہے۔

(الکیمسٹ......پاؤلو کوئیلہو)

فاخرہ بتول......موڑہ دھمیال

حکمران کی ذمہ داری

ایک مرتبہ خلافت عثمانیہ کے حکمران سلیمان قانونی (1520-66ء) کی خدمت میں ایک بوڑھی خاتون یہ شکایت لے کر حاضر ہوئی کہ خلیفہ کے سپاہیوں نے اس کے مویشی چرا لیے ہیں جبکہ چوری کے وقت وہ اپنے گھر کے اندر سو رہی تھی۔ سلیمان ذی شان نے بڑھیا کی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لیے ضروری تھا کہ اپنے مویشیوں کی حفاظت کے لیے رات کے لیے رات کو جاگتیں اور سونے سے اجتناب کرتیں!''

خلیفہ کی بات سن کر بڑھیا ٹکٹکی باندھے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، پھر اس کی سرزنش کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

''میرے آقا! میں نے سمجھا کہ آپ ہماری دیکھ بھال کے لیے جاگ رہے ہیں اس لیے میں کسی پروا کے بغیر اطمینان کی نیند سو رہی تھی۔''

بڑھیا کا اطمینان بخش جواب سن کر سلیمان کو اپنی غلطی کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہا، چنانچہ وہ گویا ہوا۔

''تمہارے ساتھ حق ہے (یعنی تم حق پر ہو)''

حرا کنول......سکرنڈ

نظم

جنوری کی کتنی شامیں آئیں
آ کر بیت گئیں
دل نے کوئی آہٹ
کوئی دستک محسوس نہ کی
لیکن اتنے برسوں بعد
آج کی شام میں جانے کیا ہے
دائیں آنکھ کا دایاں کونا
بھیگ گیا ہے۔

(نوشی گیلانی)

کنول شاہین قیصر......تلہ گنگ

☆☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

رباب راجپوت، کی ڈائری میں تحریر

مجاہد لکھنوی کی غزل

ہر سال جو آتا ہے، پھر آیا وہ نیا سال
لو بڑھتی ہوئی عمر کا اک اور گھٹا سال

دن ہفتے بنے، بن گئے ہفتوں کے مہینے
آغوش میں پھر بارہ مہینوں کی پلا سال

وہ بارہ بجے رات کے لمحات نہ پوچھو
پل بھر میں جو دیکھا تو یہ آیا وہ گیا سال

اک عمر بڑھاتا ہے اک آگے نہیں بڑھتا
مردوں کا جدا سال ہے، عورت کا جدا سال

سب کہنے کو کہتے نیا سال مبارک
معلوم نہیں ہوگا یہ اچھا کہ برا سال

سردی، کبھی گرمی، کبھی بارش، کبھی طوفان
دنیا کو دکھاتا ہے عجب ناز و ادا سال

برسوں سے دیا جاتا ہے اب نعتیں ہم کو
اک ہم سے گزرتا نہیں ہے جرم و خطا سال

توبہ کرو اور دل سے دعا مانگو مجاہد
بے خوف و خطر گزرے الٰہی یہ نیا سال

فردوس فہیم، کی ڈائری میں تحریر

ایک خوبصورت غزل

وہی گلیاں وہی کوچے وہی سردی کا موسم ہے
اسی انداز سے اپنا نظام زیست برہم ہے

یہ حسن اتفاق ایسا کہ نکھری چاندنی بھی ہے
وہی ہر سمت ویرانی، اداسی، تشنگی سی ہے

وہی ہے بھیڑ سوچوں کی وہی تنہائیاں پھر سے
مسافر اجنبی اور دشت کی پنہائیاں پھر سے

مجھے سب یاد ہے کچھ سال پہلے کا یہ قصہ ہے
وہی لمحہ تو ویرانے کا اک آباد حصہ ہے

میری آنکھوں میں وہ اک لمحہ موجود اب بھی ہے
وہ زندہ رات میرے ساتھ لا کھوں بار جاگی ہے

کسی نے رات کی تنہائی میں سرگوشیاں کی تھیں
کسی کی نرم گفتاری نے دل کو لوریاں دی تھیں

کسی نے میری تنہائی کا کرب بانٹا تھا
کسی نے رات کی چنری میں روشن چاند ٹانکا تھا

چمکتے جگنوؤں کا سیل اک بخشا تھا راتوں کو
دھڑکتا سا نیا عنوان دیا تھا میرے خوابوں کو

میرے شعروں میں وہ الہام کی صورت میں اترا تھا
معانی بن کے جو لفظوں میں وہ پہلی بار دھڑکا تھا

وہ جس کے ہونے سے زندگی نغمہ سرائی ہے
اسے کہنا کہ بھیگی جنوری پھر لوٹ آئی ہے

گُل میناخان، کی ڈائری میں تحریر
ابن انشا کی غزل

اپنا اپنا چاند

اک چاند پرانا صدیوں کا جس چاند کے پیٹ میں ہالہ ہے
اک چاند نئے لوگوں نے افلاک پہ آج اُبھارا ہے

اس چاند کا چہرہ اُجلا ہے، اس چاند کا رتبہ عالی ہے
اس چاند میں بھی گن لاکھوں ہیں اس چاند کی ہیبت نرالی ہے

اس چاند کے تو بھی دیوانے، اس چاند کے آلے لگتے ہیں
اس چاند چراغ کے پروانے، اس چاند کی عید مناتے ہیں

تم چاند نگر کے انشا جی کس چاند کے عاشق ہوتے ہو!
کس چاند پہ جی کھوتے ہو کس چاند شب پہ روتے ہو

صبا حمید، کی ڈائری میں تحریر
مریم ماہ منیر کی نظم

تو مثلِ مہتاب، ہی بن ذرا

تُو مثلِ مہتاب ہی بن ذرا
میرے سنگ تو دو گام چل ذرا
تجھے اپنے رنگ میں رنگ لوں
تجھے اپنی روح میں اُتار لوں
میری آرزو زندگانی تو بن ذرا
اندھیری راتوں کا چراغ تو بن ذرا
تجھی میں کُل کائنات اپنی بساؤں
تجھی کو جہاں میں اپنی بناؤں
میری شرط ہے فقط اتنی ذرا
میرے سنگ دو گام چل ذرا

ثنا شہزاد، کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی نظم

صرف ایک لڑکی

اپنے سرد کمرے میں
میں اُداس بیٹھی ہوں
نیم وا دریچوں سے
نم ہوائیں آتی ہیں
میرے جسم کو چھو کر
آگ سی لگا دیتی ہیں
تیرا نام لے لے کر
مجھ کو گدگداتی ہیں
کاش میرے پر ہوتے

تیرے پاس اُڑ آتی
کاش میں ہوا ہوتی
تجھ کو چھو کے لوٹ آتی
میں نہیں مگر کچھ بھی
سنگ دل رواجوں کے
آہنی حصاروں میں
عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں

کنول شاہین، کی ڈائری میں تحریر
افتخار عارف کی غزل

سرِ بام ہجر کا دیا بجھا تو خبر ہوئی
سرِ شام کوئی جدا ہوا تو خبر ہوئی

میرا خوش خرام بلا کا تیز خرام تھا
میری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی

میرے سارے حرف، تمام حرف عذاب تھے
میرے کم سخن نے سخن کیا تو خبر ہوئی

کوئی بات بگڑ گئی تو پتا چلا
میرے بے وفا نے کرم کیا تو خبر ہوئی

میرے قصہ گو نے کہاں کہاں سے بڑھائی بات
مجھے داستان کا سرا ملا تو خبر ہوئی

شگفتہ سلیمان



رباب راجپوت ____ پھول نگر
نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے نیا سال سب کو راس آئے

رفعت جبیں ____ ملتان
پھر نیا سال، نئی صبح، نئی امیدیں
اے خدا خیر کی خبروں کے اُجالے رکھنا

ام طاہرہ ____ ٹنڈو اکرم
ایک اور اینٹ گر گئی دیوارِ حیات کی
نادان کہہ رہے ہیں نیا سال مبارک

حنا کرن ____ پتوکی
اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کر اک شہرِ محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اجاڑ شامیں نہ آئیں لگے سال
اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں

شازیہ گلزار بھٹی ____ بھکر
یہ سال بھی گزرا ہے
تیرے پیار کی مانند
آتے ہوئے کچھ اور تھا
جاتے ہوئے کچھ اور

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ____ بھکر
تو مسکرائے سدا اور یونہی آباد رہے
خدا کرے یہ نیا سال تجھے راس آئے

حورین زینب ____ کہروڑ پکا
تیرے ہجراں سے تعلق کو نبھانے کے لیے
ہم نے اس سال بھی جینے کی قسم کھائی ہے

مسرت طارق ____ مظفر آباد
سردیوں کی شام ہے اور دھیان میں ہیں
دھند میں لپٹے ہوئے وعدے کسی کے

رانی ____ شورکوٹ
سالِ نو میں اک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو
سارے دل، سارے دریچے دھو جائے

آسیہ سرفراز ____ کوٹ چھٹہ
سردیوں کا موسم ہے برفیلی ہوائیں ہیں
سالِ نو آ چکا ہے جنوری کی شامیں ہیں
اداسیوں میں لیے ہوئے ماہ سال گزرے ہیں
چلے آؤ کہ صدیوں سے ترسی ہوئی نگاہیں ہیں

کنول شاہین ____ تلہ گنگ
شاید اس سال شکستہ ہوں مصائب کی سلیں
شاید اس سال ہی صحرا میں کچھ پھول کھلیں
راہِ ہستی کے دوراہے پہ اچانک اک دن
شاید اس سال ہی کچھ بچھڑے ہوئے آن ملیں

فرزانہ سرور ____ لاہور
وہ عنک رُت، یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل یہ کہتا ہے کہ موسم کوئی اب یاد آئے
ہم نے ماضی کی سخاوت پہ جو پل بھر سوچا
دُکھ بھی کیا کیا ہمیں یادوں کے سبب یاد آئے

قرۃ العین خرم ____ لاہور
ایک دن پوچھتی پھرے گی حیات
اہلِ دل کس نگر میں رہتے ہیں
منزلِ زیست کی کشش مت پوچھ
راستے بھی سفر میں رہتے ہیں

عائشہ عامر ____ دہاڑی
سال کی پہلی کرن کے ساتھ پھر جاگا ہے دل
پھر وہی طلب اب کے برس مل جانے کو

افشاں شریف ____ کراچی
نئی رُتیں، نئے خواب ہیں اور چاہتوں کے سلسلے
سالِ نو کے سنگ ہیں تیری گلاب رفاقتوں کے سلسلے

سیما کنول ـــــــــ روہڑی
سُنا تھا ٹوٹ کے جُڑنا بہت مضبوط کرتا ہے
سو ریزہ ریزہ کر بیٹھا اسی امید پہ خود کو

یاسمین ملک ـــــــــ چکوال
آغوش میں مہکو گے دکھائی نہیں دو گے
تم نکہت گلزار ہو ہم پردہ شب ہیں

فردوس فہیم ـــــــــ کراچی
آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

ابرہا دون ـــــــــ جہلم
اب ترے ذکر پہ ہم بات بدل دیتے ہیں
کتنی رغبت تھی ترے نام سے پہلے پہلے

ثمینہ عتیق ـــــــــ ملتان
زندگی کی راہوں میں ہم نے شام کر دی
دل کی ہر گھڑی ان کے نام کر دی
اتنا بھی نہ سوچا کیسے کٹے گی زندگی
بس بن سوچے ہر خوشی ان کے نام کر دی

نادیہ یاسر ـــــــــ کراچی
میں اپنے حالات سے صلح تو کر لوں لیکن
مجھ میں جو اک شخص روپوش ہے مر جائے گا

عابدہ نثار ـــــــــ کراچی
دم توڑ جاتی ہے ہر شکایت لبوں پہ آ کر
جب وہ معصومیت سے کہتے ہیں، میں نے کیا کیا ہے

ندا، نفضہ ـــــــــ گوجرہ
عشق کی نگری میں معافی نہیں کسی کو بھی
عشق عمر نہیں دیکھتا بس اُجاڑ دیتا ہے

صائمہ سندھو ـــــــــ اسلام آباد
عجیب لوگ بستے ہیں تیرے شہر میں محسن
مرمت کانچ کی کرتے ہیں پتھر کے اوزاروں سے

آسیہ جاوید ـــــــــ علی پور چٹھہ
اب نہ جاگیں گے راتوں کو تیری یادوں کے سہارے
ہم نے عادت کو بدلنا ہے تیری نظروں کی طرح

فرحین ظفر ـــــــــ کراچی
میں نے سمندر سے سیکھا ہے جینے کا سلیقہ
چُپ چاپ سے بہنا، اپنی موج میں رہنا

ارم ذوالفقار ـــــــــ گلستان جوہر
اس نے بھلا دیا تو شکوہ نہ کر اے زندگی!!
جن کو دل کی چوکھٹ پہ بٹھاؤں کے بے اختیار ہوتے ہیں

سعدیہ مریم ـــــــــ کراچی
محبت نہ کرتے تو آج اُداس نہ ہوتے
ایک چھوٹی سی خطا میری زندگی برباد کر گئی

عائشہ، تحریم ـــــــــ محراب پور
آج تنہا ہوں تو آواز تک نہ دی کسی نے
کل تک محفل میں تھا تو لوگوں کا ہجوم تھا

ثمینہ تاج ـــــــــ اسلام آباد
محفل لگی تھی بد دعاؤں کی ہم نے بھی دل میں کہا
اُسے عشق ہو، اسے عشق ہو، اُسے عشق ہو

ندا ادریس ـــــــــ لاہور
کانٹے بھی تم، پھول بھی تم
پتھر بھی تم، دھول بھی تم

پہچان تیری اے انسان آخر ہے کیا
یہاں قاتل بھی تم اور مقتول بھی تم

عفت شہزاد ـــــــــ کراچی
عشق انسان کو قلندر تو علی کرتا ہے
عشق پاگل نہیں، پاگل کو ولی کرتا ہے

رباب راجپوت ـــــــــ بھائی پھیرو
بکھر رہے ہیں مری زندگی کے تمام ورق
نہ جانے کب کوئی آندھی اُڑا کے لے جائے
میں کب تک دوسروں کے دُکھ سنبھال کے رکھوں فراز
جس جس کے ہیں وہ نشانی بتا کے لے جائے

رابعہ عمران چوہدری ـــــــــ رحیم یار خان
ٹھٹھرتی ہوئی شب سیاہ اور وہ بھی طویل تر
محسن ہجر کے ماروں پہ قیامت ہے جنوری

افشاں سمیع ـــــــــ کراچی
اک سال گیا اک سال نیا ہے آنے کو
پر وقت کا اب بھی ہوش نہیں دیوانے کو

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

ہماری ہیروئن

ساری فلم میں لوگ اس حصے میں دلچسپی لیتے ہیں جو انٹرول کہلاتا ہے، جس میں لوگ مشروبات پیتے، مونگ پھلی کھاتے اور کانوں سے پرانی روئی نکال کر نئی روئی رکھتے ہیں۔ ہر کردار اتنا اونچا بولتا ہے کہ آغا حشر کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔ پنجاب کے دیہات میں بہرہ پن عام ہے۔ ہیروئن اور سائڈ ہیروئن کے والدین بلکہ تمام گاؤں والے بہرے ہوتے ہیں، ورنہ تو کردار جس طرح چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے اظہار عشق کرتے ہیں، فوراً پکڑے جائیں اور جوتے کھائیں۔ ہیروئن اور دوسری لڑکیوں کی کود پھاند ایک طرح کی ورزش ہے اور یہ ہی ہماری ہیروئن کی قابل رشک صحت کا راز ہے۔

(ابن انشاء)

کنول شاہین قیصر......تلہ گنگ

زندگی

انسان اپنی زندگی میں بہت سی باتیں کبھی نہیں بھولتا، خاص طور پر وہ جو اس کی زندگی میں پہلی بار اس کے وجود پر دستک دیتی ہیں۔ پہلا حادثہ، پہلی نادانی، پہلا جھوٹ، کالج کا پہلا دن، پہلا نشہ، پہلا سفر اور پہلی محبت وہ آپ کی زندگی میں یوں شامل ہو جاتی ہے جیسے آپ کا سانس کا آنا جانا، آپ سانس لیتے ہیں، سوچے سمجھے بغیر۔ آپ ان باتوں کو کبھی نہیں بھولتے، چاہے یاد کریں یا نہ کریں، وہ سانسوں کی طرح آپ کے وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔

(ثروت نذیر......میں عبدالقادر)

فضہ نور......روہڑی

عشق مجازی

"تو وہ خود سے محبت کروائے، کسی ہمارے جیسے انسان کے لیے ہمیں کیوں بھٹکاتا ہے کہ ہم در بدر ہو جاتے ہیں، وہ تو مختار کل ہے، پھر ہمیں اپنی ہی بنائی مٹی کی مورتیوں کے لیے بے اختیار کیوں کر دیتا ہے، ہمارا عشق، ہماری توجہ اپنے تک محدود کیوں نہیں رکھتا۔

جو فقیر کر دیتی ہے، وہ ہی محبت ہوتی ہے، مل جائے تو بھی ٹھیک، نہ ملے تو بھی ٹھیک۔"

(فرزانہ کھرل...... پیار کا دوسرا شہر)

اقرا عزیز......گاؤں دریا خان جلبانی

سفارت کاری کا فن

سفارت کاری کے فن میں چینیوں کا اپنا ہی ایک خاص اور نرالا انداز ہے۔ وہ اپنے دوستوں پر بھی اپنی رائے یا مشورہ یا نصیحت خواہ مخواہ یا برملا ٹھونسنے کے عادی نہیں، لیکن اشاروں، کنایوں میں اپنا عندیہ نہایت خوش اسلوبی سے واشگاف طور پر ظاہر کر دینے میں انتہائی مہارت رکھتے ہیں۔

میرا اندازہ ہے کہ رات کے ڈھائی بجے مجھے جگا کر غالباً وہ اپنے مخصوص انداز میں یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ جنگ کے یہ ہی ابتدائی گھنٹے انتہائی اہم ہیں، ہندوستانی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور چینیوں کے خوف سے سر پر پاؤں رکھ کر ہر محاذ سے بھاگ رہی ہے۔ اگر پاکستان اس موقع پر کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، تو ہرگز وقت ضائع نہ کرے۔ میں نے فوراً لباس تبدیل کیا اور اپنی کار نکال کر تیز رفتاری سے ایوان صدر جا پہنچا۔ اس وقت کوئی تین بجے کا عمل تھا، کسی قدر تگ و دو کے بعد مجھے صدر ایوب کی خواب گاہ تک رسائی ہو گئی۔ میں نے انہیں چینی کے ساتھ اپنی گفتگو تفصیلاً سنائی، تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔

'یہ کوئی غیر متوقع خبر ہرگز نہیں، لیکن اتنی رات

گئے تمہیں صرف یہ خبر سنانے کے لیے آنے سے اس کا اصلی مقصد کیا تھا؟" میں نے اپنا قیاس بیان کیا، شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ ہم ان لمحات کو اپنے مقصد کے لیے کسی فائدہ مندی کے لیے استعمال میں لے آئیں۔

"مثلاً......" صدر ایوب نے پوچھا۔

"مثلاً......" میں نے اناڑیوں کی طرح تجویز پیش کی۔ "اسی لمحے اگر ہماری افواج کی نقل و حرکت بھی مقبوضہ کشمیر کی سرحدوں کے خاص خاص مقامات کی جانب شروع ہو جائے تو......" صدر ایوب نے تند و تیز لہجے میں میری بات کاٹ کر کہا۔

"تم سویلین لوگ فوجی نقل و حرکت کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہو۔ جاؤ اب تم بھی جا کر آرام کرو، مجھے بھی نیند آرہی ہے۔"

آج تک میرا یہی خیال ہے کہ اس رات صدر ایوب نے اپنی زندگی اور صدارت کا اہم ترین سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ اگر ان کی قائدانہ صلاحیتوں پر غنود کا غبار نہ چھایا ہوتا اور ان کے کردار میں شیوہ دیوانگی اور شیوہ سردانگی کا کچھ امتزاج بھی موجود ہوتا، تو غالباً اس روز ہماری تاریخ کا دھارا ایک نیا رخ اختیار کر سکتا تھا۔

(قدرت اللہ شہاب......شہاب نامہ)

فائزہ بھٹی......پتوکی

بے وفائی کا دکھ

بہت دکھ ہوتا ہے اس وقت کہ جس کے لیے ہم ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیں اور وہ خود دنیا میں آگے نکل کر ہمیں پیچھے اکیلا چھوڑ دے۔

(سمیرا حمید......یارم)

سعدیہ وحید سعدی......اسلام آباد

سرمہ

مستری مہتاب دین کی بیوی حکیم علی علم، مشہور موجد سرمہ کی تیسری بیٹی تھی۔ حکیم صاحب کا دعوا تھا کہ جو کوئی بھی ان کا سرمہ استعمال کرے گا، وہ دن کو تارے دیکھنے لگے گا۔ چنانچہ شہر لاہور میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو دن کے وقت صرف تارے ہی نظر آتے ہیں اور وہ حکیم صاحب مرحوم کی روح کو دعائیں دیتے ہیں۔

(محمد خالد اختر......لالٹین)

نوشین اقبال نوشی......گاؤں بدر مرجان

مشاعروں کی بود و باش

ایک بزرگ شاعر ہر مشاعرے میں اس قصے سے آتے کہ ہاتھ میں موٹی سی چھڑی ہوتی تھی اور ساتھ میں کیمرہ لیے ان کا بیٹا ہوتا تھا۔ بیٹا یوں تو بیٹھا اونگھتا رہتا تھا، لیکن جوں ہی ابا جان شعر پڑھنے کو کھڑے ہوتے، وہ حرکت میں آجاتا اور تصویروں پر تصویریں اتارتا رہتا۔ ابا جان بھی ایسے تھے کہ اپنی نشست پر جم کر نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ مختلف بہانوں سے ادھر ادھر آتے جاتے رہتے تھے کہ کہیں انہیں شروع ہی میں نہ بلا لیا جائے۔ ایک بار اپنے مخصوص ترنم میں غزل کا پہلا شعر پڑھا اور اسی ترنم میں لہک کر اس کی تقطیع بھی کر دی۔

فاعلن فاعلن فاعلن

بس پھر غضب ہو گیا۔ جوں ہی وہ شعر مکمل کرتے، سارا مجمع اس ترنم میں اور قوالی کے انداز میں اس کی تقطیع کرنے لگتا۔ وہ پہلے تو محظوظ ہوئے، پھر خفا، پھر ناراض، برہم اور آخر میں چھڑی اٹھائی، بیٹے کا ہاتھ تھاما اور محفل سے اس بڑھیا کی طرح نکل گئے جو اپنا مرغ بغل میں داب کر گاؤں سے چلی گئی تھی، لیکن مقطع سنائے بغیر نہیں گئے۔

(رضا علی عابدی......اردو کا حال)

☆☆

روبینہ شریف

مسکراتی کرنیں

کفایت شعار

بیوی بازار سے گھر آئی تو شوہر سے بولی۔

"تمہارے لیے کپڑا خرید کر لائی ہوں۔ اس سے تمہارے لیے خوب صورت رومال بناؤں گی۔"

شوہر نے حیران ہو کر کہا۔ "اس سارے کپڑے سے تم میرے لیے رومال بناؤ گی۔ بھئی یہ تو درجن بھر رومالوں کے لیے بھی بہت ہے۔"

بیوی نے مسکرا کر انکشاف کیا۔

"ایک رومال سے جو کپڑا بچے گا، میں اس سے اپنی شلوار قمیص بناؤں گی۔"

اقصیٰ شہزاد......ملتان

بھروسا

بیوی نے شوہر سے پوچھا۔ "آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟"

شوہر نے جذباتی ہو کر کہا۔ "میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔"

"پھر بھی بتایے تو اگر میں مر گئی تو آپ کیا کریں گے؟" بیوی نے پوچھا۔

"مجنون بن جاؤں گا۔" شوہر نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دوسری شادی تو نہیں کریں گے؟" بیوی نے بے یقینی سے پوچھا۔

"دیکھو بیگم! پاگل کا کیا بھروسا...... وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

شوہر نے جواب دیا۔

رابعہ اظہر......گوجراں

قانون

دو ویل ڈریسڈ وکیل ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں گئے اور دو کپ کافی کا آرڈر دیا۔ پھر اپنے بریف کیس میں سے دو سینڈوچ کھانے کے لیے نکالے تو ویٹر نے انہیں ٹوکا۔

"سوری سر! آپ یہاں اپنا کھانا نہیں کھا سکتے۔ یہ رولز کے خلاف ہے۔"

وکیلوں نے اطمینان سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنے سینڈوچز آپس میں تبدیل کر لیے اور انہیں کھانے لگے۔

امرین عامر......کراچی

اف یہ موبائل

شوہر نے غصے سے اپنی بیوی سے کہا۔

"یہ کیسی دال پکائی ہے۔ نہ نمک، نہ مرچ، تم سارا دن موبائل پر لگی رہتی ہو، کچھ پتا ہی نہیں چلتا، کیا ڈالتا ہے، کیا نہیں۔"

"پہلے آپ موبائل سائڈ پر رکھ کر کھانا کھایے۔ کب سے دیکھ رہی ہوں، پانی میں ڈبو ڈبو کر روٹی کھا رہے ہیں۔"

بیوی نے آرام سے جواب دیا۔

لبنیٰ خاور......فیصل آباد

فراخدلی

اسکاٹ لینڈ کے لوگ کنجوسی کے لیے مشہور ہیں۔ ایک اسکاٹ کا بیٹا امتحان میں فرسٹ آیا۔ باپ نے اس کا نتیجہ دیکھ کر اس کی ہمت افزائی کے لیے کہا۔ "بیٹا! مجھ سے صرف ایک چیز مانگو، تا کہ میں تمہیں انعام کے طور پر دے سکوں۔"

اس کے ننھے بیٹے نے کہا۔ ''بہت اچھا بابا! لیکن مجھے اجازت دیں کہ میں کچھ سوچ لوں۔'' باپ نے کہا۔ ''بہت اچھا...... تم سوچ سکتے ہو۔''

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بیٹے نے کہا۔ ''ہاں ابا جان! اگر ممکن ہو تو مجھے ایک بائیسکل خرید دیں۔''

باپ نے کہا۔ ''نہیں بیٹے! اب یہ ممکن نہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک چیز مانگو، تم نے مجھ سے جس چیز کی اجازت مانگی، جو میں نے تمہیں دے دی۔''

اسما کریم...... جھنگ

سوا سیر

ایک رنگ ساز کے پاس کوئی آدمی کپڑا رنگوانے کے لیے آیا تو رنگ ساز نے پوچھا۔ ''کون سا رنگ کرنا ہے؟''

آدمی نے کہا۔ ''سفید، کالے، سرخ، نیلے، پیلے زرد، خاکی اور سبز کے علاوہ جو چاہے کر دیں۔''

رنگ ساز نے یہ سن کر کہا۔ ''اچھی بات ہے، آپ ہفتہ، اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات اور جمعہ کے علاوہ جس دن بھی جی چاہے آ کر لے جائیں۔''

سونیا علی۔ تصور

احتجاج

نوجوان مریض نے ماہر نفسیات کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا، تو اس نے مریض سے اس کے دل کی بات اگلوانے کا طریقہ سوچا۔ چند لمحوں بعد اس نے کاغذ پنسل سے ایک عمودی لکیر کھینچی اور مریض سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''دلکش لڑکی!'' نوجوان مریض نے فوراً جواب دیا۔

ماہر نفسیات نے اس عمودی لکیر پر ایک طرف سے افقی لکیر کھینچ کر پھر مریض سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''دلکش لڑکی تھوڑا سا جھک کر بال سنوار رہی ہے۔'' نوجوان مریض نے خوش گوار لہجے میں جواب دیا۔

''میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا۔'' ماہر نفسیات نے کہا۔ ''تمہارے دماغ میں جنسیات بھری ہوئی ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ گندی گندی تصویریں تو آپ خود بنا رہے ہیں۔'' نوجوان مریض نے شکوہ کیا۔

قرۃ العین...... لاہور

قابل دید

کراچی کے ایک دفتر میں کام کرنے والے ایک کلرک کی آواز ویسے ہی کافی اونچی تھی اور جب وہ فون پر کسی سے ناراض ہوتے یا بحث میں الجھتے تو اور بھی زیادہ زور سے چلانے لگتے تھے۔

ایک روز وہ اسی طرح چلا رہے تھے کہ آواز جنرل منیجر کے کمرے تک پہنچ گئی، جی ایم نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلایا اور پوچھا ''کون صاحب چلا رہے ہیں؟''

''سر یہ عابد خان صاحب ہیں، لاہور اپنے بہنوئی فہیم فاروقی سے بات کر رہے ہیں۔'' چپڑاسی نے بتایا۔

''تو کمبخت عقل کیوں نہیں استعمال کرتا؟ آخر ہم نے فون کس لیے لگوائے ہیں۔'' جی ایم غصے سے بولے۔

نمرہ، اقرا...... کراچی

ڈبل سم

میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''میرا دل ایک موبائل ہے اور تم اس کی ''سم کارڈ'' ہو۔''

بیوی آہستہ سے بولی۔ ''ایک بات پوچھوں آپ سے؟''

میں نے کہا۔ ضرور پوچھو؟''

وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''تمہارا موبائل ''ڈبل سم'' والا تو نہیں ہے نا؟''

حنا کرن...... چتوکی

☆☆

نامے میرے نام

الوش ابصار...... قائداعظم یونی ورسٹی

میں نے خود کو کبھی اس قابل سمجھا نہیں تھا کہ میں کرن میں اپنی رائے دوں گی اس کا اتنا احترام کیا جائے گا کہ صفحہ پر سج جائے بہت شکریہ۔

اب آتی ہوں اس ماہ کے کرن کی طرف سرورق پر بجی سبز سوٹ میں ماڈل جو پوری ادا سے اپنا بند ادیکھ کر ہمیں چڑا رہی ہیں اچھی لگی۔ پھر حمد و نعت سے مستفید ہوتے ہی جمپ لگائی جی ہاں ''مجبور فیشن'' کی طرف۔ اف ہر جملے پر دل دھڑکنے لگتا ہے۔ مصباح جی پلیز اس کا اینڈ اچھے والا کرنا۔ ''رلی پزل'' کے بعد وہ صفحات ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نے لے لیے ہیں۔ یقیناً یہ بھی اچھا رہے گا۔ ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' میں حوریہ کا بدلتا رویہ خوش گوار لگ رہا ہے۔ نادیہ احمد کا ناول ''جنوں مائل'' اففف پہلا سین یہ کئی بار کئی ناولز میں پڑھ چکے ہیں۔ ٹھیک ہے دوسری، تیسری شادی قسمت سے کرنی پڑ جاتی ہے لیکن مرد کو اتنا تو خیال کرنا چاہیے ایٹ لیسٹ پہلی رات کو تو اولاد کا تحفہ نہ دے، یہ سب بعد میں کہہ سکتا ہے۔ صدف ریحان گیلانی نے اب کی دفعہ بھی بہت اچھا اور محنت سے لکھا۔ افسانے سارے ہی ٹاپ کلاس تھے خاص کر نزہت جبیں ضیاء کا ''راہ طلب'' بہت ہی پسند آیا۔

ج: پیاری الوش! آپ سب بہنیں ہمارے لیے بہت قابل احترام ہیں اور آپ لوگوں کی رائے سے ہی آپ کا کرن اپنے قدم آگے بڑھاتا ہے۔ کرن کی پسندیدگی کے لیے بے حد شکریہ۔

ثناء شہزاد...... کراچی

دسمبر کا شمارہ 13 تاریخ کو ملا سرورق اچھا لگا اداریہ اور حمد و نعت پڑھنے کے بعد اسد محمود سے ملاقات کی۔ حنا الطاف کی سنی اس کے بعد پہلے ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' پڑھا اس قسط کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ حوریہ کے دل میں بابر کا خیال آ ہی گیا اب اس کہانی کا اختتام بہت اچھا سا ہونا چاہیے۔ نگہت عبداللہ کا ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کی دوسری قسط پسند آئی یہ کہانی اچھی چلے گی۔ ''مجبور فیشن'' پڑھ کر بے ساختہ مصباح علی سید کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اللہ پاک انہیں صحت سے بھرپور لمبی زندگی عطا کرے آمین۔ ''جنوں مائل'' نادیہ احمد نے بہت کمال کا لکھا۔ صدف ریحان گیلانی ''ضروری تو نہیں'' میں آ کر چھا گئیں صدف ریحان گیلانی جلدی جلدی آیا کریں۔ یمنیٰ اختر ''حصار ذات'' بس سو سو تھا نہ بہت اچھا نہ برا۔ ام ایمان کی تحریر ''احساس سے گندھے لوگ'' بہت پسند آئی۔ حیات نام اچھا لگا۔ اب کی بار افسانے چاروں ہی اچھے تھے۔ جو نمبر ون رہا وہ نزہت جبین ضیاء کا ''راہ طلب میں'' بہت شان دار لکھا۔ انعم خان کی ''نابینا'' روایتی سی کہانی تھی۔ آسیہ مظہر چوہدری نے بھی اچھا لکھا۔ نظیر فاطمہ کا ''وہ جو اپنے تھے'' پسند آیا۔

ج: پیاری ثناء! آپ تو کرن کی مستقل قاری ہیں اور ہر ماہ آپ کا تبصرہ کرنا اچھا لگتا ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران آمنہ رئیس۔ گجرات

دسمبر کے کرن کا ٹائٹل پہلی نظر میں پسند آ گیا۔ مگر چٹیاں کلائیاں سونی سونی کیوں تھیں۔ ست رنگی چوڑیاں ہونی چاہیے تھیں ''اداریہ'' حسب روایت ہر ماہ یہ محفل پر اثر ہوتی ہے۔ ''حمد باری تعالیٰ'' ''نعت

رسول مقبول'' دل و جان سے پسند ہیں۔ انٹرویو میں اسد محمود مجھے حسرت سی ہوئی میں نے موصوف کو ابھی تک اسکرین پہ نہیں دیکھا۔ ''میری بھی سنیئے'' میں حنا الطاف اچھی لگیں۔

سب سے پہلے ''مجبور نشیمن'' کو پڑھا کہ بڑی بے چینی سے پورا ماہ اس کا انتظار کیا تھا۔

ساری قسط ہی زبردست رہی پلیز جلدی سے سسپنس ختم کریں اور حنبل اور روائیہ کو پھر ایک ہونے کا موقع دیں۔

دوسرا ناول ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' پڑھا۔ چلو جی یہ تو خوش کن بات ہوگئی کہ حوریہ کو بابر کی ضرورت پڑ گئی ۔ حوریہ کو سمجھ داری سے کام لینا چاہیے۔ علی شاہ کو اپنے حقیقی رشتوں سے جدا نہ کرے کسی اچھے موڑ پر اس کہانی کو ختم ہونا چاہیے اب۔

نادیہ احمد کا ''جنوں مائل'' زبردست تحریر۔ اذلان کے گناہ گاروں خود ہی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ چاروں افسانے اچھے تھے۔ ''نابینا'' اور ''دو کوڑی کی عورت'' دونوں کا موضوع ایک ہی تھا۔ عورت محبت میں بک جاتی ہے اور بے مول خریدار ہیں۔ محبت اور عزت کے سمجھوتوں میں جب عزت کو محبت پر فوقیت دی جائے تب پھر نہ محبت باقی بچتی ہیں اور نہ پھر عزت ملتی ہے۔ پہلا افسانہ ''وہ جو اپنے تھے'' ہمارے معاشرے کے ہر تیسرے گھرانے کی اسٹوری تھی۔ ہر کوئی ہر رشتہ کو کیش کروا رہا ہے۔ مستقل سلسلے اچھے لگے۔

میری طرف سے آپ سب اسٹاف کو نئے سال کی بہت ساری خوشیاں ملیں۔ بس یہی دعا ہے۔ ہمارے ملک کو دشمنوں کی نظر بد سے بچائے۔ آمین

کرن کتاب میں آپ نے میرا پیغام من وعن شائع کر دیا ہنس ہنس کر میرا برا حال ہوگیا۔ میں نے یہ کتاب سنبھال کر رکھ دی ہے کہ حسین بڑا ہوگا تو اسے پڑھاؤں گی۔

ج: فوزیہ جی! ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ آپ نے مصروفیت کے باوجود ''کرن'' پڑھا اور ہمیں اپنی رائے سے نوازا۔ کرن کے سارے اسٹاف کی طرف سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے والے سال آپ کے لیے خوشیاں ہی خوشیاں لائے آمین۔

سدرہ بتول......ملتان

پہلے تو سب کو نئے سال کی مبارک باد۔

''خدا کرے نیا سال سب کو راس آئے'' ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' ابھی تک تو نہیں بدلیں آگے آگے دیکھتے ہیں کیا ہوگا۔ ''نظیر فاطمہ'' افسانہ اچھا تھا سچ ہی کہتے ہیں کہ۔

یہ جو دل میں قیام کرتے ہیں
یہی جینا حرام کرتے ہیں

دھوکا، دکھ سب اپنے ہی دیتے ہیں۔

چلیں چھوڑیں اس کہانی کے تبصرے پہ سارا رسالہ بھر جائے گا آپ کا۔ ''ضروری تو نہیں'' ناکس ون بٹ اگین'' یہ جو دل میں...... جینا حرام۔'' ہاہاہا اور دوسری بات کہ اب وقت بدل رہا ہے ماں باپ کو تھوڑا مارجن دینا چاہیے ہر دفعہ بڑے درست فیصلہ نہیں کر سکتے۔

ام ایمان کی ''احساس سے گندھے لوگ'' سوری ٹو سے بٹ ٹیپکل سی اسٹوری تھی۔

'راہ طلب'' کیا یار بس قربانی قربانی قربانی کی کہانیاں اب تو اکتاہٹ ہونے لگی ایک جیسی کہانیاں پڑھ کے۔ سوری' بٹ اپنے اپنے نظریے کی بات ہے۔ کیا عورت صرف ارتقاء کا ذریعہ ہے؟ یمنیٰ اختر کا ناولٹ زبردست تھا کہیں کہیں ڈائیلاگ مزے کے تھے۔ انعم خان کا افسانہ ''نابینا'' انف مطلب حد ہی ہوگی جو کام رامین شرافت سے کرنے لگی تھی کہ ماں باپ کے پاس اس کا رشتہ لائے لڑکے والے تو قبول کرنے میں کیا حرج تھا اگر مان جاتے تو رامین کبھی ایسا قدم نہ اٹھاتی ''دو کوڑی کی عورت'' بھی اچھی کہانی تھی۔

ج: سدرہ بتول جی! آپ کا تبصرہ کچھ ادھورا سا لگا۔ امید ہے آئندہ ''کرن'' کی تمام کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کریں گی۔ جہاں تک قربانی کی کہانیوں کی بات ہے تو عورت کا تو دوسرا نام ہی قربانی ہے کہیں ماں باپ کے لیے قربانی۔ کہیں

شوہر کے لیے اور کہیں بچوں کے لیے۔ آنے والے سال کے لیے ''کرن'' کے اسٹاف کی طرف سے نیک تمنائیں۔

اقرا امتیاز......سرگودھا

اس دفعہ ٹائٹل گرل کے ایئر رنگز بہت پسند آئے۔ اسد محمود سے ملاقات کر ہی رہے تھے کہ حنا الطاف نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں آمنہ سے ملاقات کی۔

''مجبور نشیمن'' میں حنبل کا رویہ ہضم نہیں ہو رہا۔ اذلان اب کیوں پچھتا رہے ہو۔ اب اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کرو کہ حنبل کو ساری بات بتا سکو۔

مکمل ناول ''ضروری تو نہیں'' شجاع ہی جازمہ کا ہمسفر بنے۔ شجاع وہ کہاں گئے تمہارے وعدے۔ بس اتنی سی ہی محبت تھی۔ آخر کار خیام کو جازمہ مل ہی گئی۔ نادیہ احمد کی تحریر کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ''جنوں مائل'' کیا زبردست اسٹوری تھی۔ صرف دولت کی خاطر ان باپ بیٹے کی زندگی اجیرن کر دی۔

ناولٹ ''احساس سے گندھے لوگ'' ولید اور حیات کی نوک جھوک سے خاصے لطف اندوز ہوئے آخر انسان ٹھوکر کھا کر ہی کیوں سنبھلتا ہے۔ سعید کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بازو کاٹنا ہی تھا تو ولید کے ساتھ یہ حادثہ پیش آتا۔ ''حصار ذات میں اترے تو'' اس سٹوری میں کیا مشکل مشکل نام تھے۔ اسٹوری اچھی تھی۔ افسانہ ''دو کوڑی کی عورت'' کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا۔ ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' ناول اختتام کی طرف گامزن ہے۔ اب حوریہ اور بابر کا ملاپ ہو ہی گیا۔ کنول شہزادی اسکالرشپ کی بہت بہت مبارک ہو۔ کرن کتاب تو ہے ہی بیسٹ میری طرف سے سب کو ہیپی نیو ایئر خدا ہم سب کے لیے نیا سال خوشیوں کا پیغام لائے۔

ج: اقراء! کرن کی کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ قارئین سے درخواست ہے کہ ''نام میرے نام میں'' پیغام نہیں دیا کریں یہ محفل صرف کرن کی کہانیوں اور سلسلوں پر تبصرے کے لیے ہے پیغامات کے لیے ہم نے ایک الگ سلسلہ شروع کیا ہے جو ''کرن کتاب'' میں ''آپ کا پیغام اپنوں کے نام'' سے شائع ہوتا۔ آپ اپنا پیغام اس میں بھیج سکتے ہیں۔

فضہ نور......روہڑی

اس بار بھی میرا خط شائع نہیں ہوا۔ لگتا ہے آپ کی بھی ردی کی ٹوکری کو بھوک لگنے لگی ہے جو میرے ہی خط کھانے لگی ہے میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ میں 19 یا 20 تک اپنا خط پوسٹ کروادوں اور زیادہ تر 19 یا 21 تک پوسٹ کروا دیتی ہوں۔ آپ مجھے یہ بتا دیں کہ خط کب تک پوسٹ ہو جانا ہے چاہیے جو آپ تک پہنچ جائے۔ اس ماہ کا ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ حمد و نعت سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد انٹرویو پڑھے اسد محمود سے ملاقات اچھی رہی حنا الطاف کی بھی سنی آمنہ کے مقابل ہے آئینہ اچھا رہا۔

پچھلی بار ''رلپنزل'' تنزیلہ ریاض کا سلسلہ وار ناول کا اختتام بہت زبردست رہا تنزیلہ جی کو بہت مبارک باد اتنا اچھا ناول لکھنے پر۔

نیا سلسلہ وار ناول ''ہوائیں رخ بدل گئیں''۔ ''ابھی اسٹارٹنگ تو اچھی رہی' دونوں اقساط اچھی رہیں مکمل ناول ''مجبور نشیمن'' مصباح آپی بہت لاجواب قسط لے کر آئی ہیں۔

ناولٹ ''احساس سے گندھے لوگ'' ام ایمان قاضی واقعی سپرہٹ رہی اسٹوری۔ حیات کا اعتماد اس کے مکالمے بڑے جاندار لگے۔ ''حصار ذات'' یمنیٰ اختر حقیقت سے قریب تر اکثر ماں باپ بچوں کو دولت کمانے کی خاطر اپنی شفقت سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ فسانہ حیات بیان کیا ہے یمنیٰ نے بالکل ایسے لگ رہا تھا۔

آپی میں اپنا مقابل ہے آئینہ بھیج رہی ہوں۔

ج: فضہ جی! جب آپ کا خط ہمیں موصول ہو جاتا ہے تو ہم ضرور شائع کرتے ہیں یقین مانیں کہ آپ کا خط ہمیں ملا ہی نہیں تھا۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ اگر ہمیں دیر سے بھی ملے تو ہم

پڑھتے ضرور ہیں۔ آپ کے ''مقابل ہے آئینہ'' کے جوابات ہمیں موصول ہو گئے ہیں ان شاءاللہ شائع کریں گے۔

لیلیٰ رب نواز......ودپھوالی بھکر

پہلی بار کرن میں خط لکھ رہی ہوں اور خط لکھنے کی وجہ مصباح جی کا ''مہجور نشیمن'' ہے۔ مصباح جی مجھے آپ کا مہجور نشیمن بہت پسند آیا اور پلیز ''مہجور نشیمن'' کا مطلب بھی بتا دیں اذلان کا کردار بالکل بھی پسند نہیں آیا میرا دل کرتا ہے کہ اس کا گلا دبا دوں لیکن ہائے رے مجبوری ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' میں حوریہ اور بابر کی جوڑی بیسٹ ہے پلیز حوریہ کا دل اب بابر کے لیے موم کر ہی دیں اتنا امتحان نہ لیں بابر کا کیونکہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور باقی رائٹرز سے گزارش ہے کہ کوئی چودھری والی کہانیاں لکھیں اور ان کا اینڈ بھی اچھا ہونا چاہیے لیکن ہو ایک دو قسط والی پلیز اور سب سے اہم بات تو بھول گئی پلیز میرا لیٹر شائع کر دیجیے گا اور عاطف اسلم اینڈ عمران عباس کا انٹرویو شائع کر دیں مجھے انتظار رہے گا۔

ج: لیلیٰ جی! ''مہجور نشیمن'' کا مطلب ہے چھوڑا گیا آشیانہ۔ لیلیٰ جی! لگتا ہے کہ اب ہماری صرف سلسلہ وار کہانیاں پڑھتی ہیں کیونکہ آپ نے باقی کرن کی کہانیوں اور سلسلوں پر تو تبصرہ کیا ہی نہیں۔ امید ہے آئندہ آپ باقی کہانیوں پر بھی تبصرہ کریں گی۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔

شبنم حنیف......لاہور

دسمبر کا شمارہ 19 کو ملا۔ سب سے پہلے مصباح علی سید کا ناول ''مہجور نشیمن'' پڑھا۔ حسب معمول یہ قسط بھی زبردست تھی۔ نادیہ احمد کا ناول ''جنوں مائل'' بھی شاندار تھا۔ ناولٹ میں یمنیٰ اختر کا ''حصار ذات'' پسند آیا۔ افسانوں میں انعم خان کا افسانہ ''نابینا'' بہت منفرد تھا۔ ''نامے میرے نام'' میں سب ہی خط شوق سے پڑھتی ہوں۔ (اور جب اپنا خط دیکھوں گی تو شوق مزید بڑھ جائے گا) ''مسکراتی کرنیں'' میں ثمینہ اکرم کے لطائف اچھے لگے۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' بہت ہی زبردست سلسلہ ہے۔ جو پیراگراف زیادہ پسند آتا ہے وہ میں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتی ہوں۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا تھا کیا۔ پیراگراف بھیجنے کے لیے کتاب کا نام اور رائٹر کا نام لکھنا ضروری ہے یا پھر بغیر رائٹر کے نام کے پسندیدہ پیراگراف بھیج سکتے ہیں۔ ''میری بھی سنیے'' میں حنا الطاف سے ملاقات اچھی رہی۔ الغرض کرن کے تمام سلسلے زبردست ہیں۔ میں اور میری بہنیں ثمرین اور نسیم کرن بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ کرن ہمیں 15، 16 تک ملتا ہے۔ کرن کے لیے خط بھیجنے کی لاسٹ ڈیٹ کون سی ہے کیونکہ بعض اوقات خط پوسٹ کرنے کے لیے بھائی کو ٹائم نہیں ملتا یا پھر کوئی اور پرابلم ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے جلدی پوسٹ نہیں کر پاتے۔ آپ آخری تاریخ بتا دیں تاکہ کوشش کریں تب تک بھیج سکیں۔

ج: شبنم جی! کرن میں خط لکھنے کا بہت شکریہ۔ خط ہمیں کم از کم 28 تاریخ تک پہنچ جانا چاہیے۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' میں آپ یا تو رائٹر کا نام یا کتاب کا نام ضرور لکھیں۔ ہمیں آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

فوزیہ اسد، مریم اسد، مبشرہ اسد......چیچہ وطنی حیات آباد

بھیگے بھیگے دسمبر کا نکھرا سا کرن بہت، بہت پسند آیا اور تھاہ کر کے دل میں اتر گیا۔

''ہوائیں رخ بدل گئیں'' بہت زبردست ناول ہے نگہت عبداللہ نے جب بھی لکھا کمال کا لکھا اور اپنی ہر تحریر میں کمال ہی کر دیا۔

''آواز کی دنیا میں'' جمیل احمد کی آواز سن کر دل باغ باغ ہو گیا ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' آسیہ مرزا بہت پیاری ہیں اور اپنی طرح کا پیارا ناول انہوں نے کرن کو دیا ہے اور کرن نے تو کتنے ہی پھولوں کی جڑیں مضبوط کی ہیں آسیہ بھی ان ہی میں سے ہیں۔

''صدف ریحان'' کا مکمل ناول میں رات دیر تک پڑھتی رہی بچوں نے ادھم تو بہت مچایا پر آدھا پڑھ کر سکون کی نیند کہاں جب تک پورا ناول نہیں پڑھ لیا!

اداکارہ حنا الطاف کو سن کر اچھا لگا! ''جنوں مائل'' نادیہ احمد کا ناول اپنی نوعیت کا منفرد ناول تھا!

میں سب سے پہلے ''مسکراتی کرنیں'' پڑھتی ہوں تاکہ مسکرا کر ماہنامہ کرن کی ابتدا کروں! ام ایمان اور یمنیٰ اختر کے ناولٹ اچھے تھے! مستقل سارے سلسلے ہی زبردست ہیں۔ نظیر فاطمہ، نزہت جبیں اور انعم خان کے افسانے بھی اچھے تھے۔ یہ تھا کرن کی کاوشوں پر محبت بھرا تبصرہ اور کرن کے تمام اسٹاف کے لیے اک شعر

میں زندگی کی جنگ میں ہارا ضرور ہوں
مگر کسی محاذ پر بھی پسپا نہیں ہوا......!!

ج: فوزیہ جی! آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے ہماری کاوشوں کو سراہا امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ''نامے میرے نام'' کی محفل میں شرکت کرتی رہیں گی۔

صائمہ مشتاق......بھاگٹانوالہ سرگودھا

اس دفعہ کئی ماہ کی دوری کے بعد کرن پر تبصرہ کر رہی ہوں اس لیے کرن یہاں ہی پڑھ لیا اور یہاں سے کیا پوسٹ کروائی اب آتی ہوں شمارے کی جانب ٹائٹل گرل تو بہت پیاری لگ رہی تھی اس کے بعد ''حمد'' اور ''نعت'' کو پڑھا۔ اسد محمود سے ملاقات اچھی رہی ''آواز کی دنیا'' میں جمیل احمد اور ''میری بھی سنیے'' میں حنا الطاف سے ملاقات بیسٹ رہی ''مقابل ہے آئینہ'' میں آمنہ کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ اب بات ہو جائے میرے موسٹ فیورٹ ـــــ آسیہ مرزا کے سلسلہ وار ناول ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' کی پیاری آسیہ مرزا جی اس دفعہ بھی یہ قسط شاندار رہی۔ ایک طرح سے اینڈ ہو ہی گیا ہے۔ حوریہ کو آخر احساس ہو ہی گیا ہے۔ اس ناول کی کامیابی پر بہت مبارک ہو۔

نگہت عبداللہ کا ناول ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' پہلی قسط کی طرح یہ قسط بھی جاندار رہی حمزہ کے والد حیدر علی کا انتقال ہو گیا اب تو شہرینہ کی والدہ کبھی بھی حمزہ سے شہرینہ کی شادی کے لیے نہیں ما

نادیہ احمد کا مکمل ناول ''جنون مائل'' بہت بہت زبردست لگا۔ رابیل اور اس کے بابا جان کی نٹ کھٹ بہت اچھی لگی۔ ''مسکراتی کرنیں'' میں سب کی کرنوں نے مسکرانے پر مجبور کر دیا خاص کر میری اپنی کزن اقرا امتیاز نے ہاہاہا یار مذاق کر رہی ہو۔

اگر زندگی نے وفا کی تو 2018ء میں ملے گی سب کو میری طرف سے نیا سال مبارک ہو۔

ج: صائمہ جی! ہم آپ کو خط نہ لکھنے پر اس لیے معاف کر رہے ہیں کہ آپ نے اپنی مجبوری بتا دی ہے ورنہ ہم ناراض ہو جاتے ـــــ آپ کو بھی کرن کے سارے اسٹاف کی طرف سے نیا سال مبارک ہو۔

عابش جنجوعہ......تونسہ شریف

کچھ پڑھائی کی مصروفیت کچھ اپنی سستی کی وجہ سے کافی ماہ بعد اپنے پیارے رسالے میں شرکت کر رہے ہیں۔ پتا نہیں کسی نے ہماری کمی محسوس بھی کی ہے یا نہیں۔ خیر کرن نے اس بار بہت زیادہ انتظار نہیں کروایا شکر ہے بروقت مل گیا۔ ''حمد و نعت'' دو

سانحہ ارتحال

ہمارے ساتھی محمد عمران کی والدہ محترمہ مختصر علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں

اناللہ وانا الیہ راجعون

ادارہ محمد عمران کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور محمد عمران اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

مرتبہ پڑھ کر اپنے 4 سالہ بھانجے احمد رازی کو سنائے جو رسالہ آتے ہی "کرن کتاب" لے لیتا ہے کہ یہ میرا کرن ہے۔ نگہت عبداللہ کا سادہ انداز میں تحریر ناول "ہوائیں رخ بدل گئیں" اچھا لگ رہا ہے۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" حور یہ بھی بس عجیب مزاج کی لڑکی ہے۔ اب اس کا جلدی خوش گوار اینڈ کیجیے۔ "مجبور نشیمن" ہمیشہ کی طرح زبردست آمنہ بیگم بہت برا کر رہی ہیں معصوم سوچ کی روائیہ سے۔

باقی تمام ناولٹ، افسانے سب ہی اچھے سے مکمل ناول "ضروری نہیں" اور "جنوں مائل" بہت ہی اچھے زبردست تھے۔ "مقابل ہے آئینہ" میں آمنہ سے مل کر اچھا لگا۔ باقی مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا رہا۔

ج: عابش جی! کسی نے آپ کی کمی محسوس کی ہو یا نہ کی ہو ہم نے بہت کمی محسوس کی تھی۔ آپ کا خط لکھنے کا بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ! آپ کے بھانجے کی تمام تکالیف دور فرمائے (آمین) امید ہے اپنی سستی چھوڑ کر اب ہر ماہ "نامے میرے نام" کی محفل میں شریک ہوں گی۔

ندا امام...... حاصل پور

کچھ ماہ پہلے مجھے نہیں پتا تھا کہ "مجبور نشیمن" کیا بلا ہے۔ اور نہ پتا چلتا تو اچھا تھا' زندگی میں اچھا خاصا سکون تھا۔ عجیب ہیجان برپا کر دیا مصباح صاحبہ نے۔ دو دن میں ساری اقساط پڑھ ڈالیں اور اب اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار' کیسے وقت گزاروں میں؟ دونوں مکمل ناول ٹاپ کلاس تھے نادیہ احمد نے رنگ جمانے کی کوشش ضرور کی لیکن صدف ریحان تو میدان مارنے کی ٹھان کر اتریں۔ ناولٹ میں مجھے ام ایمان قاضی اچھا لگا حقیقت سے قریب لگا۔

ج: پیاری ندا! آپ پہلی دفعہ کرن کی محفل میں شریک ہوئی ہیں۔ خوش آمدید آئندہ بھی اپنے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوتی رہیے گا۔

سدرہ...... فاروق آباد

کچھ کہانیاں آپ کو ایسے جکڑ لیتی ہیں کہ بے ساختہ دل سے نکلتا ہے ان کا نام کچھ اور ہونا چاہیے بالکل اسی طرح "مجبور نشیمن" کا نام مصباح جی کو شکنجہ رکھنا چاہیے تھا ہم سب اس میں بری طرح پھنس گئے ہیں مصباح جی اب کیسے نکلیں ہم۔

نگہت عبداللہ بالکل درست کہتی ہیں۔ "ہوائیں رخ بدلتی ہیں"۔ اب دیکھتے ہیں۔ ہوائیں اپنا رخ کہاں کہاں بدلیں گی۔ ناولٹ میں "حصار ذات" یمنیٰ اختر کا بہت پسند آیا۔ واہ واہ...... افسانے سارے زبردست لگے۔ مکمل ناول ابھی پڑھے نہیں تو کیا رائے دوں۔

ج: پیاری سدرہ! بس آپ شکنجہ سے نکلنے والی ہیں۔ "مجبور نشیمن" کو اس قدر پسند کرنے کا مصباح علی سید کی جانب سے بے حد شکریہ۔ اگلی دفعہ پورے کرن پر تبصرہ کیجیے گا انتظار رہے گا۔

اسما کریم...... جھنگ

سب سے پہلے تو "رلپنزل" ایک جان دار تحریر جو برسوں یاد رہے گی' اب دوسری جان دار تحریر جو سمٹنے کو ہے "مجبور نشیمن" اس کے بارے میں الفاظ کم پڑ جاتے ہیں یہ کہنا غلط نہ ہوگا اس ناول نے قاری کو اتنا خود میں غرق کر رکھا ہے۔ خود مصباح کا کیا حال ہو گا کس طرح ڈوب کر لکھ رہی ہیں۔ مصباح جی آپ کا قلم مضبوط بہت ہے۔

اس بار جس افسانے نے ساری توجہ کھینچی وہ "دو کوڑی کی عورت" ہے موضوع پرانا مگر لکھنے کا انداز اور لکھنے والی کا نام نیا ہے۔ یہ افسانہ ٹاپ آف لسٹ۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ باقی رسالہ پڑھا نہیں تو تبصرہ کیا کروں۔

ج: پیاری اسما! تبصرہ تو آپ نے خوب کیا ہے مگر ادھورا ادھورا سا ہے۔ امید ہے آئندہ پوری کہانیوں پر رائے کا اظہار کریں گی۔ بالکل جناب ہر قاری بہن "مقابل آئینہ" اور "کچن اور آپ" میں شرکت کر سکتی ہیں یہ دونوں سلسلے آپ بہنوں کے لیے ہی ہیں۔ بہنوں سے درخواست ہے "مقابل ہے آئینہ" جوابات صرف ایک جملے یا لائن میں نہیں۔ دو چار لائینوں کا لکھا کریں۔

☆☆